

اردو ترجمہ

تفسیر روح البیان

پارہ نمبر ۱۹

تالیف

الامام العالم الفاضل والشیخ التحریر الکامل الجامع بین البواطن والظواہر ومفخر الاماثل والاکابر خاتمۃ المفسرین وقدوۃ ارباب الحقیقۃ والیقین فرید اوانہ وقطب زمانہ منبع جمیع العلوم مولانا ومولی الروم

الشیخ اسمٰعیل حقی البروسوی قدس سرہ العالی

ترجمہ

شیخ التفسیر والحدیث الحاج حضرت مولانا ابوالصالح محمد فیض احمد اویسی رضوی

مکتبہ اویسیہ رضویہ ○ ملتان روڈ ○ بہاولپور

نام کتاب ——— فیوض الرحمٰن ترجمہ تفسیر روح البیان

مؤلف ——— حضرت علامہ اسمٰعیل حقی قدس سرہٗ

مترجم ——— الحاج مولانا محمد فیض احمد اویسی

خطاط ——— محمد شریف گل

مصحح ——— چوہدری مشتاق محمد خاں لاہور

سنِ طباعت ——— فروری ۱۹۸۷ء

ناشر ——— مکتبہ اویسیہ رضویہ، ملتان روڈ، بہاولپور

قیمت ——— روپے

باہتمام: صاحبزادہ عطاء الرسول اویسی

نبی کو اپنے خاتمے کا علم نہ تھا = $\frac{247}{19}$

مرزائیت ابلیس در اصل ہے = $\frac{266}{19}$

چالیس ہزار =

صورِ رسالت = $\frac{۳۸۱}{19}$

بلقیس نے چالیس لفظ

بچے = $\frac{۶۰۵}{19}$

پارہ نمبر ۱۹

وَقَالَ الَّذِيْنَ

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ط لَقَدِ
اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ○ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ
لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ○ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ
هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ○ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ○ وَ
يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ○ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ
لِلرَّحْمٰنِ ط وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ○ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ
يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ○ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا
خَلِيْلًا ○ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ ط وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ
خَذُوْلًا ○ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ○
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ط وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ○ وَ
قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ج كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ
فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ○ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ○ ط

اَلَّذِیْنَ یُحْشَرُوْنَ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ اِلٰی جَھَنَّمَ اُولٰٓئِکَ شَرٌّ مَّکَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِیْلًا ع ۵

ترجمہ : اور ان لوگوں نے کہا جو ہمارے ہاں حاضری کی اُمید نہیں رکھتے کہ ہم پر فرشتے کیوں نہ نازل کیے گئے یا ہم اپنے رب کو آنکھوں سے دیکھتے بیشک یہ لوگ اپنے خیال میں اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں اور بہت بڑی سرکشی میں حد سے آگے بڑھ رہے ہیں جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے وہ دن مجرموں کے لیے خوشی کا نہ ہوگا اور کہیں گے اے اللہ! آج ہمارے لیے ہو کوئی آڑ رکی ہوئی اور ہم نے اُن کے عمل کو اُن کے سامنے کر کے باریک غبار کے بکھرے ہوئے ذرّے کر دیا بہشتیوں کے لیے ہوگا اس دن بہتر ٹھکانا اور دوپہر کی نیند کی اچھی آرام گاہ، اور اس دن آسمان بادلوں سے پھٹ جائے گا اور مکمل طور پر فرشتے نازل کیے جائیں گے اور اس دن حقیقی سلطنت رحمٰن کی ہوگی اور وہ دن کافروں کے لیے بہت سخت ہے اور اس دن ظالم اپنے ہاتھ چبائے گا کہے گا ہائے ہائے کاش دنیا میں میں نے رسول کے ساتھ راہ بنا لی ہوتی۔ ہائے میری شامتِ اعمال کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا اس نے آئی ہوئی نصیحت سے مجھے بہکایا اور شیطان انسان کو رسوا کرنے والا ہے اور رسول نے کہا اے میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو نظر انداز کر دیا۔ اور یونہی ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے ہر نبی کے دشمن بنائے اور تمہارا رب ہدایت کرنے اور مدد دینے کے لیے کافی ہے اور کافروں نے کہا کہ قرآن یکبارگی کیوں نہیں نازل کیا گیا یونہی تدریجاً اس لیے اتارا تاکہ اس ذریعہ سے ہم تمہارا دل مضبوط کریں اور ہم نے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا اور وہ کوئی بھی عجیب بات تمہارے ہاں لائیں مگر ہم حق اور اس سے بہتر بیان لائیں گے وہ لوگ جو اپنے منہ کے بل جہنم کی طرف اکٹھے جائیں گے ان کا ٹھکانا سب سے زیادہ بُرا اور سب سے زیادہ گمراہ ہے۔

تفسیر عالمانہ وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا۔ الرجاء وہ ظن جو پوشیدہ امر کے حصول کا تقاضا کرے۔ اللقاء وہ ادراک جو بصر و بصیرت کے متعلق ہو۔

قاعدہ : اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے ذکر سے قرآن مجید میں ہر جگہ قیامت کا دن مراد ہے اور بمعنے رجوع الی اللہ یعنی ایسے حاکم و مالک کی طرف رجوع کرنا جس کے سوا کوئی حاکم ہے نہ مالک۔

اب معنی یہ ہوا کہ اور کہا ان لوگوں نے جنہیں ہمارے ہاں حاضری کی کوئی امید نہیں یعنی وہ لوگ جو بعث و حشر اور حساب و جزا کے منکر ہیں یعنی کفارِ مکہ۔ اور تاج المصادر میں الرجاء بمعنے امید رکھنا اور ڈرنا لکھا ہے۔

اب آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ ہمارے دیکھنے سے نہیں ڈرتے۔ لَوْلَآ یہ حرف تحضیض ہے بمعنے ھلا یعنی کیوں نہیں اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰٓئِکَۃُ نازل کیے گئے ہمارے اوپر ملائکہ۔ یعنی ہمارے ہاں فرشتے رسول بن کر نازل ہوتے کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق بشریت رسالت کے لائق نہیں اَوْ نَرٰی رَبَّنَا یا ہم اپنے پروردگار کو کھلم کھلا دیکھیں اور خود رب تعالیٰ ہمیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق واتباع کا حکم فرمائے کیونکہ یہی طریقہ ایمان وتصدیق کے لیے احسن واقویٰ ہے اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان دو طریقوں سے کوئی ایک طریقہ اختیار نہیں فرمایا تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسے ہماری تصدیق برائے نبوت کا ارادہ نہیں۔

منکرینِ رؤیۃ باری تعالیٰ کا رد شیخ نجم الدین نے اپنی تاویلات میں لکھا کہ منکرین آخرت اور کافرین تو رؤیۃ حق تعالیٰ کی آرزو کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا :

اَوْ نَرٰی رَبَّھُمْ۔ ترجمہ : یا ہم اپنے پروردگار کو دیکھیں۔

لیکن افسوس کہ ایمان کے مدعی جنہیں آخرت پر ایمان بھی ہے اور حشر میں اُٹھنے کا یقین بھی رکھتے ہیں لیکن اپنے رب تعالیٰ کی رؤیت کے منکر ہیں حالانکہ رویتِ باری تعالیٰ کے متعلق نصوص وارد ہیں ان سے تو وہی منکرین آخرت بہتر ہوئے کہ انہوں نے رؤیتِ حق تعالیٰ کا جواز ظاہر کرکے اس کی آرزو پیش کر دی۔ جیسے انہیں انزال الملائکہ کا اقرار ہے ایسے ہی وہ رؤیت باری تعالیٰ کے بھی مُقِر ہیں۔ نتیجہ نکلا کہ منکرینِ قیامت اور منکرینِ رؤیتِ باری تعالیٰ نصوص کے انکار میں اشتراک ہے کیونکہ جیسے روایات سے بعث ونشر اور آخرت ثابت ہے ایسے ہی نصوص سے ثابت ہے کہ اہلِ ایمان کو قیامت میں باری تعالیٰ کی زیارت ہوگی۔

لَقَدِ اسْتَکْبَرُوْا یہ لام قسم محذوف کا جواب ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ بخدا انھوں نے تکبر کیا مد الاستکبار انسان غلط تصورات سے بھرپور ہو کر اپنے میں وہ مرتبہ ظاہر کرے جو اس میں نہیں۔ اب مطلب یہ ہُوا کہ اُنہوں نے باطل کے طور کبر کو ظاہر کیا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ اپنے نفسوں کے متعلق، یعنی انہوں نے اپنے نفسوں کے لیے خیالی مراتب ودرجات گھڑ لیے اسی لیے کہہ دیا کہ ان کے ہاں پیغاماتِ الٰہی ملائکہ لے آئیں یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے لیے خود انہیں اللہ تعالیٰ آکر فرمادے۔

ف : کاشفی نے لکھا کہ بخدا انہوں نے اپنے خیال سے اپنے آپ کو بڑا بنا لیا یعنی اس فیصلے میں انہوں نے تکبر سے کام لیا اور بے جا جرأت کی۔

وَعَتَوْ اور انہوں نے ظلم اور طغیان میں حد سے تجاوز کیا۔ العتو بمعنے الغلو اور طاعت سے دُور ہونا۔ عُتُوًّا کَبِیْرًا ۝ سرکشی کی انتہا کو پہنچ گئے کہ باوجودیکہ معجزات وبراہین دیکھے لیکن ان سے

روگردانی کی اور خباثتِ طبعی سے اپنے خبیث نفسوں کے لیے ملائکہ کا معائنہ اور باری تعالیٰ کی زیارت کا مطالبہ کر ڈالا حالانکہ ان خبثاء کی خباثت اور غلاظتِ طبعی کو زیارتِ ایزدی کا امکان کسی پاگل دماغ کو ہوگا ، ورنہ ظاہر ہے کہ دنیا میں تو سوائے ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی نبی علیہ السلام اور ولی کو زیارت نہیں ہوتی اور نہ کسی کو ہو سکتی ہے اور ہمارے حضور شافع النشور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دنیا کی حدوں کو عبور کرکے ذاتِ حق تعالیٰ کو بے حجاب دیکھا۔ دنیا کی حد ہفت افلاک تک ہے اور بس۔ اس لیے کہ عالمِ دنیا کون و فساد کا عالم ہے۔

مسئلہ : الوسیط میں ہے کہ رؤیتِ حق کی طلب کو عتو سے اس لیے موصوف کیا گیا کہ انہوں نے دل وجان سے رؤیت کی آرزو نہیں کی بلکہ ان کا مقصد حق سے عناد اور اللہ و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طاعت سے انکار کے طور آرزو کی اس اعتبار سے اُنہوں نے اپنی گفتگو اور کفر میں غلو کیا۔

سوال : جب اللہ تعالیٰ کا دیدار جائز ہے تو پھر جائز امر پر انھیں زجر و توبیخ کیوں ؟

جواب : (۱) انھیں زجر و توبیخ دوسری وجہ سے کی گئی وہ یہ کہ ایسی طلب کی جو ان کے لائق نہیں تھی وہ اس لیے کہ جب انہوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دلائل و براہین دیکھ لیے تھے تو پھر بجائے تسلیم کرنے کے دوسرے مطالبہ کے درپے ہوگئے۔ اور ظاہر ہے کہ جو دلیل دیکھ کر پھر دلیل کا مطالبہ کرے اسے احمق کہا جاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں سرکشی یعنی عتو و غلو سے تعبیر فرمایا۔

(۲) وہ ایمان بالغیب کے مکلف تھے لیکن جونہی انہوں نے رویت (آنکھوں سے دیکھنے) کا سوال کیا تو اصل موجب سے متجاوز ہوگئے اسی لیے انھیں اللہ تعالیٰ نے عتو سے موصوف فرمایا۔

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ اس دن سے کہ وہ ملائکہ کو دیکھیں گے یعنی عذاب کے فرشتوں کو قیامت میں دیکھیں گے۔

سوال : یوم تنزل الملٰئکۃ الخ کیوں نہیں فرمایا ؟

جواب : تاکہ معلوم ہو کہ ملائکہ کی رؤیت ان کے مطالبہ کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی دوسرے طریقہ سے ہے وہ ہے عذاب میں مبتلا ہونا اور یوم کا منصوب ہونا بوجہ ظرفیت کے ہے جیسا کہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

لَا بُشْرٰی يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ اس دن مجرموں کو کوئی بشارت نہ ہوگی۔ یہ جملہ بمعنے یبشر کے ہے یعنی قیامت میں انھیں خوشخبری سے نوازا نہیں جائے گا۔ اس کا معنیٰ یہ نہیں کہ نفس بشریٰ ان سے متعلق نہ ہوگی اس لیے کہ بشری مصدر ہے اور مصدر اپنے ماقبل میں عمل نہیں کرتا اسی طرح جو شے ماقبل میں عمل نہیں کرتی وہ مابعد میں بھی عمل نہ کرے۔ المجرم ، جرم سے ہے یعنی ثمر کو درخت سے کاٹنا۔ عرفاً ہر مکروہ عمل کے ارتکاب کو جرم

کہا جاتا ہے۔ اور ضمیر کے بجائے المجرمین کی تصریح میں اشارہ ہے کہ ان پر کفر کے علاوہ مجرم ہونے کی مُہر ثبت کرنی ہے اور وہ تاکید (جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے یعنی انہوں نے فرشتوں کا نزول اور رویتِ باری تعالیٰ کا مطالبہ کیا ہے) کے لیے یومئذ کو تکرار کے طور پر لایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جو کچھ وہ مانگ رہے ہیں وہ ضرور ہوگا لیکن اس کے موجود ہونے پر انہیں پریشان ہونا پڑے گا کیونکہ اس وقت انہیں خوشخبری تو کوئی سنائی نہیں جائے گی البتہ انہیں ہراساں کیا جائے گا اور ہر وقت عذاب میں مبتلا رکھا جائے گا بخلاف اہلِ ایمان کے کہ ان کے ہاں ملائکہ حاضری دے کر خوشخبریاں سنائیں گے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام سناتے ہوئے کہیں گے:

ان لا تخافوا ولا تحزنوا الخ ترجمہ: نہ خوف کھاؤ اور نہ غم کرو۔

خلاصہ یہ کہ کفارِ مکہ کو قیامت میں کسی قسم کی خوشخبری نہیں دی جائے گی۔

وَيَقُولُونَ ملائکہ کو دیکھ کر کفار مجرمین کہیں گے۔ اس کا عطف فعل منفی مذکور پر ہے حِجْرًا مَّحْجُورًا ٥ حجراً، حجرہ کا مصدر ہے بمعنے منع، اور محجور بمعنے ممنوع۔ اور محجورا، حجرا کی صفت ہے۔ یہ تاکید کے طور لایا گیا ہے جیسے یوم میں الیوم اور لیل میں اللیل تاکید کے لیے آتے ہیں۔ یہ کلمہ در اصل اس وقت بولتے ہیں جب ان پر سخت ہجوم اور دشمن کا سامنا ہو۔

اب معنیٰ یہ ہُوا کہ اپنے ہاں ملائکہ کے نزول کا مطالبہ کرتے ہیں حالاں کہ ان کا حال یہ ہوگا کہ جب وہ قیامت میں ملائکہ کرام کے دیکھنے سے کراہت کا اظہار کرتے ہوئے کہیں گے: حجراً محجوراً۔ یہ کلمہ نزولِ بأس کے وقت پناہ کے طور پر کہتے اور اللہ تعالیٰ سے استدعا کرتے ہوئے عرض کرتے کہ ان کے لیے کوئی سبب ہو جس سے وہ اس مکروہ شے کو نہ دیکھیں اور وہ مکروہ شے ان سے دور رکھے تاکہ وہ شے ان تک نہ پہنچ پائے۔

ف: زاد (المسیر) میں لکھا کہ جب کفار مشعر حرام میں کسی ایسے کو دیکھتے جس سے انہیں خطرہ ہوتا تو اسے کہتے: حجراً محجوراً۔ اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم ماہ حرام میں ہیں اور تو بھی اس ماہِ حرام کا خیال کر۔ اس سے ان کا اصل مقصد یہی ہوتا کہ وہ اس مکروہ امر کی شدّت سے حفاظت پا جائیں یہاں قیامت میں بھی اسی خیال سے حجراً محجوراً کہیں گے کہ شاید قیامت کے عذاب سے بچ جائیں۔

ف: منقول ہے کہ قریشِ مکہ کو جب کوئی ایسا امر لاحق ہوتا کہ جس سے انہیں خطرہ ہوتا تو کہتے:

حاجورا حاجورا۔ "بچاؤ بچاؤ"

اس سے ان کا یہ واضح کرنا ہوتا کہ وہ حرم شریف میں ہیں اور یہ لفظ سننے والا ان کو تکلیف نہ دیتا۔ اب قیامت میں بھی اسی ارادے سے کہیں گے: حجرا محجورا۔ لیکن اس دن ایسا کلمہ انھیں کوئی فائدہ نہ دے گا۔

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ٥ القدوم بمعنے مدت کے بعد مسافر کا

آنا۔ اور ھباء وہ گرد و غبار جو سورج کی کرنوں سے روشندانوں میں اڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ الھبوۃ سے ہے بمعنے الغبار۔ منثور، ھباء کی صفت ہے بمعنے پھیلی ہوئی۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے کفار اور ان کے ان اعمال کا حال بتایا ہے جو انہوں نے دنیا میں کیے۔ مثلاً صلہ رحمی، مظلوم کی فریاد رسی اور مہمان نوازی اور قیدی آزاد کرنا، یتیم پروری و دیگر وہ نیکیاں کہ اگر انہیں ایمان کو قبول کرنے کے بعد کرتے تو ان کا بہترین ثواب پاتے ان کی مثال بادشاہ کے ان باغیوں کی ہے جو بادشاہ کے خلاف ہو کر اچھے کام کریں تو بادشاہ حکم فرمائے کہ ان کے مکانات اور زمینیں وغیرہا چھین لی جائیں اور ان کی آبادیوں کو بربادیوں سے بدل دیا جائے حتیٰ کہ ان کے نشانات تک مٹا دیئے جائیں۔

اب آیت کا معنیٰ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے اعمال کے متعلق ارادہ کیا اور انھیں بالکل باطل قرار دے دیا۔ اس لیے کہ ان کے قبول کرنے کے شرائط نہیں ہیں یعنی ایمان سے خالی ہیں۔ اس تقریر پر قدمنا کا مجازی معنیٰ کیا گیا ہے کیونکہ وہاں قدوم کا تصور کیسا۔ اور یہاں ہیئت کی تشبیہ ہے اور ایسے مقامات پر مفردات اپنے معانی اصلیہ میں مستعمل ہیں اور ان کے ضائع شدہ اعمال کو غبار سے حقارت کی وجہ سے تشبیہ دی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ وہ قابلِ اعتبار نہیں۔ اور منثوراً میں اشارہ ہے کہ ان کے اعمال کسی طریقہ سے بھی نظم و ترتیب میں نہیں آسکیں گے۔

فائدہ صوفیانہ : اس میں اشارہ ہے کہ اہلِ بدعت کے اعمال کا حال بھی یونہی ہے کہ وہ اپنے اعمال خواہشِ نفسانی کو مدِنظر رکھ کر کرتے ہیں اور ان میں ریاء کی ملاوٹ ہوتی ہے اسی لیے ان کے اعمال باطل ہو کر رہ جائیں گے جن کا نہ کوئی نشان رہے گا اور نہ ہی ان کی کوئی خبر لے گا۔ حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

۱	شنیدم کہ نابالغی روزہ داشت	بصد محنت آورد روزی بچاشت
۲	بگفتا پس آں روز سائق نبرد	بزرگ آمدش طاعت از طفل خرد
۳	پدر دیدہ بوسید و مادر سرش	فشاندند بادام و زر برسرش
۴	چو بر وی گزر کرد یک نیمہ روز	فتاد اندر و آتش معدہ سوز
۵	بدل گفت اگر لقمہ چندی خورم	چہ داند پدر عیب یا مادرم
۶	چو روی پسر در پدر بود و قوم	نہاں خورد و پیدا بسر برد صوم
۷	کہ داند چو در بند حق نیستی	اگر بی وضو در نماز ایستی
۸	پس ایں پیر ازاں طفل نادان ترست	کہ از بہر مردم بطاعت درست

۹ کلید در دوزخست آں نماز که در چشم مردم گزاری دراز

۱۰ اگر جز بحق میرود جاده ات در آتش نشانند سجاده ات

ترجمہ: ۱۔ میں نے سنا ہے کہ ایک نابالغ نے روزہ رکھ لیا۔ سو مشقتوں سے چاشت تک دن پہنچایا

۲۔ اس دن اس کو مکتب سے خلیفہ لے گیا۔ چھوٹے بچے کی عبادت اسکو بڑی معلوم ہوئی۔

۳۔ باپ نے آنکھیں چومیں ماں نے اس کا سر۔ انھوں نے بادام اور چاندی اسکے سر پر نچھاور کی۔

۴۔ جب اس پر آدھا دن گزرا۔ اس کے اندر معدہ کی آگ سے جلن پیدا ہوگئی۔

۵۔ اس نے دل میں کہا اگر میں چند لقمے کھالوں میرے باپ یا ماں غیب کو کیا جانیں گے؟

۶۔ جب لڑکے کا رخ باپ اور قوم کی طرف تھا تو چپکے سے کھالیا بظاہر روزہ پورا کرلیا۔

۷۔ اگر تو خدا کی فکر میں نہیں ہے تو کسی کو کیا معلوم۔ اگر تو بے وضو نماز میں کھڑا ہو جائے۔

۸۔ یہ بوڑھا اس بچہ سے بھی زیادہ نادان ہے جو انسانوں کی خاطر عبادت میں لگا ہے۔

۹۔ وہ نماز دوزخ کے دروازے کی کنجی ہے جو تو لوگوں کی نگاہوں کے سامنے لمبی پڑھے۔

۱۰۔ اگر تیری سڑک اللہ تعالیٰ کی جانب کے سوا ہے تو تیرے مصلّیٰ کو آگ میں ڈال دیں گے۔

اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ بہشتی یعنی اہلِ ایمان یَوۡمَئِذٍ اس دن جس دن کفار کا حال وہی ہوگا کہ انھیں خوشخبری نہیں ہوگی اور وہ حجراً محجوراً پکاریں گے اور ان کے اعمال اڑتی ہوئی غبار کی طرح بیکار اور باطل بنا دیے جائیں گے، اور اہلِ ایمان اس کے برعکس خَیۡرٌ مُّسۡتَقَرًّا بہتر قرارگاہ میں ہوں گے۔ مستقر وہ مکان جسے انسان اپنی نشست و برخاست کے لیے مقرر کرے۔ یعنی اہلِ ایمان کی رہائش گاہ ان کافروں دنیاداروں کی دنیوی رہائش گاہ سے بہتر ہوگی۔ یعنی اہلِ ایمان کے مکانات آخرت میں دنیا کے کافروں کے مکانوں اور منزلوں سے بہتر و اعلیٰ ہوں گے یا یہ افضلیت آخرت میں کفّار کے مکانات کی وجہ سے ہے۔

سوال: یہ معنی نامناسب ہے اس لیے کہ کافروں کے لیے آخرت میں خیریت کا مفہوم کیسا؟

جواب: تہکم و استہزاء کے طور ہے۔ جیسے قولِ باری تعالیٰ "قل اذٰلك خير ام جنة الخلد" میں تہکم و تقریع ہے یا یہ افضلیت بوجہ زیادہ مطلقہ کے ارادہ پر ہے یعنی وہ اہلِ ایمان خیریت کے انتہائی اعلیٰ مراتب پر ہوں گے۔ یہی تقریر وَّ اَحۡسَنُ مَقِیۡلًا ۝ میں کی جائے۔ یعنی کافروں کے دنیا کے قیلولہ کرنے کے مکانات سے آخرت میں بہترین مقام میں ہوں گے یا آخرت میں اہلِ ایمان اہلِ کفر سے بہتر قیلولہ گاہ میں ہوں گے یا وہ انتہائی احسن قیلولہ گاہ میں ہوں گے۔ المقیل بمعنے موضع القیلولة یعنی قیلولہ کی جگہ۔ اور قیلولہ بمعنے موسم گرما میں دوپہر کے وقت آرام کرنا۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

نمت نصف النہار ۔ (میں دوپہر کو سویا)
اس سے یہی قیلولہ مراد ہوتا ہے ۔ لیکن یہاں یہ وہ جگہ مراد ہے جہاں اہلِ بہشت اپنی ازواج کے ساتھ آرام کے لیے اور ان سے گفت وشنید اور لہو ولعب کے لیے ٹھہریں گے ۔ ورنہ بہشت میں کہاں دوپہر، کہاں گرمی اور کہاں نیند، بلکہ وہاں مطلق آرام ہوگا جس میں غفلت نہ ہوگی اور نہ کوئی حس ادراک سے خالی ہوگی ۔ اسی طرح جہنم میں کوئی مکان آرام کے لیے نہیں ہوگا اور نہ ہی وہاں کافروں کو نیند کے لیے وقت دیا جائے گا بلکہ وہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا ہوں گے ۔

ف : مقیل سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے مروی ہے کہ اہلِ بہشت کے لیے قیامت کے دن اتنی مقدار ہوگی جتنی صبح سے دوپہر کا وقت گزار کر قیلولہ کے لیے اپنے مسکن میں آرام کے لیے جاتا ہے ایسے بہشتی اتنا وقت گزار کر اپنے اپنے مسکن میں چلے جائیں گے اور دوزخی دوزخ میں ۔ اور مجوسیوں کے لیے پیاس کے ساتھ دنیوی پچاس ہزار سال کی مقدار گزرے گی (العیاذ باللہ) ۔

ف : اسے احسن سے موصوف کرنے میں اشارہ ہے کہ بہشتیوں کے مسکن ایسے ہی مختلف مزینات سے مزیّن ہوں گے جیسے دُنیا میں دُلھن کا گھر سجایا جاتا ہے ۔

تفسیر صُوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ جو لوگ حشر ونشر پر ایمان اور رؤیتِ باری تعالیٰ کا یقین رکھتے ہیں ان اہلِ بہشت کے لیے یومئذ خیر مستقراً بہترین قرارگاہ ہوگی ۔ اس لیے کہ عوام اہلِ بہشت کو بہشت اور خواص کو حضرتِ ربوبیت اور قربِ حق تعالیٰ نصیب ہوگا ۔ کما قال تعالیٰ :

الیٰ ربک یومئذ المستقر ۔ ترجمہ: تیرے رب کے ہاں آج ٹھہرنے کی جگہ ہے ۔

واحسن مقیلا اس لیے کہ دوزخ منکرینِ حشر اور بہشت اہلِ ایمان اور قربِ حق راجعین الی اللہ اور مجذوبین کے ٹھہرنے کی جگہ ہے ۔

سبق : دانا پر لازم ہے کہ وہ مستقر اخروی ومقیل علوی کے حصول کے لیے جدّ وجہد کرے ۔

حکایت ایک رات شیخ حجازی آیت :
"وجنۃ عرضہا السمٰوٰت والارض" ترجمہ : اور وہ بہشت جو کہ چوڑائی میں زمین وآسمان ہے ۔
پڑھ پڑھ کر روتے رہے ۔ آپ سے عرض کیا گیا کہ اس آیت میں تو الٹا بہشت کی وسعت کا بیان ہے پھر آپ کیوں روتے ہیں ؟ آپ نے فرمایا : اگر خدانخواستہ اس میں مجھے قدم رکھنے کی جگہ بھی نہ ملے تو اس کی وسعت کا کیا فائدہ !

حدیث شریف میں ہے :
"من سعادۃ المرء المسکن الواسع والجار الصالح والمرکب الھنیئ" ۔

(انسان کی سعادت کی علامت ہے کہ اسے رہنے کے لیے جگہ فراخ اور ہمسایہ نیک اور سواری طبیعت کے موافق ہو)

ف : کسی سے پوچھا گیا، غنی کون ہے؟ اس نے جواب دیا: مکان فراخ اور رزق فراخ جسے حاصل ہو وہی دنیا میں غنی ہے۔

ف : دنیا کی سعادات آخرت کی سعادات کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

افتخار از رنگ و بو و از مکان

ہست شادی و فریب کودکان

ترجمہ : رنگ و بو و مکان پر فخر کرنا بازیچۂ اطفال ہے۔

؎

۱ ہر کجا باشد شہ مارا بساط

ہست صحرا گر بود سم الخیاط

۲ ہر کجا یوسف وحی باشد چو ماہ

جنت است آں چہ کہ باشد قعر چاہ

ترجمہ : جہاں ہمارا محبوب ڈیرہ ڈال لے وہی ہمارے لیے فراخ مکان ہے اگرچہ وہ سُوئی کے ناکہ کے برابر ہو، جہاں یُوسف قیام پذیر ہو وہاں گہرا کنواں بہشت ہے۔

عارف کی جنّت عارف باللہ کی جنّت پاک قلب و معرفتِ الٰہی ہے۔ چنانچہ یحیٰی بن معاذ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دُنیا میں ایک ایسی بہشت موجود ہے جو اس میں داخل ہوگا وہ کبھی آخرت کی بہشت کا شوق ظاہر نہیں کرے گا۔ عرض کیا گیا، وہ کون سی بہشت ہے؟ آپ نے فرمایا: معرفتِ الٰہی ؎

چو دادت صورت خوب و صفت ہم

بیا تا بدہدت ایں معرفت ھم

چو خونے مشک گردد از دم پاک

بود ممکن کہ تن جانے شود پاک

ترجمہ : جب تجھے صورت حسین اور بہتر صفت عطا کی ہے تو تم اس کے دروازے پر آؤ تاکہ وہ تمہیں معرفت عطا فرمائے۔ جو خون ایک ہی دم سے مشک ہو جاتا ہے کہ اس دم سے سارا

جسم کیوں پاک نہ ہو جائے گا۔

تفسیر عالمانہ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ اس وقت کو یاد کرو جب کہ پہاڑ پھٹ جائیں گے۔ تاج المصادر میں تشقق میں پھٹنا دراصل تتشقق تھا۔ تلظّٰی کی طرح ایک تاء محذوف ہوئی ہے بِالْغَمَامِ بادل کے ساتھ۔ اسے اس نام سے اس لیے موسوم کیا گیا ہے کہ اس سے سورج کی روشنی چھپ جاتی ہے۔ الغم بمعنی ستر الشئ یعنی آسمانوں سے بادل کے طلوع سے۔ یہ وہی بادل ہے جسے آیت:

هُل ينظرون الّا ان یاتیهم الله فی ظلل من الغمام والملئِكة۔

(نہیں دیکھیں گے مگر یہ کہ ان کے ہاں عذابِ الٰہی بادلوں کے سایوں میں آئیں گے اور فرشتے)

میں بیان کیا گیا ہے۔ بعض نے کہا کہ غمام سائبان کی طرح باریک سفید بادل تھا جو بنی اسرائیل کے لیے ظاہر ہوا یعنی جب وہ جنگل میں حیران و ششدر پھر رہے تھے تو ان پر اس طرح کا بادل چھا گیا تھا۔

ف: حضرت ابو اللیث رحمہ اللہ نے فرمایا:

غمام بادل کی طرح ایک سفید شے جو ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے۔

چنانچہ **حدیث شریف** میں ہے:

دعوۃ المظلوم ترفع فوق الغمام۔

(مظلوم کی دعا ساتوں آسمانوں کے اوپر غمام کے اوپر جاتی ہے)

ف: حضرت امام نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا:

غمام ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے اور سفید بادل ہے جس کی موٹائی ساتوں آسمانوں کے برابر ہے، جسے آج تک اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے روکا ہوا ہے اس کا بوجھ ساتوں آسمانوں کے برابر ہے۔ جب اللہ تعالیٰ آسمانوں کے پھٹنے کا ارادہ فرمائے گا تو اس بادل کا بوجھ ان پر ڈالے گا تو وہ پھٹ جائیں گے۔ یوم تشقق السماء کا یہی مطلب ہے یعنی آسمان پھٹ جائیں گے اس بادل کے بوجھ سے۔ یعنی بادل ظاہر ہو کر آسمانوں سے نکلے گا اور اسی میں ملائکہ کرام ہوں گے۔ کما قال تعالیٰ:

وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ۝ یعنی غیر معہود طریقہ سے اسی بادل سے عجیب طور نازل ہوں گے بعضوں نے کہا کہ اس وقت علٰحدہ علٰحدہ آسمان پھٹ جائیں گے تو انہیں آسمانوں سے ملائکہ کرام بندوں کے عملنامے لے کر نکلیں گے۔

تنشق السّماء مروی ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے پہلا آسمان پھٹے گا تو اس سے آسمانِ دنیا کے انس و جن کی گنتی میں ملائکہ کرام نکلیں گے انھیں مخلوقِ خدا کہے گی : کیا تم میں ہمارا پروردگار ہے یعنی حساب کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم وارد ہو چکا ہے، وہ فرشتے کہیں گے : نہیں وہ عنقریب آنے والا ہے۔ اس کے بعد دُوسرا آسمان پھٹے گا اس سے دوہرے فرشتے تشریف لائیں گے۔ اسی طرح ہر دوسرا آسمان پہلی مقدار سے دوہری مقدار سے ملائکہ نازل ہوتے رہیں گے یہاں تک کہ ساتوں آسمان پھٹ جائیں گے تو غمام ظاہر ہوگا۔ یعنی وہی سفید بادل جو ساتوں آسمانوں کے اُوپر ہے اس کے بعد حساب کا حکم نازل ہوگا۔ یوم تشقق السّماء کا یہی معنیٰ ہے۔

ف : یہ زمین پہلے آسمان کے مقابلہ میں ایسے ہے جیسے زمین کے سامنے ایک رستہ۔ اسی طرح ملائکہ کی گنتی کا حال ہے۔ پھر اسی طرح ہر نچلا آسمان اوپر والے کے مقابلہ میں، اندازہ لگائیے کہ ساتوں آسمانوں کی گنتی پر غور کیا جائے تو ان کے لیے زمین میں وسعت کہاں! کما فی حواشی الشیخ۔

اعجوبہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ زمین کو دستر خوان کی طرح دراز کر کے بچھا دے گا۔ اور ظاہر ہے کہ آسمان قبہ جات کی طرح پھیلے ہوئے ہوں گے، جب ان میں سے ایک کو اُٹھا لیا جائے گا تو زمین اس کی مقدار وسیع ہو جائے گی اسی طرح ساتوں آسمانوں کے قبے اُٹھتے جائیں گے اور زمین وسعت پذیر ہوتی جائے گی۔ اسی طرح ملائکہ کرام اس میں پھیلتے جائیں گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ملائکہ لطیف اجسام ہیں اس لیے ان کے لیے ایک دُوسرے پر مزاحمت کا تصوّر نہ کیا جائے۔ یہ مزاحمت انسانوں کے متعلق ہو سکتی ہے اس لیے کہ انسان ثقیل اجسام ہیں۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ۔ الملك مبتدا ہے اور الحق، الرحمٰن کی صفت ہے اور وہ مبتداء کی خبر ہے اور یومئذ خبر کو مبتدا کے ثبوت کے لیے ظرف ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ سلطنت قاہرہ اور استیلاء کلی ظاہری و باطنی بایں معنی کہ اسے ہرگز زوال نہیں۔ وُہ قیامت میں صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہے اور اسے یومئذ سے مقید کرنے میں اشارہ ہے کہ قیامت میں سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہوگی اور کسی کے لیے مجازاً بھی ملکیت و سلطنت کا تصوّر نہ ہوگا ۔

چو مدعیان زبان دعوی
از مالکیت در بستہ باشند

ترجمہ : جب مدعیان قیامت میں مالکیت سے زبان بند کیے ہوں گے۔

ف : دنیا میں بھی اگرچہ سلطنت و ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے لیکن اس میں مجازاً کسی نہ کسی کا ملک و

سلطنت ہے۔

وَكَانَ يَوْمًا اور ہوگا وہ دن عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا کافرین پرسخت یعنی شدتِ ہول کی وجہ سے کفار پر وہ دن بڑا سخت ہوگا۔ عسر یسیر کی نقیض ہے اسی لیے قیامت کا دن اہلِ ایمان پر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے نہایت آسان ہوگا۔

حدیث شریف میں ہے:

انہ یھون یوم القیامۃ علی المؤمن حتی یکون اخف علیہ من صلاۃ مکتوبۃ صلاھا فی الدنیا۔

(قیامت کا دن اہلِ ایمان پر ایسے آسان ہوگا جیسے اس نے دنیا میں خفیف تر دوگانہ پڑھا ہوگا)

ف: کفار پر وہ دن اس لیے سخت ہوگا کہ وہ جہنم میں داخل ہوں گے اور انہیں بہشت کی محرومی سے حسرت ہوگی حالانکہ دنیا میں نعمتیں حاصل تھیں اُن سے محروم ہوکر طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہوں گے اور اہلِ ایمان کو آسانی بایں معنی ہوگی کہ وہ جنات کی نعمتوں اور دیدارِ الٰہی سے نوازے جائیں گے اور اس سے قبل دنیا میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تکلیف پر راضی تھے اور انہیں آسانیاں حاصل نہیں تھیں۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ اس دُکھ درد کے بعد آرام وسکون نصیب ہوگا۔

حکایت علی سہل صعلوکی کو یہودی کے حمام کی قید سے نکال کر ایک سیاہ پردے کے دُھوئیں میں ڈالا گیا۔ یہودی نے کہا کہ تم کہتے ہو کہ دنیا اہلِ ایمان کے لیے قیدخانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔ اس کا کیا مطلب؟ سہل صعلوکی نے فوراً جواب دیا کہ جب تم جہنم میں جاؤ گے تو تم اس دنیا کو جنت تصور کروگے اور جب ہم بہشت میں جائیں گے تو ہمیں یہ دنیا قید محسوس ہوگی۔ لوگ ان کے فوری جواب سے متعجب ہوئے۔

نجاتِ اہوالِ آخرت حضرت شیخ شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کی گئی: دنیا میں اشتغال اور آخرت میں اہوال ہیں ان سے نجات کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ دنیوی مشاغل کو ترک کردو آخرت کے اہوال سے نجات نصیب ہوجائے گی۔ وہ لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں جو دنیا کی طلب سے فارغ اور اس کے شہوات سے دُور اور اس کے فریب سے نہ صرف مجتنب ہیں بلکہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے ؎

ایں جہان جیفہ است و مردار و رخیص
بر چنیں مردار چوں باشم حریص

ترجمہ: یہ جہان جیفہ و مردار اور بدبُودار ہے۔ ایسے مردار پر میں کیسے حریص بن سکتا ہوں۔

بعض بزرگوں نے فرمایا کہ بہشت کے بنگلے پر لکھا ہے کہ صد حیف اس پر جو ... کا خریدار ہے۔

اللہ والوں کی نشانی اولیاءُ اللہ نے ماسوی اللہ کی محبت کو دل سے کاٹ کر رکھ دیا ہے اور وہ شدائد و مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو ہر وقت تیار رکھتے ہیں یہاں تک کہ وہ منزلِ مقصود کو پہنچے۔

اولیاءؒ کے دشمن کی سزا اہلِ انکار قیامت میں سخت سے سخت دُکھ درد میں مبتلا ہوں گے اس لیے کہ وہ اولیاءؒ کی شان میں گستاخیاں کرتے رہے اور عوام کو ان سے متنفر کرنے میں کوشاں رہے اور چاہتے کہ عوام اولیاءُ اللہ سے رُوگردانی کر کے ان کی طرف متوجہ ہوں اور وہ مال و اسباب وغیرہ ان سے لُوٹ کر کھا جائیں، حالاں کہ مرنے کے بعد جملہ املاک و اسباب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوں گے۔ اور ایسے لوگ کسی شے کے مالک نہیں ہوں گے، اسی لیے اپنے سے کوئی دُکھ اور درد دُور نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے لازم ہے کہ انسان ہر وقت تجدیدِ ایمان اور اقرارٌ بالّلسان پر کمربستہ رہے۔ کما ورد :

جددوا ایمانکم بقول لا الٰہ الا اللہ۔

(لا الٰہ الا اللہ کی تجدید کرو)

سوال : اس حدیث شریف سے معلوم ہُوا کہ ایمان بھی پُرانا ہو جاتا ہے۔

جواب : ایمان کے پرانے ہونے کا یہ معنیٰ ہے کہ انسان پر غفلت چھا جائے اور وہ شوقِ الٰہی سے دُور ہو جائے تو ایسے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ تجدیدِ ایمان سے اپنی دُوری اور غفلت کو ہٹائے تاکہ کلمہ طیبہ کی برکت سے شوقِ حق اور جذبۂ الٰہی اور محبتِ ایزدی اسے حاصل ہو۔

سبق : عاقل پر لازم ہے کہ وہ ہر وقت ذکرِ حق میں مشغول رہے یہاں تک کہ اس کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ جائے۔

؎ جدائی مبادا مرا از خدا
دگر ہر چہ پیش آیدم شایدم

ترجمہ : ایسا نہ ہو کہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے جُدائی ہو، دوسرا کوئی دکھ درد آئے تو ہمیں منظور ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ مرتے دم تک ہم اس کی اطاعت و فرماں برداری سے سرِمُو نہ ہٹیں۔ (آمین)

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ یوم فعل اذکر مقدر کی وجہ سے منصوب ہے اور العض بمعنے کسی شے کو دانتوں سے چبانا۔ اور عض الیدین سے ندامت مراد ہے۔ کیونکہ لوگوں کی عادت ہے کہ ندامت کے وقت ہاتھ چباتے ہیں۔ اسی طرح اسے کبھی عض الانامل سے اور کبھی اکل البنان اور کبھی حرق الاسنان وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں اور ان الفاظ سے غیظ و غضب اور حسرت مراد لیتے ہیں اور یہ الفاظ مترادفات سے ہیں۔

ف : الکواشی میں ہے کہ ممکن ہے کہ لفظ علیٰ زائد ہو اس معنے پر عض اپنے حقیقی معنی پر ہو گا۔ جیسا کہ مروی ہے کہ قیامت کے دن کافر اپنے دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک چبا جائے گا ابھی کہنیوں تک پہنچے گا تو دونوں ہاتھ پھر مکمل اور صحیح و سالم ہو جائیں گے وہ پھر انہیں کھانے لگ جائے گا۔ اسی طرح وہ کھاتا جائے گا اور ہاتھ از سرِ نو پیدا ہوتے رہیں گے۔ اس کا یہ ہاتھوں کو چبانے اور کھانے کا عمل اپنی کمی اور کوتاہی سے ندامت کی وجہ سے ہو گا۔

اب آیت کا معنیٰ یہ ہوا کہ ظالم قیامت میں حسرت سے اپنے دونوں ہاتھوں کو متحیر لوگوں کی طرح چبائے گا۔ الظالم سے ظالموں کی جنس مراد ہے اس میں عقبہ بن ابی معیط بھی داخل ہے۔

گستاخِ رسول کی سزا

عقبہ بن ابی معیط کی عادت تھی کہ جب بھی وہ سفر سے واپس آتا تو طعام پکا کر عام و خاص اہلِ مکہ سب کو مدعو کرتا اور اس کی دعوت میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لاتے اور وہ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس پاک میں بھی بکثرت حاضری دیتا۔ اس کی باتیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی لگتیں۔ ایک دن سفر سے واپس آیا اور دعوتِ عام پکائی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مدعو کیا۔ حضرت کاشفی نے لکھا ہے کہ وہ آپ کو آپ کی ہمسائیگی کی وجہ سے مدعو کرتا۔ جب حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اس نے طعام پیش کیا تو آپ نے فرمایا: میں تیرا طعام صرف اس شرط پر کھاؤں گا کہ تو گواہی دے کہ:

لا الٰہ الا اللہ و انی رسول اللہ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

اور اہلِ عرب کے ہاں یہ بہت بڑی عار تھی کہ کوئی ان کے گھر آئے اور طعام کھائے بغیر چلا جائے۔ اس نے اس دستور کے مطابق حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی منت سماجت کی لیکن آپ نے ایک نہ مانی۔ عقبہ نے آپ کی شرط منظور کرتے ہوئے کلمۂ شہادت پڑھ لیا۔ اس پر آپ نے اس کا طعام کھایا۔ اس وقت عقبہ کا دوست اُبی بن خلف جمحی موجود نہیں تھا حالانکہ یہ عقبہ کا بہت گہرا اور جاں نثار دوست تھا۔ جونہی واپس آیا اور اسے معلوم ہوا کہ عقبہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دین قبول کر لیا ہے اس نے عقبہ سے کہا کہ: صبوت یا عقبہ۔ (اے عقبہ! تو اپنے آبا کے دین کو چھوڑ کر ایک نئے دین[1] میں داخل ہو گیا ہے) اس نے کہا بخدا

---

[1] اس پر غور کریں کہ کفارِ مکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو بدعۃ اور آپ کو بدعتی کہتے تھے یہ سنت کہنا کسے نصیب ہے اور جنہیں کہا جاتا ہے انہیں کس کی سنت نصیب ہے۔ تفصیل فقیر کی کتاب "العصمۃ عن البدعۃ" میں دیکھئے۔ اویسی غفرلہٗ

میں غیر دین میں شامل نہیں ہُوا۔ صرف بات اتنی ہے کہ وہ شخص (حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) میرے گھر آیا اور اس شرط پر کھانا منظور کیا کہ میں اس کا کلمہ پڑھوں۔ میں نے بوجہ مجبوری پڑھ لیا، مجھے شرم آئی کہ کہیں وہ میرے گھر سے طعام کھائے بغیر نہ چلے جائیں۔ میں نے کلمہ پڑھا اور اس نے کھانا کھایا۔ ابی بن خلف نے کہا: میں ایسے تجھ پر راضی ہونے والا نہیں جب تک کہ تم چل کر اُس کے چہرے پر نہ تھوکو اور کھلم کھلا گالی نہ دو اور اس کی تکذیب نہ کرو (نعوذ باللہ) عقبہ نے کہا: چلو ان امور کی سرانجام دہی سے مجھے کون سا انکار ہے۔ چنانچہ وہ دونوں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ کو بارگاہ خداوندی میں سربسجود دیکھا تو اس (عقبہ) نے آپ کے چہرۂ اقدس پر تھوک دیا (العیاذ باللہ)۔

اسباب النزول کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہی تھوک ایک آگ جانسوز بن کر (بجائے حضور علیہ السلام پر گرنے کے) عقبہ کے چہرہ پر لَوٹی اور اُس کے دونوں رخساروں کو جلا ڈالا۔ جب تک وہ زندہ رہا اس کے چہرے پر وہ داغ نمایاں رہے۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

ہر کہ بر شمع خدا آرد پفو
شمع کے میرد بسوزد پوز او
کے شود دریا ز پو سنگ نجس
کے شود خورشید از پف منطمس

ترجمہ: جو اللہ تعالیٰ کی شمع پر تھوکتا ہے شمع تو نہیں بجھے گی البتہ اس کا منہ جل جائے گا۔ اور گوبر سے دریا پلید نہیں ہوتا اور نہ ہی سورج تھوکنے سے بے نور ہوتا ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ سے فرمایا کہ تُو نے میرے چہرے پر تھُوکا ہے اس سے میرا تو کچھ نہیں بگڑا لیکن یاد رکھ میں تیرا سر تلوار سے مکہ کے باہر لٹکا دُوں گا۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ وہ بدر کے دن جب قیدی ہو کر آیا تو حضور علیہ السلام نے حضرت علی یا حضرت عاصم بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ اس خبیث کو قتل کر دیں۔ ابی بن خلف خبیث کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ مبارک سے اُحد کے دن تیر مارا تو وہ مکہ کو لوٹا اور سرف کے مقام پر دم توڑ گیا۔

ف: سرف بفتح السین المہملۃ وکسر الراء، اور یہی صفت ابی بن خلف کے لیے بھی موزوں ہے اس لئے کہ سرف بمعنے مسرف ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

شر الناس رجل قتل نبیا اوقتلہ نبی۔

(بدترین انسان وُہ ہے جو کسی نبی علیہ السلام کو شہید کرے یا نبی علیہ السلام اسے قتل کریں)۔

ف : پہلا شخص یعنی جس نے کسی نبی علیہ السلام کو شہید کیا تو وہ شریر ترین اس لیے ہے کہ اس نے نبی علیہ السلام کی توہین کی اور انبیاء علیہم السلام بلند درجات کے مالک ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ مقابلہ کرنے والے بھی مراتب کے لحاظ سے بدترین انسان ہوں گے یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ مراتب کے لوگوں کا مقابلہ رذیل تر لوگ کرتے ہیں اور جب دشمنی زوروں پر ہوتی ہے تو ان میں ایک مارا جاتا ہے اس لیے کہ ضد اپنی ضد کا ازالہ چاہتی ہے، اور دوسری صورت، یعنی جسے نبی علیہ السلام قتل کریں اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام شفقت و رحمت علی الخلق سے جبلّی طور پر بھرپور رہوتے ہیں وہ کسی کے قتل کا اقدام نہیں کرتے مگر اس وقت جب دیکھتے ہیں کہ اس کے لیے فلاح کے دروازے بند ہیں اور انہیں یقین ہوجاتا ہے اس کا زندہ رہنا مزید شقاوت کا موجب بلکہ ضرر شدید کا سبب ہوگا اسی لیے ان کا ایسے بدبختوں کو قتل کرنا بھی خالی از رحمت نہیں ہوتا۔ مثنوی شریف میں ہے؛

چونکہ دندان تو کرمش در فتاد

نیست دندان برکنش اے اوستاد

تاکہ باقی تن نگردد زار ازو

گرچہ بود آں تو شو بیزار ازو

ترجمہ : جب تمہارے دانتوں میں کیڑا پڑے تو تم اسے دانت نہ سمجھو بلکہ اسے جلد اکھیڑ دو تاکہ دوسرے اعضاء اس سے ضرر نہ پائیں۔ اگر سستی کرو گے تو پھر اس سے بھی بیزار ہوگے۔

ف : انسان العیون میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنے ہاتھ مبارک سے سوائے ابی بن خلف کے اور کسی کو قتل نہیں فرمایا، نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔

یَقُوْلُ یہ یعض کے فاعل سے حال ہے۔ کہے گا کافر یَا اے لوگو! لَیْتَنِیْ کاش کہ میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ منادی محذوف ہے یا حرفِ ندا محض تنبیہ کے لیے ہے جس میں منبہ کی کسی تعیین کا قصد نہیں کیا گیا۔ اتَّخَذْتُ دنیا میں میں بنا لیتا مَعَ الرَّسُوْلِ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سَبِیْلًا ان تکلیفوں سے نجات پانے کا کوئی چارہ۔ یعنی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتا اور آپ کے لائے ہوئے اسلام کو قبول کر لیتا۔ یٰوَیْلَتٰی میرے اوپر افسوس ہے۔ لفظ ویل، ویلہ بمعنے ہلاکت ہے اور یا ویلتا جزع و تحسر کا کلمہ ہے۔ دراصل یا ویلتی بکسر التاء تھا۔ کسرہ کو فتح سے اور یاء متکلم کو الف سے تبدیل کیا گیا، تاکہ کسرہ کا یاء کے ساتھ مل کر کسرات کا اجتماع نہ ہو۔ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اے میری ہلاکت! آ جا اور حاضر ہو جا۔

اس لیے کہ یہی تیری حاضری کا وقت ہے۔

ف : اصل نداء اس کے لیے ہوتی ہے جس کو اپنی طرف متوجہ کرنا مطلوب ہو اور وہ ذوی العقول ہوتے ہیں لیکن کبھی اہلِ عرب مجازاً غیر ذوی العقول پر نداء استعمال کرتے ہیں اس میں صرف حسرت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا۔ خلیل بمعنے دوست۔ یہ خلّۃ سے مشتق ہے بمعنے مودّت، اس لیے کہ وہ انسان کے نفس کے درمیان گھُس جاتی ہے لیکن یہاں پر انسان کے وہ دوست مراد ہیں جنہوں نے اسے گمراہ کیا یعنی شیاطین جن و انس۔ اس معنے پر عقبہ کے لیے ابی بن خلف بھی اس میں داخل ہے۔

ف : فلاں و فلاں بول کر ان کے اسماء مراد لیے جاتے ہیں یعنی لفظ فلاں سے مذکر ذوی العقول کا علم اور فلانہ سے مونث ذوی العقول کا علم مراد ہوگا اور جب ان پر الف لام داخل ہو تو اس وقت غیر ذوی العقول مراد ہوں گے۔ اس میں اختلاف ہے کہ اس کے لام کے مقابلہ کا الف یا سے تبدیل ہوا ہے یا واؤ سے۔

لَقَدْ اَضَلَّنِيْ بخدا مجھے گمراہ کیا یا باز رکھا عَنِ الذِّكْرِ قرآن سے جو ہر مرغوب ذکر کی یاد دہانی کراتا ہے اور ہر تکلیف رساں امر کی خبر دیتا ہے بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ بعد اس کے کہ وہ میرے ہاں آیا اور باوجودیکہ میں اس پر عمل کرنے کی قدرت بھی رکھتا تھا اور اس کے احکامات سنانے والے سے اس کی باتیں بھی سنتا رہا۔

وَكَانَ الشَّيْطٰنُ اور شیطان ابلیس مخالفینِ اسلام کے ساتھ تعلق جوڑنے اور رسولِ خدا سے تعلق توڑنے اور قرآن مجید کو چھوڑنے کے لیے لِلْاِنْسَانِ انسان کو جو اس کا مطیع ہے خَذُوْلًا رسوا کرنے والا اور اسے اپنی دوستی میں بہت زیادہ ورغلانے والا یہاں تک کہ وہ اسے تباہی و بربادی کے گڑھے میں ڈال کر خود پیچھے ہٹ جاتا ہے اور بجائے فائدہ پہنچانے کے اسے نقصان میں ڈالتا ہے۔ یہی اس کا انجام ہوتا ہے جو ابلیس کی کارروائی کو صحیح سمجھتا ہے جسے مدد اور نصرت کی امید دلائی جائے۔ اس کی امداد سے پیچھے ہٹ جانے کو الخذلان کہا جاتا ہے اور شیطان کو اس صفت سے موصوف کرنے میں اشارہ ہے کہ شیطان انسان کو طرح طرح کی تمناؤں میں پھنسا کر مختلف وعدوں سے بہلا کر ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ مثلاً اسے دنیا میں کہتا ہے کہ آخرت میں میری طرف سے یہ ہوگا اور وُہ ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ یہ جملہ معترضہ ہے اپنے ماقبل کے مضمون کی تائید و تاکید کرتا ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا ظالم کے قول کا تتمہ ہے۔

مسئلہ : یہ آیت عام ہے شیطان کے علاوہ ان لوگوں کو بھی شامل ہے جو ظلم و ستم و دیگر معاصی و جرائم میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔

مسئلہ : حقیقی محبت یہ ہے کہ جس میں نہ کوئی طمع و لالچ ہو اور نہ خوف اور خطرہ، صرف دین کی بھلائی مقصود ہو۔

اسی لیے حدیث شریف میں ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے ایک دوسرے سے بھائی بھائی بن کر رہو۔ یعنی طریقِ رحمٰن کی بنا پر دوستی ہو شیطان کے طریق سے نہ ہو۔

حدیث شریف میں ہے؛

انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اس لیے دیکھ لیا کرے کہ میں کس سے دوستی کر رہا ہوں۔

حدیث شریف میں ہے؛

مومن کے سوا کسی دُوسرے کو دوست مت بناؤ۔ اور تمہارا طعام بھی صرف متقی کھائے۔ یعنی گھر میں کھانے کے لیے صرف متقی کو بلاؤ۔

ف؛ حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
متقیوں کی صحبت میں رہو اگرچہ اس میں پتھر ہی ڈھونے پڑیں بہتر ہے فاسقوں کی صحبت سے بچو اگرچہ اس میں حلوہ کھانے کو ملے۔

ف؛ بعض بزرگوں نے فرمایا کہ یہاں پر شیطان سے مراد بُرا ساتھی ہے اور اسے شیطان اس لیے کہا ہے کہ وہ خود بھی گمراہ ہے اور دوسرے کو بھی گمراہ کرنے والا ہے۔

فائدہ صُوفیانہ؛ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طلب میں نہ ہو وہ شیطان ہے اور حیوانوں کی مانند ہے بلکہ ان سے بھی گیا گزرا ہے کیونکہ جانور دُوسروں کو تو گمراہ نہیں کرتے اور شیطان خود بھی گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔

حضرت ابوبکر محمد بن عبداللہ الحامدی رحمہ اللہ نے فرمایا: ؎

اصحب خیار الناس حین لقیتهم
خیرا لصحابه من یکون عفیفا
والناس مثل دراهم میزتها
فوجدت فیهم فضة وزیوفا

ترجمہ: جب تم کسی سے ملو تو بہترین لوگوں کو ساتھی بنا کر۔ اور بہترین ساتھی وہ ہیں جو پاکدامن ہوں۔ اور لوگ دراہم و دنانیر کی طرح ہیں ان میں بعض کھوٹے ہوتے ہیں اور بعض کھرے۔

حدیث شریف میں ہے:

مثل الجلیس الصالح مثل العطار ان لم ینلك من عطره یعلق بك من ریحه د

مثل الجليس السوء مثل الكيران لم يحرقك بنارہ يعبق بك ريحه۔
(نیک ساتھی کی مثال عطار کی ہے کہ اگرچہ تم ان سے عطر نہیں حاصل کر سکو گے اس کی خوشبو سے تو معطر ہو جاؤ گے۔ اور بُرے ساتھی کی مثال بھٹی کی ہے کہ اگر وہ جلائے گی نہیں تو اس کا دھواں تو پہنچے گا ہی)
جونہی اہل اسلام مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ پہنچے تو کہا ہم نے دو دنوں میں تمہارے نیک اور بد پہچان لیے۔ اہل مدینہ نے پوچھا: وہ کیسے؟ اہل مکہ مہاجرین نے کہا: وہ اس طرح کہ ہمارے نیک نیکوں کے ساتھی ہو گئے اور بُرے بُروں کے۔ اس سے ثابت ہُوا کہ ہر ایک اپنی فطرت کے مطابق کسی سے دوستی کرتا ہے۔
اضحوکہ ایک جگہ چوروں کو گرفتار کیا گیا تو ایک گویا بھی ان کے ساتھ پکڑا گیا۔ اس نے کہا کہ میں چور نہیں گویا ہُوں۔ گرفتار کرنے والوں نے کہا ، ہمیں گا کر دکھا ۔ چنانچہ اس نے عدی کا یہ شعر پڑھا: ؎

عن المرء لا تسأل وابصر قرينه

فكل قرين بالمقارن يقتدى

ترجمہ: کسی کی کیفیت ایسے مت پوچھ ، بلکہ اس کے ساتھی کو دیکھ ، اس لیے کہ ہر شخص اپنے دوست کی اقتدا کرتا ہے۔
منقول ہے کہ اس گویے سے کہا گیا کہ تُو نے سچ کہا لیکن چونکہ تُو بھی ان کا ساتھی ہے اس لیے تجھے بھی قتل کیا جائے گا۔ چنانچہ ان کے ساتھ اسے بھی قتل کر دیا گیا ۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ حق ذات پاک اللہ الصمد
که بود به مار بد از یار بد

۲ مار بد جانی ستاند از سلیم
یار بد آرد سوی نار جحیم

۳ از قرین بے قول وگفت وگوے او
خو بدزدد دل نہاں از خوے او

ترجمہ: ۱۔ حق ذات اللہ الصمد ہے اس لئے کہ سانپ بُرا یار بُرے سے بہتر ہے۔
۲۔ بُرا سانپ تندرست انسان کی جان لیتا ہے لیکن بُرا دوست جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔
۳۔ ساتھی سے بغیر باتوں اور گفتگو کے صرف صحبت سے دل پر اس کی عادت کے اثرات پڑتے ہیں۔

۱ اے خنک آں مردہ کز خود رستہ شد
در وجود زندۂ پیوستہ شد

۲ وائے آں زندہ کہ با مردہ نشست
مردہ گشت و زندگی از وے بجست

۳ چوں تو در قرآن حق بگریختے
با روان انبیاء آویختے

۴ ہست قرآن حالہائے انبیاءؑ
ماہیان بحر پاک کبریا

۵ ور بخوانی و نۂ قرآن پذیر
انبیا و اولیا را دیدہ گیر

۶ ور پذیرائی چو بر خوانی قصص
مرغ جانت تنگ آید در قفص

۷ مرغ کو اندر قفص زندانیست
می نجوید رستن از زندانیست

۸ روح ہائے کز قفصہا رستہ اند
انبیاء و رہبر شائستہ اند

۹ از بروں آواز شان آید ز دین
کہ رہ رستن ترا این است این

۱۰ ما بدین رستیم زین تنگین قفص
جز کہ این رہ نیست چارہ این قفص

ترجمہ : ۱۔ خوش قسمت ہے وہ مردہ جو دنیا سے نجات پاگیا زندہ کے وجود سے جاملا۔
۲۔ اس زندہ پر افسوس ہے جو مردہ کے ساتھ بیٹھ کر مردہ ہوا اور اس سے زندگی دور ہوگئی۔
۳۔ جب تم قرآن حق کی طرف متوجہ ہوئے تو ارواحِ انبیاء علیہم السلام سے اس کا تعلق جڑ گیا۔
۵۔ قرآن پڑھ کر اس پر عمل نہیں کرتے تو انبیاء و اولیاء کو اپنے سے دور سمجھ۔
۴۔ قرآن انبیاء علیہم السلام کے حالات ہیں وہ پاک کبریا کے دریا کی مچھلیاں ہیں۔

۶۔ اگر تم ان کے قصے پڑھ کر اس پر عمل کرتے ہو تو تیری روح تیرے پنجرے میں تنگ آجائیگی ۔

۷۔ وہ پرندہ پنجرے میں قیدی ہے وہ اس قید سے چھٹکارا نہیں چاہتی ۔

۸۔ وہ ارواح جو پنجروں سے نجات چاہتی ہیں انھیں انبیاء و اولیاء رہبر چاہئیں ۔

۹۔ دین کے ذریعے باہر سے ان کی آواز آئے گی کہ اس قید سے چھٹکارے کا یہ طریقہ ہے ۔

۱۰۔ ہم نے بھی اس قید سے اسی طرح نجات پائی ہے اس قید سے اسی طرح کے راہ کے سوئی کوئی چارہ نہیں ۔

ہم اللہ تعالیٰ سے خلاص اور اہلِ اختصاص سے التحاق اور ہر زبان اور ہر حال میں قرآن مجید پر عمل کی توفیق کا سوال کرتے ہیں۔

تفسیر عالمانہ وَقَالَ الرَّسُوْلُ اس کا عطف وقال الذین لا یرجون لقاءنا پر ہے ۔ درمیان میں جملہ معترضہ تھا۔ یعنی کافروں نے ایسے ایسے کہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان سے سرکشی دیکھی تو بارگاہِ حق میں عرض کی: یَا رَبِّ اے میرے پروردگار اِنَّ قَوْمِي بے شک میری قوم قریش اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا انہوں نے قرآن مجید بالکل چھوڑ دیا اور اس پر ایمان نہیں لاتے اور اس سے روگردانی کی۔

مسئلہ : اس میں اشارہ ہے کہ مومن پر لازم ہے کہ قرآن مجید سے زیادہ کو لگائے اور دن رات اس کی تلاوت میں لگا رہے تاکہ اس کی وعید ہذا میں مندرج نہ ہو۔

حدیث شریف میں ہے :

من تعلم القراٰن وعلق مصحفا لم یتعاھدہ و لم ینظر فیہ جاء یوم القیامۃ متعلقا بہ یقول یارب العالمین عبدك ھذا اتخذنی مھجورًا اقض بینی وبینہ ۔

(جو قرآن مجید کو پڑھ کر اس کی تلاوت نہ کرے اور اس میں غور و فکر نہ کرے تو قیامت میں قرآن مجید اس کو پکڑ کر بارگاہِ حق میں لائے گا اور عرض کرے گا : تیرے اس بندے نے مجھے چھوڑ دیا تھا فلہذا اس کے اور میرے درمیان فیصلہ فرما)

مسئلہ : قرآن مجید کی کوئی آیت پڑھ کر اسے بھلا دینا گناہِ کبیرہ ہے ۔ اور بھلا دینے کا یہ معنیٰ ہے کہ اسے قرآن مجید سے دیکھ کر بھی نہ پڑھ سکے ۔ کما فی القنیۃ۔

حدیث شریف میں ہے :

ان ھذہ القلوب لتصدأ کما یصدأ الحدید ۔

(قلوب لوہے کی طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں)

عرض کی گئی تو پھر ان قلوب کو جلاء کیسے نصیب ہوگی ؟ آپ نے فرمایا :

تلاوۃ القراٰن وذکر اللہ (تلاوتِ قرآن اور ذکرِ الٰہی سے)

ے

دل پر درد را دوا قرآن

جان مجروح را شفا قرآن

ہرچہ جوئے زنص قرآن جوئے

کہ بود گنج علمہا قرآن

ترجمہ : دلِ پُر درد کی دوا قرآن مجید ہے اور مجروح جان کی شفا قرآن مجید ہے۔ جو کچھ تلاش کرنا ہو نصِ قرآن سے تلاش کرو کیونکہ علوم کا گنجینہ قرآن مجید ہے۔

مثنوی شریف میں ہے ، ے

١ شاہنامہ یا کلیلہ پیش تو

ہمچناں باشد کہ قرآن از عتو

٢ فرق آنکہ باشد از حق و مجاز

کہ کند کحل عنایت چشم باز

٣ ورنہ پشک و مشک پیش اخشمی

ہر دو یکسانست چوں نبود شمی

٤ خویشتن مشغول کردن از ملال

باشدش قصد کلامِ ذوالجلال

٥ کاتش وسواس را وغصّہ را

زاں سخن بنشاند و سازد دوا

ترجمہ : ١۔ شاہنامہ یا کلیلہ (قصہ) تجھے سرکشی کے لئے اسی طرح مفید ہیں جیسے قرآن

٢۔ فرق یہ ہے کہ قرآن حق ہے اور وہ قصے مجاز لیکن چشم کشائی کیلئے ہر دونوں سرمہ ہیں۔

٣۔ ورنہ جس کی ناک بند ہو اسکے لئے مینگنی اور مشک یکساں ہیں کیوں کہ اس میں سونگھنے کی قوت نہیں۔

٤۔ خود کو ملال سے دور رکھنا اسے کلام ذوالجلال فائدہ دے گی۔

٥۔ وسواس اور غصہ کی آگ اس کلام سے بجھے گی بلکہ بیماریوں سے دوا و شفا کا کام دے گی۔

وَكَذٰلِكَ جیسے ہم نے آپ کی قوم کے مجرمین جیسے ابوجہل وغیرہ کو آپ کا دشمن بنایا ہے ، ایسے ہی جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ ہم نے ہر نبی علیہ السلام کے لیے بنایا ہے عَدُوًّا دشمن ۔ لفظ نبی جمع کا

معنیٰ دیتا ہے مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ ان کی قوموں کے مجرمین جیسے نمرود ابراہیم علیہ السلام کے لیے اور فرعون موسیٰ علیہ السلام کے لیے اور یہود عیسیٰ علیہ السلام کے لیے۔ اسی لیے آپ صبر کیجئے جیسے انہوں نے صبر کیا، آپ بھی فتحیاب ہوں گے جیسے وہ فتحیاب ہوئے۔

ف : اس میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کی اقتداء کی ترغیب ہے، کہ جیسے انہوں نے صاحبِ شریعت ہو کر دعوتِ الی اللہ میں تکلیفیں جھیلیں اور کامیاب ہوئے۔ آپ بھی تکالیف برداشت کریں اور فتحیاب ہوں گے۔

وَكَفٰى بِرَبِّكَ اور آپ کو آپ کا رب تعالیٰ کافی ہے۔ باء صلہ کی زائدہ اور تاکید کے لیے ہے هَادِيًا یہ تمیز ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی وجہ سے کہ وہی آپ کو اپنے مطالب میں کامیابی کی رہبری فرمائے گا اور اسی سے ہی آپ کی شریعت کی ترویج ہوگی اور اسی سے ہی آپ کی شریعت پر عمل کرنے والوں کی کثرت ہوگی وَّنَصِيْرًا اور اس کی نصرت اور مدد سے کہ آپ اپنے جملہ اعداء پر غلبہ پائیں گے فلہٰذا آپ اپنے دشمنوں کی پروا مت کیجئے اور عنقریب زمین کے کونے کونے پر آپ کا حکم نافذ ہوگا اور عالم دنیا کے چپّہ چپّہ پر اسلام کا راج ہوگا۔

ف : آیت کی تصریح اور اس کے اشارہ سے ثابت ہوا کہ ہر نبی علیہ السلام اور ہر ولی کا دشمن ہوا کرتا ہے اس سے اللہ تعالیٰ انہیں آزمائش میں ڈالتا ہے تاکہ ان کی شرافت اور برگزیدگی کا اظہار ہو۔

ف : حضرت ابوبکر بن طاہر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے درجات مخالفین کی مخالفت اور دشمنی سے بلند ہوتے ہیں ؎

از برائے حکمتی روح القدس از طشتِ زر
دستِ موسیٰ را بسوے طشت آزر می برد

ترجمہ : حکمت کی بنا پر روح القدس نے سونے کے تھال سے موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ ہٹا کر انگاروں کے تھال کی طرف پہنچایا۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات النجمیہ میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے سچے دوست اولیاء احباء پر اپنی درگاہ سے راندہ شدہ دشمن کو مسلط فرما دیتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ مبغوض حق کی ایذاؤں پر صبر کرتا ہے اس سے اللہ تعالیٰ اس کے حوصلے دیکھتا ہے کہ وہ قضاء و قدر پر صبر کرتا ہے اور اس کے دکھ اور تکلیف کی آزمائش کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے اور اپنے جملہ امور اسی کے سپرد کرتا ہے اور اس پر توکل کرتا ہے یا اس کے برعکس عمل کرتا ہے تاکہ بندے کو اپنی طرف کی راہ آسان کرے بلکہ اس کے بعد اسے سیرِ الٰہی کے لیے پر نصیب ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اڑ کر حضرت الٰہیہ میں

پہنچتا ہے ۔ انبیاء علیہم السلام و اولیاءِ کرام کی تربیت میں اللہ تعالیٰ کا یہی طریقہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے طریقے میں ہرگز تبدیلی نہیں ہوتی ۔

حدیث شریف میں ہے : کہ کوئی اللہ کا بندہ پہاڑ کی چوٹی پر اس لیے پہنچتا ہے کہ کوئی منافق اس کے ساتھ دشمنی کرکے اسے ایذا پہنچائے تو اللہ تعالیٰ اسے اجر و ثواب سے نوازتا ہے ۔

ف : دشمنِ اولیاء بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے بلکہ ولایت کی دشمنی سے انہیں سخت سے سخت عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے ۔

حدیث قدسی من عادی لی ولیا فقد بارزنی بالحرب ۔
(جس نے میرے کسی محبوب کو ایذا دی اس نے میرے ساتھ اعلانِ جنگ کیا)
(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :)

حدیث قدسی وانا انتقم لاولیائی کما ینتقم اللیث الجری لجروہ ۔
(میں اپنے محبوبوں کے دشمنوں پر ایسے حملہ کرتا ہوں جیسے شیرِ نر اپنے چھوٹے بچّے کو ایذا دینے والے پر حملہ کرتا ہے)

دشمن ولی اللہ کی حکایت منقول ہے کہ ایک دانشمند فنِ منطق میں یکتا اور دیگر فنونِ ریاضی و ہندسہ و معقولات میں بے نظیر تھا اپنے زمانے کا متبحر عالم مانا جاتا تھا اس کا نام تھا میر جمال ۔ قلندرانہ طریق سے زندگی بسر کرتا تھا واسکٹ پہنتا تھا نماز کے قریب نہیں پھٹکتا تھا ایسی کوئی برائی نہ تھی جس کا اس نے ارتکاب نہ کیا ہو ۔ پرلے درجے کا بے غیرت تھا ۔ مشایخ و اولیاء کرام کا جانی دشمن تھا ہمیشہ ان کی مذمت و غیبت میں لگا رہتا تھا اور ان کی بے ادبی میں کسر نہیں چھوڑتا تھا ان کے حق میں ہر وقت گستاخانہ باتیں کہتا رہتا تھا ایک دن دو تین طالب علموں کو اپنے ساتھ لے کر حضرت مولانا ناصر الدین اتراری کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے طالب علم بھی اولیاءِ کرام کی گستاخی اور بے ادبی میں اس سے کچھ کم نہ تھے ۔ میر جمال مذکور نے حضرت مولانا ناصر الدین کے ہاں بیٹھتے ہی اپنی واسکٹ سے بھنگ کی چٹکی لی اور منہ میں ڈالی اور چاہا کہ اسے نگلے ۔ لیکن جونہی اسے نگلنے لگا اس کے حلقوم میں پھنس گئی یہاں تک کہ سانس بھی بند ہوگئی، قریب تھا کہ دم توڑ دے مولانا اتراری نے اس کی گدی پہ زور سے مکا رسید کیا، مکا لگتے ہی بھنگ کی چٹکی منہ سے باہر جا پڑی ۔ اس کی اس خراب حالت پہ تمام حضارِ مجلس ہنس پڑے اور وہ سخت شرمسار ہوکر مجلس سے بے آبرو ہوکر نکلا اور رسوائی سے علاقہ چھوڑ گیا ۔ پھر کسی نے اسے نہ دیکھا ۔ مثنوی شریف میں ہے : ؎

۱ چوں خدا خواہد کہ پردۂ کس درد
میلش اندر طعنۂ پاکاں برد

۲ آنکہ می درید جامہ خلق چست
شد درید آن او ایشاں درست

۳ آں دہاں کژ کرد و تسخیر بخواند
مر محمد را دہانش کژ بماند

۴ باز آمد کاے محمد عفو کن
اے ترا الطاف و علم من لدن

۵ من ترا افسوس میکردم ز جہل
من بدم افسوس را منسوب اہل

ترجمہ: ۱۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کا پردہ چاک کرنا چاہتا ہے تو اس کا میلان پاک لوگوں (انبیاء و اولیاء) پر طعن و تشنیع کی طرف کر دیتا ہے۔ ۲۔ جو مخلوق کے پردے چاک کرتا ہے ان کے پردے تو درست ہو جائیں گے لیکن اس کا اپنا پردہ چاک رہتا ہے۔ ۳۔ اس نالائق کا منہ بگڑ گیا جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بددعا کی۔ ۴۔ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ اے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے معاف فرمائیے۔ آپ کا لطف و کرم تو لدنی (ازلی) ہے۔ ۵۔ میں نے آپکی جہالت سے بے ادبی کی میں برا ہوں اور میرے جیسے بروں کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔

تفسیر عالمانہ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ اور مشرکین عرب نے کہا کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کیوں نہیں نازل کیا گیا جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ کتب ثلاثہ یعنی توراۃ و انجیل و زبور کی طرح ایک ہی بار۔ یہ القراٰن سے حال ہے اس لیے کہ یہ مجتمعاً کے معنی میں ہے۔

ف: یہ متحیر اور مبہوت لوگوں کا اعتراض ہے اس کا کوئی فائدہ نہیں اس لیے کہ معجزہ ہونے کی حیثیت سے اس کا کوئی فرق نہیں کہ وہ متفرق ہو کر اُترے یا مجتمع ہو کر حالانکہ انہوں نے ایک سورۃ کا مقابلہ کرنا چاہا تو اس سے بھی عاجز آ گئے اگرچہ انہوں نے اس مقابلہ میں سر تک کی بازی لگا دی بالآخر قرآن مجید کی ایک سورۃ جیسی سورۃ نہ لا سکے۔ ان کا اعتراض بیکار بایں معنی بھی ہے کہ قرآن مجید کے متفرق طور پر اتارنے میں بے شمار فوائد ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے جو قرآن مجید میں بیان فرمایا کہ: كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ کاف محلاً منصوب ہے اس لیے کہ یہ مصدر کی صفت ہے اور وہ مصدر مابعد کا مؤکد و معلل ہے اور ذٰلك کا اشارہ ان کے مفہوم کلام کی طرف ہے

دراصل عبارت یُوں تھی :

مثل ذلک التنزیل المفرق الذی قدحوا الخ

یعنی ہم نے اسی متفرق تنزیل کو اسی طرح نازل کیا جس پر انہیں اعتراض ہے ہم اس کے مخالف نہیں اتارا ، اور ہمارا ایسے اتارنا اسی لیے ہے تاکہ آپ کے قلبِ انور کو تقویت حاصل ہو۔

قرآن کو متفرق طور پر اُتارنے کے فوائد

قرآن مجید کو متفرق طور پر نازل کرنے میں چند فوائد یہ بھی ہیں کہ :

(۱) اس کی عبارت کو یاد کرنا۔

(۲) معنی کا سمجھنا۔

(۳) احکام کا ضبط۔

(۴) اس پر عمل کرنا آسان ہو۔ ورنہ توراۃ جب یکبارگی نازل ہُوئی تو بنی اسرائیل کے لیے عمل کرنا دشوار ہوگیا۔

(۵) جُونہی آپ پر وحی جدید نازل ہوتی تو آپ کی قوتِ قلبی اور بصیرۃ میں اضافہ ہوجاتا۔

خلاصہ یہ کہ قرآن مجید کا متفرق طور پر نزول حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص مبارکہ سے ہیں۔ دوسرے انبیا علیہم السلام کو یہ شرف نصیب نہ ہوا۔

نیز قرآن مجید کے متفرق طور پر نازل کرنے کا اصلی مقصد یہی تھا کہ آپ کا قلبِ انور خلق قرآن سے متخلق اور آپ کی نورانیت کو تقویت حاصل ہو اور آپ اس کے حقائق و علوم سے استفادہ و استفاضہ فرمائیں اور ان فوائد کی تکمیل قرآن مجید کے متفرق طور پر نازل کرنے سے ہوسکتی تھی۔ مثلاً آسمان سے اگر بارش یکبارگی نازل ہو تو کھیتوں کو بجائے فائدہ کے نقصان ہوگا۔ لیکن سب کو معلوم ہے کہ بارش کا نزول متفرق طور پر ہوتا ہے تو کھیتیاں سرسبز ہوتی اور رنگ لاتی ہیں۔

وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝ اس کا عطف فعل مضمر پر ہے۔ ترتیل بمعنے تفریق اور تھوڑا سا وقفہ کرکے حرف کا آنا لیکن سانس نہ ٹوٹے۔ دراصل اسے دانتوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے بمعنے دانتوں کا کھولنا۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ ہم آپ پر قرآن اتارا اور تھوڑا تھوڑا کرکے اسے پڑھا کر چنانچہ قرآن مجید کے نزول کی مدت بیس یا تئیس سال ہے۔ وَلَا يَأْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ یہاں پر مثل سے سوال عجیب وغریب کلام مراد ہے اسے باطل امور کی مثال کے وقت بولا جاتا ہے یعنی کفار آپ پر اور قرآن مجید پر طعن وتشنیع کرتے ہیں۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ اے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ! مشرکینِ عرب آپ کی نبوت اور آپ کی کتاب کے متعلق کوئی بری مثال نہیں دیتے اِلَّا جِئْنٰكَ مگر ہم اس کے مقابلہ میں صرف آپ کے لیے لاتے ہیں بِالْحَقِّ حق جواب کو۔ یعنی ہم کفار کے باطل اقوال کے مقابلہ میں ایسا جواب لاتے ہیں جو ان کے بطلان کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکتا ہے

وَ اَحْسَنَ تَفْسِیْرًا ؕ اس کا حق پر عطف ہے۔ تفسیر فسر سے ہے بمعنے پوشیدہ امر کو کھولنا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم ایسا جواب لاتے ہیں جو بیان کے لحاظ سے نہایت احسن اور حق وصواب کی مکمل تفصیل کرنے والا اور حکمت کے تقاضے کے عین مطابق ہوتا ہے۔

ازالہ وہم یاد رہے کہ قرآن مجید کا ہر مضمون فی حد ذاتہ نہایت حسن وکمال پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ معاذ اللہ کفار کے مطاعن بھی حسن ہیں لیکن قرآن مجید کے مضامین ان سے احسن ہیں کیونکہ ان کا تو ہر سوال بطلان کا مجموعہ ہوتا ہے تو پھر اسے کیسے کہا جائے کہ وہ حسن ہے ہاں احسن ان کے گمان کی حیثیت سے ہے کہ وہ اپنے ہر سوال کو حسن سمجھتے تھے یا یہ کہا جائے کہ ہمارا جواب ان کے سوال سے احسن ہے۔

ف : یہ استثناء مفرغ ہے اور محلاً منصوب علی الحالیۃ ہے۔ اب عبارت یوں ہوگی :

لا یاتونك بمثل فی حال من الاحوال الاحال اتیانا ایاك الحق الذی لا محید عنه۔

یعنی وہ آپ کے لیے بری مثال قائم کرتے ہیں تو ہم اس کے جواب میں ایسی تحقیقی بات کرتے ہیں جس سے انہیں انکار کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

ف : اس سے صاف اور واضح طور پر فرمایا کہ کفار و مشرکین کے جملہ سوالات مبنی بر باطل اور اللہ تعالیٰ کے جملہ جوابات مبنی بر حق و صدق ہیں اور اس میں اشارہ ہے کہ ان کا سوال ہذا بھی باطل ہے اور ہمارا جواب صحیح اور حق ہے۔

نکتہ : پہلے انبیاء علیہم السلام کے ہاں دستور رہا کہ ان پر کفار سوالات کرتے تو ان کا جواب وہ خود دیتے اور یہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے کہ آپ پر کفار کے ہر سوال کا جواب خود اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُحْشَرُوْنَ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ اِلٰی جَهَنَّمَ یہی وہ لوگ ہیں جو اٹھائے جائیں گے درانحالیکہ منہ کے بل گھسیٹ کر انہیں جہنم کی طرف کھینچ کر لے جایا جائے گا۔ یعنی زمین کی طرف منہ کے بل جہنم کی طرف جائیں گے۔

حدیث شریف میں ہے قیامت میں لوگ تین طرح پر محشور رہوں گے :

(۱) جانوروں کی طرح ،

(۲) قدموں پر چل کر۔

(۳) منہ کے بل۔

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی کہ منہ کے بل کیسے چلیں گے؟ آپ نے فرمایا : وہ ذات جس نے

قدموں پر چلنے کی توفیق بخشی ہے منہ کے بل چلنے کی بھی قدرت دے سکتی ہے۔

اُولٰٓئِكَ وہی گروہ شَرٌّ مَّكَانًا بدتر از روئے مکان ہے اس لیے کہ دنیا میں ان کے مکانات اہلِ ایمان کے مکانات سے برتر تھے۔ دراصل یہ لوگ اہلِ ایمان پر طعن و تشنیع کے طور کہا کرتے:

ای الفریقین خیر مقاما و احسن ندیا۔

(دو گروہوں میں سے کون سا گروہ مقام و مجلس کے لحاظ سے احسن ہے)

اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا:

فسیعلمون من ھو شر مکانا۔

(عنقریب جان لیں گے کہ کون مکان کے لحاظ سے بُرا ہے)

یعنی ان دونوں گروہوں میں کون ہے مکان کے لحاظ سے بدتر، کیونکہ قیامت میں جب اپنے اندازے غلط پائیں گے تو کہہ اٹھیں گے ہم ہی مکانات کے لحاظ سے بدتر ہیں۔

وَّ اَضَلُّ سَبِيْلًا اور راہ سے سب سے زیادہ بھٹکے ہُوئے اور خطا کار، یعنی بہت زیادہ ٹیڑھے اور از جہت راہ صواب اور حق سے دُور تر کیونکہ انہیں وہی راستہ جہنم میں لے جائے گا۔

ف: یہ افعل التفضیل مطلق زیادتی کے لیے ہے۔

اب معنیٰ یہ ہوا کہ وہی طریق مستقیم سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں ان کے مکان کو شر یعنی کہہ کر ان کی بدترین شرارت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح سبیل کو اضل سے موصوف کرنا اسناد مجازی ہے اور اس میں بھی مبالغہ مطلوب ہے۔

ف: چونکہ وہ اہلِ ایمان کو گمراہی کی طرف منسوب کرتے اس لیے کہتے:

وانا اوایاکم لعلی ھدی او فی ضلال مبین۔

(ہم یا تم ہدایت پر ہیں یا کھُلی گمراہی میں)

جب اہلِ ایمان کو بہشت کی طرف جاتا دیکھیں گے اور اپنے آپ کو جہنم کی طرف، تو اس وقت ان کی آنکھ کھُلے گی۔ پھر انھیں معلوم ہوگا کہ گمراہ کون اور ہدایت یافتہ کون! حضرت صائب نے فرمایا: ؎

واقف نمی شوند کہ گم کردہ اند راہ

تا رہروان براہنمائی می رسند

ترجمہ: انھیں واقفیت اس لیے نہیں کہ انہوں نے اپنا راستہ گم کر دیا تاکہ رہرو لوگ رہنمائی نہ پا سکیں۔

ف : قیامت کے دن ایمان وکفر میں امتیاز کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے کما قال : وامتازوا الیوم ایھا المجرمون ۔ (اے مجرمو! آج علیحدہ ہو جاؤ)

نکتہ : منہ کے بل جہنم کی طرف اس لیے لے جانا ہوگا کہ اُنھوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سامنے تکبر کیا اور اپنے آپ کو بہت اونچا تصور کرکے بارگاہِ الٰہی میں نہ جھکے اسی لیے انہیں اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کی سزا میں مبتلا فرمایا اور اہل ایمان نے چونکہ عجز و نیاز سے سر جھکایا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے درجات بلند فرمائے۔

ف : جو بھی مخالفت سے دور رہے اور موافقت میں سر جُھکا دے تو وہ نجات پا جاتا ہے اور جو اس کے برعکس کرتا ہے تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اور عاصی اللہ تعالیٰ سے بھاگ کر جائے گا کہاں! بالآخر اس نے اللہ تعالےٰ کی گرفت میں آنا ہے۔

حکایت حضرت احمد بن ابی الجواری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک دن میں اپنے بالاخانے میں بیٹھا تھا کہ ایک ننھی بچی نے دروازہ کھٹکھٹایا، میں نے پُوچھا : تو کون ہے؟ اس نے کہا میں ایک چھوٹی بچی ہُوں، آپ سے رہبری لینے آئی ہُوں۔ میں نے کہا : نجات کی یا فرار کی؟ اس نے کہا اے بطال! خاموش رہیے، کیا بھاگنے کا بھی کوئی راستہ ہوتا ہے، اور بندہ بھاگے گا بھی تو جائے گا کہاں! کیونکہ جب وہ اپنے آقا کے قبضے میں ہے تو پھر بھاگ کر جائے گا کہاں!

سبق : دانا پر لازم ہے کہ دنیا میں رہ کر کسی اچھے مکان کی طرف بھاگنے کی جدوجہد کرے تاکہ اسے آخرت میں بُرے مکان سے نجات نصیب ہو۔

مسئلہ : دنیا میں بہترین مکانات مساجد ہیں اور علومِ دینیہ کی مجالس بھی بہترین مجلسیں ہیں اس لیے کہ وہاں نفحاتِ الٰہیہ کی خوشبو آتی ہے۔

حضرت عارف جامی قدس سرہٗ نے فرمایا : ؎

ما نداریم مشامی کہ توانیم شنید
ورنہ ہر دم رسد از گلشن وصلت نفحات

ترجمہ : ہمارے ہاں وہ دماغ کہاں کہ ہم نفحاتِ حق سونگھ سکیں ورنہ گلشن وصالِ حق کے نفحات کی خوشبو ہر وقت نصیب ہوتی۔

ہم اللہ تعالیٰ سے روضات توحید کی نفحات اور حدائق التفرید کی خوشبوؤں کا سوال کرتے ہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۖۚ فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ؕ وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ
لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۚۖ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۠ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا
بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ۝ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۫ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ۝ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى
الْقَرْيَةِ الَّتِيْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ۝ وَ
اِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ۝ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا
عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ
سَبِيْلًا ۝ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۝ اَمْ تَحْسَبُ
اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝

ترجمہ: اور بے شک ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی اور ہم نے اس کے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو اس کا مددگار بنایا پھر ہم نے دونوں کو فرمایا کہ تم دونوں اس قوم کی طرف جاؤ جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا سو ہم نے انھیں برباد کر کے ہلاک کر دیا اور قوم نوح کو بھی جب انہوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی ہم نے انھیں غرق کر دیا اور انھیں لوگوں کے لیے عبرت بنایا اور ہم نے ظالموں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے اور عاد و ثمود اور کنوئیں والوں کو بھی اور ان کے درمیان میں بہت سی اُمتوں کو ہم نے برباد کیا اور ہم نے ہر ایک کی مثالیں بیان کیں اور ہم نے سب کو تباہ کر کے ملیا میٹ کر دیا اور البتہ یہ لوگ اس بستی سے ہو کر آئے ہیں جس پر بُری طرح بارش برسی۔ تو کیا وہ اسے دیکھتے نہیں تھے بلکہ وہ مر کر اُٹھنے کی امید نہیں رکھتے تھے اور جب وہ تمھیں دیکھتے ہیں تو تمھیں ٹھٹھا مخول ٹھہراتے ہیں کیا یہ وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ قریب تھا کہ یہ تمھیں ہمارے معبودوں سے بہکا دے اگر ہم ان پر صبر نہ کرتے۔ زود تر انھیں معلوم ہوگا جب عذاب دیکھیں گے کہ کون سیدھی راہ سے بھٹکا ہوا ہے کیا تم نے اسے دیکھا کہ جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا لیا کیا تم اس کی نگرانی کا ذمہ لگاؤ گے یا تمہارا خیال ہے کہ ان کے اکثر کچھ سنتے یا سمجھتے ہیں وہ تو نہیں مگر جانور بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔

تفسیر عالمانہ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ یہ لام قسمیہ ہے اور قسم کا جواب محذوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ بخدا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو توراۃ عنایت فرمائی یعنی فرعون اور اس کی قوم کو غرق کرنے کے

بعد ہم نے موسیٰ علیہ السّلام پر توراۃ نازل فرمائی۔)

نکتہ: قصے کے آغاز میں کتاب کے انزال کا ذکر فرمایا حالانکہ اس کا نزول فرعون اور اس کی قوم کی تباہی اور ہلاکت کے بعد ہوا اور اسے اس تباہی و ہلاکت سے کوئی واسطہ بھی نہیں جیسے دوسرے معجزات کو اس سے کوئی واسطہ نہیں اس میں اشارہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ابتدائی دور سے ہی عروج و ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے تھے اور نہایت درجہ کے کمالات کو بہت جلد پہنچ گئے تھے مثلاً بنی اسرائیل کو نجات دلانا اور انہیں تورات کے احکام کے مطابق راہِ حق پہ لگانا وغیرہ۔

وَجَعَلْنَا مَعَهٗ یہ ظرف جعلنا کے متعلق ہے **اَخَاهُ** یہ جعلنا کا مفعول اول ہے **هٰرُوْنَ** یہ اخاہ سے بدل ہے اور یہ عجمی اسم ہے اس جیسا کلمہ عربی میں استعمال نہیں ہوا **وَزِيْرًا** یہ جعلنا کا مفعول ثانی ہے (یعنی ہم نے ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کا وزیر بنایا بایں معنیٰ کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے معین و مددگار ہو کر ان کا دعوتِ حق اور اعلائے کلمہ میں ہاتھ بٹائیں)

حل لغات: موازرۃ بمعنے معاونت ہے۔ القاموس میں ہے: الوزر بالکسر بمعنے حمل اور حمل ثقیل اور الوزیر بمعنے بادشاہ کا وہ ساتھی جو اس کے شاہی امور اٹھائے اور اس کی رائے اور جملہ حال میں اعانت کرے الوزارہ بالکسر، اور اسے مفتوح بھی پڑھا جاتا ہے۔ الوزیر کی جمع وزراء آتی ہے۔

ف: الحباء (محرکۃ) بادشاہ کا ہم نشین اور اس کا خاص آدمی۔ بعض اہل لغت کہتے ہیں،

وزیر وہ ہے جو مرجع امور ہو اور اس کی رائے کو کوئی ٹھکرا نہ سکے۔ الوزر بالتحریک سے ہے۔ الوزر وہ شے جسے جائے پناہ بنایا جائے اور مصائب کے وقت اس کا دامن تھاما جائے۔ پہاڑ کو بھی اسی معنی پہ الوزر کہا جاتا ہے۔ اور قرآن مجید میں ہے: كَلَّا لَا وَزَرَ بمعنے لا ملجأ يومَ القيٰمة۔ یہاں پہ وزر بمعنے ملجاء واقع ہوا ہے اور الوزر بالکسر بمعنے الثقل۔ پہاڑ کے ثقل سے مشابہت کی وجہ سے اس معنیٰ میں استعمال ہوا اور کبھی وزر سے گناہ بھی مراد ہوتا ہے، اس لیے کہ گناہ ایک بوجھ ہے۔ چنانچہ گناہ کو ثقل (بوجھ) سے قرآن مجید میں تعبیر کیا گیا ہے۔ کما قال:

لیحملوا اوزارھم۔ (تاکہ اپنے بوجھ اٹھائیں)

اور فرمایا:

لیحملن اثقالھم و اثقالًا مع اثقالھم۔ (تاکہ اپنے بوجھ اور دوسروں کے بوجھ بھی اٹھائیں۔)

اور الوزیر فارسی میں بمعنے یار و مددگار اور کارساز۔

سوال: حضرت ہارون علیہ السلام کو وزیر کس طرح کہا گیا حالانکہ وہ تو نبی تھے اس معنے پہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے نبوت شریک تھے اور شرکت فی النبوۃ وزارت کے منافی ہے۔

جواب : مشارکت فی النبوۃ منافی نہیں بلکہ ہمارے مقصد کی مؤید ہے اس لیے کہ شریک فی الامر ایک دوسرے کے بوجھ اٹھانے والے ہوتے ہیں۔

فَقُلْنَا تو ہم نے انھیں اس وقت فرمایا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا تم دونوں ان لوگوں کے ہاں تشریف لے چلو جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے یعنی فرعون اور اس کی قوم قبطی کے ہاں، اور آیات سے موسیٰ علیہ السلام کے وہ نو معجزات مراد ہیں جو قرآن مجید میں مذکور ہیں اور موسیٰ علیہ السلام سے ظاہر ہوئے۔

سوال : ارسال الی القوم کے جملے میں قوم کو تکذیب کے ساتھ کیوں موصوف نہیں فرمایا اور اس جملہ میں اس صفت سے انھیں موصوف کرنے کا کیا فائدہ؟

جواب : حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ارسال کے وقت تو ان سے تکذیب کا صدور نہیں ہوا بلکہ ان کی تکذیب کا صدور ان معجزات کے ظہور کے بعد ہوا اسی لیے اب رسولِ خدا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے بتایا گیا کہ وہ تکذیب کرنے والے تھے نیز اب کا اظہار آنے والے جملے کی علت بنے گا یعنی بتایا گیا کہ ان کی تباہی و بربادی کی علت ان کی تکذیب تھی۔ بعض نے کہا کہ آیات سے یہاں پر آیاتِ تکوینیہ مراد ہیں یعنی وہ علامات جنھیں اللہ تعالیٰ نے عالمِ دنیا میں پیدا فرمایا بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہاں پر آیات سے رسل کرام علیہم السلام اور وہ کتابیں آسمانی مراد ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے تشریف لانے سے پہلے نازل ہوئیں۔ چنانچہ نوح علیہ السلام کے واقعہ میں الرسل سے سابقہ رسل مراد ہیں۔ کما قال :

وقوم نوح کذبوا الرسل۔ ترجمہ: اور نوح کی قوم نے تکذیب کی۔

باء ہر لحاظ سے کذبوا کے متعلق ہے اذھبوا کے متعلق بنانا غلط ہے اگرچہ ان کے ہاں بھی معجزات لے کر گئے۔ چنانچہ سورۂ شعراء میں ہے کہ :

فاذھبا بایتنا۔ ترجمہ: تو جاؤ ہمارے معجزات لے کر۔

یاد رہے کہ تکذیب کا تعلق کبھی آیات سے ہو۔ چنانچہ اعراف میں فرمایا :

فظلموا بھا۔ ترجمہ: تو انہوں نے ان کے ساتھ ظلم کیا۔

اور سورۂ طٰہٰ میں فرمایا :

ولقد اریناہ اٰیاتنا۔ ترجمہ: بے شک ہم نے اسے اپنی آیات دکھائیں۔

یہاں دونوں آیتوں میں ھا کا مرجع آیات ہے اور کبھی اس کا تعلق موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے ہوا۔ چنانچہ سورۂ مومنین میں ہے : فکذبوھما (تو انہوں نے ان دونوں کی تکذیب کی)

فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًاؕ توہم نے انہیں تباہ و برباد کر ڈالا۔

حل لغات : التدمیر بمعنے ہلاکت وتباہی کوکسی شے پر ڈالنا۔اور الدمار بمعنے ہلاکت کے ذریعے کسی کی جڑ اکھاڑنا ۔ الدمور بمعنے مکروہ شے میں داخل ہونا(اصل عبارت یوں ہے : پھر وہ دونوں حضرات فرعون اور اس کی قوم کے ہاں تشریف لے گئے اور انہیں ہمارے جملہ آیات دکھائے لیکن انہوں نے ہمیشہ کے لیے انکار کر دیا پھر ہم نے ان کی تکذیب کے بعد مکمل طور ایسے عجیب طریقے سے تباہ و برباد کر ڈالا کہ جس کی کُنہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ یعنی ان کی تکذیب کے بعد ہم نے انہیں دریائے قلزم میں ڈبو دیا۔)

سوال : قصے کے ابتدائی اور پھر آخری حصے کو بیان کرنے کا کیا معنیٰ ؟

جواب : نصیحت وعبرت مقصود تھی اور ان پر الزام حجت مطلوب تھا کہ انہوں نے بعثت رسل کی تکذیب کی۔ ہم نے انہیں تباہ و برباد کر ڈالا۔

یہ فاء تعقیبیہ ہے اس سے تکذیب کا انجام بتانا مطلوب تھا سو وہ ہو گیا یعنی چونکہ ان کی تکذیب میں استمرار تھا اسی لیے وہ تباہ و برباد ہوئے اگرچہ تکذیب و تباہی و بربادی کے درمیان میں لمبا عرصہ گزرا لیکن چونکہ وہ استمراری تھی اس لیے فاء تعقیبیہ لانے میں کوئی حرج نہیں۔

وَقَوْمَ نُوْحٍ یہ فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے اور اس محذوف فعل پر (فدمرنٰھم) دلالت کرتا ہے۔اب معنیٰ یہ ہُوا کہ ہم نے قومِ نوح علیہ السلام کو تباہ و برباد کیا لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ جبکہ اُنہوں نے رسل کرام یعنی نوح علیہ السلام اور ان سے پہلے حضرات جیسے شیث و ادریس علیہما السلام کی تکذیب کی یا یہاں پر صرف نوح علیہ السلام مراد ہیں، اس لیے کہ ایک نبی علیہ السلام کی تکذیب گویا جملہ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب ہے اس لیے کہ ان سب کا توحید و اسلام پر اتفاق تھا۔ بعض مفسرین نے فرمایا چونکہ حضرت نوح علیہ السلام اپنے اور اپنے سے بعد کو آنے والے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے کی دعوت دیتے تھے۔ پھر جب اُنہوں نے نوح علیہ السلام کی تکذیب کی تو گویا جملہ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی۔

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان روایات میں ہے کہ ہر نبی علیہ السلام اپنی اُمّت سے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا معاہدہ لیتے تھے اگر وہ ان کے زمانۂ اقدس میں تشریف لائیں۔

اَغْرَقْنٰهُمْ ہم نے ان سب کو طوفان میں غرق کر دیا(الاغراق بمعنے غرق کرنا ۔ اور الغرق بمعنے پانی میں ڈوبنا الرسوب بمعنے السفول یعنی نیچے کو ہونا یعنی پانی کے نیچے ہونا' جسے ہم ڈوبنے سے تعبیر کرتے ہیں یہ جملہ مستانفہ ہے اور ان کے اغراق کی کیفیت بیان کرنے کے لیے واقع ہوا ہے وَجَعَلْنٰهُمْ اور ہم نے ان کے اغراق اور قصے کو بنایا ہے لِلنَّاسِ اٰيَةً لوگوں کے لیے ایک عظیم علامت جس سے مشاہدہ کرنے اور سننے والا

عبرت حاصل کرے۔ آیۃ بمعنے نشان و داستان ہے اور یہ جعلنا کا مفعول ثانی ہے اور للناس اس کا ظرف لغو ہے۔ وَاَعْتَدْنَا اور ہم نے آخرت میں تیار کیا ہے لِلظّٰلِمِیْنَ ظالمین یعنی غرق ہونے والوں کے لیے۔ یہاں ضمیر کے بجائے اسمِ ظاہر کو لانے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ظلم پر مہر ثبت ہو اور معلوم ہو کہ وہ کفر و تکذیب میں حد سے تجاوز کر گئے۔ عَذَابًا اَلِیْمًا ○ دردناک عذاب۔ یہ عذاب اس کے علاوہ ہوگا جو انہیں دنیا میں نصیب ہوا۔ اور الیم بمعنے وجیع یعنی دردناک وَّعَادًا اس کا عطف قومِ نوح پر ہے یعنی ہم نے عاد کو ہود علیہ السلام کی تکذیب کی وجہ سے ہلاک و تباہ کیا وَّثَمُوْدَا۠ اور ثمود کی قوم کو صالح علیہ السلام کی تکذیب سے وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ الرس بمعنے کنواں۔ اور ہر وہ گڑھا جو پتھروں اور پکی اینٹوں سے تیار نہ کیا گیا ہو۔ چنانچہ کشاف میں لکھا ہے الرس البئر الغیر المطویۃ ای المبنیۃ انتھی۔ اور قاموس میں صحاح کی طرح ہے کہ وہ کنواں جو مٹی وغیرہ ہٹا کر تیار کیا جائے (اور اصحاب الرس وہ قوم ہے جو بت پرستی کرتی تھی۔ ان کے ہاں شعیب علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا گیا تو انھوں نے آپ کی تکذیب کی۔ وہ ایک دن کنوئیں کے اردگرد بیٹھے تھے اور وہ کنواں صرف پانی کا گڑھا تھا اسی سے وہ خود اور جانوروں کو نہریں کھود کر پانی پلاتے تھے وہ سب اسی میں دھنس گئے اور ان کے جانور اور اسباب بھی اس میں برباد ہو گئے۔ اور قاموس میں ہے الرس وہ کنواں ہے جو قومِ ثمود کا بقایا ہے انھوں نے بھی اپنے نبی علیہ السلام کی تکذیب کی پھر اسے بند کر کے بالکل چھپا دیا پھر جو فعلِ بد انھوں نے اپنے نبی علیہ السلام کے ساتھ کیا اسی سے منسوب ہوئے، اس معنے پر مس مصدر ہے اور اُن کے نبی علیہ السلام کا نام نامی حضرت حنظلہ بن صفوان تھا جو موسٰی علیہ السلام سے پہلے گزرے۔ اسی طرح ابنِ کثیر نے ذکر کیا ہے۔)

اصحاب الرس کو عذاب

مروی ہے کہ جونہی انہوں نے نبی علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈالا تو اس کا پانی نیچے چلا گیا۔ اس سے وہ پیاسے مرنے لگے اور ان کے درخت خشک ہو گئے اور باغات کے پھل ختم ہو گئے حالانکہ اس سے قبل وہ بڑے خوشحال تھے سیر ہو کر پانی پیتے۔ اور ان کی تمام زمینوں اور باغات کے لیے کنوئیں کا پانی مکتفی تھا اس کے بعد وہ وحشی طبیعت ہو گئے حالانکہ اس سے قبل بہت شریف انسان سمجھے جاتے تھے، ان میں افتراق و اختلاف پیدا ہو گیا حالانکہ اس سے قبل بہت بڑے متحد و متفق تھے اگرچہ بت پرست تھے لیکن نبی علیہ السلام کی برکت سے بڑے خوشحال تھے جب نبی علیہ السلام کی گستاخی کی تو ان مصائب و مشکلات میں مبتلا ہو گئے۔)

---

[1] یہ پہلے زمانہ کے لوگوں کے لیے تھا اب ہزاروں گستاخیاں کی جا رہی ہیں لیکن کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی سزا ایک یہی ہے کہ خاتمہ برباد ہوگا ورنہ پھر مرنے کے بعد سخت عذاب۔ اویسی غفرلہٗ

معجزۂ نبی ان کے ہاں ایک جانور بہت طاقت ور اور عظیم الجثہ پیدا ہوگیا جس کی گردن بھی بہت لمبی تھی۔ اور اس میں ہر قسم کا رنگ پایا جاتا تھا اور وہ ان کے بچوں پر حملہ کر کے ان کے گھروں سے اٹھا کر لے جاتا تھا اور بجانب ِغرب کہیں نامعلوم جگہ پر چھُپ جاتا۔ اس کی طویل گردن کی وجہ سے اسے عنقاء اور مغرب کی طرف جانے سے عنقاءِ مغرب کہا جاتا۔ اور اسے چھپا اور پوشیدہ کرنے والا جانور کہا جانے لگا۔ ایک دن اس نے ایک قریب البلوغ لڑکی کو اٹھا یا اس کی شکایت حضرت حنظلہ بن صفوان علیہ السلام سے کی گئی اور وعدہ کیا کہ اگر انھیں اس موذی جانور کی شرارت سے نجات مل جائے تو ہم آپ پر ایمان لائیں گے۔ آپ نے اس کے لیے بددعا کی تو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے ایک بجلی نازل فرمائی جس سے وہ جل کر راکھ ہوگیا۔ اس کے بعد وہ لوگ محفوظ ہوگئے۔ بعض نے فرمایا کہ اسے خطِ استواء کے نیچے بعض ایسے جزائر میں اللہ تعالیٰ نے پہنچایا جہاں کوئی انسان نہیں پہنچ سکتا اور وہاں ایسے حیوانات بکثرت ہیں مثلاً ہاتھی اور کرکدن (گینڈا)[1] اور دیگر درندے اور موذی پرندے۔

دعائے نبی کی تاثیر (حضرت کاشفی نے لکھا کہ پیغمبر نے دعا مانگی کہ یا اللہ! اس مُرغ کو پکڑ لے اور اس کی نسل کو ختم کردے۔ پیغمبر علیہ السلام کی دُعا قبول ہُوئی کہ وہ پرندہ گم ہوگیا اور اس کی نسل آج تک ختم ہے حتی کہ اب اس کا نشان بھی نہیں ملتا۔ ہاں ہم صرف اس کے نام سے واقف ہیں۔ اب نایاب اشیاء کے بارے میں مثال دی جاتی ہے توعنقا کی) چنانچہ کسی نے کہا:

منسوخ شد مروّت و معدوم شد وفا
وز ہر دو نام ماند چو عنقاء و کیمیا

ترجمہ: مروّت مٹ گئی اور وفا ناپید ہوگئی۔ عنقاء کیمیا کی طرح اب ان دونوں کا محض نام ہی باقی ہے۔

اور صاحبِ لمعات نے عشق کی بے نشانی بھی اسی سے ظاہر فرمائی

عشقم کہ در دو کون و مکانم بدید نیست
عنقائے مغربم کہ نشانم بدید نیست

ترجمہ: میرے عشق کی منزل دیکھنے کے قابل ہے لیکن میں تو عنقائے مغرب ہوں پھر میرا مکان قابلِ دید کیسے!

---

[1] غیاث اللغات

عنقاء کا تعارف مزید عنقاء (بالضم) اسے عنقائے مغرب و مغربہ کہا جاتا ہے۔ یعنی عنقاء کو مغرب کی طرف مضاف کرکے، وہ ایک معروف الاسم پرندہ ہے لیکن اس کا جسم کسی نے کہیں نہیں دیکھا ویسے نایاب اشیاء کے لیے اسے مثال کے طور بولا جاتا ہے یا اس پرندے کو بولتے ہیں جو بہت بڑا ہو اور اڑنے میں بہت جولانیاں دکھائے۔ کمافی القاموس

اصحاب الرس کیطرف اشارہ ان بدبختوں نے نبی علیہ السلام کی شکر گزاری کے بجائے انہیں شہید کرکے کنویں میں پھینک دیا اور پھر اسے چھپادیا، جیسا کہ اوپر گزرا۔

زندہ نبی علیہ السلام حضرت حنظلہ علیہ السلام کو بہت مدت کے بعد اسی کنویں میں دیکھا گیا کہ آپ نے اپنا ہاتھ زخم کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ جونہی لوگوں نے آپ کے جسم اطہر کو دیکھا تو آپ کا ہاتھ زخم سے ہٹادیا۔ ہاتھ کا ہٹانا ہی تھا کہ آپ کے زخم مبارک سے خون بہنے لگا۔ پھر ہاتھ مبارک زخم کے اوپر رکھ دیا گیا تو خون بہنے سے رک گیا۔

اعجوبۂ اصحاب الرس بعض علماء نے کہا کہ اصحاب الرس عورتوں کا گروہ تھا جو اپنے عملِ بد کی شامت سے عذاب میں مبتلا ہوا۔ ان کا واقعہ یوں ہے کہ دلہات بنت ابلیس نے ان عورتوں کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ اگر عورت عورت سے بدفعلی کرے تو خوب مزا آتا ہے۔ پھر انہیں سحق کا طریقہ بتایا، اس سے اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کو یوں عذاب میں مبتلا کیا کہ اول شب کو ایک کڑک ان پر پڑی، صبح کو زمین دھنس گئی، دوپہر دن کو ایک سخت چیز آئی اس کے بعد ان میں ایک بھی باقی نہ رہی، تمام کی تمام تہس نہس ہوگئیں۔

حدیث شریف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
ان من اشراط الساعۃ ان تستکفی الرجال بالرجال والنساء بالنساء وذالك السحق۔

(قیامت کی علامات میں سے ہے کہ مرد مردوں سے شہوت رانی کرکے اور عورتیں عورتوں سے سُحق کے طریقہ سے گزارہ کریں گے۔

حدیث شریف میں ہے:

سحاق النساء زنا بینھن۔

(عورت عورت سے سحق کرے تو ان کا یہ فعل زنا میں داخل ہے)

یہ حدیث مرفوع ہے۔

پہلا بہشتی کالا حبشی

بعض بزرگوں نے فرمایا کہ اصحاب الرس نے اپنے نبی علیہ السلام کی تکذیب کی اور اسے ایک تنگ کنوئیں میں بند کر کے اوپر ایسا بڑا پتھر رکھ دیا کہ جسے کوئی بھی نہ ہٹا سکے اگرچہ مل کر کئی آدمی بھی ہٹانا چاہیں۔ اس نبی علیہ السلام پر صرف ایک حبشی کالا ایمان لایا جو وہی صرف اپنے نبی علیہ السلام کے کام آیا کہ دن کو پہاڑوں سے لکڑیاں جمع کر کے بیچتا اور اسی سے طعام لے جا کر کنوئیں کے کسی سوراخ سے ڈالتا جسے وہ نبی علیہ السلام تناول فرماتے اور عرصہ کئی سال یہی طریقہ کار رہا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو تباہ و برباد کر ڈالا پھر ایک فرشتے نے وہ پتھر ہٹایا اور وہی نبی علیہ السلام کنوئیں سے باہر تشریف لائے۔

ف: بعض علماء فرماتے ہیں کہ وہ پتھر اسی کالے حبشی نے ہٹایا جسے اللہ تعالیٰ نے اتنا بھاری پتھر اٹھانے کی قوت بخشی۔ پتھر ہٹا کر اندر رسی ڈالی جسے پکڑ کر وہ نبی علیہ السلام باہر تشریف لائے۔ اسے انعام یہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے اس نبی علیہ السلام کے ہاں وحی بھیجی کہ وہی کالا حبشی بہشت میں آپ کا رفیق ہوگا۔

حدیث شریف میں ہے:

ان اول الناس دخولا الجنۃ لعبد اسود۔

(سب سے پہلے بہشت میں داخل ہونے والا ایک کالا حبشی ہوگا[1])

علی بن حسین بن علی زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تفسیر کا نمونہ

حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص از بنی تمیم حضرت امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کی کہ آپ فرمائیے کہ اصحاب الرس کون لوگ تھے اور کس زمانہ اور کس ولایت میں اور ان کا مسکن کہاں تھا اور کون سے بادشاہ کے زمانہ میں تھے۔ ان کے ہاں کوئی پیغمبر تشریف لایا یا نہ۔ اور وہ کس وجہ سے ہلاک و تباہ ہوئے۔ ہم قرآن میں ان کا نام تو پڑھتے ہیں لیکن ہمیں ان کا ذکر تفصیل سے نہیں ملا۔ سیدنا امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے تمیمی بھائی! تو نے مجھ سے ایسا سوال کیا ہے کہ تجھ سے پہلے مجھ سے کسی نے پوچھا تک نہیں اور میرے سوا تم کسی اور سے یہ قصہ نہیں سنو گے۔ اصحاب الرس بنی اسرائیل کے ہمعصر اور سلیمان علیہ السلام سے پہلے گزرے ہیں۔ وہ صنوبر کے درخت کو پوجتے تھے اور یہ درخت چشمہ معروف کے کنارے پر یافث بن نوح علیہ السلام نے بویا تھا۔ اس چشمہ سے باہر ایک نہر جاری تھی اور ان کا بارہ حصص پر مشتمل نہر کے کنارے ایک شہر تھا۔ اس نہر کا نام رس تھا،

---

[1] اس سے یہی کالا حبشی مراد ہے جس نے اپنے نبی علیہ السلام کی غلامی کا حق ادا کیا۔

بلادِ مشرق میں اس سے بڑی نہر کوئی نہیں تھی اور نہ ہی اس زمانہ میں اس سے بڑا کوئی اور شہر تھا ان کا دارالخلافہ شہر اسفند آباد میں تھا بادشاہ نمرود بن کنعان کی نسل سے تھا اور وہ بھی اسی شہر میں رہتا تھا اور صنوبر کا درخت بھی اسی شہر میں تھا۔ یہ لوگ اسی درخت کا بیج لے کر اپنے شہر میں گئے تاکہ وہ درخت پیدا ہو اور وہ اس کی پرستش اپنے شہر میں ہی کریں اور وہ چشمہ جو اس درخت کے نیچے تھا اس کا پانی پینے کی کسی کو اجازت نہ تھی اور نہ اس سے پانی لے کر کسی اور ضرورت کے لیے اسے استعمال کرتے۔ بلکہ کہتے،

هی حیاة الهتنا فلا ینبغی لاحد ان ینقص من حیاتها۔

(یہ پانی ہمارے معبودوں کی زندگی ہے اس لیے کسی کو لائق نہیں کہ ان کی زندگی کو گھٹائے)

ہاں پانی کی اپنی ضروریات اسی نہر سے پوری کرتے ان کا طریقہ تھا کہ ہر ماہ اس درخت صنوبر کے ارد گرد جمع ہوتے اور اسے طرح طرح کے زیورات اور پوشاک سے آراستہ و پیراستہ کرتے اور جانور ذبح کرتے اور بہت بڑی آگ جلا کر قربانیوں کو اسی میں ڈالتے تاکہ گرد اور دھواں زیادہ سے زیادہ ہو جب دھوئیں سے تاریکی چھا جاتی یہاں تک کہ آسمان کے کنارے چھپ جاتے تو پھر سربسجود ہو جاتے اور نہایت عجز و نیاز سے گڑگڑاتے یہاں تک کہ درخت سے شیطان آواز دیتا:

انی قد رضیت عنکم فطیبوا انفسا و قروا اعینا۔

(میں تم سے راضی ہوں فلہذا خوشیاں مناؤ اور آنکھیں ٹھنڈی کرو)

وہ شیطانی آواز جب ان کے کان میں پہنچتی سجدہ سے سر اٹھا کر خوش ہو جاتے یہاں تک کہ اسی خوشی میں ایک سالم دن شراب نوشی کی محفل جماتے اور کہتے کہ ہم سے ہمارا معبود راضی ہو گیا۔ اسی طریقے سے زندگی بسر کرتے۔ یوں ان کے کفر و شرک کا بازار گرم ہو گیا اور وہ طغیان و سرکشی میں یکتا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے ان کے ہاں ایک پیغمبر بھیجا۔ وہ پیغمبر یہود بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ عرصہ دراز تک انھیں دعوتِ دین دیتے رہے لیکن وہ بدبخت کفر و شرک میں قدم آگے ہی بڑھاتے رہے۔ پیغمبر علیہ السلام نے تنگ آکر اللہ تعالیٰ سے التجا کی: یا رب

یا رب ان عبادك ابوا الا تکذیبي والکفر بك لیعبدون شجرة لا تضر ولا تنفع فارهم قدرتك وسلطانك۔

اے الٰہ العالمین! تیرے بندے میری تکذیب کر رہے ہیں اور تیرے ساتھ کفر کرنے میں کسر اٹھا نہیں رکھ رہے فلہذا انھیں اپنی قدرت کا کرشمہ دکھا۔

جب پیغمبر علیہ السلام نے بددعا کی تو ان کے تمام درخت خشک ہو گئے۔ اصحاب الرس نے کہا یہ نحوست اسی مرد کی ہے جو پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہے اور ہمارے معبودوں کی مذمت کرتا ہے۔ ان بدبختوں نے پیغمبر علیہ السلام کو پکڑ کر ایک بڑے کنویں میں پھینک دیا۔ بعض نے کہا کہ نے کی لکڑیوں سے کنواں اس طرح تیار کیا گیا کہ اوپر سے پانی

کھینچتے تھے۔ لیکن وُہ بھی خشک ہو گیا اسی نبی علیہ السلام کو پکڑ کر اسی کنویں میں ڈال دیا اور اوپر ایک بھاری پتھر رکھ دیا۔ پھر خوش ہُوئے کہ اب ہم سے ہمارے معبود راضی ہوں گے اس لیے کہ ہم نے ان کے دشمن کو کنویں میں بند کر دیا ہے پیغمبر علیہ السلام نے اس وحشت گاہ میں اللہ تعالیٰ سے عرض کی :

سیدی و مولائی قد تری ضیق مکانی وشدۃ کربی فارحم ضعف رکنی وقلۃ حیلتی وعجل قبض روحی ولا تؤخر۔

(اے میرے آقا و مولا! تُو میری تنگی مکان اور درد و کرب کی سختی کو دیکھ رہا ہے۔ فلہذا میرے حال پر رحم فرما اور میرے قلت حیلے کو دیکھ اب میری گزارش ہے کہ مجھے دُنیا سے اٹھا لے، میری رُوح قبض کر لے)

اس کے بعد نبی علیہ السلام کا وصال ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا : میرے بندوں نے میرے حوصلے سے فائدہ اٹھایا ہے اور وُہ میری مہلت سے دھوکا کھا بیٹھے ہیں اسی لیے میرے غیر کی پرستش کر رہے ہیں اور میرے نبی علیہ السلام کو شہید کر ڈالا اور میں اپنے اس بندے سے بدلہ لیتا ہُوں جو میرا مقابلہ کرتا ہے اور میرے عذاب سے نہیں ڈرتا۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ ان کو آنے والی نسلوں کے لیے عبرت بناؤں اور انہیں سخت عذاب میں مبتلا کروں۔ یہ فرمایا اور سخت آندھی کو حکم دیا کہ انہیں تباہ و برباد کر دے۔ چنانچہ آندھی چلی اور وہ تباہ و برباد ہو کر زمین میں دھنس گئے اور اوپر سے زمین کبریت کی طرح سخت ہو گئی اور اوپر سے سیاہ بادل امڈا اور آگ برسائی۔ یُوں وُہ زمین کے اندر ہی پگھل کر فی النار والسقر ہو گئے۔ (کذا فی کشف الاسرار للعالم الربانی الرشید الیزدی)

وَقُرُوْنًا اور ہم نے بہت سے زمانہ کے لوگوں کو تباہ کیا۔ یہ قرن کی جمع ہے وہ قوم جو ایک دوسرے سے ایک زمانہ کو مقترن ہو۔ اور صحیح یہ ہے کہ ایک سو سال کا قرن ہوتا ہے۔

چنانچہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نومولود بچے کی دُعا میں فرمایا :

عش قرنا۔

(وہ سو سال زندہ رہا۔ (کذا فی القاموس)

بَيْنَ ذٰلِكَ مذکورہ طائفوں اور امتوں کے درمیان۔

یعنی نوح وعاد کے درمیان اور اصحاب الرس کے درمیان۔

كَثِيْرًا بہت سے گروہ جنہیں صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

لا یعلمهم الا اللہ۔ ترجمہ: انہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اسی لیے مروی ہے کہ کذب النسابون (نسب بیان کرنے والے) جھوٹے ہیں یعنی وہ نساب جو انساب بیانی میں صدق اور حق کے مدعی ہیں یہ قرونا کی صفت ہے اور اس کا مفرد ہونا مضر نہیں اس لیے کہ اس میں جمع اور عدد پایا جاتا ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر فرمایا:

وبث منهما رجالا کثیرا۔ ترجمہ: اور ان سے بہت سے مرد و عورتیں پھیلائے۔

وَكُلًّا اس کا منصوب ہونا فعل مضمر کی وجہ سے ہے جس پر اس کا مابعد دلالت کرتا ہے۔ یعنی ذکرنا و انذرنا یعنی ہم نے مذکورہ ہلاک و تباہ شدگان کے ہر ایک گروہ کو نصیحت کی اور خدا تعالیٰ کے خوف سے ڈرایا ضَرَبْنَا لَهُ الْأَمْثَالَ ہم نے انہیں بواسطہ رسل کرام علیہم السلام عجیب و غریب قصے سنائے جو انہیں معاصی و کفر سے روکنے کا سبب بن سکتے تھے وَكُلًّا تکذیب و اصرار علی المعاصی و الجرائم کے بعد ہر ایک گروہ کو تَبَّرْنَا تَتْبِيرًا عجیب و غریب طریقے سے تباہ و برباد کر ڈالا۔ التبر بالفتح و الکسر بمعنے اہلاک یعنی تباہ و برباد کرنا۔ تتبیر بمعنے تکسیر و تقطیع۔ زجاج نے فرمایا جس چیز کو تم توڑو گے اور ٹکڑے ٹکڑے کرو گے تو اہل عرب کہیں گے: تبرته۔ اسی لیے التبر توڑنے والی شے کو کہا جاتا ہے اور سونے اور چاندی کے وہ ٹکڑے جنہیں زیورات وغیرہ کے قابل نہ بنایا جائے تو انہیں بھی تبر سے تعبیر کرتے ہیں جب زیورات کے لائق بنائے جائیں گے تو پھر انہیں ذهب و فضة کہا جائے گا۔

وَلَقَدْ أَتَوْا اور بخدا قریش اپنی تجارت گاہوں سے علاقہ شام میں آئے اور گزرے عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي أُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ایسی بستی پر جس پر بری بارش اتری یعنی سدوم (بالدال المهملة) بعض نے بالذال المعجمہ لکھا۔ اور قوم لوط کے ان پانچوں شہروں میں سب سے بڑا شہر یہی تھا اور وہ سب پتھراؤ سے تباہ و برباد ہوئے اور ان کے اہل بہت برا فعل یعنی لواطت کرتے تھے ان پر جو پتھر پڑتا تھا وہ انسان کے برابر ہوتا تھا۔ ان میں سے ایک بھی نہ بچ سکا۔ البتہ ان پانچ شہروں میں ایک شہر کے لوگ بچ گئے کیونکہ وہ یہ فعل بد (لواطت) نہیں کرتے تھے۔ اور سدوم تو سارا ہی تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ اس کی تخصیص اس لئے ہے کہ وہی قریش کے تاجروں کی گزرگاہ تھا اور وہ جب وہاں سے گزرتے تو اسے الٹا پڑا دیکھتے لیکن عبرت حاصل نہیں کرتے تھے۔ اور مطر السوء مصدر مؤکد ہے اور اس کے زوائد کو حذف کیا گیا ہے۔ دراصل امطار السوء تھا۔ اور ایسے زوائد کا حذف عرب میں عام ہے جیسے انبته الله نباتا حسنا۔ مطر بالمجہول خیر میں اور امطر شر میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ دونوں مشترک لغتیں ہیں۔ السوء بفتح السین وضمها ہر وہ شے جس سے انسان پریشان ہو اور غم یا آفت میں مبتلا ہو یا کسی اور آزمائش

اب معنٰی یہ ہوا کہ وہ لوگ اس لبستی سے گزرتے ہیں جن پر بُری بارش یعنی پتھر برسائے گئے۔)

حدیثِ معراج کا ایک جُز حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے شبِ معراج تیسرے آسمان پر ایک پتھر رکھا دیکھ کر جبرائیل علیہ السلام سے پُوچھا۔ انہوں نے عرض کی کہ یہ قومِ لوط سے ہم نے بچا کر رکھا ہے اور آپ کی ظالم امت کے لیے چھپا رکھا ہے۔ یعنی میں نے اسے چھپا یا اور تیار کر رکھا ہے، اور یہ قیامت کے علامات میں سے ہے کہ آسمان سے بعض دانے مثلاً گندم یا جوار وغیرہ برسیں گے۔ فقیر (صاحبِ رُوح البیان قدس سرہٗ) کہتا ہے کہ ہم نے اپنے زمانے میں ان کو دیکھا اور آنے والے زمانے میں ظالمین پر پتھر وغیرہ برسیں گے۔ (نعوذ باللہ تعالیٰ)

اَفَلَمۡ یَکُوۡنُوۡا یَرَوۡنَہَا کیا انہوں نے انھیں سر کے بل پڑے نہیں دیکھے جب وُہ ان سے گزرتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ اس منظر کو دیکھ کر خوف کرکے اور عبرت حاصل کر کے ایمان لائیں بَلۡ کَانُوۡا لَا یَرۡجُوۡنَ نُشُوۡرًا الرجاء دراصل بھلائی کے انتظار کو کہا جاتا ہے اور مسرت کے حصول کے گمان پر بھی رجاء کا اطلاق ہوتا ہے اور کافر کو تو مرنے کے بعد اُٹھنے کی کوئی خوشی نہیں۔ لیکن اُن کے لیے یہ اطلاق مجازی ہے بمعنے توقع، اور لفظ توقع خیر و شر دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ اس معنے پر کافر اور توقع النشور کے درمیان نسبت جائز ہے۔ اب معنٰی یہ ہوا کہ وہ کافر تو نشور کی توقع بھی نہیں رکھتے بلکہ سرے سے قیامت میں اعمال کی سزا کے منکر ہیں، اور قیامت میں پل بھر بھی اُٹھنے کے قائل نہیں، حالانکہ اُس کا وقوع یقینی اور جُملہ لوگوں کو حاوی ہے اور ہر ایک کا اُٹھنا لازمی امر ہے۔ جب وُہ آخرت میں اُٹھنے کے منکر ہیں تو پھر ایک مخصوص گروہ کو دُنیوی عذاب کے کس طرح قائل کر سکتے ہیں۔ جب انہیں اس کا اقرار ہی نہیں تو پھر ان سے نصیحت قبول کرنے کی توقع کیسے ہو سکتی ہے، اگرچہ وہ ایک گروہ کی تباہی و ہلاکت کو آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں۔ ہاں وُہ ایسے آثار دیکھ کر صرف اتنا کہتے ہیں کہ یہ اتفاق ہے زمانے کا۔

ف: قیامت میں اُٹھنے کا منکر صرف کافر ہو سکتا ہے اُسے موسم ربیع سے محسوس ہونا چاہیے، کیونکہ یہ بتاتا ہے کہ آخر فنا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

جب تم موسمِ بہار کو دیکھو تو قیامت میں اُٹھنے کی گھڑی کو یاد کر لیا کرو۔

ف: اس لیے موسم ربیع یوم النشور کی مانند ہے۔ کیونکہ ربیع بیج بونے کے ابتدائی موسم کا نام ہے کہ پھر اس سے کھیتی اُگنے کی اُمید ہوتی ہے اور دل اسی طرف لگا رہتا ہے کہ نہ معلوم کھیتی اُگے یا نہ اُگے۔ ایسے ہی اس مومن کا حال ہے جو طاعتِ الٰہی میں جد و جہد کرتا ہے تو پھر اس کا دل قیامت تک خوف و رجاء

میں معلق رہتا ہے کہ نجانے اس کی نیکی قبول بھی ہوگی یا نہیں۔ پھر جب کھیتی اُگتی ہے اور پک جاتی ہے اسے کاٹ کر صاف ستھرا کیا جاتا ہے پھر اسے پیس کر آٹا گوندھ کر پکایا جاتا ہے اور جونہی روٹی صحیح سالم پک کر دسترخوان پر آجاتی ہے تب انسان خوش ہوتا ہے کہ اس کی محنت کام آگئی۔ اگر روٹی تنور میں جل جائے تو غمگین ہوتا ہے کہ افسوس محنت رائیگاں گئی۔ ایسے اطاعت گزار انسان کا حال ہے کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور دیگر نیک کام بجالاتا ہے یہاں تک کہ ملک الموت آکر اس کی جان لے لیتا ہے گویا اس کی رُوح کو موت کی درانتی سے کاٹ لیا جاتا ہے اور پھر اسے قبر میں دفن کیا جاتا ہے اور وہ قیامت کا انتظار کرتا ہے پھر اسے قبر سے اٹھا کر حساب کے میدان میں لے جایا جاتا ہے اور حکم ہوتا ہے کہ پل صراط سے گزرے جب وہ بندہ پل صراط سے صحیح سالم گزر گیا تو وہ لقائے حق کا مستحق ہوتا ہے ورنہ ہلاک و تباہ ہوگیا۔

سبق: عاقل پر لازم ہے کہ وُہ اپنے اعمالنامے کو ہر وقت سامنے رکھ کر اپنے انجام کو اچھا بنانے کی کوشش کرے۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ فضل مردان بر زن اے حالی پرست
زان بود کہ مرد پایان بین تر ست

۲ مرد کاندر عاقبت بینی خمست
او ز اہل عاقبت از زن کمست

۳ از جہان دو بانگ می آید بضد
تا کدامین را تو باشی مستعد

۴ آن یکی بانگش نشور اتقیاء
وین دگر بانگش فریب اشقیاء

۵ آن یکے بانگ این کہ اینک حاضرم
بانگ دیگر بنگر اندر آخرم

۶ من شگوفہ خارم اے فخر کبار
گل بریزم من نمایم شاخ خار

۷ بانگ اشگوفہ اش کہ اینک گل فروش
بانگ خارش او کہ سوی ما مکوش

۸ اے خنک آن کو ز اوّل آن شنید
کش عقول و مستمع مردان بشنید

ترجمہ: ۱۔ اے حال پرست اپنے میں برگزیدہ لوگوں کے حالات پیدا کر اس لئے کہ نیک مرد اپنے انجام کا خوب خیال رکھتا ہے۔
۲۔ جو شخص اپنے انجام بینی میں کمزور رہے وہ عاقبت بینیوں میں عورت سے بھی کم درجہ ہے۔
۳۔ جہانِ دنیا میں دو مخالف آوازیں آ رہی ہیں نامعلوم تو کس آواز کا مستعد ہے۔
۴۔ ایک آواز پرہیزگاروں کے ساتھ اٹھنے کی دوسری آواز بدبختوں کے مکر و فریب کی۔
۵۔ ایک آواز تو نقد صورت میں ہے کہ وہ کہتی ہے میں تیرے سامنے ہوں دوسری آواز کہتی ہے کہ میرا نتیجہ آخر میں ہوگا۔
۶۔ دوسری کہتی ہے کہ میں کانٹوں کا شگوفہ ہوں، شگوفہ آواز دیتا ہے کہ اسے حاصل کر لے آگے پھول ہے۔ اسے حاصل کر لے پھر تجھ پر پھول نچھاور کروں گا۔ ۷۔ شگوفہ کی یہی آواز ہوتی ہے کہ آجا اور پھول حاصل کر لے لیکن کانٹا آواز دیتا ہے کہ ادھر آنے کی کوشش نہ کر۔ ۸۔ خوش قسمت ہے وہ جس نے عقل سے پہلی آواز سنی اور مردانِ حق کی آواز سے نفع اٹھایا۔

وَاِذَا رَاٰوْكَ اور اے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کو قریش مکہ جب دیکھتے ہیں اِنْ یَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا یہ ان نافیہ ہے یعنی آپ کو نہیں بناتے مگر ٹھٹھا مخول کی جگہ۔ یعنی آپ سے استہزاء کے طور آپ کی تحقیر و اہانت کرتے ہوئے کہتے ہیں اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ۝ کیا یہ وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہاں رسول بنا کر بھیجا ہے تاکہ ہمارے اوپر حجت قائم کرے۔ یعنی ان بدبختوں نے نہ صرف ایمان کا انکار کیا بلکہ شبہات ظاہر کئے۔ جب آپ کو دیکھتے تو آپ کے ساتھ استہزاء کرتے اور آپ کی تحقیر و اہانت کرتے۔ یہی بات ابوجہل نے ابوسفیان کو کہی کہ کیا بنی عبد مناف کا نبی (علیہ السلام) یہی ہے۔

تفسیر صوفیانہ

تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ ظاہر بین لوگ تو نبوت کو صرف ظاہری حس سے دیکھتے ہیں حالانکہ اسے نظرِ بصیرۃ سے دیکھا جاتا ہے وہ بھی نورِ حق کی تائید و توفیق سے، اور یہ بیچارے نگاہِ بصیرت سے محروم اور نورِ الٰہی کی تائید و توفیق سے بے بہرہ ہیں اسی لیے جونہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنیں تو کلامِ نبوت و رسالت کی حقیقت کو نہ پا سکے بلکہ ان سے الٹا استہزاء کرتے ہوئے کہنے لگے:

اھٰذا الذی بعث اللہ رسولا و ھو بشر مثلنا محتاج الی الطعام و الشراب۔
(کیا اسی بشر کو ہمارے ہاں اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے وہ تو ہمارے جیسا آدمی اور بشر ہے وہ کھانے پینے کا محتاج ہے)[1]

---

[1] یقین جانئے آج کل اسی طرح کی باتیں وہابی، دیوبندی، نجدی، مودودی وغیرہ ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتے ہیں۔ اویسی غفرلہٗ

مثنوی شریف میں ہے : سے

۱ کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نبشتن شیر شیر

۲ جملہ عالم زین سبب گمراہ شد
کم کسی ز ابدال حق آگاہ شد

۳ ہمسری با انبیاء بر داشتند
اولیاء را ہمچو خود پنداشتند

۴ گفتہ اینک ما بشر ایشاں بشر
ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور

۵ این ندانستند ایشاں از عمی
ہست فرق درمیان بے منتہی

۶ ہر دو گون زنبور خوردند از محل
لیک شد زین نیش وزاں دیگر عسل

۷ ہر دو گون آہو گیا خوردند و آب
زین یکے سرگیں شد و زاں مشک ناب

۸ ہر دو نے خوردند از یک آبخور
این یکے خالی واں پُر از شکر

ترجمہ : ۱۔ پاک لوگوں کا قیاس اپنے اوپر نہ کر اگرچہ لکھنے میں شیر و شیر برابر ہیں ۔

۲۔ اکثر لوگ اسی لئے گمراہ ہوئے ابدال کے سوا بہت بہت اس راز سے آگاہ ہوئے ۔

۳۔ لوگوں (کافروں) نے انبیاء سے برابری کا دم بھرا اور اولیاء کو اپنے جیسا سمجھا ۔

۴۔ (اور) کہا وہ بھی بشر ہیں اور ہم بھی بشر ہیں ہم سب خواب اور خوراک کے پابند ہیں ۔

۵۔ لیکن اندھے پن سے یہ نہ سمجھا کہ ان کے اور ہمارے درمیان بے انتہا فرق ہے ۔

۶۔ دو بھڑ ہیں جو ایک ہی جگہ سے خوراک کھاتے ہیں لیکن ایک میں زہر ہے دوسرے میں شہد

۷۔ دو ہرن ہیں ایک جیسا گھاس کھاتے ہیں اور پانی پیتے ہیں لیکن ایک سے گندگی دوسرے سے مشک حاصل ہوتا ہے ۔

۸۔ دو نے ہیں ایک ہی نہر کا پانی پیتے ہیں ایک خالی ہے دوسرا شکر سے پُر ہے ۔

تفسیر عالمانہ اِنْ کَادَ لَیُضِلُّنَا یہ اِن مخففہ از ثقیلہ ہے اور لیضلنا میں لام فارقہ ما بین النافیہ و المثقلہ ہے اور اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے (یعنی بیشک شان یہ ہے کہ) حضرت محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں بہکا دیں گے عَنْ اٰلِهَتِنَا ہمارے معبودوں سے، یعنی وہ ہمیں ہمارے معبودوں کی عبادت سے پھیر کر ان سے بالکل دور کر دیں گے یعنی قریب ہے کہ وہ اپنے میٹھے کلام اور اپنی دعوتِ اسلامی میں بہت جدوجہد کریں گے اور ہمیں ہمارے معبودوں کی پرستش سے روک دیں گے لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَیْهَا کیوں نہ ہم اپنے معبودوں کی پرستش پر ثابت قدم رہیں اور اسے مضبوطی سے پکڑیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا وَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ اور یقیناً معلوم کر لیں گے اگرچہ دیر سے سہی حِیْنَ یَرَوْنَ الْعَذَابَ جب اس عذاب کو دیکھیں گے جس کے وہ کفر کی وجہ سے مستحق ہیں، اسے قیامت میں تو کھلم کھلا دیکھیں گے۔ اور نمونہ کے طور پر انھیں بدر میں دکھایا گیا مَنْ اَضَلُّ سَبِیْلًا ٥ راستے کے لحاظ سے کون زیادہ گمراہ ہے۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ انہوں نے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو لیضلنا (گمراہ ہونے) کی طرف منسوب کیا اور ظاہر ہے کہ جو دوسرے کو گمراہ کرتا ہے وہ پہلے خود گمراہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا۔

ف: اللہ تعالیٰ انہیں مہلت دیتا ہے اسی لیے گمراہی کی رؤیت کو قیامت سے متعلق فرمایا۔ اور گمراہی کی نسبت راستہ کی طرف مجازی ہے کیونکہ گمراہ تو وہ ہوتے ہیں جو گمراہی کے راستہ پر چلتے ہیں (اور من اضل سبیلا جملہ استفہامیہ ہے جسے یعلمون سے معلق کیا گیا ہے اور وہ اس کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

اَرَءَیْتَ کیا تم نے نہیں دیکھا مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ جس نے اپنی خواہشات کو معبود بنا لیا ہے۔

تحقیق اَرَءَیْتَ یہ کلمہ کبھی اعلام کے لیے اور کبھی سوال کے لیے اور یہاں تعجب کے لیے ہے یعنی تم نے ان کے اس صفت سے موصوف ہونے سے تعجب نہیں کیا الٰهہ مفعول ثانی ہے اسے مفعول اول سے مقدم کرنا اس کے مہتم بالشان القبیح ہونے کی وجہ سے ہے اس لیے امر تعجب اس پر گھومتا ہے اور الهوٰی، هوٰہ کا مصدر ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی سے محبت اور اس کی خواہش نفسانی کرے پھر محبوب خواہش کردہ شے پر استعمال ہونے لگا وہ محبوب خواہش کردہ شے محمود ہو یا مذموم پھر عموماً غیر محمود استعمال ہونے لگا۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

فلان اتبع هوٰہ۔ ترجمہ: فلاں نے خواہش کی تابعداری کی۔

یہ کسی کی مذمت کے وقت بولا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ الهوی ہر اس شے پر استعمال ہوتا ہے جس کی طرف طبع کا میلان ہو اور محض شہوت کی بنا پر بغیر سند منقول و دلیل معقول کے جس کی نفس خواہش کرے۔

اب معنی یہ ہُوا کہ اے (محبوب) محمد (عربی صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ نے اس سے تعجب نہیں کیا جس نے خواہش نفسانی کو اپنے لیے معبود بنایا بایں طور کہ اس کی اطاعت کی اور اپنے دینی امر کی اسی پر بنا رکھی کہ وہ حجت و برہان کو سننے سے رُوگردانی کرتا ہے گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس سے تعجب نہیں کرتے ہو جس نے اپنی خواہش نفسانی کو معبود کے قایم مقام بنا لیا کہ اس کی اطاعت پر التزام کرتا اور اس کی مخالفت کو حرام سمجھتا ہے۔ یعنی اسے دیکھ کر تعجب کرو۔ یہ استفہام تقریر و تعجیب کا ہے۔

اعجوبۂ کفّار منقول ہے کہ عرب کی ایک قوم پتھروں کی پرستش کرتی تھی۔ جو بھی حسین پتھر دل کو اچھا لگتا اسی کی عبادت کرنے لگ جاتے، اس سے پہلے والے پتھروں کو پھینک دیتے تھے۔ حارث بن قیس اس قوم کا ایک فرد تھا، اس کا ایک پتھر کا بُت اونٹ سے گر کر گم ہوگیا۔ اعلان ہوا کہ اے قافلے والو! ٹھہرو، بُت اونٹ سے گر کر کہیں گم ہوگیا ہے جب تک مل نہ جائے آگے نہ بڑھو۔ تھوڑی دیر تک تلاش کے بعد جب پتھر کا بت نہ ملا، تو کسی نے آواز دی: گھبرائیے نہیں، مجھے اس سے حسین تر پتھر مل گیا ہے، اسے چھوڑیئے اب اسی کی پرستش کرتے رہیں گے

حدیث شریف میں ہے:
ما عبد اله ابغض علی اللہ من الھوٰی۔

(معبودانِ باطل میں سب سے مبغوض خواہشِ نفسانی ہے)

ف: جو نفس کی خواہش کے مطابق عبادت کرتا ہے وُہ غیر اللہ کا پرستار ہے۔ اسی طرح جو شریعت کے مطابق امور تو سرانجام دیتا ہے لیکن اس میں خواہشِ نفسانی کو دخل دیتا ہے تو وہ بھی حظوظِ نفسانیہ کا پرستار ہے اسے حقوقِ ربانیہ سے کوئی تعلق نہیں (کذا فی التاویلات النجمیہ)

ف: مُلّا کاشفی نے لکھا کہ صاحبِ تاویلات نے فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور شے سے محبّت کرتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اس سے باز آجائے ورنہ اس کی ہر عبادت غیر اللہ کی پرستش میں شمار ہوگی اس لیے کہ وہ عبادت کے غیر اللہ کی محبت میں مبتلا ہوگا۔

اعجوبۂ دُنیا سید حسینی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب آدم علیہ السلام کا نکاح بی بی حوّا علیہا السلام سے ہوا تو ابلیس کا عقد دنیا سے کیا گیا، جیسے آدم علیہ السلام کی نسل سے انسان پیدا ہُوئے شیطان سے بذریعہ دنیا ہوا و ہوس اور رسوم و عادات مردودہ اور مذاہب و ادیانِ باطلہ ظاہر ہوئے ؎

غبارے کہ خیزد میان رہ اوست
چہ گویم کہ ہر یوسفے را چہ اوست

(ترجمہ: وہ غبار کہ درمیان راہ سے اٹھتی ہے میں کیا عرض کروں کہ ہر یوسف (نیک نام) کے

آگے ہلاکت کا گڑھا ہے)

شہوتِ نفسانی کا غلبہ اور اسے یہ درجہ حاصل ہے کہ دُنیا میں سب سے پہلا غیر اللہ کی پرستش کردہ یعنی معبودِ باطل خواہشِ نفسانی ہے۔ اسی کی شان میں وارد ہے اور قرآن مجید اسی کے متعلق فرماتا ہے:

ارأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ۔ ترجمہ: کیا اسے دیکھا ہے جس نے خواہش کی تابعداری کی۔

خلاصہ یہ کہ غیر اللہ کی پرستش کا اصل معبودِ باطل خواہش نفسانی ہے باقی جملہ معبودانِ باطلہ اسی کی فرع ہیں اسی لئے مشائخ نے فرمایا کہ جو بھی خواہشِ نفسانی سے بچ گیا اسے ایمان کی حقیقت نصیب ہو گئی ؎

سر ز ہوی تافتن از سروریست

ترک ہوی قوتِ پیغمبریست [طرب المجالس]

(ترجمہ: خواہش نفسانی سے منہ موڑنا دین کی سرداری ہے اور خواہشِ نفسانی کا ترک پیغمبری قوت ہے)

ف: حضرت ابوسلیمان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو اپنے نفس کی خواہش کا اتباع کرتا ہے وہ اپنے آپ کو قتل کرتا ہے اس لیے کہ انسان کی حقیقی زندگی ذکر میں اور اس کی موت ذکر سے فراموشی اور غفلت سے ہے جو وہ غفلت کر کے خواہشات کا اتباع کرتا ہے۔ اور جب خواہشات کی اتباع کرتا ہے تو اہلِ اموات میں داخل ہو جاتا ہے۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ این جہان شہوتے بتخانہ ایست

انبیا و کافراں را لانہ ایست

۲ لیک شہوت بندۂ پاکاں بود

زر نسوزد زانکہ نقد کاں بود

۳ کافراں قلبند و پاکاں ہمچو زر

اندریں بوتہ درند ایں دو نفر

۴ قلب چوں آمد سیہ شد در زماں

زر در آمد شد زری او عیاں

ترجمہ: ۱۔ یہ جہان شہوت سے پُر اور بتخانہ ہے انبیاء علیہم السلام اور کافروں کیلئے امتحان گاہ ہے۔

۲۔ لیکن نیک لوگ شہوت سے پاک ہوتے ہیں سونا نہیں جلتا اس لئے کہ اصلی کان سے ہے۔

۳۔ کافر کھوٹ کی طرح ہیں اور نیک لوگ سونے کی طرح انھی دو مثالوں میں ہیں یہ دو گروہ۔

۴۔ سونے کا کھوٹ اسی وقت سیاہ ہوتا ہے تو سونا کھل کر صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔

حکایت کسی نے سمرقند کے ایک شیخ کامل سے سوال کیا کہ کسی نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو مُردہ دیکھا، اس کی تعبیر کیا ہے؟ اسی طرح کسی نے نبی علیہ السلام کو مُردہ دیکھا۔ اس شیخ نے فرمایا کہ اس شخص نے کسی شرعی معاملہ میں کوتاہی کی ہوگی، اور مرنا در اصل شریعت کا ہے جسے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جاری فرمایا: اس شخص کو حضورِ حق وحضوریِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نصیب تھی اب وہ کسی غلطی کے باعث اس حضوری سے محروم ہوگیا۔ اسی کو اسے موتِ الٰہی و نبوی میں دکھایا گیا۔

حضرت عارف مولانا نورالدین جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: اس کی تاویل آیۃ ارأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ سے ظاہر ہے۔ وہ اسی طرح ہے کہ اس شخص نے اپنی خواہشِ نفسانی کو معبود بنایا ہوا ہے اور خواہش نفسانی کی صورت مُردے کی ہے پھر اسے کسی کامل یا کسی عمل سے اس کے دل سے دُور کیا گیا، تو اس خواہش کا چلا جانا گویا اس کا مُردہ ہو جانا ہے۔ اس کی تعبیر کے بعد اس کی سچائی کی علامت یہ ہے کہ اس شخص کی حق کی حضوری میں اضافہ ہو۔ (کذا فی رشحات علی الصفی بن الحسین الکاشفی)

اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ کیا تم ہو عَلَيْهِ اس شخص پر جس نے خواہش نفسانی کو معبود بنایا وَكِيْلًا ۝ نگران جسے تم شرک ومعاصی سے بچاؤ اور وہ اسی حال پر قایم ہو۔ یعنی آپ اس کام کے لیے نہیں بھیجے گئے کہ انہیں معاصی وشرک سے بچاتے رہیں بلکہ آپ کو خوفِ حق دلانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور اس میں آپ کو روکا نہیں گیا کہ آپ انہیں دعوتِ اسلام بھی پیش نہ کریں۔ بلکہ آپ کو بتایا گیا کہ ان کے متعلق قضا وقدر میں ایسا ہو چکا ہے لیکن آپ انھیں بدستور حق کا ڈر سناتے رہیں۔

ف: بعض نے کہا کہ یہ آیت آیۃ السیف سے منسوخ ہے۔

اَمْ تَحْسَبُ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ کیا تمھیں گمان ہے کہ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ ان کے سامنے جو آیاتِ قرآنی پڑھی جاتی ہیں ان کے اکثر صحیح طور پر سُنتے ہیں اَوْ يَعْقِلُوْنَ یا قرآن مجید کے اندر کی نصائح ومواعظ اور وہ امور جو انہیں ان قبائح سے روکنے والے ہیں جو محاسن کے اسباب ہیں کو صحیح طور سمجھتے ہیں اسی لیے آپ ان کے متعلق اہتمام فرماتے اور ان کے ایمان کے لیے طمع رکھتے ہیں۔

ف: اکثر کی قید اس لیے ہے کہ ان کے بعض نے قرآن مجید کو صحیح معنے پر سُنا اور صحیح معنے پر سمجھا، لیکن تکبر اور بغاوت کے طور روگردانی کی یا انہیں خطرہ تھا کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے تو ہم سے جاہ وحشم چھن جائے گا۔

فائدہ صوفیانہ حضرت ابن عطا رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ گمان مت کرو کہ تم انھیں سُنا رہے ہو، ہاں تم انھیں سنا سکتے ہو جو ازل سے سُن چکے ہیں۔ ورنہ جو ازل سے محروم ہے اسے کتنی ہی حق کی باتیں سناؤ، اور دعوتِ حق کی کتنی ہی دلیلیں قایم کرو وہ نہیں سُنے گا۔ اور یہ جو آپ کی دعوت قبول کر رہے ہیں اور قرآن کو

صحیح معنے میں سنتے سمجھتے ہیں یہ وہ ہیں جنھوں نے ازل میں سُنا اور سمجھا اور قبول کیا۔ جو رُوگردانی اور غفلت کرتا ہے اس کے نصیب میں ازل سے محرومی تھی۔

اِنْ هُمْ نہیں ہیں یہ، یعنی آیاتِ قرآنی وغیرہ جو ان کے کانوں میں گونج رہی ہیں اور توجہ نہیں دیتے اور نہ ہی ان سے نفع پاتے ہیں اور نہ دلائل و معجزات کا مشاہدہ کرکے ان میں تدبر کرتے ہیں اِلَّا كَالْاَنْعَامِ مگر جانوروں کی طرح ہیں یعنی جیسے جانور غفلت میں ہیں اور کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ بھی ایسے ہی ہیں۔

ف : تاویلات نجمیہ میں ہے کہ یہ کھانے پینے اور حظوظِ نفسانیہ پورے کرنے کے ہیں، جیسے جانوروں کو کھانے پینے وغیرہ کے بغیر کام ہے۔

بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ بلکہ وہ راستہ پر چلنے کے لحاظ سے جانوروں سے زیادہ گمراہ ہیں اس لیے کہ وہ اپنے قائد (کھینچ کر لے جانے والے) کے سامنے سر جھکاتا اور اپنے محسن کی تمیز رکھتا ہے اور وہ صرف ان چیزوں کا متلاشی ہوتا ہے جو اسے نفع دیں اور جو چیزیں اسے نقصان دیں ان سے دُور بھاگتا ہے اور یہ اپنے رب تعالیٰ کے نافرمان اور اس کے احسان فراموش بلکہ اس کے دشمن شیطان کے زیرِ فرمان چلتے ہیں اور ثواب جو ان کے لیے بہت بڑے نفع سے دُور، اور عذاب و سزا جو ان کے لیے عظیم نقصان کے درپے رہتے ہیں اور جانوروں کو حق کے اعتقاد اور خیر و شر کے اکتساب کا پتا نہیں ہوتا اور یہ ان امور کے جاننے کے باوجود بے خبر رہتے ہیں اور جانوروں کی جہالت کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی اور ان کی جہالت ہزاروں فتنوں کے دروازے کھولتی ہے بلکہ اوروں کو بھی حق سے روکتی ہے اور جانوروں کو طلب کمال کی قدرت ہی نہیں دی گئی اسی لیے نہ ان کی تقصیر سمجھی جاتی ہے اور نہ ہی ان کی مذمت کی جاتی ہے اور انہیں قدرت حاصل ہے لیکن کوتاہی کرتے ہیں اسی لیے یہ سخت سے سخت تر عذاب کے مستحق ہیں۔

نکتہ : اللہ تعالیٰ نے ملائکہ میں صرف عقل پیدا فرمائی اور جانوروں میں صرف شہوت، اور انسان میں عقل اور شہوت دونوں پیدا کیے گئے جس پر شہوت کا غلبہ ہُوا اور عقل مغلوب، تو وہ جانوروں سے بدتر ٹھہرا۔ کما قال :

بل هم اضل سبيلا۔ ترجمہ: بلکہ وہ راستہ سے بہت زیادہ بھٹکنے والے ہیں۔

اسی لیے اپنے دونوں قدموں یعنی عقل مغلوب اور شہوت غالب سے درکِ اسفل کی طرف منتقل کیا جاتا ہے اور وہ ایسے نچلے درک میں پہنچتا ہے جہاں جانوروں کا پہنچنا بہت کم ہے اس لیے کہ انسان دو قدموں (عقل مغلوب اور شہوت غالب) سے چل کر گیا اور جانور صرف شہوت سے چلے گا۔ فلہذا اسے اضل سبیلا سے تعبیر کیا گیا۔ یعنی جس کی عقل شہوت پر غالب ہوئی وہ بمنزلہ ملائکہ ہو گیا، اس لیے کہ جیسے وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے پاک ہو گیا۔ اور جو شخص اپنے معاملات پر قابو پالیتا ہے وہ ملائکہ سے افضل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اولئك هم خير البرية۔ ترجمہ: وہی تمام مخلوق سے بہتر ہیں۔

چنانچہ مثنوی شریف میں ہے :-

۱	درحدیث آمد کہ یزداں مجید	خلق عالم را سہ گونہ آفرید
۲	یک گروہ را جملہ عقل و علم و جود	آں فرشتہ است او نداند جز سجود
۳	نیست اندر عنصرش حرص و ہوا	نور مطلق زندہ از عشق خدا
۴	یک گروہ دیگر از دانش تہی	ہمچو حیوان از علف در فربہی
۵	او نبیند جز کہ اصطبل و علف	از شقاوت غافلست واز شرف
۶	ایں سوم ہست آدمی زاد و بشر	از فرشتہ نیمی و نیمی ز خر
۷	نیم خر خود مائل سفلی بود	نیم دیگر مائل علوی بود
۸	آں دو قسم آسودہ از جنگ و خراب	ویں بشر باد و مخالف در عذاب
۹	وایں بشر ہم زامتحان قسمت شدند	آدمی شکلند و سہ امت شدند
۱۰	یک گروہ مستغرق مطلق شدست	ہمچو عیسی با ملک ملحق شدست
۱۱	نقش آدم لیک معنی جبرئیل	رستہ از خشم و ہوا و قال و قیل
۱۲	قسم دیگر با خراں ملحق شدند	خشم محض و شہوت مطلق شدند
۱۳	وصف جبریلی در ایشاں بود رفت	تنگ بود آں خانہ و آں وصف رفت
۱۴	نام "کالانعام" کرد آں قوم را	زانکہ نسبت کو بیقظہ نوم را
۱۵	روح حیوانی ندارد غیر نوم	حسہائے منعکس دارند قوم
۱۶	ماند یک قسمی دگر اندر جہاد	نیم حیوان نیم حی بارشاد
۱۷	روز و شب در جنگ واندر کش مکش	کردہ چالیش آخرش با اولش

ترجمہ: ۱۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق تین طرح کی پیدا فرمائی۔

۲۔ ایک تو وہ ہے جو سراپا عقل و علم موجود ہے۔ وہ فرشتے ہیں جو سجدہ کرنے کے سوا کچھ نہیں جانتے۔

۳۔ ان کے عنصر میں حرص و ہوا ہے نہیں نور مطلق ہیں عشقِ خدا سے زندہ ہیں۔

۴۔ دوسرا گروہ ہے جو دانش سے بالکل فارغ ہیں جیسے حیوان کہ وہ گھاس کھا کر موٹے ہیں۔

۵۔ انھیں اصطبل اور گھاس کے سوا کسی شئے سے غرض نہیں نہ انھیں شقاوت کا علم نہ شرافت کا۔

۶۔ تیسرا گروہ آدم زادوں کا ہے جو فرشتوں کی طرح بھی اور گدھوں کی طرح بھی۔

۷۔ گدھے کی طرح سفل کی طرف قائل ہیں اور ملائکہ کی طرح علو کی طرف بھی مائل ہوں۔

۸۔ پہلے دو گروہ جنگ اور دیگر خرابیوں سے آسودہ ہیں اور یہ انسان دو مخالف وجوہ سے دوزخ میں ہے۔

۹۔ پھر انسان کا امتحان کی وجہ سے تقسیم ہوئی۔ وہ آدمی کی شکل میں ہیں لیکن دراصل تین قسم ہیں۔

۱۰۔ ایک گروہ مطلق مستغرق ہے عیسیٰ علیہ السلام کی طرح فرشتوں سے جا ملے۔

۱۱۔ بظاہر آدمی ہیں درحقیقت وہ فرشتے ہیں وہ غصہ اور شہوت اور قیل وقال سے چھٹکارا پاچکے ہیں۔

۱۲۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو گدھوں سے جاملے ہیں ان میں غصہ و شہوت بھرپور ہے۔

۱۳۔ ان میں ملکی صفت تو تھی لیکن اب ان سے نکل گئی کیونکہ انکا اندرونی حال تنگ تھا اسکےلئے وہ وصف نکل گیا۔

۱۴۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو جانوروں جیسا کہا ہے اسکے لئے کہ یہ بہ نسبت بیداری کی نیندیں زیادہ ہیں۔

۱۵۔ کیونکہ روح حیوانی نیند میں ہے ایسے لوگ ہمیشہ حس الٹی رکھتے ہیں۔

۱۶۔ ایک گروہ اور ہے جو ہمیشہ جہاد میں ہے وہ حیوان بھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ رہبری سے سرشار ہے۔

۱۷۔ روز و شب جنگ اور کشمکش میں ہیں ان کے آخری حالات کو اول سے ملادیا گیا ہے۔

سبق : عاقل پر لازم ہے کہ افعالِ حیوانیہ سے احتراز کرے اس لیے کہ وہ صوری و معنوی جاہ و جلال کے زوال کا سبب ہے۔ برامکہ سے پوچھا گیا کہ تمہاری دولت کے زوال کا سبب کون سا عمل ہوا؟ انہوں نے کہا

زوالِ دولت کا سبب صبح کی نیند اور شام کو خورد و نوش کی مصروفیت۔

ف : (صاحبِ روح البیان نے فرمایا کہ) صبح کی نماز کے بعد میں سو رہا تھا کہ مجھے کہا گیا کون ہے جو صبح کی نیند نہیں چھوڑتا! اس کا مطلب یہ تھا کہ جو مطلقاً راحتِ ظاہرہ کو نہیں چھوڑتا اور حیوانوں کی طرح آرام طلبی میں وقت بسر کرتا ہے تو وہ غفلت سے خلاص نہیں پائے گا۔

نتیجہ نکلا کہ خلاص کا دارومدار ترکِ راحت اور مخالفتِ نفس و طبیعت کی راہ پہ چلنے میں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا ۝
ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا ۝ وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّ النَّوْمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ
النَّهَارَ نُشُوْرًا ۝ وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً طَهُوْرًا ۝ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّ نُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَاۤ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِیَّ كَثِیْرًا ۝ وَ لَقَدْ
صَرَّفْنٰهُ بَیْنَهُمْ لِیَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝ وَ لَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ
نَّذِیْرًا ۝ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِیْرًا ۝ وَ هُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ
هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَ جَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝ وَ هُوَ
الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا ؕ وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا ۝ وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُهُمْ وَ لَا یَضُرُّهُمْ ؕ وَ كَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِیْرًا ۝ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا
وَّ نَذِیْرًا ۝ قُلْ مَاۤ اَسْــٴَـلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِیْلًا ۝
وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَ كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِیْرًا ۚۛ ۝ الَّذِیْ
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚۛ اَلرَّحْمٰنُ فَسْــٴَـلْ
بِهٖ خَبِیْرًا ۝ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا
تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا ۝

ترجمہ: اے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا تم نے اپنے رب کو نہیں دیکھا کہ اس نے سایہ کو کیسے پھیلایا۔ اور اگر وہ چاہتا تو وہ اسے ٹھہرا ہوا کر دیتا پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا پھر ہم نے اسے آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیا اور وہی ہے جس نے رات کو تمہارے لیے پردہ اور نیند کو آرام اور دن کو اُٹھنے کا وقت بنایا اور وہی ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا اپنی بارانِ رحمت کے آگے مژدہ سُناتی ہوئی۔ اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی نازل کیا تاکہ اس کے ذریعے کسی ویران شہر کو آباد کریں اور اسے اپنے پیدا کردہ بہت سے جانوروں اور آدمیوں کو پلائیں اور ہم نے اسے ان کے درمیان بانٹ دیا تاکہ وہ غور کریں تو بہت سے لوگوں نے نہ مانا مگر ناشکر کرنا اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ڈر سنانے والا بھیج دیتے سو کافروں کی بات نہ مان اور قرآن سے ان کے ساتھ بہت بڑا جہاد کر اور وہی ہے جس نے دو دریاؤں کو ملایا ان میں یہ میٹھا ہے نہایت شیریں اور یہ کھاری ہے نہایت کڑوا اور ان کے درمیان میں حجاب اور آڑ مضبوط رکھی اور وہی ہے جس نے پانی سے بشر بنایا پھر اس کے رشتے اور سسرال مقرر کر دئے اور تمہارا رب

قادر ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا ایسے بتوں کو پُوجتے ہیں جو نہ انھیں نفع دے سکیں اور نہ نقصان پہنچا سکیں اور کافر اپنے رب کے بالمقابل شیطان کا امدادی ہے اور ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر خوشخبری اور ڈر سنانے والا، فرمایئے میں اس پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا مگر جو چاہے اپنے رب کی طرف راہ بنا لے اور توکل کرو اس زندہ پر جو نہیں مرے گا اور اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجئے اور وہی کافی ہے اپنے بندوں کے گناہوں پر خبردار، جس نے آسمان اور زمین جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں بنائے پھر اپنی شان کے لائق عرش پر استوا فرمایا، وُہ رحمان ہے اس کے متعلق کسی باخبر سے پُوچھیے، اور جب انہیں کہا جائے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں رحمٰن کیا ہے کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کا تم حکم دیتے ہو اور انہیں اس حکم نے اور نفرت میں بڑھایا۔

تفسیر عالمانہ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور ہمزہ تقریر کا ہے۔ اور رؤیت سے آنکھوں کا حقیقی دیکھنا مراد ہے۔ اس لیے دیکھی ہوئی شے کے لیے ضروری ہے کہ آنکھ کا اس سے تعلق ہو۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ اے محبوب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ نے اپنے رب تعالیٰ کی عجیب و غریب مصنوعات کو نہیں دیکھا کَیْفَ منصوب ہے اس کا ناصب مَدَّ الظِّلَّ ہے۔

حلِ لغات: المد بمعنے الجز، یعنی المدۃ سے ہے۔ یعنی وُہ مدّت جو ممتد وقت کے لیے ہو، اور ظل (سایہ) ہر اس روشن چیز سے حاصل ہوتا ہے جس کی روشنی ذاتی ہو جیسے سورج یا عرضی جیسے چاند۔

المفردات میں ہے کہ الظل، الضح (بالکس) کی نقیض ہے۔ الضح بمعنے سورج اور اس کی روشنی (کما فی القاموس) اور وہ الفئ سے عام ہے اسی لیے ظل اللیل و ظل الجنۃ کہا جاتا ہے۔ اور جہاں سورج کی روشنی نہ پہنچے اسے بھی ظل سے تعبیر کیا جاسکتا ہے لیکن فئ کا اطلاق زوالِ شمس کے بعد ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ پہلے سورج سایہ کو تھوڑا تھوڑا کرکے زائل کرتا ہے زوال تک یہی صورت رہتی ہے زوال کے بعد سایہ سورج کی روشنی کو کاٹنا شروع کردیتا ہے یہاں تک کہ سورج کی روشنی ختم ہوجاتی ہے اور یہ سلسلہ سورج کے زوال سے شروع ہوکر غروب تک جاری رہتا ہے یعنی وُہ ظل جو سورج کی روشنی کا ناسخ ہوتا ہے اسے فئ سے تعبیر کیا جاتا ہے اس لیے کہ الفئ بمعنے الرجوع اور اس لیے بھی کہ مشرق سے مغرب کی طرف رجوع کرتا ہے یعنی زوال سے غروب کو پہنچتا ہے اور الظل کا تعلق صرف زوال تک رہتا ہے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے سایہ کو پیدا فرمایا پہاڑوں اور مکانوں اور درختوں سے جب سُورج طلوع کرکے آگے کو بڑھتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت کا بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ جملہ امور حادثہ میں اس کی حکمت کو بالذات نسبت ہے اسے درمیان میں کسی سبب کی محتاجی نہیں ہر شے میں بالذات وہی خود مؤثر ہے البتہ اسباب وعلل اس کی قدرت کی دلیلیں ہیں۔

وَلَوْ شَآءَ اور تیرا رب تعالیٰ اسی سایہ کو ساکن کرنا چاہے لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا تو اسے ساکن بنا سکتا ہے۔ یعنی شے اپنے طول و امتداد میں ثابت اور مقیم ہو۔ یسکن بلد کذا یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی شہر میں ساکن اور مقیم ہو۔ دو معطوفوں کے درمیان یہ جملہ معترضہ ہے اور تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنی مشیّت و حکمت سے اشیاء میں تاثیر پیدا کرتا ہے اسباب عادیہ کو درمیان میں دخل نہیں ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۙ اس کا عطف مدّ پر ہے یعنی یہ بھی اسی کے حکم میں ہے اور دلیلاً بجائے دالاً اس لیے کہ اس سے ضوء شمس مراد ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ ہم نے سورج کو ایک ایسی علامت بنایا ہے جو اس کے تغیر احوال سے سایہ کا پتا چلتا ہے اس میں کسی خارجی سبب کی بھی ضرورت نہیں اور نہ ہی کسی غیر کی تاثیر کی ضرورت ہے جیسا کہ جملہ معترضہ سے معلوم ہوتا ہے۔

ف : صیغۂ غائب کے بعد صیغہ جمع متکلم لانے میں اشارہ ہے کہ واقعی ان امور میں خارجی تاثیر کو کسی قسم کا تعلق نہیں، اور پھر اتنا بڑا کام ایک ذات سے سرانجام ہو رہا ہے تو یہ اس کی عظیم قدرت کی دلیل ہے۔ اس معنے پر صیغہ جمع عظمت و حکمت پر دلالت کرنے کے لیے لایا گیا ہے اور یہی راز ہے لفظ ثمّ کے لانے کا، ورنہ یہاں تاخیر زمانی تو نہیں ہو سکتی۔

ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اس کا عطف بھی مدّ پر ہے اور یہ بھی اسی کے حکم میں داخل ہے اور یہ ثمّ زمانی تراخی کے لیے ہے یعنی ہم نے اسے زائل کیا بعد اس کے کہ ہم نے اسے دراز کرکے پیدا کیا پھر اسے ہم نے مٹایا یہ محض ہماری قدرت اور مشیّت سے ہوا ہے جبکہ سورج اپنی شعاعوں کو معمول کے مطابق پھیلاتا ہے۔ اس میں کسی خارجی تاثیر کو کوئی دخل نہیں۔ یہاں پر اسے قبض سے اشارہ ہے کہ گویا وہ ایک بکھری ہوئی شے کی طرح ہے جسے سمیٹ لیا گیا ایسے ہی اس کی پیدائش کو احداث سے تعبیر فرمایا ہے یہ بھی اس کے بکھرنے کی طرف اشارہ کرنا مطلوب تھا ورنہ دونوں میں اصلی مقصد تخلیق ہے۔ اِلَيْنَا اس میں تصریح ہے کہ جملہ امور کا مرجع ذات باری تعالیٰ ہے جیسے ہر شے کا حدوث اسی سے ہے تو اسی طرح رجوع بھی اسی کی طرف ہے قَبْضًا يَّسِيْرًا ۝ سمیٹنا تھوڑا تھوڑا کرکے، یعنی جونہی سورج اوپر چڑھتا جائے گا سایہ گھٹتا جائے گا، اس لیے کہ سورج سایہ کے گھٹنے اور بڑھنے کی دلیل ہے۔ یعنی سورج جب بلند ہوگا تو مغرب کی جانب سے سایہ گھٹ جائے گا اور یہ کیفیت آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ اور اگر یکبارگی سایہ کو سمیٹ لیا جاتا تو سایہ اور دھوپ سے جو منافع مطلوب ہیں وہ سب کے سب بیکار ہو جاتے اسی لیے سایہ کو بتدریج سمیٹا گیا تاکہ انسان سایہ اور دھوپ سے منافع حاصل کر سکے (کذا قال مولانا ابو السعود فی تفسیرہ) اور دوسرے مفسرین نے فرمایا کہ مدّ بمعنے بسط ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے طلوعِ فجر و طلوعِ شمس کے درمیان سایہ کو بسیط فرمایا۔ اس لیے کہ اس وقت دھوپ نہیں ہوتی اور روشنی تو ہوتی ہے لیکن سایہ تمام روئے زمین پر پھیلا ہوتا ہے سمٹنا اس وقت شروع ہوتا ہے جب سورج طلوع ہوتا ہے۔ اور یہی وقت نہایت خوشگوار ہوتا ہے اس لیے کہ اندھیرا طبیعت میں گھبراہٹ پیدا کرتا ہے اور آنکھوں کو بھی کوئی شے اچھی طرح نظر نہیں آتی۔ اسی طرح جب سورج

طلوع ہوتا ہے تو روشنی آسمانی خلا پہ حائل ہوجاتی ہے اور سورج کی تیز روشنی آنکھوں کی بینائی کے لیے مُضر ہے لیکن طلوعِ فجر اور طلوعِ شمس کے درمیانی وقت میں ان دونوں میں کوئی نہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بہشت کو ایسے سایہ سے موصوف فرمایا۔ کما قال؛

وظل ممدود۔ ترجمہ: اور سایہ دراز۔

اس لیے بعض بزرگوں نے اس وقت کو بہشت کی گھڑیوں سے تشبیہ دی ہے صرف فرق اتنا ہے کہ بہشت کی ساعات منور ترین ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ظل ضوٗ خالص وظلمت خالصہ کی درمیانی شے کو کہا جاتا ہے۔

ولو شاء لجعله ساکناً اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اسے ہمیشہ ساکن بناتا کہ اس پر کسی جگہ سے دھوپ نہ پڑتی۔ اسی کا نام ہے سایہ کا استقرار۔ یعنی سُورج اس پر دھوپ ڈال کر زائل نہ کرتا۔ مثلاً نہ سورج منقبض ہوتا نہ منسبط بایں طور کہ وُہ ایک جگہ پر ٹھہرا رہتا۔ اسی کو سکون یعنی عدم الاستقرار کہا جاتا ہے۔ ثم جعلنا الشمس علیہ دلیلا پھر ہم نے سورج کو سایہ کی علامت بنایا اس لیے کہ اگر سورج نہ ہوتا تو سایہ بھی نہ ہوتا اس لیے کہ یہ آپس میں لازم و ملزوم ہیں جیسے نور نہ ہو تو ظلمت نہیں۔ ایسے ہی تمام اضداد کو سمجھئے۔ یہی معنی یعنی تعمیم الظل کا مفہوم زیادہ موزوں ہے لیکن یہ معنی حضرت مولانا ابوالسعود کو ناپسند ہیں، اس لیے کہ جو معنیٰ ہم نے بیان کیا ہے وہ اگرچہ درحقیقت افق شرقی کا سایہ ہے۔ لیکن وہ غیر معہود ہے۔ کیونکہ متعارف میں ہے کہ سایہ ایک مخصوص حالت کا نام ہے جس کا عوام مشاہدہ کرتے ہیں وہ ایک ایسی جگہ پڑتا ہے جو اس کے اور سورج کے درمیان ایک جسم کثیف کا ہونا ضروری ہے[1]

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس

عین المعانی میں لکھا ہے کہ مدالظل اسی زمانۂ فترت کی طرف اشارہ ہے جس زمانہ میں کوئی نبی علیہ السّلام نہیں تھا اس دَور میں لوگ سخت متحیّر تھے کہ اچانک سرورِ عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلّم جلوہ گر ہوئے اگر وہ سایہ (یعنی دورِ فترت) دائمی رہتا تو مخلوق ہمیشہ اندھیرے میں پڑی رہتی ؎

گر نہ خورشید جمال یار گشتی رہنموں

از شبِ تاریک غفلت کس نبردے رہ بروں

(ترجمہ: اگر جمالِ محبوب کا سورج طلوع نہ ہوتا تو اس شبِ تاریک سے کسی کو بھی رہبری نصیب نہ ہوتی)

---

[1] اسی وجہ سے ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سایہ نہیں تھا کہ آپ کا جسمِ اطہر کثیف نہیں، بلکہ لطیف ترین تھا۔ اویسی غفرلہٗ

شانِ نزول اور معجزۂ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم

صاحبِ کشف الاسرار نے لکھا کہ یہ آیت ایک معجزہ ہے جو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ظاہر ہوا۔ جسے اہلِ حقیقت سمجھتے ہیں کہ یہی قرب و کرامت کی علامت ہے جو صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیب ہوئی۔ معجزہ کا بیان یوں ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اثنائے سفر میں قیلولہ کے ارادے سے ایک درخت کے نیچے آرام فرما ہوئے لیکن درخت کا سایہ کافی نہ ہوا۔ اس لیے کہ آپ کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک کثیر تعداد تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر درخت کا سایہ دراز کردیا، یہاں تک کہ تمام لشکر اسی سایہ کے نیچے آرام فرما ہوا۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت وکرامت کو بھی ظاہر فرمادیا۔ کما قال:

الم تر الی ربّك كيف مدّ الظّل ۔ ترجمہ: کیا اپنے ربّ کو نہیں دیکھا کہ کیسے سایہ کو دراز کیا۔

نکتہ موسیٰ علیہ السلام نے جب عرض کی: ارنی، تو انہیں جواب ملا: لن ترانی۔ لیکن یہاں بغیر طلب کے کہا: الم ترَ، یعنی اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! جب آپ مجھے دیکھتے اور میرے دیدار سے سرشار رہیں تو پھر آپ کو اور کیا چاہیے! ؎

فرقست میان آنکہ یارش در بر
با آنکہ دو چشم انتظارش بر در

(ترجمہ: ان دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے ایک کا محبوب بغل میں ہے اور دوسرا دروازے پر محبوب کے انتظار میں ہے)

مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ مرغ بر بالا پران و سیاہ اش
می دود بر خاک و پران مرغ وش

۲ ابلہی صیّاد آن سایہ شود
می دود چندانکہ بے مایہ شود

۳ بے خبر کان عکس آن مرغ ہوا ست
بے خبر کہ اصل آن سایہ کجا ست

۴ تیر اندازد بسوے سایہ او
ترکشش خالی شود از جست و جو

۵ ترکش عمرش تہی شد عمر رفت
از دویدن در شکار سایہ تفت

۶ سایۂ یزدان چو باشد دایہ اش
وارہاند از خیال و سایہ اش

۷ سایۂ یزدان بود بندۂ خدا
مردۂ این عالم و زندہ خدا

۸ دامن او گیر زو تر بے گمان
تا رہی در دامن آخر زمان

۹ "کیف مد الظل" نقش اولیا ست
کاو دلیل نور خورشید خدا ست

۱۰ اندر این وادی مرو بے این دلیل
"لا احب الآفلین" گو چون خلیل

۱۱ رو ز سیاہ آفتابے را بیاب
دامن شہ شمس تبریزی بتاب

(ترجمہ : ۱۔ پرندہ اوپر اڑتا ہے لیکن اس کا سایہ زمین پر اسی طرح دوڑتا ہے جیسے مرغ اوپر اڑتا ہے۔

۲۔ بیوقوف ہے وہ جو اس سایہ کا شکاری ہے بے سود اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔

۳۔ اسے خبر نہیں کہ یہ تو اس ہوا پر اڑنے والے پرندے کا سایہ ہے اس سے وہ بے خبر ہے کہ اسکا اصل کہاں ہے؟

۴۔ اس کے سایہ کی طرف تیر پھینکتا ہے جستجو سے اس کی ترکش خالی ہو جاتی ہے۔

۵۔ اسکی عمر کی ترکش خالی ہوگئی اور عمر ختم ہو شکار کے سایہ کے پیچھے دوڑنے میں۔

۶۔ ہاں سایہ یزداں اگر اسکی پرورش کنندہ ہو جائے تو پھر وہ خیال و سایہ سے نجات پالے گا۔

۷۔ بندۂ خدا سایۂ یزداں ہے۔ یہ جہان مردہ ہے اور زندہ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

۸۔ اس کا دامن جلدی پکڑ پھر یقیناً تو زندگی پھر اسکے دامن رکھکر نجات پائیگا۔

۹۔ کیف مد الظل نقش اولیا ہے اسلئے کہ وہ نور خدا کے آفتاب کی دلیل ہے۔

۱۰۔ اس وادی میں رہبر کے بغیر نہ جا خلیل علیہ السلام کی طرح کہہ۔

۱۱۔ سایہ کو چھوڑ سورج کو تلاش کر شہ شمس تبریزی کا دامن حاصل کر۔

تفسیر صوفیانہ المصطلحات میں ہے کہ الظل سے وجودِ اضافی مراد ہے جو اعیانِ ممکنہ کے تعینات سے ظاہر ہوا اور ان کے احکام یہ ہیں کہ وُہ تعینات معدوم تھے پھر اللہ تعالیٰ کے اسم نور سے وجود خارجی میں ظاہر ہُوئے۔ یہی وجود خارجی انہی تعینات کی طرف منسوب ہے۔ ان تعینات کی ظلمت عدمیۃ اُس نور سے جو اپنی ظاہری صورتوں میں ہُوا چُھپ جاتے ہیں۔ ظہور نور کی وجہ سے یہ ظل ظاہر ہو جاتا ہے ورنہ فی نفسہٖ وہ معدوم ہے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا الم تر الیٰ ربك كيف مدّ الظل کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب تعالیٰ نے ممکنات پر وجود اضافی کو کیسے ظاہر فرمایا، اسی نور کے مقابلہ میں یہ ظلمت عدم ہے جہاں بھی ظلمت استعمال ہوگی وہاں یہی عدم نور مراد ہوگا، یعنی وُہ عدم جس کی شان یہ ہے کہ وہ منوّر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور (الأیۃ)

اللہ مومنوں کا ولی ہے وہ انہیں ظلمات سے نُور کی طرف نکالتا ہے۔

اور وہ کامل ولی جسے حضرۃ واحدیہ کا تحقق نصیب ہے اور سلطان عادل کو ظل اللہ کہا جاتا ہے یعنی حقیقتِ الٰہیہ جامعہ کا ظل۔ انسانِ کامل جسے سلطانِ اعظم کہا جائے، کا راز یہی ہے وہی الجامعیۃ والاحاطۃ کا مظہر ہے۔

تفسیر عالمانہ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا اور اللہ تعالیٰ وُہ ہے جس نے تمہارے لیے رات کو لباس کی طرح بنایا جیسے لباس انسان کو چھپا لیتا ہے ایسے ہی رات انسان کو اپنی اندھیری میں اپنے اندر چھپا لیتی ہے رات کی اندھیری کو لباس سے مشابہت صرف چھپانے کی وجہ سے ہے۔

حلِ لغات : اللبس بمعنے سترالشئ (کسی شے کو چھپانا) اور اللباس اس شے کا نام ہے جو انسان کے قبیح حصّے کو چھپا لے اور عورت و مرد کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا۔ کما قال :

ھن لباس لکم وانتم لباس لھن (وُہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا)

وہ بھی اس لیے کہ ایک دوسرے کو بُرائی سے بچانے سے روکتے ہیں، اور تقویٰ کو لباس کہا گیا۔ کما قال :

ولباس التقوٰی۔ ترجمہ : اور تقوی کا لباس۔

اس میں بھی تمثیل و تشبیہ ہے۔

سوال : جب رات کو انسان کا لباس کہا گیا تو پھر رات کو نماز پڑھنے میں لباس کی ضرورت نہ ہو، حالانکہ یہ غلط ہے۔

جواب : نماز کے حقوق کی ادائیگی کے لیے ظلمۃ اللیل کافی نہیں بلکہ اس کے لیے علٰحدہ لباس ضروری ہے اندھیرے میں نماز پڑھی جائے یا اُجالے میں۔

وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا اور نیند کو آرام بنایا۔ النوم چڑھنے والے بخار کے رطوبات سے دماغ کے اعصاب کا ڈھیلا ہونا۔ السبت بمعنے قطع العمل۔ یوم سبتھم یعنی یوم قطعھم للعمل۔ ہفتہ کے دن کو بھی اسی لیے اس نام سے موسوم کیا گیا کہ اسی دن ان کا کام منقطع ہو جاتا ہے یا اس لیے کہ ہفتہ بھر کے ایّام اسی پر ختم ہوئے۔ چنانچہ مروی ہے

کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق کا آغاز اتوار کے دن شروع فرما کر چھ دنوں میں مکمل کر دیا، اور ہفتہ کا دن خالی رہ گیا (کذا فی المفردات)

اب معنیٰ یہ ہُوا کہ عموماً رات کے وقت جو نیند کی جاتی ہے اس میں تمام کاروبار منقطع ہو جاتے ہیں۔ یعنی وُہ کاروبار جو حالتِ بیداری میں انجام پاتے ہیں وہ رات کے وقت منقطع ہوجاتے ہیں۔ یا چُونکہ نوم ایک قسم کی موت ہے اسی لیے اسے سبات سے تعبیر کیا گیا، سبات بمعنے منقطع ہونا، اور موت بھی ہر قسم کے تعلقات منقطع کر دیتی ہے اور چونکہ انقطاعِ حیات میں ان دونوں کو آپس میں مشابہت ہے اس لیے اسے سبات سے تعبیر کیا گیا۔ اسی معنے پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وھو الذی یتوفاکم باللیل۔ ترجمہ: اور وہ اللہ جو تمہیں رات میں فوت کرتا ہے۔

اس سے ثابت ہُوا کہ نیند اور موت ایک شئے ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ موت میں روح کی روشنی جسم کے ظاہر و باطن سے بالکل خارج ہوجاتی ہے اور نوم (نیند) میں انقطاع ناقص ہوتا ہے۔ یعنی نیند میں روح کی روشنی بظاہر تو منقطع ہوجاتی ہے لیکن بباطن باقی رہتی ہے۔ اسی اعتبار سے میّت کو مسبوت کہا گیا کہ اس سے حیات کا انقطاع ہوجاتا ہے۔ وُہ مریض جس پر بیہوشی طاری ہو اسے بھی مسبوت کہتے ہیں اس لیے کہ اس سے عقل و تمیز زائل ہوجاتی ہے چنانچہ اسلام کی بعض کتب کی عبارات میں ہے:

مثل المبطون والمفلوج والمسبوت۔ (جیسے مبطون جو پیٹ کی بیماری میں مبتلا ہو اور مفلوج جس پر فالج کا حملہ ہو اور مسبوت بمعنے بیہوش)

مسئلہ: ایسے اہلِ اموات کو دیر سے دفنایا جائے یہاں تک کہ ان پر ایک دن اور ایک رات گزر جائے تاکہ ان کی موت کا یقین ہوجائے۔

وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ○ اور بنایا دن کو ایسا وقت کہ اس میں روشنی منتشر ہو۔

مسئلہ: النہار شریعت پاک میں ما بین طلوع الفجر الیٰ غروب الشمس کو کہا جاتا ہے۔ عموماً اس کا اطلاق طلوع الشمس الیٰ غروب الشمس پر ہوتا ہے۔

النشور یا الانتشار سے ہے بمعنے ذو نشور۔ یعنی بنایا دن کو صاحب نشور بایں معنی کہ لوگ اس میں منتشر ہوتے ہیں طلبِ رزق و معاش کے لیے۔ کما قال:

لتسکنوا فیہ و لتبتغوا من فضلہ ﴿ تاکہ تم اس میں سکون کرسکو اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرسکو۔

یا نشور، نشر المیت سے ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب مُردہ زندہ ہوکر لوٹے اور نہار کو اسی نیند سے اٹھنے کی جاگ مقرر فرمایا اور نیند موتیٰ کے قیامت میں اُٹھنے کی طرح ہے۔ یہاں مضاف محذوف ہے اور مضاف الیہ کو مضاف کے قائم مقام کھڑا کیا گیا ہے۔ اس میں مبالغہ مقصود ہے۔ خلاصہ یہ کہ نوم و یقظہ میں موت و نشور کی طرف

اشارہ ہے۔ اسی لیے حضرت لقمان علیہ السلام نے فرمایا: "بیٹا! جیسے نیند کے بعد جاگ اُٹھتے ہو ایسے مرو گے پھر قیامت پہ اُٹھو گے"۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

نوم ما چوں شد اخ الموت اے فلاں
زیں برادر آں برادر را بداں

(ترجمہ: ہماری نیند موت کی بہن سمجھئے، یہ دونوں آپس میں بہن بھائی ہیں)

مسئلہ: آیت سے بقدرِ ضرورت نیند کی اجازت دی گئی ہے۔ ضرورت سے بدن کی سُستی مراد ہے، اور مجاہدات سے بدن تھک جاتا ہے، دراصل نیند سے ظاہری حواس بند ہو جاتے ہیں اور قلب کے حواس کھل جاتے ہیں۔

دنیا کا مسافر نیند میں ایک راز یہ ہے کہ انسان کا روح قدسی یا لطیفہ ربانیہ یا نفس ناطقہ اسی جسم سفلی میں مسافر ہے اور وہ اسی جسم کی اصلاح اور اس کے منافع کی تحصیل اور اس کے نقصانات کو دفع کرنے کے لیے دنیا میں آکر اسی جسم میں مقید ہے جب تک انسان جاگتا رہتا ہے وہ رُوح مقید رہتی ہے۔ جب انسان نیند کرتا ہے تو رُوح اپنے اصلی مکان اور معدن ذاتی کی طرف جا کر ارواح و معرفت معانی کو دیکھ کر راحت پاتی ہے اور ان غیوب کو دیکھتی ہے جو عالمِ ملکوت میں معانی موجود ہیں وہ عالمِ شہادت میں صورِ مثالیہ میں دیکھتی ہے۔ تعبیر رُؤیا میں بھی یہی راز ہے جب کوئی مجاہد ربانی نیند نہیں کرتا تو اس کے ارکان اربعہ مٹی، ہوا، نار، پانی پگھل جاتے ہیں اس طرح سے اس کا دل عوارض ظاہری سے خالی ہو جاتا ہے۔ پھر چونکہ اس وقت حجابات ہٹ جاتے ہیں، بنا بریں وُہ اپنے دل کی آنکھ سے عالمِ ملکوت کا مشاہدہ کرتا ہے اسی لیے اسے رب تعالیٰ کے وصال کا اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر خوش قسمتی سے بارہا خواب میں دیدار الٰہی سے مشرف ہوتا ہے۔

حکایت شاہ شجاع رحمہ اللہ تعالیٰ نے تیس سال مسلسل نیند نہ کی ایک رات ان کی اچانک آنکھ لگ گئی تو انھوں نے خواب میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا اس کے بعد جہاں بیٹھے ہوتے سو جاتے۔ آپ سے وجہ پُوچھی گئی تو آپ نے اس کا جواب دیا: ؎

رأیت سرور قلبی فی منامی
فاحببت التنعس والمناما

(ترجمہ: مجھے خواب میں محبوب کی زیارت ہُوئی اسی لیے نیند اور اُونگھ مجھے پسند ہے)[1]

---

[1] ہمارے امام اعظم رضی اللہ عنہ کو بھی سَو بار خواب میں اللہ تعالیٰ کی زیارت ہُوئی۔ اویسی غفرلہٗ

شانِ ولایت یہی اہلِ نہایۃ اولیائے کاملین کا حال ہے کہ ان کی قلبی بصیرت ہروقت بیدار رہتی ہے اسی لیے ان کی نیند بیداری کا حکم رکھتی ہے[1]۔ کسی شاعر نے فرمایا : ؎

مشو بمرگ ز امداد اہلِ دل نومید
کہ خواب مردم آگاہ عین بیداریست

(ترجمہ : اولیاٗ اللہ کے وصال (موت) سے ان کی امداد سے (وہابیوں) کی طرح ناامید نہ ہو اس لیے کہ ان بزرگوں کی نیند بھی بیداری ہے (اسی طرح ان کی موت بھی حیات ہے)

اور ہم جیسوں کا حال یہ ہے : ؎

سر آنگہ ببالیں نہد ہوشمند
کہ خوابش بقہر آورد در کمند

(ترجمہ : جب کوئی دانشمند سرہانے پر سر رکھتا ہے تو قہر وغلبہ سے نیند اسے مقید کرلیتی ہے)

ف : حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عبادت کی تین علامتیں ہیں :
(۱) رات کو سوجانا کہ بیدار ہوکر طاعتِ الٰہی بجالائے گا۔
(۲) صلوٰۃ کے لیے خلوۃ۔
(۳) دن سے کراہت کرنا کہ ریاء کا شائبہ ہے۔
یا ڈر ہے کہ نماز سے غفلت اور اس کے امور کی ادائیگی میں عجلت کرنا فتنہ کا خطرہ ہے۔

ف : بعض بزرگوں نے فرمایا کہ رات کی گھڑیاں بعض لوگوں کے لیے سکون کا، اور بعض لوگوں کے لیے بے قرار رہنے کا موجب بنایا مثلاً اہلِ غفلت رات کو سکون سے سوتے ہیں تو اہلِ دل بیدار رہتے ہیں۔ اگر وہ روح وصال میں ہوتے ہیں تو ان پر نیند غلبہ نہیں کرتی بوجہ ان کے کمال انس کے اگر وہ فراق کے درد رسیدہ ہوتے ہیں تو بھی نیند نہیں کرتے بوجہ پریشانی کے۔ خلاصہ یہ کہ بیداری عشّاق کا خاصہ ہے یا بوجہ کمال سرور کے یا بوجہ ہجوم غموم کے۔

ف : بیداری پر اپنے باطن کو اللہ تعالیٰ کی طرف لگا دے اور اپنے فکر کو امورِ الٰہی میں مصروف رکھے ورنہ اس پر ماسوٰی کے فکرات گھیر لیں گے اسی لیے لازم ہے زبان کو ذکرِ الٰہی میں مشغول رکھے۔ سچے عاشقِ الٰہی کی مثال اس ننھے بچے کی ہے جسے کسی شے سے پیار ہو کہ وہ جاگتے ہی اسی کو یاد کرتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کی کیفیت مرنے کے

---

[1] اسی لیے حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کا نیند کرنے سے وضو نہیں ٹوٹتا تھا اسی طرح بعض دیگر عارفین کے متعلق منقول ہے۔ اویسی غفرلہٗ (الیواقیت والجواہر)

بعد اُٹھنے کی ہے کہ جس شے سے اسے دُنیا میں پیار ہوگا اسی پر مرنے کے بعد اُٹھے گا۔

سبق : انسان پر لازم ہے کہ بیداری کے بعد غور کرے کہ وہ کس فکر میں ہے تاکہ اسے عبرت حاصل ہو کہ مرنے کے بعد قبر سے اُٹھتے وقت وہی نصیب ہوگا جو اس کا شغل دنیا میں ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ اس کا شغل ذاتِ حق ہے یا غیر اللہ، اب خود سوچ لے کہ کس شغل سے محبّت کرتا ہے!

حدیث شریف "جب انسان نیند کرتا ہے تو شیطان اس کے سر میں تین گرہیں ڈالتا ہے پھر اگر اٹھ کر ذکرِ الٰہی کرتا ہے تو اس کی ایک گرہ ٹوٹ جاتی ہے، جب وضو کرتا ہے تو دوسری، جب نماز پڑھتا ہے تو تیسری گرہ بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کے بعد خوش و خرم اور ہشاش بشاش ہو کر وقت گزارتا ہے۔"

حدیث کے آخر میں ہے:

"اگر وہ نیند میں ایسا غرق ہو جاتا ہے کہ اس کی نماز بھی چلی جاتی ہے تو شیطان اس کے کان میں پیشاب کر دیتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نفس اور شیطان کے شر سے بچائے۔ (آمین)

تفسیر عالمانہ وَهُوَ الَّذِیْٓ اور وہ اللہ تعالیٰ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ جس نے ہواؤں کو کھولا۔ کشف الاسرار میں ہے کہ یہاں پر ارسال بمعنے کھولنا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

ارسلت الطیر وارسلت الکلب المعلم۔

(میں نے پرندہ اور شکاری کُتّا کھول دیا)

المفردات میں ہے کہ کبھی الارسال بمعنے التسخیر آتا ہے۔ جیسے ارسال الریح۔ اور الریح مشہور ہے اور وہ متحرک ہے اور رحمت کے وقت الریاح بولا جاتا ہے۔ یعنی جمع کے صیغہ سے اس لیے کہ وہ ہوا جنوب، شمال، صبا کی جامع ہوتی ہے اور عذاب میں ریح استعمال ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ صرف ایک ہے یعنی الدبور یعنی عقیم، جو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچاتی۔

حدیث شریف میں وارد ہے:

اللھم اجعلھا لنا ریاحا ولا تجعلھا ریحا۔

(اے اللہ! ہمارے لیے ہوا ریاح بنا ریح نہ بنا)

بُشْرًا یہ الریاح سے حال ہے مخفف کر کے بضمتین لبشور اور بشیر کی جمع ہے بمعنے مبشر، اس لئے کہ ایسی ہوائیں بارش کی خوشخبری سُناتی ہیں بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ بارش سے پہلے اسے استعارۃً رحمت

کہا گیا ہے وہ اس معنے پر کہ پہلے ہوا چلتی ہے پھر بادل آتے ہیں اس کے بعد بارش ہوتی ہے۔ یعنی بارش سے پہلے عموماً ہوائیں چلتی ہیں اسے آسمان کی رحمت سے تعبیر کرتے ہیں اس لیے کہ آسمان رحمت بھیجتا ہے۔ یعنی اسی سے ہی یہ رحمت نازل ہوتی ہے وَاَنۡزَلۡنَا اور ہم نے اپنی عظمت سے نازل کیا۔ صیغہ غیب سے جمع متکلم کی طرف التفات کیا گیا ہے انزال الرحمۃ کے مہتم بالشان ہونے کی وجہ سے اور نزول رحمت ارسال الریاح کا نتیجہ ہے مِنَ السَّمَآءِ آسمان یعنی اوپر کی جہت سے۔ اس کی بارہا تحقیق گزری ہے۔ مَآءً طَهُوۡرًا پاک پانی، طهور، طاهر کا مبالغہ ہے یعنی وُہ پانی جو خود پاک اور دوسروں کو پاک کرنے والا یعنی وُہ پانی جس سے حدث و نجاست دُور کی جائے۔ لفظ طهور جیسے صفت واقع ہوتا ہے جیسے آیت ہذا میں ہے۔ ایسے ہی اسم بھی واقع ہوتا ہے۔ جیسے:

التراب طهور المؤمن۔

(مٹی مومن کو پاک کرنے والی ہے)

اور کبھی بمعنے طہارت بھی آتا ہے، جیسے:

تطهرت طهورا حسنا۔ (یعنی میں نے اچھے طریق سے وضو کیا)

اسی سے ہے حضور علیہ السلام کا ارشادِ گرامی:

لا صلٰوۃ الا بالطهور۔ (یعنی طہارت کے بغیر نماز جائز نہیں)

ف: اصل لفظ طهور ہے کہ یہ پانی کی اصل خلقت پر استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: ماء المطر، ماء البحر، ماء العیون، ماء الآبار۔ اور پھر پانی جس صفت کو اختیار کرے تب بھی طهور کا استعمال ہوگا۔ مثلاً عذوبۃ، ملوحۃ، حرارۃ، برودۃ وغیرہ۔ (فتح الرحمٰن)

مسئلہ: اگر پانی میں تغیر آجائے۔ مثلاً ایک مدت تک کھڑا رہنا یا کسی ایسی پاک چیز کی اُس میں ملاوٹ ہو کہ جس سے بچنا ناممکن ہو، جیسے مٹی، درخت کے پتے وغیرہ۔ تو وہ پانی پاک رہے گا اور دوسروں کو بھی پاک کرسکے گا۔ یعنی اس سے رفعِ احداث اور ازالۃ انجاس جائز ہے۔ (اس پر تمام فقہاء کرام کا اتفاق ہے)

مسئلہ: اگر پانی اپنی خلقت بدل لے تب بھی پاک ہے۔

مسئلہ: جس پانی پر غیر شے کا غلبہ ہو جائے تو وہ پانی پاک تو ہوگا لیکن دوسروں کو پاک نہ کرسکے گا۔ یہی تینوں ائمہ کا مذہب ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بہنے والی پاک اشیاء سے وضو کے لیے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ جیسے سرکہ اور گلاب کا پانی، اور ان کی طرح اور چیزیں۔ اس کے متعلق ائمہ ثلاثہ اور محمد بن حسن اور زفر نے خلاف کیا ہے۔

مسئلہ: امام اعظم رحمہ اللہ نے اس پانی سے ازالۂ نجاسات اور وضو وغیرہ کے جواز کا فتویٰ دیا ہے جو پاک شے سے

متغیر ہوجائے جیسے زعفران وغیرہ بشرطیکہ پانی کی رقت (رقیق ہونا) باقی ہو۔ باقی تفصیل کتب فقہ میں ہے۔

ف : ماء کو طھورا سے موصوف کرنے میں اشارہ ہے کہ پانی ایک عظیم نعمت ہے اور یہ نعمت احیاء و سقی کا تتمہ ہے اور پانی انسان کے لیے ضروری ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوشگوار شے اور نافع ترین چیز ہے کہ جہاں پہنچتا ہے فائدہ پہنچاتا ہے۔ اگرچہ پانی کی طہارت کے بیان کو یہاں بظاہر کوئی مناسبت نہیں۔

نکتہ : اس میں انسان کو تنبیہ ہے کہ جیسے ظاہر کو پاک کرنا ضروری ہے ایسے ہی باطن کو پاک کرنا اور زیادہ ضروری ہے اس لیے کہ باطن کو تلویثات سے پاک رکھنا بہ نسبت ظاہر کے نہایت لازم اور بہت اہم ہے اس لیے کہ حق تعالیٰ کا منظر ظاہر نہیں بلکہ باطن ہے۔

وسعتِ رزق کا آسان طریقہ تطہیر یعنی کپڑے، جسم کا پاک رکھنا اور ہمیشہ باوضو رہنا وسعتِ رزق کا سبب ہے۔ چنانچہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دم علی الطہارۃ یوسع علیك الرزق"

(طہارت پر مداومت کرو، رزق میں وسعت ہوگی)

اور پانی رزق ظاہری کا سبب ہے اور طاہر و مطہر ہے۔

سبق : طالب سالک پر لازم ہے کہ وہ باوضو ہو یعنی طہارت پر مداومت کرے اس لیے کہ یہ رزق معنوی کے حصول کا سبب ہے۔ رزقِ معنوی سے فیضِ الٰہی مراد ہے جو رُوح کی غذا ہے۔

لِنُحْيِۦَ بِهٖ یہ پانی کے نازل کرنے کی تعلیل ہے بَلْدَةً مَّيْتًا تاکہ ہم آباد کریں ایسے شہروں کو جہاں نہ اشجار نہ اثمار اور نہ چراگاہیں ہیں۔ احیاء سے کھیتیاں اگانا مراد ہے اور بلدۃ سے زمین کا ایک علاقہ مراد ہے آباد ہو یا غیر آباد۔ مطلب یہ کہ ہم بارش کے ذریعے ایسے علاقے آباد کرتے ہیں جو قحط سالی کی وجہ سے خشک تھے یا موسم سرما کی وجہ سے ویران اور غیر آباد ہو چکے تھے۔

سوال : بلدۃ کی صفت میتۃ ہونا چاہیے یہاں مذکر (میتا) کیوں؟

جواب : یہاں بلدۃ سے بلد یا موضع یا مکان مراد ہے۔ علاوہ ازیں میتا کے لفظ کی گردان نہیں ہوتی اس کا صیغہ اسم فاعل یا اسم مفعول وغیرہ نہیں آتا اسے اسمِ جامد کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔

وَنُسْقِيَهٗ اور پانی پاک کے نالوں اور وادیوں وغیرہ میں جاری ہونے یا حوضوں اور چشموں اور کنوؤں میں جمع ہونے کے وقت پلاتے ہیں۔

حل لغات : اسقی اور سقی کا ایک ہی معنیٰ ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے: سقاۃ الغیث واسقی۔ یعنی اسے اللہ تعالیٰ نے بارش کا پانی پلایا۔ اس کا اسم السقیا آتا ہے۔ امام راغب نے فرمایا کہ السقی والسقیا بمعنی کسی کو پانی دینا، تاکہ

وہ اسے پیئے۔ اور الاسقاء بمعنے کسی کو پانی دینا تاکہ وُہ اسے لے کر جہاں چاہے استعمال کرے۔ الاسقاء، السقی سے بلیغ تر ہے کیونکہ الاسقاء کا مطلب یہی ہے کہ دوسرے کو پانی کا گویا مالک بنا دیا جاتا ہے کہ وہ جیسے چاہے کرے یا کسی دوسرے کام میں لگائے۔ مثلاً:

اسقیتہ نہراً۔ (یعنی میں نے نہر کا پانی دیا) جسے وہ ہر مصرف میں لا سکتا ہے، یہی نہیں کہ وہ صرف پئے گا۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ ہم نے انھیں پانی پر قدرت دے دی تاکہ وہ اس سے اپنے کاروبار چلائیں، اسی سے خود پئیں اور اپنے جانوروں کو پلائیں، وغیرہ۔

مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِيَّ كَثِيْرًا یہ نسقیہ کے متعلق ہے یعنی ہم پلاتے ہیں اپنی بعض مخلوق کو، جو وہ جانور اور انسان ہیں انعاماً و اناسیّ کا منصوب ہو جانا جار و مجرور کے محل سے بدل کی وجہ سے یعنی ممّا خلقنا کے ممّا سے۔ اور یہ بھی ہے کہ نسقیہ کا مفعول ہو اور ممّا خلقنا کا متعلق محذوف ہے اور یہ انعام سے حال ہے الانعام نعم کی جمع ہے وہ مال جو چر کر گزارہ کرے۔ اس کا زیادہ تر اطلاق اونٹوں پر ہوتا ہے۔ "المغرب" میں ہے کہ الانعام ان آٹھ جوڑوں کا نام ہے جن کا ذکر آٹھویں پارے میں گزرا ہے۔ کما قال:

من الابل اثنین و من البقر اثنین و من الضأن اثنین و من المعز اثنین۔

(اُونٹ اور گائے اور بھیڑ بکری کا جوڑا جوڑا)

تحقیق اَنَاسِیَّ سیبویہ کے نزدیک یہ انسان کی جمع ہے دراصل اناسین تھا، نون کو یا سے تبدیل کر کے ماقبل والی یاء میں ادغام کیا گیا ہے۔ اور فراء و مبرد اور زجاج فرماتے ہیں کہ یہ انسی کی جمع ہے لیکن اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے اس لیے کہ فعالی اس صیغے کی جمع ہوتی ہے جس میں وہ یاء مشدّدہ ہو جو نسب پر دلالت نہ کرے جیسے کرسی کی جمع کراسی آتی ہے اگر کرسی میں یاء نسبی ہوتی تو اس کی جمع کراسی ہرگز نہ آتی، اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ انسی کی یاء نسبی نہیں، اگر انسی کی جمع مانا جائے تو اسے اناسیۃ آنا چاہیے جیسے معالی کی جمع معالیۃ آتی ہے۔ امام راغب نے فرمایا کہ انسی، انس کی طرف منسوب ہے۔ ہر اس شے کو کہا جاتا ہے جس میں انس بہت زیادہ ہو، اور ہر وُہ شے جس کے ساتھ انس کیا جائے، اس کی جمع اناسی آتی ہے۔ اور فرمایا کہ کرسی میں بھی یاء نسبی ہے اس لیے کہ کرس کی طرف منسوب ہے بمعنے تلبد۔ اسی لیے کاغذوں کے یکجا شدہ مجموعہ یعنی متلبد (گتہ) کو کراسہ کہا جاتا ہے۔

كَثِيْرًا یہ اناسی کی صفت ہے کیونکہ یہاں پر اناسی بمعنے بشر ہے اور ان سے وُہ جنگلی لوگ مراد ہیں جن کی بسر اوقات بارش پر ہے۔ اسی لیے انعام و اناسی کو نکرہ لایا گیا ہے۔ یہ تنکیر افراد نوعی ہے اور ان کی تخصیص اس لیے ہے کہ شہری اور دیہاتی لوگ نہروں یا چشموں کے قریب رہتے ہیں اسی لیے انہیں پینے کی ضروریات پُورا کرنے کے لئے آسمانی پانی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اسی طرح حیوانات اور وحوش و طیور کا بھی ذکر نہیں کیا اس لیے کہ

انھیں بھی پانی کی تلاش نہیں ہوتی ۔

ف : اعوزہ الشئ اس وقت بولتے ہیں جب کسی کو اسی شے کی محتاجی ہو لیکن وہ اس کے حصول پر قدرت نہ رکھتا ہو ۔ اور انعام کی تخصیص اس لیے ہے کہ ایسے جانوروں کو انسان اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے اکثر اوقات اپنے پاس رکھتا ہے، اور اس کے اکثر منافع اور اس کی معیشت کے اکثر معاملات انہی سے متعلق ہیں اسی لیے اناسی سے انعام کا ذکر پہلے فرمایا، یہ ایسے ہے جیسے ان کے ذکر زمین کی آبادی کو پہلے بیان فرمایا کیونکہ زمین کی آبادی جانوروں اور انسانوں کی زندگی اور وجہ معاش کا سبب ہے ۔ قربان اس کی شان پر کہ پہلے انسان کا ذکر، پھر اس کے رزق کا ذکر فرمایا ۔ مثلاً انعام کا ذکر پہلے ہے اس لیے کہ وہ انسان کا رزق ہیں، پھر نبات کا، اور وہ جانوروں کا رزق ہیں، پھر بارش کا، کہ وہ نبات کا رزق ہے ۔ اس بنا پر بارش کا ذکر پہلے کر کے اسی پر حیات الارض بالنبات کو مرتب فرمایا ۔ اس پر انعام کے ذکر کو مرتب فرمایا ۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بخدا ہم نے اسے بار بار دہرایا ۔ یعنی انشاء السحاب و انزل المطر انھیں قرآن مجید و دیگر کتب سماویہ میں بار بار تکرار کیا ہے بَیْنَھُمْ ان کے مابین یعنی متقدمین و متاخرین میں لِیَذَّکَّرُوْا تاکہ نصیحت حاصل کریں یعنی تفکر کریں اور کمال قدرت کو پہچانیں اور نعمت کا حق سمجھیں اور پھر اس کی ادائیگی کے لیے تیار ہوں ۔ یہ در اصل یتذکر وا تھا ۔ اور تذکر و تفکر کا ایک معنیٰ ہے فَاَبٰی، الاباء بمعنے سخت انکار کرنا ۔ مثلاً کہا جاتا ہے : رجل ابی بمعنے سخت منکر ۔ یعنی وہ تکالیف برداشت کرنے سے بچنے والا ہے ۔ اس معنے پر یہ نفی کے معنی میں ہے ۔ اسی لیے اس کا استثنا جائز ہوتا ہے ۔ گویا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ لَمْ یَفْعَلْ یا لَمْ یُرِد یا لَمْ یَرْضَ ۔ اَکْثَرَ النَّاسِ پہلے اور پچھلے لوگوں میں سے اکثر اِلَّا کُفُوْرًا الّا مگر کفرانِ نعمت اور ان کی شان میں بہت تھوڑی پروا کرنے والے، ورنہ نعمت کا حق یہ تھا کہ وہ اس میں تفکر کرتا اور اس سے ہی وجود صانع اور اس کی قدرت و احسان پر استدلال کرتا ۔ اور کفران یا کفر نعمۃ یہ ہے کہ شکر کی ادائیگی نہ کی جائے اور سب سے بڑا کفران یا کفر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی علیہ السلام کی نبوت و شریعت کا انکار کیا جائے لفظ کفران اکثر نعمت کے انکار پر اور لفظ کفر دین کے انکار پر استعمال ہوتا ہے ۔ اور کفور دونوں کے لیے برابر استعمال ہوتا ہے ۔ (کذا فی المفردات) اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ صرفنٰہ کی ضمیر پاک پانی کی طرف راجع ہے جس سے آسمان کا پانی مراد لیا گیا ہے ۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ ولقد صرفنٰہ ہم نے بارش کے پانی کو ان کے بعض شہروں اور مکانوں پر مختلف کر کے اتارا، بعض اوقات میں ان پر بارش نازل فرمائی، یعنی انھیں نہ تو تیز بارش برسا کر تکلیف دی جاتی ہے نہ بالکل معمولی بارش سے انھیں قحط سالی میں مبتلا کیا جاتا ہے نہ ہی لگاتار بارش کر کے انھیں تباہ کیا جاتا ہے لیکن ان کے اکثر ایسے ہیں جو صرف کفرانِ نعمت اور کفرِ دین کو پسند کرتے ہیں ۔ مثلاً کہتے ہیں :

مطرنا بنوء کذا ۔

یعنی ہم فلاں ستارے کے سقوط سے بارش دئے گئے، جیسے اہلِ نجوم کہتے ہیں ۔ اس عقیدہ والے لوگوں کو کافر کہا گیا ہے

کہ اُنھوں نے ایسی صفت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کے بجائے ایسی عظیم نعمت کو افلاک وکواکب کی طرف منسوب کیا۔

مسئلہ: جس کا عقیدہ ہو کہ بارش کا تعلق ستاروں سے ہے تو وہ کافر ہے۔ ہاں اگر یہ عقیدہ ہو کہ ہر شے کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور ستارے تو صرف بارش کی علامت ہیں انھیں اللہ تعالیٰ نے بارش کے لیے نشانیاں بنایا ہے کہ فلاں وقت طلوعِ فجر کے وقت جانبِ مغرب سے ستارا گرے گا اور اس کے مقابلے میں مشرق سے عین اسی وقت ستارہ طلوع ہوگا تو بارش ہوگی۔ یہ عقیدہ صحیح ہے (ہم اہلسنّت بحمدہٖ تعالیٰ انبیاء واولیاءؑ کے متعلق اس طرح کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ کام کرتا تو اللہ ہے اور اسی کی تخلیق سے امور سرانجام پاتے ہیں لیکن یہ حضرات ان امور کے وسائل ہیں۔ والتفصیل فی کتب اہلسنت)

عقیدہ: اہلِ عرب (جاہلیت کے لوگوں) کا عقیدہ تھا کہ بارشیں اور ہوائیں، اور گرمی سردی انہی ستاروں کے سقوط یا طلوع کی وجہ سے ہوتی ہے، اس لیے کہ جس ستارے کی تاثیر ہوتی ہے اسی دور میں اس کی شاہی ہوتی ہے۔

حلِ لغات: نؤناء به الحمل یعنے اثقله سے ہے۔ اور النوء وہ ستارہ جو غروب کی طرف مائل کرے، اور جو شخص اپنی طلب میں کامیاب نہ ہو اس کے لیے کہا جاتا ہے: اخطاء نوئك۔

حدیث شریف میں ہے: ثلاث من امر الجاهلية الطعن فی الانساب والنياحة والانواء۔

(زمانۂ جاہلیت کی تین رسمیں ہیں:

۱۔ انساب پر طعن وتشنیع

۲۔ بین کرنا

۳۔ ستاروں کو اپنے امور میں موثر سمجھنا۔

حدیث شریف: حضرت زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صبح کی نمازِ حدیبیہ میں بادلوں کے سایہ میں نماز ادا فرمائی۔ فراغت کے بعد آپ نے صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ تمہارے رب تعالیٰ نے کیا فرمایا ہے؟ انھوں نے عرض کی: الله ورسوله اعلم۔ (اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے بندے میرے اوپر ایمان بھی لاتے ہیں اور میرے ساتھ کفر بھی کرتے ہیں ان میں جو کہتا ہے ہمیں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اس کی رحمت سے بارش نصیب ہوئی ہے تو ایسا بندہ میرے اوپر ایمان رکھتا ہے اور ستاروں سے کفر کرتا ہے۔ اور ان میں جو یہ کہتا ہے کہ ہمیں بارش ملی ہے تو ستاروں سے، تو ایسا شخص میرے ساتھ کفر کرتا ہے اور ستاروں پر ایمان رکھتا ہے (کذا فی کشف الاسرار)

سبق سالک پر لازم ہے کہ وہ برے اعتقاد سے بچے اور عقیدہ رکھے کہ ہر شے کا موثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہے ۔ اسی کے حکم سے بارش نازل ہوتی ہے اور وہی اسے بعض شہروں میں نازل کرتا ہے اور بعض سے بند رکھتا ہے ۔ بعض اوقات میں برساتا ہے اور بعض اوقات روکتا ہے کبھی زور سے برساتا ہے کبھی آہستہ ، اس میں اس کی ہزار مصلحتیں اور بے شمار مصلحتیں ہوتی ہیں ۔

ف : ملائکہ کرام کو معلوم ہوتا ہے کہ اس سال کتنے قطرے زمین پر برسائے جائیں گے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مقرر کردہ مقدار کو نہیں گھٹاتا ۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کن کن شہروں میں بارش ہوگی ۔

حدیث شریف رات اور دن کی کوئی گھڑی ایسی نہیں ہوتی جس میں آسمان سے بارش نہ برسے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ جہاں چاہے بارش برسائے ۔ یہ حدیث مرفوع ہے ۔

حدیث شریف ہر سال کی بارش کی مقدار برابر ہوتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ جس علاقہ کے لوگوں کے جرائم و معاصی زیادہ ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوتا ہے تو ان کے علاقہ کی بارش دوسرے علاقہ میں برسائی جاتی ہے یا پھر جنگلوں اور دریاؤں میں ۔

مثنوی شریف میں ہے : ؎

تو بزن یا ربنا آب طہور
تا شود این نار عالم جملہ نور
آب دریا جملہ در فرمان تست
آب و آتش اے خداوندان تست
گر تو خواہی آتش آب خوش شود
ور نخواہی آب آتش ہم شود
ایں طلب از ماہم از ایجاد تست
رستن از بیداد یارب یاد تست

ترجمہ : یارب پاک پانی مار تاکہ اس عالم کی نار نور ہو جائے ۔
۲ ۔ دریا کا پانی تیرے فرمان میں ہے اے اللہ والو ! یہ پانی اور آگ تیرے ہیں ۔
۳ ۔ اگر چاہتے ہو کہ آگ پانی ہو جائے اور چاہتا ہے کہ پانی آگ ہو جائے ۔
۴ ۔ یہ طلب بھی تیری ایجاد ہے بیداد سے نجات تیری یاد سے ملے گی ۔

وَلَوْ شِئْنَا اگر ہم چاہیں لَبَعَثْنَا تو بھیج دیں ۔ المفردات میں ہے کہ البعث بمعنے شے کو برانگیختہ اور کسی شے کی طرف

متوجہ کرنا فِیْ کُلِّ قَرْیَۃٍ ہر گاؤں میں۔ در اصل القریہ اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں نَذِیْرًا ۝ منذر یعنی ڈرانے والا، یہ الانذار سے ہے بمعنے ایسی خبر دینا جس میں خوف ہو اور خبر دینے والا بھی رسول علیہ السلام ہو۔ یعنی آپ کو کل کائنات کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ یہ صرف آپ کی عزّت افزائی اور تمام رسل کرام علیہم السلام پر آپ کو فوقیت بخشنے کے لیے ہے ورنہ ہم اگر چاہتے تو ہر بستی کا علٰحدہ علٰحدہ رسول بھیجتے، اس سے آپ سے نبوت و رسالت کے امور کا بوجھ ہلکا ہو جاتا لیکن چونکہ آپ ختم المرسلین ہیں اسی لیے آپ کو تا قیامت کُل کائنات کے ذرّے ذرّے کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزّت وعظمت کا بیان ہے اور خاص بندوں کو اپنے محبوب علیہ السلام کی شانِ اقدس کے متعلق تنبیہ ہے اس کی قدرت کا اظہار تو بایں معنی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے اس سے فلاسفر کا رد ہے کہ وُہ اللہ تعالیٰ کو بعض امور کا قادر نہیں مانتے۔ اسی طرح طبائعیہ یعنی جاہل صوفیوں کا رد ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اربابِ نبوت وُہ ہو سکتے ہیں جنہیں اتصالِ الٰہی حاصل ہو اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ ان کی غلط فہمی ہے اس لیے کہ میں قادر ہُوں اپنے بندوں سے نبی بنانے پر، اور اپنی مرضی سے کام کرنے پر۔

فلاسفہ اور جہال صوفیہ کا رد ایسے جاہلوں کا رد موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے واضح ہوتا ہے۔ مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ امت کے کثرتِ سوال سے تنگ آکر اللہ تعالیٰ سے شکایت کی اس پر اللہ تعالیٰ نے آنِ واحد میں بنی اسرائیل سے ایک ہزار آدمیوں کو نبی منتخب فرما دیا اس پر بنی اسرائیل کے باقی لوگ ان انبیاء علیہم السلام کے ہاں چلے گئے اس سے موسیٰ علیہ السلام کو ملال ہُوا اور عرض کیا: یا اللہ! میں اس کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام کو آنِ وحدت میں موت دے دی اس سے موسیٰ علیہ السلام کی عزت وعظمت کا اندازہ کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی خاطر داری کتنی مطلوب تھی۔

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان جب موسیٰ علیہ السلام کی عزت وعظمت کا یہ حال ہے تو ان سب اور ہم سب کے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم (جو خود موسیٰ علیہ السلام کے بھی آقا ہیں) کی عزت وعظمت کو خود سمجھئے کہ آپ کو نبوت میں منفرد مقام حاصل ہے اور نبوت میں فضیلت کا یہ عالم ہے کہ عالمِ کائنات کے ذرّہ ذرّہ کے نبی مرسل ہیں۔ آپ کی تشریف آوری سے جملہ سابق شرائع منسوخ ہو گئیں اور آپ کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو گیا اور آپ کی کتاب (قرآن مجید) ہر طرح کی تغییر و تبدیل سے محفوظ کر لیا گیا اور آپ کی ملت کو تا قیامت جاری و ساری رکھا گیا۔

ف: آیت میں اپنے مخصوص بندوں کو بھی ادب سکھایا گیا ہے اس لیے کہ جب اپنے حبیب علیہ السلام سے

یُوں خطاب فرمایا:

ولو شئنا لنذهبن بالذی اوحینا الیك ۔ ترجمہ: اگر ہم چاہیں تو اسے لیجائیں جو تمہاری طرف وحی کی گئی ۔

تو پھر باقیوں کی کیا مجال کہ دم مار سکیں۔ اس میں انھیں اشارہ ہے کہ وُہ اگرچہ گناہوں سے معصوم ومحفوظ سہی لیکن انھیں اپنے اعمال پر نظر نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی ان سے عجب کرنا چاہیے بلکہ انھیں ہر وقت فضلِ الٰہی اور لطفِ حق کو مدِّ نظر رکھنا لازمی ہے۔

ف: اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اپنے مخصوص بندوں کو معصوم ومحفوظ رکھے اس لیے انھیں شدید تاکید فرمائی کہ وہ صرف اسی کی طرف متوجہ ہوں یہاں تک کہ درمیان سے دُوئی کو اٹھا دے۔

تفسیر عالمانہ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ ان کافروں نے آپ کو اپنے معبودوں کی پرستش کے لیے دعوت دی تو آپ ان کی دعوت قبول نہ کیجئے اور نہ ہی ان کے آباؑ کے دین کی اتباع کیجئے بلکہ آپ ان کی سخت گرفت فرمائیے، معمولی جھکاؤ کا بھی اظہار نہ فرمائیے بلکہ اپنی دعوت اسلامی پر مضبوطی کیجئے اور اظہارِ حق میں مکمل جد وجہد فرمائیے۔

وَجَاهِدْهُمْ اور ان کے ساتھ جہاد فرمائیے اور کوشش کو بڑھائیے۔ الجہاد والمجاھدہ بمعنے دشمن کی مدافعت میں اپنی جملہ طاقت کو خرچ کر دینا۔ بہٖ قرآن مجید کی تلاوت کے ذریعے یعنی قرآنی مواعظ وامم سابقہ کے مکذبین کے جملہ حالات انھیں سنائیے جِهَادًا كَبِيْرًا بہت بڑا جہاد کہ اس میں معمولی سُستی وکاہلی بھی نہ ہو۔ اس لیے سفہاء کو دلائل وبراہین سے سمجھانا اعداء کے ساتھ تلوار کے ذریعے لڑنے سے زیادہ اہم ہے۔

سوال: تم نے یہاں پر جہاد سے دلائل وبراہین قائم کرنا مراد لیاہے حالانکہ جہاد سے تو علی الاطلاق قتال بالسیف مراد ہوتا ہے۔

جواب: قتال بالسیف کے جہاد کا حکم ہجرت کے بعد نازل ہُوا اور یہ سورۃ مکیہ ہے اس لیے لازماً وہی معنیٰ کرنا پڑے گا جو ہم نے اُوپر بیان کیا ہے۔

مسئلہ: امام راغب نے فرمایا کہ جہاد جیسے تلوار سے ہوتا ہے ایسے ہی ہاتھ اور زبان سے بھی ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

جاھدوا الکفار بایدیکم و السنتکم ۔

(کافروں سے ہاتھ اور زبان سے لڑو)۔

اور حدیث کے آخر میں ہے:

جاھدوا المشرکین باموالکم وانفسکم و السنتکم ۔

(مشرکین سے مال اور نفوس اور زبانوں سے لڑو)

ف : زبان سے لڑنے کا معنی یہ ہے کہ اُن کی خرابیوں کو اُنھیں زبانی سمجھاؤ اور ان کی ہجو کرو اگر وہ ہجو سے باز آتے ہیں۔ ان کے ساتھ سخت کلامی کرو اگر وہ سخت کلامی سے ہی مانتے ہیں، وغیرہ (کما فی مشارع الاشواق)

ف : فقیر (اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ) کہتا ہے کہ لفظ مشرکین میں اہلِ ریاء اور اہلِ بدعۃ (سیئہ) کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے اور جاھدوا کا خطاب اہلِ اخلاص اور اہلسنّت کو ہے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ اے مخلصو! اور اے اہلسنت! ہر زمانہ میں اہلِ بطلان کا مقابلہ کرو۔ اور یہ حکم بالخصوص اس وقت ضروری ہو جاتا ہے جب اہلِ بطلان کے غلبے کا خوف ہو (بحمدہٖ تعالیٰ ہم اہلسنت (بریلوی مسلک) کے احناف کو خصوصیت حاصل ہے کہ ہم اپنے دور کے تمام بدمذاہب سے ٹکرا جاتے ہیں اور کسی مصلحت سے ہم بدمذہبوں کی تردید سے نہیں رُکتے۔ فللّٰہ الحمد والمنّۃ)

یہی وجہ ہے کہ سلطان ظالم کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو افضل جہاد کہا گیا ہے اور یہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے :

افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر۔ ظالم بادشاہ کو کلمہ حق کہنا افضل جہاد ہے۔

نکتہ : بادشاہ ظلم کو کلمۂ حق کہنے کو افضل جہاد اس لیے کہا گیا ہے کہ عام دشمن کے مقابلہ کے وقت انسان کو جہاں مغلوب ہونے کا خوف ہوتا ہے وہاں پر غالب ہونے کی بھی امید ہوتی ہے لیکن ظالم کے سامنے حق کہنے کے وقت تباہی وہلاکت کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا اس لیے کہ ظالم اپنے نفسِ شریر کا بندہ ہوتا ہے، وہ جُونہی اپنے خلاف کوئی بات سنتا ہے تو کہنے والے کو فوراً اپنے ظلم وقہر کا نشانہ بنا دیتا ہے۔ اسی بنا پر ظالم کو حق کہنے والا جان ہتھیلی پر رکھ کر حق بولے گا۔ اس معنے پر اس کے حق بولنے کو افضل الجہاد کہا گیا اس لیے کہ یہ اجل الخوف یعنی بہت بڑے خوف کے مقابلے میں اجرِ عظیم ہوگا (کذا فی ابکار الافکار للسمرقندی)

تفسیر صُوفیانہ آیت میں نفس اور اس کے صفات کی طرف اشارہ ہے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ اے سالک! تم نفس اور اس کی صفاتِ ذمیمہ کی اتباع نہ کرنا بلکہ اس کی خواہش کی مخالفت میں اس کے ساتھ قانونِ قرآن کے مطابق صدق وسچائی کی تلوار سے جہاد کرنا اور اس کی شہوات کو ہرگز پُورا نہ کرنا بلکہ اس کے تعلقات کو منقطع کرنا ہمارے لیے بہت بڑا جہاد ہے خیال رکھنا کسی وقت بھی اس کی معمولی ضرورت وخواہش میں موافقت نہ کرنا ہر وقت عزم بالجزم کر کے اس کی دشمنی میں سر کی بازی لگا دینا اسی طرح حقوق اللہ کی ادائیگی ہوگی یاد رکھئے کسی وقت بھی اس کی طرف منہ پھیر کر نہ دیکھنا بلکہ جہاں تک ہو سکے ماسوی اللہ کے جملہ خطرات دل سے دُور رکھنا۔

مثنوی شریف میں ہے : ؎

اے شہاں کشتیم ما خصم بروں
ماند خصمی زاں بتر در اندروں

۲ کشتن ایں کار عقل و ہوش نیست
شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست

۳ دوزخست ایں نفس و دوزخ اژدہاست
کو بدریاہا نہ گردد کم و کاست

۴ ہفت دریا را در آشامد ہنوز
کم نگردد سوزش آں خلق سوز

۵ قوت از حق خواہم و توفیق و لاف
تا بسوزن برکنم ایں کوہ قاف

۶ سہل شیری دانکہ صفہا بشکند
شیر آنست آنکہ خود را بشکند

ترجمہ
۱۔ اے یاروہم تو باہر والے دشمن سے لڑ رہے ہیں۔ بد تر دشمن تو ہمارے اندر ہے۔
۲۔ اس کا مارنا عقل و ہوش کا کام نہیں اندر کا شیر خرگوش کے تابع نہیں ہوسکتا۔
۳۔ یہ نفس دوزخ ہے اور دوزخ بھی بڑا اژدہا کی طرح کہ وہ کئی دریاؤں سے بھی کمی نہیں ہوسکتی۔
۴۔ سات دریا پی جائے تو تاہنوز خلق سوز سوزش کم نہ ہوگی۔
۵۔ حق تعالیٰ سے قوت وتوفیق وامداد چاہتا ہوں تاکہ سوئی سے کوہ قاف کو اکھیڑ لوں۔
۶۔ صفوں کو توڑنے والا شیر بننا آسان ہے شیر وہ ہے جو خود کو شکست دے۔

تفسیر عالمانہ وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ یہ مرج الدابۃ سے ہے بمعنے خلاھا و ارسلھا ترعی۔ اس کو چھوڑ در انحالیکہ وہ چرتی ہے۔ یا مرج امرھم سے ہے بمعنے اختلط۔ البحر اکثر لوگوں کے نزدیک بہت زیادہ پانی کو کہا جاتا ہے وہ میٹھا ہو یا کڑوا۔ در اصل اس مکان واسع کو کہا جاتا ہے جو بہت زیادہ پانی کا جامع ہو۔ (کذا فی المفردات)

اب معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے دو دریاؤں کو اپنے جاری ہونے کی جگہ ایسے چھوڑ دیا جیسے گھوڑوں کو چراگاہ میں چھوڑا جائے در انحالیکہ وہ آپس میں ایسے مل کر چلنے والے ہیں کہ ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے اور نہ ہی ایک دوسرے ملتبس ہوتے ہیں باوجودیکہ آپس میں ایک دوسرے کے بالکل قریب ہیں لیکن ان کا آپس کا بُعد بھی ظاہر ہے۔ ان کے متقارب ہونے کے اشارہ پر حرف قرب مصرح ہے۔ چنانچہ اسے مقید پر محمول کرنا بھی جائز ہے۔ چنانچہ فرمایا:
مرج البحرین یلتقیان۔

هٰذَا عَذْبٌ یہ حال ہے یہاں قولاً محذوف ہے یعنی درانحالیکہ کہا جائے گا کہ یہ میٹھا ہے فُرَاتٌ پینے کے لحاظ سے خوشگوار ہے کہ اس کے پینے سے پیاس بجھ جاتی ہے بوجہ اس کے میٹھا ہونے کے۔ یہ عذبٌ کی صفت ہے اور اس کی تاء اصلیہ ہے۔

ف: علامہ طیبی نے فرمایا کہ یہ اس نام سے اس لیے موسوم ہُوا ہے کہ یہ پیاس مٹاتا ہے، بمعنے الکسر، اسی معنے کے اعتبار سے کہ وُہ پیاس کو قلب سے کاٹ دیتا ہے اس کا کسر سے مشتق ہونے کے لیے کافی ہے یہ اشتقاق کبیر میں داخل ہے جیسے جبذ، جذب سے، اشتقاق سے اشتقاق کبیر نہے۔ اسی سے کوفہ کی نہر فرات مشتق ہے یہ ایک بہت بڑی نہر ہے جس کا مخرج ارمینیہ ہے اور اس کا اصل ملکوت ہے۔ وہ جابلقا کی ایک بستی ہے۔ یہی نہر وہاں سے کُوفہ میں پہنچتی ہے، اس کا آخر کا ایک حصہ دجلہ میں ہے دُوسرا البحر فارس میں ہے۔

وَّهٰذَا مِلْحٌ اور یہ دُوسرا دریائے شور ہے۔ امام راغب نے فرمایا کہ ملح سے وُہ پانی مراد ہے جس کے ذائقہ کا تغیر معروف ہے اور متجمد ہے اہل لغت کہتے ہیں مَلَحَ، یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی شے کا ذائقہ متغیر ہوجائے اگر منجمد نہ ہو تو کہا جائے گا: ماءٌ ملحٌ۔ اہلِ عرب ماءٌ مالح بہت تھوڑا استعمال کرتے ہیں۔ اُجَاجٌ ط بہت زیادہ کڑوا۔ یہ ملح کی صفت ہے۔

اعجوبہ مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے اسی دریا کو نہایت سخت کڑوا پیدا فرمایا یہاں تک کہ پینا تو درکنار مُنہ میں ڈالنا تک مشکل تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان سے میٹھا پانی نازل فرمایا۔ یہ نہروں، دریاؤں، کنوؤں، چشموں کا میٹھا پانی وہی آسمانی پانی ہے جب قیامت قریب ہوگی تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو تھال دے کر بھیجے گا اس تھال کی عظمت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے وہ فرشتہ تمام نازل کردہ پانی اسی تھال میں جمع کر کے بہشت میں لے جائے گا۔

ف: ماء البحر کے کڑوے پن کے متعلق اختلاف ہے بعض نے کہا کہ جب وہ کافی دیر ٹھہرتا ہے تو اسے سورج کی گرمی جلاتی ہے تو وُہ پانی کڑوا ہوجاتا ہے۔ اس کے لطیف اجزاء کو ہوا جذب کرلیتی ہے اس کے غلیظ اجزاء باقی رہ جاتے ہیں زمین کی رطوبت اس کا بقیہ ہیں۔ بعض نے کہا کہ دریا کے اندر چند جڑیں ہیں جو دریا کے پانی کو متغیر کر دیتی ہیں۔ اس معنے پر وہ سخت کڑوا ہوتا ہے۔

وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا اور ان دو دریاؤں کے درمیان میں بنائی بَرْزَخًا اپنی قدرت سے ایک آڑ اور حاجز جو کسی کو نظر نہیں آتا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا، الحجر بمعنے المنع اور المحجور بمعنے الممنوع، اور یہ الحجر کی صفت تاکیدی ہے جیسے لَیل الیل میں الیل لیل کی اور یوم الیوم میں ایوم، یوم کی صفت تاکیدی ہے یہ استعاذہ کا کلمہ ہے جیسے اسی سورت میں پہلے بیان ہوچکا ہے۔ یہاں پر تشبیہ کے طور پر واقع ہوا ہے۔ یعنی ان میں تنافر بلیغ ہے، گویا وہ ہر ایک ایک دوسرے اسی کلمہ سے پناہ مانگتا ہے اور کہتا ہے تجھ پر حرام ہے کہ تو مجھ پر غلبہ

کرسکے اور میری صفت وکیفیت کو زائل کرسکے۔

ف : اکثر اہلِ تفاسیر فرماتے ہیں کہ بحرین سے بحر فارس و بحر روم مراد ہیں اس لیے کہ یہ دونوں بحر محیط میں ملتے ہیں یہی ان دونوں کے ملنے کی جگہ ہے۔ سورۂ کہف میں مجمع البحرین سے یہی جگہ مراد ہے لیکن اس سے لازم ہے کہ ایک میٹھا ہو اور دُوسرا کڑوا۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اس میں میٹھے دریا کا یہاں وجود ہی نہیں۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں دریائے محیط کی دو جھیلیں ہیں وُہ یہاں کڑوا ہے اگرچہ اس کا اصل میٹھا ہے۔ (کذا قال فی فتح القریب عند قولہ تعالیٰ :

وکان عرشہ علی الماء۔

یہاں پر الماء سے میٹھا دریا مراد لیا ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا فرمایا تو دریائے محیط کو زمین سے علیٰحدہ کر لیا اور وہ جملہ زمین کو ایسے محیط ہے جیسے آنکھ میں سیاہ حصّے کو سفید حصہ محیط ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام نہروں کو ایک میٹھا دریا کہا جائے اس لیے کہ ہر بڑی نہر کو بھی دریا کہا جا سکتا ہے (کذا فی مختار الصحاح) جیسے بغداد کے دجلہ کو نہر کہا جاتا ہے جسے دریائے فارس میں ملایا جاتا ہے باوجود اینہمہ اس کا عُمق کئی میلوں تک پھیلا ہُوا ہے اور اس کا ذائقہ کبھی متغیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح نہر طبریہ کہ اس کا ایک حصّہ ٹھنڈا ہے اور دوسرا گرم۔ لیکن کیا مجال ہے کہ اس کا ایک حصّہ دوسرے میں مل جائے۔ آیت میں بہتر ہے کہ اسے دریائے نیل اور بحر اخضر پر محمول کیا جائے۔ بحر اخضر سے دریائے فارس مراد ہے، اور یہ بحرِ ہند کا ایک شعبہ ہے اور یہ بھی دریائے محیط سے متصل ہے اور بحر فارس کڑوا ہے اور یہ عجائبات کے اظہار میں مشہور ہے اسی میں موتی بنتے ہیں اور موتی دریائے شور میں بن سکتے ہیں اور دریائے زنگ کے ملنے سے پہلے دریائے اخضر میں داخل ہوتا ہے۔ السمرج کا یہی معنی ہے۔ اگر دریائے نیل اس میں نہ ملتا تو اسے کوئی بھی نہ پی سکتا کیونکہ دریائے اخضر حد سے زیادہ کڑوا ہے (کذا فی انسان العیون)

ف : بعض علماء نے فرمایا کہ دریائے سیحون وجیحون ونیل وفرات جبل عالی سے زبرجد خضرا سے نکل کر بحر مظلم پر چلتا ہے اور وہ شہد سے میٹھا اور مشک سے زیادہ خوشبودار ہے لیکن اس کے جاری ہونے کی جگہیں متغیر ہو جاتی ہیں اس پر بحر ملح ہے بحر الملح سے بحر ظلمۃ مراد جسے بحر محیط غربی کہا جاتا ہے اسے المظلم اس لیئے کہتے ہیں کہ اس کی آواز ہولناک ہے اور اس سے بڑی بڑی موجیں اُٹھتی ہیں جو بڑی سخت ہوتی ہیں اللہ ہی جانے اس کے اگلے کنارے کے بعد کیا ہے۔ بعض نے کہا کہ میٹھا اور کڑوا پانی دریا میں جمع ہوتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ میٹھا پانی اوپر ہوتا ہے اور کڑوا نیچے۔ لیکن یہ دوسرے پر غلبہ نہیں پا سکتے۔ یہی حجراً محجوراً کا معنے ہے یہ قول اس کے مخالف ہے جو بعض نے کہا ہر نہر کا ابتدائی کنارہ پہاڑوں سے شروع ہوتا ہے اور پھر وُہ جمع ہو کر دریاؤں میں پہنچتی ہیں ان کی گزرگاہوں میں پتھروں کے ٹکڑے اور جھیلیں واقع ہوتی ہیں جب وُہ نہریں دریائے شور میں گرتی ہیں اور ان پر سورج کی روشنی پڑتی ہے تو آسمانی فضا میں بخار اٹھتا ہے، پھر بادل بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہروں کے گرنے سے دریاؤں کے پانی میں اضافہ

نہیں ہوتا۔ اس تقریر سے ثابت ہوتا ہے کہ میٹھا پانی دریا کے اُوپر کے حصّے میں اور کڑوا نچلے حصّے میں ہوتا ہے اس لیے کہ میٹھا پانی خفیف اور کڑوا ثقیل اور بوجھل ہوتا ہے، اور خفیف کا میلان اوپر کو ہوتا ہے۔

ف : وہب نے کہا ہے کہ مچھلی اور بَیل دریا کے اس پانی کو پی جاتے ہیں جو زمین کے پانیوں سے زاید پانی دریا میں پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت تک دریاؤں میں پانی اپنی مقدار سے نہیں بڑھتا۔ اور قدرتِ حق کی کوئی انتہا نہیں۔

اعجوبہ علمائ فرماتے ہیں کہ بحیرہ تنیس ایک ششماہی میٹھا ہوتا ہے دوسری ششماہی کڑوا۔ اس کا یہ حال ہمیشہ رہا اور رہے گا۔

تفسیر صُوفیانہ کاشفی نے لکھا کہ محققین صوفیہ نے فرمایا کہ بحرین سے وہ خوف ورجاء مراد ہے جو مومن کے قلب میں ہے کہ ان دونوں کو ایک دُوسرے پر غلبہ نہیں ہوتا۔ اگر خوف ورجاء کو تولا جائے تو دونوں کا وزن یکساں ہوگا۔

ف : کشف الاسرار میں لکھا ہے کہ بحرِ ملوح عذوبۃ نہیں اور نہ ہی ملح میں ملوحت ہے اصلی جوہریۃ میں دونوں برابر ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی دو الگ الگ متغایر صفتیں پیدا فرمائی ہیں اسی طرح انسانی قلوب کا حال ہے کہ ان میں بعض یقین وعرفان کا معدن ہیں اور ان کے بعض شکوک وکفران کا مرکز۔

ف : بعض بزرگوں نے فرمایا کہ دریا صرف دُو ہیں :

۱۔ بحر المعرفۃ

۲۔ بحر النکرہ

پہلے کو بحر الصفات کہا جاتا ہے اس سے ارواح وقلوب وعقول پر لطائف کا فیضان ہوتا ہے اور یہ عارفین کا حصہ ہے۔ دوسرا بحر الذات ہے یہ کڑوا بایں معنیٰ ہے کہ اس کو قلوب وارواح وعقول حاصل نہیں کر سکتے، اور نہ ہی اس میں کسی نے قدم رکھا ہے۔ اس معنے پر یہ بحر النکرہ ہے۔ ان کے درمیان مشیتِ الٰہی کی آڑ ہے کہ وہ بحرِ صفات کو بحرِ ذات سے ملنے نہیں دیتی اور نہ ہی بحر الذات والے بحرِ صفات والوں کی طرف جا سکتے ہیں نیز یہ بھی ہے کہ اہلِ معرفت قلوب انوار موافقات سے منور ہیں اور بحرِ اہلِ نکرہ کے قلوب ظلمۃ مخالفات سے تاریک ہیں ان کے درمیان عوام کے قلوب ہیں انھیں نہ ورود کی خبر، نہ وصول کا پتا، نہ انھیں خطاب نہ جواب۔ مثنوی شریف میں ہے : ؎

۱ ماہیاں را بحر نگزارد بروں
خاکیاں را بحر نگزارد دروں

۲ اصل ماہی زآب وحیواں از گلست
حیلہ وتدبیر ایں جا باطلست

۳ قفل زفتست وکشاینده خدا
دست درتسلیم زن اندر رضا

ترجمہ: ۱۔ مچھلیوں کو دریا باہر نہیں جانے دیتا۔ خاکیوں کو وہ اپنے اندر نہیں رہنے دیتا۔
۲۔ مچھلی کا اصل پانی اور دوسرے بعض حیوان کا اصل گل ہے۔ حیلہ وتدبیر اس جگہ باطل ہے۔
۳۔ تالہ بند ہے اسے خدا کھولے۔ رضا و تسلیم کو ہاتھ میں لے۔

قطرہ با قلزم چہ استیزہ کند
ابلہست او ریش خود برمے کند

ترجمہ: قطرہ دریائے قلزم سے کیا لڑائی کرے ایسا انسان بے وقوف ہے جو اپنے سے زائد طاقت والے کے ساتھ لڑائی کر کے اپنی داڑھی نوچتا ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ فیاض وہاب سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے بحر فیض کثیر اور عطاءے وفیر میں داخل فرمائے۔ اور وہ اس پر قادر بھی ہے۔

تفسیر عالمانہ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ اور اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا مِنَ الْمَآءِ اس پانی سے جس سے آدم علیہ السلام کا گارا گوندھا گیا، یا اس سے نطفہ مراد ہے بَشَرًا آدمی کو۔ بشر، بشرۃ سے ہے بمعنے ظاہر الجلد [اس معنے پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بشر ہیں، ہمیں اس سے انکار نہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور علیہ السلام بشر تو ہیں لیکن آپ کی حقیقت نور ہے][1] جیسے لفظ ادمہ (محرکۃ) جلد کے اندر کے اس حصہ کو کہا جاتا ہے جو گوشت سے متصل ہے۔ اور انسان کو بشر بھی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا چمڑا بالوں سے ظاہر ہے بخلاف دیگر ان حیوانات کے کہ جن کے چمڑے پر اُون یا بال وغیرہ ہیں جیسے بھیڑ بکری، اونٹ وغیرہ۔ اور قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ بشر آیا ہے وہاں یہی معنیٰ مراد ہے اس میں واحد وجمع یکساں ہیں۔ فَجَعَلَهٗ یہ ضمیر البشر کی طرف راجع ہیں یا الماء کی طرف۔ نَسَبًا وَّصِهْرًا ط یعنی پھر اس بشر یا پانی کو دو قسم بنایا:

(۱) دو نسب یعنی وہ نرینہ رشتہ، جس کی طرف باقی سب منسوب ہوں۔ مثلاً کہا جائے فلان بن فلان اور فلانۃ بنت فلان ؎

فانما امہات الناس اوعیۃ مستودعات وللآباء ابنا

---

[1] اضافہ از اویسی غفرلہٗ

ترجمہ : لوگوں کی مائیں برتن اور امانت کی جگہ ہیں اور ابناً، آباد کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔

(۲) زنانہ رشتہ، کہ جن سے مردوں کے اختلاط سے نسل میں اضافہ ہو۔ کما قال تعالیٰ :

فجعل منہ الزوجین الذکر والانثیٰ۔ ترجمہ: تو بنایا اس سے جوڑا نر اور مادہ۔

ف : امام راغب نے فرمایا کہ نسب ماں باپ کے اشتراک سے ہوتا ہے، یہ دو قسم ہے :

(۱) نسب بالطول جیسے آباؤ ابناؑ کے درمیان اشتراک۔

(۲) نسب بالعرض جیسے اخوۃ و بنی العم کے مابین نسبت کو کہا جاتا ہے۔ نسیب فلان بمعنے فلاں اس کا قریبی رشتہ دار ہے۔ الصھر بنت الرجل کے شوہر یعنی داماد کو کہا جاتا ہے، اسی طرح بہن کا شوہر (بہنوئی) بھی الصھر میں شامل ہے (کذا فی القاموس) اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں۔

ف : تاج المصادر میں ہے کہ المصاھرۃ بمعنی کسی کے ساتھ رشتہ قائم کرنا۔

وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ○ اور تیرا رب بہت قدرت والا ہے کہ اس نے صرف ایک مادہ سے ان گنت انسان پیدا فرمائے، پھر ان کے اعضا اور طبائع بھی مختلف ہیں اور ان کی دو متقابل اقسام بنائیں، کبھی ایک ہی مادہ سے جوڑا (نر، مادہ) پیدا فرماتا ہے۔

ف : کشف الاسرار میں مرقوم ہے کہ یہ آیت حضور علیہ السلام اور حضرت علی و حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کے حق میں نازل ہوئی۔ جب حضور علیہ السلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عزاد اور داماد تھے۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسباً میں شامل تھے اور صھراً میں بھی۔ یہ ابن سیرین کا قول ہے۔

نکاحِ فاطمہ و علی رضی اللہ عنہما عرشِ بریں پر ایک روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف لائے۔ آپ کے ہاتھ میں خوشبودار پھول تھا آپ نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا : اے سلمان! جاؤ، علی (رضی اللہ عنہ) کو بلا لاؤ۔ حضرت سلمان نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عرض کی کہ آپ کو حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم بلا رہے ہیں۔ حضرت علی نے پوچھا : کیوں ؟ اور آپ کیا فرماتے ہیں ؟ اور آپ کس حالت میں ہیں ؟ اس نے عرض کی : ہشاش بشاش اور شاداں و فرحاں۔ اس وقت ایسا لگتا تھا جیسے آپ کا چہرۂ منور ماہِ تاباں اور شمعِ فروزاں ہو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، حضور اکرم نے وہی خوشبودار پھول حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دے دیا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس پھول کی بہت اچھی خوشبو ہے۔ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ پھول اُن پھولوں میں سے ایک ہے جو حورانِ بہشتی نے میری لختِ جگر فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے وقت برسائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پُوچھا کہ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کا عقد کس کے ساتھ ہوا؟ آپ نے فرمایا: آپ کے ساتھ اے علی! (رضی اللہ عنہ) اس کی تفصیل یہ ہے کہ مَیں مسجد میں بیٹھا تھا کہ ایک فرشتہ حاضر ہُوا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا میں نے اس کا نام پُوچھا تو اس نے اپنا نام محمودؔ بتایا۔ اس نے عرض کی مَیں تیسرے آسمان کے فلاں مقام پر رہتا ہوں شب کا باقی تہائی حصّہ رہتا تھا کہ مجھے آسمان کے طبقات سے ایک آواز سنائی دی جس میں تمام طبقات کے ملائکہ مقربین و روحانیین و کروبیین کو چوتھے آسمان کے ایک خاص مقام پر جمع ہونے کا حکم ہوا، وہ حسب الحکم جمع ہو گئے۔ اسی طرح مقعدِ صدق اور تمام بہشت اور جنۃ الفردوس وغیرہ کے ملائکہ اور جنۃ عدن وغیرہ کے اعلیٰ درجات کے فرشتے جمع ہوئے، حکم ہوا کہ اے مقربانِ بارگاہ! اور اے خاصانِ بادشاہِ حقیقی! سورۂ ھل اتیٰ علی الانسان پڑھو۔ سب نے مل کر نہایت خوش الحانی سے مذکورہ سورت پڑھی۔ پھر شجرِ طوبیٰ کو حکم ہُوا کہ وہ اپنے اور بہشت کے خوشبودار پھُول برسائے تاکہ فاطمہ و علی رضی اللہ عنہما کا نکاح پڑھا جائے۔ چنانچہ بہشت کے تمام درختوں اور طوبیٰ نے پھُول برسائے۔ پہلے بتایا گیا ہے کہ طوبیٰ درخت کا پتہ پتہ بہشت کے تمام مکانات کے چپّہ چپّہ سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ طوبیٰ درخت نے حرکت کی تو بہشت کے مروارید اور موتی اور بہترین زیورات جھڑ پڑے۔ اس کے بعد حکم ہوا کہ ایک منبر لائیے جو کہ طوبیٰ کے درخت کے ایک زبرجد کے موتی کا دانہ تھا، اسے وہاں بچھایا گیا اور ساتویں طبقہ کا ایک حیل نامی فرشتہ بلایا گیا جو تمام ملائکہ سے فصیح ترین اور قادر الکلام فرشتہ ہے وہ اسی منبر پر تشریف لایا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور پیغمبرانِ عظام پر درود بھیجا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جبرائیل و میکائیل علیہما السلام کو بلاواسطہ بلاکر گواہ بنایا اور فرمایا کہ میں نے فاطمۃ الزہرا اور علی رضی اللہ عنہما کا عقد نکاح کیا اور میں ہی ان دونوں کا متولی ہُوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جَنّات عدن کے نیچے سے ایک بہترین اور روشن ترین بادل کو فرمایا کہ وہ موتیوں کی بارش برسائے۔ اس کے بعد جملہ رضوان و ولدان و حورانِ بہشت نے موتی نچھاور کیے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے یہی خوشخبری اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو بھجوائی اور فرمایا کہ میں نے فاطمہ و علی رضی اللہ عنہما کا عقد آسمان پر کر دیا آپ ان کا عقد زمین پہ کیجئے۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرشتے کا بیان سُن کر تمام مہاجرین و انصار کو بُلایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منہ کر کے فرمایا: اے علی (رضی اللہ عنہ)! یہی حکم مجھے آسمان سے پہنچا ہے، میں نے فاطمہ کا نکاح تم سے کر دیا آپ چار درہم مہر ادا کیجئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا میں نے قبول کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بارك الله فيكما (اللہ تعالیٰ آپ دونوں کو برکت دے)[1]

ف: انسان العیون میں لکھا ہے کہ یہ نکاح ہجرت کے دوسرے سال ہوا اور ماہِ رمضان میں یہ رسم ادا کی گئی۔

---

[1] انسان العیون۔

اس وقت بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عمر مبارک پندرہ سال اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر مبارک اکیس برس اور پانچ ماہ تھی۔ ولیمہ میں ایک بکرا ذبح کیا گیا جو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔ چند سیر جوار کی روٹیاں پکائی گئیں۔ اس وقت انصار کی ایک بہت بڑی جماعت موجود تھی۔

صحابہ کرام کے تعلقات کا نمونہ

مروی ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کا رشتہ مانگا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پُوچھا تو بی بی صاحبہ خاموش ہوگئیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور نے فرمایا کہ بیٹی! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کے ساتھ عقد نکاح کی درخواست کی ہے آپ کی کیا مرضی ہے۔ یہ سُن کر بی بی صاحبہ رو پڑیں اور عرض کی: ابّا جان! آپ مجھے قریش کے غریب ترین انسان سے نکاح کے لیے فرماتے ہیں[1]۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیٹی! میں نے خود نہیں فرمایا مجھے تو آسمان سے اللہ تعالیٰ کا حکم ہُوا ہے۔ بی بی صاحبہ نے عرض کیا: تو پھر میں ویسے ہی راضی ہُوں جیسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہیں۔ اس سے قبل ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے بی بی صاحبہ کے عقد کے لیے عرض کیا تھا تو حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جیسے حکمِ ربانی ہوگا میں بھی انتظار کرتا ہُوں تم بھی انتظار کرو۔ اس کے بعد حضرت علی کو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ نے مشورہ دیا کہ آپ بھی حضور علیہ السلام سے بی بی فاطمہ سے نکاح کی درخواست کیجئے۔ حضرت علی رضی اللہ نے شکریہ ادا کرتے ہُوئے دونوں حضرات سے فرمایا کہ آپ حضرات نے مجھے ایسے امر کا مشورہ دیا جس کا مجھے خیال تک نہ تھا۔ اس کے فوراً بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا عقد نکاح میرے ساتھ کر دیجئے۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپ کے پاس مال کتنا ہے؟ عرض کی: ایک گھوڑا اور ایک زِرہ۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: گھوڑے کی تو آپ کو جہاد کے لیے ضرورت پڑے گی البتہ اپنی زِرہ بیچ ڈالئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی زرہ چار سو اسّی درہم میں بیچ ڈالی اور وہ دراہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہُوئے۔ آپ نے وہ دراہم لے کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ بازار سے خوشبو وغیرہ خرید لائیے۔ پھر حضور علیہ السلام نے نکاح کا خطبہ پڑھا جس کے الفاظ مبارک یہ تھے:

الحمد للہ المحمود بنعمتہ المعبود بوحدتہ الذی خلق الخلق بقدرتہ ومیزھم بحکمتہ ثم ان اللہ تعالیٰ جعل المصاھرۃ نسبا وصھرا وکان ربک قدیرا ثم ان اللہ امرنی ان ازوج فاطمۃ من علی علی اربعمائۃ مثقال فضۃ ارضیت یا علی۔

---

[1] آپ حیران نہ ہوں کہ بی بی صاحبہ نے یہ کیا کہہ دیا، جو کہا صحیح کہا۔ شیعہ کی روایات دیکھیے جن میں انہوں نے کمال کر دیا۔ دیکھئے جلاء العیون۔ اویسی غفرلہٗ۔ تفصیل کے لیے دیکھئے فقیر کی کتاب آئینہ شیعہ نما اور چشمہ نور افزا۔

(جمیع محامد اللہ محمود کے لیے اس کی نعمت کے ساتھ جو وہ وحدانیت میں واحد معبود ہے اور اس نے مخلوق کو اپنی قدرت سے پیدا فرمایا اور انھیں اپنی حکمت سے جدا کیا پھر اللہ تعالیٰ نے مصاہرہ کو نسب و صہر کا سبب بنایا اور تیرا رب قادر ہے۔ اس کے بعد مجھے حکم دیا کہ میں فاطمہ کا نکاح علی (رضی اللہ عنہا) سے کردوں اور اس سے چار سو مثقال چاندی مہر کے عوض کروں (پھر آپ نے فرمایا) اے علی! تم اس سے راضی ہو)

اس کے بعد حضرت علی نے خطبہ پڑھا:

الحمد للہ شکرا لا نعمہ و ایادیہ واشھد أن لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریك لہ شھادۃ تبلغہ و ترضیہ۔ (اس کی نعمتوں پر شکر و حمد ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ایسی جو اس تک پہنچائے اور راضی کر دے۔)

شادی کے بعد حصولِ برکت کا طریقہ

جب عقدِ نکاح کی رسم ادا ہو گئی تو حضور علیہ السلام نے کھجور کا تھال منگوایا اور حاضرین کے سامنے رکھ کر فرمایا کہ لے جا کر تقسیم کر دو یہ علی و فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کے ولیمہ کی دعوت ہے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا:

لا تحدث شیئا حتی تلقانی۔

(میرے حکم کے بغیر کسی سے بات نہ کرنا)

اس کے بعد بی بی اُم ایمن رضی اللہ عنہا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو لائیں اور بی بی صاحبہ کو گھر کے ایک کونے میں بٹھا دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ گھر کے دوسرے کونے میں بیٹھے تھے حتیٰ کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا:

ائتنی بماء۔ (پانی لائیے)

بی بی شرم و حیا سے کپڑوں میں چھپی چھپی ایک پیالے میں پانی لائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پیالہ لے کر اس میں کلی کی اور بی بی صاحبہ کو فرمایا:

لیجئے اس پانی سے اپنی چھاتیوں اور سر پر چھینٹے ماریے۔

اور فرمایا:

اللھم انی اعیذ ھا بك و ذریتھا من الشیطن الرجیم۔

(اے اللہ! میں اسے اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتا ہوں اور ان کے لیے شیطان رجیم سے پناہ چاہتا ہوں)

بعدہٗ پھر فرمایا:

ائتونی بماء (پانی لائیے)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں سمجھ گیا کہ یہ پانی میرے لیے ہوگا۔ اس لیے مَیں اُٹھا اور پانی کا پیالہ بھر لایا آپ نے اسے لے کر کُلی کر کے پیالے میں ڈال دی اور میرے لیے وہی حکم فرمایا جو فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کو فرمایا تھا۔ پھر میرے لیے وہی دُعا مانگی جو فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کے لیے مانگی تھی۔ اس کے بعد ہمارے لیے مشترک دُعا مانگی:

اللھم بارك فیھما و بارك علیھما و بارك لھما فی شملھما۔

(اے اللہ! ان دونوں میں اور ان دونوں کے لیے اور ان دونوں کے جماع میں برکت عطا فرما)

پھر سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھیں اور مجھے فرمایا:

ادخل باھلك باسم اللہ و البرکۃ۔ یعنی اپنی اہلیہ کو اللہ کے نام اور اس کی برکت سے لے جا۔

فاطمۃ الزہرآ و علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما کا بستر مبارک ان دونوں حضرات کا بستر مبارک بکرے کے چمڑے کا تھا، ایک کمبل تھا جسے سر کی طرف کرتے تو پاؤں کی جانب خالی ہو جاتی اور اگر پاؤں کی جانب پُورا کرتے تو سر کی جانب خالی۔ ایک روز بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ ہمارا محض بکرے کے چمڑے کا ایک بستر ہے جسے ہم رات کو آرام کرنے کے لیے بچھاتے ہیں اُسی میں دن کو اونٹ کے لیے گھاس لاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

یا بنیۃ اصبری فان موسیٰ بن عمران علیہ السلام اقام مع امرأتہ عشر سنین لھما فراش الاعبارۃ قطوانیۃ۔

(بیٹی! صبر کیجئے حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السّلام کا بستر دس سال تک صرف ایک قطوانیہ کی عبا تھی اور بس)

ف: قطوانیہ کوفہ کی بستی قطوان کی طرف منسوب ہے۔

ولادت و وصالِ فاطمۃ الزہرآ رضی اللہ عنہا نبوت سے پانچ سال پہلے بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطنِ اطہر سے بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا پیدا ہُوئیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے چھ ماہ بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا وصال ہُوا۔ آپ کی کل عمر مبارک اٹھائیس سال تھی۔ آپ کے بے شمار مناقب ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کُوفہ میں ہُوئی اور آپ کی عمر مبارک تریسٹھ سال تھی۔ آپ کی نمازِ جنازہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پڑھائی اور آپ کو رات کے وقت اندھیرے میں دفن کرکے بنو امیہ کے دور میں آپ کی قبر انور کو پوشیدہ رکھا گیا۔ خلافت بنی العباس کے شروع تک آپ کا مزار پوشیدہ رہا۔ پھر حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ

نے بتایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مزار انور فلاں جگہ ہے۔

ف: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ان کی حسبِ وصیت پڑھائی تھی۔

حدیث شریف حضور علیہ السلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

یهلك فيك رجلان محب مطر و كذاب مفتر۔

(دو گروہ آپ کی وجہ سے تباہ و برباد ہوں گے:

۱۔ حد سے زائد محبت کرنے والے۔

۲۔ آپ پر جھوٹ باندھنے والے (مفتری) [یعنی شیعہ اور خارجی وغیرہ] کذا فی انسان العیون۔

تفسیر صوفیانہ تاویلاتِ نجمیہ میں ہے کہ آیت میں اشارہ ہے کہ انسان دو مختلف جنسوں سے مرکب ہے؛ اس کی ظاہری صورت عالم خلق سے اور اس کی روح عالم امر سے ہے ان کے درمیان نسب و صہر کا رشتہ قائم کیا گیا اس کی نسبت رُوح کی طرف ہے اور روح اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی دلیل آیت و نفخت فیه من روحی ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے کی دلیل یہ حدیث ہے:

انا من الله و المؤمنون منّی۔

(میں اللہ سے ہوں اور مومن مجھ سے ہیں)

اہل اللہ اسی خاص نسب کی طرف منسوب ہیں اور ان کی صہری رشتہ داری ان کی بشریت ہے جسے پانی سے پیدا کیا گیا۔ کما قال:

انی خالق بشرا من طین فاذا سوّیته و نفخت فیه من روحی۔

(بے شک میں نے بشر کو گارے سے بنا کر اسے برابر کیا پھر اس میں اپنی رُوح پھونکی)

اس میں اللہ تعالیٰ نے دو امر جمع فرمائے۔ عوام انسانوں کو اسی صہری رشتہ داری سے بنایا۔ اسی وجہ سے ان پر خواص بشریت غالب ہے۔ مثلاً حرص و شہوت اور ہویٰ و غضب، انہی وجوہ سے عوام درکات سفلیہ کی طرف دھکیلے جاتے ہیں اور اہل نسب پر روحانیت کے خواص غالب ہوتے ہیں۔ مثلاً شوق، محبت (عشق)، طلب، حلم، کرم۔ انہی اسباب سے یہ حضرات درجات علیا پر فائز ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ وُہ ان دو گروہوں کو دو مختلف طریقوں سے بنائے۔ حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا:

قرب تو با اسباب و علل نتواں یافت
بہ سابقۂ فضل ازل نتواں یافت

ترجمہ: تیرا قرب اسباب وعلل سے نصیب نہیں ہوتا۔ سابقہ ازل کے بغیر اس کا ملنا محال ہے۔ ہر مقصود کا سوال اور اس کی اُمید اللہ تعالیٰ سے ہی ہے۔

تفسیر عالمانہ وَيَعْبُدُوْنَ اور مشرک عبادت کرتے ہیں درانحالیکہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے تجاوز کرنے والے ہیں مَا لَا يَنْفَعُهُمْ ایسی چیزوں کی عبادت کرنے میں جو انھیں کسی قسم کا نفع نہیں دیتیں۔ النفع بمعنے ایسی شے کہ جس سے بھلائی تک پہنچنے میں مدد حاصل کی جائے اور اسی کے ذریعہ خیر تک پہنچا جا سکے۔ یہاں پر خیر مراد ہے۔ اس کی نقیض ضُرٌّ آتی ہے وَلَا يَضُرُّهُمْ اور نہ ہی انھیں وہ ضرر پہنچاتے ہیں یعنی اگر ان کی عبادت نہ کی جائے تو انھیں ان سے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا۔ اس سے اصنام مراد ہیں۔ اسی طرح مخلوق میں دیگر وُہ چیزیں جو ان کے حکم میں ہیں اس لیے مخلوق میں کوئی شئے مستقل بالذات نہ کسی کو نفع دیتی ہے نہ نقصان [1] اور ظاہر ہے کہ جو مستقل بالذات کسی کو نفع ونقصان نہ پہنچائے تو اس کی عبادت سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس پر کسی معاملہ کا اعتماد نہ ہونا چاہیے اور نہ ہی اس کی اتباع کرنی چاہیے وَكَانَ الْكَافِرُ اور کافر کفر اور حق سے عداوت کی وجہ سے ہے عَلٰى رَبِّهٖ اپنے رب تعالیٰ کے ساتھ، یعنی وُہ کریم جو نعمتوں سے اپنے بندوں کی تربیت فرماتا ہے یہ ظَهِيْرًا کے متعلق ہے، شیطان کا مددگار۔ یہاں پر ظہیر بمعنے مظاہر یعنی معین ومددگار ہے اور کافر سے جنس کا فریا ابوجہل مراد ہے اس لیے کہ اس نے رحمان تعالیٰ کی نافرمانی اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں اصرار پر شیطان کی اعانت کی اور لوگوں کو نبی علیہ السلام کے ساتھ جنگ لڑنے پر ابھارنا وغیرہ بھی شیطان کی اعانت میں شامل ہے وَمَا اَرْسَلْنٰكَ ہم نے آپ کو کسی حال میں نہیں بھیجا اِلَّا مگر اس حال میں کہ آپ مُبَشِّرًا اہل ایمان کو جنت ورحمت کی خوشخبری سنانے والے۔ اَلتَّبْشِيْر سے مراد ہے ایسی خبر سنانا جس میں سرور وفرحت ہو وَّنَذِيْرًا ۝ اور کافروں کو نار وغضبِ الٰہی سے ڈرانے والے۔ الانذار ایسی خبر سنانا جس میں ڈر اور خوف ہو قُلْ اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! آپ انھیں فرمائیے مَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ میں تم سے تبلیغِ رسالت پر کچھ نہیں مانگتا ——

---

[1] یہی قاعدہ ہے جس سے دیوبندی، نجدی، مودودی وغیرہم عمداً چشم پوشی کرتے ہیں یا واقعی جہالت کے شکار ہیں ورنہ ہم اہلسنت کسی نبی ولی کو مستقل بالذات نفع ونقصان کا مالک نہیں بناتے بلکہ مستقل بالذات ماننے والے کو ہم بھی مشرک اور بے دین کہتے ہیں۔ بحمدہٖ تعالیٰ ہم اہلسنّت میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں۔ یہ ان لوگوں کا ہمارے اوپر بہتان وافترا ہے کہ بریلوی انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کو مستقل بالذات نفع ونقصان کا مالک مانتے ہیں۔ ہاں ہم بفضلہ تعالیٰ انھیں اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے مان کر انھیں اللہ تعالیٰ کے اذن وعطا سے نفع ونقصان کا سبب اور وسیلہ مانتے ہیں اور یہی اسلام کا ضابطہ ہے، ولکن الوہابیۃ قوم لا یعقلون۔ اویسی غفرلہٗ

تبلیغِ رسالت کا اضافہ ہم نے سابقہ جملہ وما ارسلناک الخ کی وجہ سے کیا ہے مِنْ اَجْرٍ اجر اور مزدوری جو تمھاری طرف سے مجھے حاصل ہو جس کی وجہ سے تم کہو کہ نبی علیہ السلام چونکہ تبلیغِ احکام پر ہم سے مال طلب کرتے ہیں اسی لیے ہم ان کی اتباع نہیں کرتے۔

ف : ہر وُہ فائدہ جو انسان کو عمل کرنے پر حاصل ہو اسے اجر کہتے ہیں وہ دنیوی ہو یا اُخروی۔

اِلَّا مَنْ شَآءَ مگر وُہ جو ارادہ کرے اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا ○ اپنے رب تعالیٰ کی طرف راہ بنائے ، یعنی اس کا مقرب ہو یا اس کے تقرب کا متلاشی ہو اس پر ایمان لاکر یا اس کی اطاعت کرکے ، جیساکہ میں تمہیں اس کی دعوت دیتا ہوں ، یعنی میں تم سے صرف یہی چاہتا ہوں کہ تم ایمان قبول کرو اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اگر تم میں سے مجھے کوئی اس کی مزدوری دینا چاہتا ہے تو میری مزدوری یہی ہے کہ میری دعوت قبول کرلے ، ورنہ مجھے تمہارے اجر و مال کی ضرورت نہیں اس لیے کہ میرے رب تعالیٰ نے جو کچھ مجھے عطا فرمایا ہے وہ بہت ہے اور میرا اجر و ثواب ان کے ہاں مقرر ہے کیونکہ قیامت میں جہاں وُہ اپنے نیک بندوں کو اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔ پیغمبروں کو بھی اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔

ف : یہاں استثناء منقطع ہے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ میں تم سے اپنے لیے مال کا سوال نہیں کرتا ، ہاں تم سے کوئی محض رضائے الٰہی کی طلب پر جتنا چاہے مجھے دے تو میں اس سے منع نہیں کرتا۔

تفسیر صُوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے الّا من شاء ان یتخذ ہاں جو اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت اور اس پر خرچ کرکے یا اس کی تعظیم کرکے اِلٰی رَبِّہٖ اپنے پروردگار کی قُرب و منزلت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے مشایخ کرام نے فرمایا کہ سالک کو اطاعت سے جنت اور بزرگوں کی تعظیم و تکریم سے قُربِ الٰہی نصیب ہوتا ہے۔

مسئلہ : فتوحاتِ مکیہ میں فرمایا کہ واعظ کو وعظ و تقریر سے اُجرت لینا ہمارے نزدیک جائز ہے اور حلال روزی کے طالب کو یہ اجر حلال ہے اگرچہ اس کا ترک افضل ہے۔

مزید توضیح وعظ و تقریر پر اُجر و قیمت لینے کی حکمت یہ ہے کہ دعوت الی الحق اجارہ کی مقتضی ہے ، اسی لیے ہر نبی علیہ السلام نے دعوتِ حق کے وقت بار بار فرمایا :

ان اجری الّا علی اللّٰہ۔

(میرا اجر و ثواب اللہ کے ہاں ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ ہر نبی علیہ السلام نے دعوت کو اجر و مزدوری ظاہر فرمایا ، اگرچہ مخلوق سے نہیں بلکہ خالق سے سہی۔

مسئلہ: اس سے ثابت ہُوا کہ اذان واقامت، تعلیم وتدریس، فقہ و قرآن اور اس کے پڑھنے اور حج اور جنگ اور وعظ وتقریر پر اُجرت، تنخواہ، نذرانہ وغیرہ لینا جائز ہے کیونکہ آج کے زمانہ میں دینی امور میں رغبت گھٹ گئی ہے اگر اجر و مزدوری تنخواہ کو منع کیا جائے تو دین و اسلام کا کام رک جائے گا۔

مسئلہ: اگرچہ شرعی امور کو ظاہر کرنا واجب ہے لیکن وہ اجر و تنخواہ اور نذرانے کے بغیر نہ بتائے تو بھی جائز ہے۔ مثلاً مفتی، معلم (مدرس)، امام (پیش امام) وغیرہم کو اپنی ڈیوٹی کی ادائیگی واجب ہے لیکن اگر وہ اپنی ڈیوٹی پر تنخواہ وغیرہ لیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔ کما فی الکرمانی وغیرہ (شرح بخاری) وغیرہ۔

مسئلہ: غسّال (میّت کو نہلانے والا) اگر کسی بستی میں سوائے اس کے اور کوئی نہ ہو تو وہی غسل (میت) کے لیے متعین ہو جانا چاہتا ہے تو اسے اجر و مزدوری نہیں لینی چاہیے۔

تفسیر عالمانہ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ اور اس ذات پر توکّل کیجئے جو ہمیشہ زندہ ہے اور اس پر موت طاری نہیں ہوتی، وہی سب کو شرور سے بچاتا ہے اور وہی ہر ایک کا کارساز ہے اسی لیے لائق ہے کہ اسی پر توکّل کیا جائے کیونکہ دوسرے مجازاً حیّ ہیں لیکن پھر بھی ان پر موت واقع ہوتی ہے پھر جب ان پر موت واقع ہوگی تو پھر ان پر توکّل (بھروسا) منقطع ہو جائے گا۔ توکّل کا معنیٰ یہ ہے کہ انسان یہ یقین کرے کہ جملہ حوادث اللہ تعالیٰ سے صادر ہوتے ہیں اس کے سوا کسی حادثہ کی کوئی ایجاد نہیں کرتا۔ اسی لیے اپنی جملہ ضروریات اسی کے سپرد کی جائیں گی۔

مسئلہ: مذکورہ بالا عقیدہ فرض ہے اور یہ ایمان کی شرائط سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وعلی اللہ فتوکّلوا ان کنتم مؤمنین۔

(اور اللہ تعالیٰ پر توکّل کرو اگر تم مؤمن ہو)

مسئلہ: اس کے علاوہ جو قلب کو سکون اور اضطراب و پریشانی سے دُوری حاصل ہوتی ہے وہ توکّل کے کمالات سے ہے (کذا فی التاویلات النجمیہ)

مسئلہ: واسطی نے فرمایا جو غیر اللہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ پر توکّل کرتا ہے تو اس کا توکّل خدا پر نہیں بلکہ غیر اللہ پر ہے۔

نکتہ: ہم صرف توکّل پر عمل کرنے سے سُنّت کے عامل ہو سکتے ہیں یا کسبِ معاش سے؟ یہ سوال حضرت ابن سالم رحمہ اللہ سے ہُوا، آپ نے جواباً فرمایا کہ حقیقی توکّل تو صرف رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو حاصل ہُوا اس مرتبہ کو حاصل کرنا معمولی بات نہ تھی اگر حضور علیہ السّلام کی طرح ہر کوئی مامور ہوتا تو کوئی بھی پُورا نہ اُترتا کیونکہ ضعفِ حال سے ان کے حقیقی توکّل کی تاب بھی جب وہ توکّل کے مرتبہ سے گر گئے تو پھر اُنہیں کسبِ معاش کا حکم بھی ہوا تاکہ رسالت پناہی

(صلی اللہ علیہ وسلم) کی دوسری سنّت سے محروم نہ رہ جائیں۔ اگر یہ دُوسرا حکم نہ ہوتا تو سب کے سب حکمِ الٰہی کی نافرمانی کے گڑھے میں گر جاتے۔

ف: عوام کا توکّل یہ ہے کہ جب کچھ ملے تو شکر کریں اور جب نہ ملے تو صبر کریں۔ اور خواص کا توکّل یہ ہے کہ جب کچھ ملے تو لے لیں اور جب نہ ملے تو شکر کریں۔

لطیفہ اولیائے کرام کے لیے اللہ تعالیٰ ایسے اسباب آسان فرماتا ہے جہاں ان کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا، اگرچہ بعض اوقات ان کے اسباب تیار کردہ ہوتے ہیں لیکن ان کو بھی اللہ تعالیٰ آسان فرماتا ہے۔

لطیفہ خالص اصفیاء کا توکّل یہ ہے کہ پہلے وہ اپنی آرزوئیں ختم کرتے ہیں، اس کے بعد وہ اس کی طلب کرتے ہیں (مل جائے تو سُبحان اللہ ورنہ ان کے قلب پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ہوتا)

نکتہ کامل توکّل کی علامت اس شیر خوار بچے کی ہے کہ اسے اپنی ماں کے سوا کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی۔ ایسے ہی سالک کا کام ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو ملجا و ماویٰ نہیں سمجھتا۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ نیست کسبے از توکّل خوب تر
چیست از تسلیم خود محبوب تر

۲ طفل تا گیرا و تا پویا نبود
مرکبش جز گردن بابا نبود

۳ چوں فضولی گشت و دست و پا نمود
در عنا افتاد و در کور و کبود

۴ ما عیال حضرتیم و شیر خواہ
گفت "الخلق عیال للالٰہ"

۵ آنکہ او از آسمان باران دہد
ہم تواند کو ز رحمت نان دہد

ترجمہ: ۱۔ توکّل سے بہتر کوئی عمل نہیں۔ تسلیم و رضا سے بھی خوب تر کوئی کام نہیں۔
۲۔ بچے کو کیا پرواہ کچھ ہو نہ ہو اس کے سوائے باپ کی گردن کے اور کوئی سواری نہیں۔
۳۔ جب بڑا ہوا اور ہاتھ پاؤں پالئے تو تکلیف میں پڑا اور پریشانیوں میں مبتلا ہوا۔
۴۔ ہم حضرت کے عیال اور شیر چاہنے والے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خلق اللہ تعالیٰ کا عیال ہے۔
۵۔ وہ ذات جو اپنے فضل سے آسمان سے بارش بخشتی ہے وہی اپنی رحمت سے روٹی دے گی

تفسیر عالمانہ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ اور اس کی حمد کرتے ہوئے اس کے ہر نقصان اور ہر وہم وگمان سے تنزیہ بیان کیجئے اور جتنے کمالات بیان ہو سکتے ہیں اس کی نعمتوں کی شکر گزاری کیجئے۔

حدیث شریف میں ہے:
من قال کل یوم سبحان اللہ وبحمدہ مائۃ مرۃ غفرت ذنوبہ ولو کانت مثل زبد البحر۔

نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص دن میں سو بار حمد و تسبیح کا ورد کرتا ہے اس کے جملہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔ (کذا فی فتح الرحمٰن)

وَكَفٰى بِهٖ با زائدہ تاکید کے لیے ہے یعنی وہ ذات جو ہمیشہ زندہ ہے اس پر کبھی موت نہیں آئے گی بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ اپنے بندوں کے ظاہری و باطنی گناہوں کے لیے کافی ہے خَبِيْرًا مطلق خبیر ہے۔ اسی لیے وہ پوری جزا عطا فرمائے گا۔ وہ اجر و ثواب عطا فرمانے میں کسی کا محتاج نہیں الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا۔ یہ جملہ محلاً مجرور اور الحی کی دوسری صفت ہے وَمَا بَيْنَهُمَا اور ان کے درمیان جتنے موالید و ارکان ہیں سب کا خالق وہی ہے فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ چھ دنوں میں۔ یعنی یہی دنیوی چھ ایام، کیونکہ وہاں نہ سورج تھا نہ چاند۔ باوجودیکہ وہ ان کو ایک لمحہ میں پیدا فرما سکتا تھا لیکن پھر بھی چھ دن لگائے۔ اس میں اپنے بندوں کو بتانا تھا کہ کاروبار میں عجلت نہ کرنا مستحب ہے ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ عرش اور اس کے ماسوا اسی کا تصرف ہے۔

حلِ لغات الاستواء بمعنی استقرار و تساوی اور بالذات شے کا معتدل ہونا۔ جب یہ لفظ علیٰ سے متعدی ہو تو استیلاء و غلبہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ (کذا فی المفردات)

یہاں یہی معنیٰ مراد ہے ملک و سلطان سے کنایہ ہے یعنی وہی عرش اور اس کے ماسوا کا مالک ہے۔ عرش کی تخصیص اس لیے کہ وہ تمام اجسام سے عظیم ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ خبر ہے، اس کا مبتدا محذوف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے اجرام علویہ و سفلیہ اور آسمان و زمین کے درمیان ہر شے کو پیدا فرمایا۔ یہ آنے والے مضمون کی تمہید ہے۔ واذا قیل لھم اسجدوا للرحمٰن (اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ رحمان کو سجدہ کرو) میں اشارہ ہے کہ استواء مذکور میں مرتبۂ رحمانیہ کی تعیین ہے۔ فَسْئَلْ بِهٖ یہ مابعد کے متعلق ہے یعنی خَبِيْرًا سے، جیسے انہٗ بھم رؤف رحیم میں بھم، رؤف رحیم کے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں ہیں یعنی خلق و استواء کے معانی خبیر سے پوچھیے کیونکہ وہ صفات و افعال کو خوب جانتا ہے۔ کما قال:

ولا ینبئك مثل خبیر (خبیر جیسا تمھیں کوئی خبر نہ دے سکا)

اور فرمایا :

وما یعلم تاویلہ الا اللہ۔

(اس کی تاویل صرف اللہ ہی جانتا ہے)

ف : بعض نے اس کا عطف والراسخون بنایا ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوگا کہ وہ معنی راسخین ہی جانتے ہیں۔ فلہٰذا ان سے سوال کیجئے۔ استواء علی العرش کی تحقیق ہم نے سورۂ اعراف، یونس، طٰہٰ میں تفصیل سے لکھی ہے۔

تفسیر صوفیانہ فتوحات مکیہ میں ہے کہ جب مسلّم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سلطانِ اعظم ہے اور سلطان کا کوئی مکان ضروری نہیں جہاں جا کر رعایا اپنی ضروریات وحاجات پیش کر سکے، وہ مکان سے منزّہ ہے، لیکن یہ اس کی مہربانی اور لطف وکرم ہے کہ اس نے اپنے ملنے کا ایک ایسا مرتبہ بتایا جسے عرش سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی لئے فرمایا استوی علی العرش تاکہ بندے اس کی طرف اپنی ضروریات لے جائیں۔ اس میں بندوں پر رحمت کا اظہار ہے نیز یہ بندوں کے عقول کے مطابق بھی ہے ورنہ وہ ہمیشہ حیران وششدر رہتے۔ اور پھر بندوں میں قلب کو ذوجہۃ پیدا فرمایا کہ وہ ہر اس شے کو قبول کرتی ہے جو جہت والی ہو، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے جہتیں بیان فرمائی ہیں، کبھی فوقیت یعنی عرش وسمأ اور کبھی احاطہ۔ کما قال ؛

اینما تولوا فثم وجہ اللہ۔ ترجمہ : جہاں منہ پھیرو وہاں اللہ ہے۔

اور فرمایا :

ینزل ربنا الی سماء الدنیا۔ ترجمہ : اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کی طرف ہمارا رب ہے۔

اور حضور علیہ السلام نے فرمایا :

ان اللہ فی قبلۃ احدکم۔ ترجمہ : بے شک اللہ تعالیٰ تمھارے قبلہ میں ہے۔

(بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے قبلہ کی جانب میں ہوتا ہے)

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جملہ امور کو اعیان کے لیے نہیں بلکہ مراتب کے لیے پیدا فرمایا۔

تفسیر عالمانہ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اور جب اہل شرک کو کہا جاتا ہے اسْجُدُوْا نماز پڑھو۔ نماز کو سجدہ سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ سجدہ نماز کے عظیم ترین ارکان سے ہے لِلرَّحْمٰنِ رحمٰن کے لیے، یعنی وہ ذات جس نے اپنی رحمت سے موجودات کو پیدا فرمایا قَالُوْا مشرکین نے کہا وَمَا الرَّحْمٰنُ رحمان کیا شے ہے یا وہ کون ہے ؟ کیونکہ لفظ ما کے وضع عام ہے یا ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں پر اس مسمّی سے سوال ہے جو اس نام سے موسوم ہے اور سوال اس لیے کیا کہ وہ مشرکین اللہ تعالیٰ کا یہ نام نہیں جانتے تھے اگرچہ کتب سابقہ میں موجود تھا کہ رحمٰن بھی اللہ تعالیٰ کا نام ہے یا وہ اس نام کو جانتے تو تھے لیکن

ان کا خیال تھا کہ اس کا اطلاق غیر اللہ پر بھی ہوتا ہے جیسے مسیلمۃ الکذاب کو "رحمان الیمامہ" کہتے ہیں اور مشرکین اس کی بھی تکذیب کرتے تھے اسی لیے غلطی کھا گئے ہیں اور ہر غیر اللہ یعنی "رحمان الیمامہ" کی عبادت کا بھی۔ اور یہ استہزاءً کہتے تھے، جیسے منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ استہزاء کرتے تھے۔ کما قال تعالیٰ:

ولئن سألتهم ليقولن انما كنّا نخوض ونلعب۔

منافقین نے سوال کے جواب میں دو غلطیاں کھائیں اور دعویٰ کیا کہ وہ اپنے قول میں سچے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی۔ کما قال تعالیٰ:

قل اباللّٰہ و اٰیاتہ کنتم تستھزءون۔

(فرمایئے کیا تم اللہ اور اس کے آیات کے ساتھ استہزاء کرتے ہو)

مغالطہ کا موجب متکلم کے کلام سے معلوم ہوا کیونکہ ہر کلام کی مثل اور نقیض بھی ہوتی ہے، اور یہاں نقیض موجود ہے کہ اسے منافقو! تم استہزاء کر رہے ہو اور استہزاء سے ہی تمہاری صداقت کی بجائے تکذیب ٹپکتی ہے (کذا فی العقد الفرید للعلامہ ابن طلحہ)

اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا کیا ہم سجدہ کریں اس کے لیے جس کا تو ہمیں حکم فرماتا ہے وہ تو اسے جانتے ہی نہیں۔ ماذا استفہام انکاری ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہم رحمان کو سجدہ ہرگز نہیں کریں گے وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ۩ اور رحمان کے سجدے کا حکم بڑھاتا ہے ان کے ایمان کی نفرت سے۔ نفور بمعنے انزعاج عن الشئ والتباعد یعنی ایک شے کا دوسری شے سے دور ہونا۔ اس کی نظیر آیہ فلم یزدھم دعائی الا فرارا ہے۔

مسئلہ: جو سرے سے رحمٰن سے ناواقف ہے یا اسے جانتا ہے لیکن اس سے ایسا قول وفعل صادر ہوتا ہے جو کافروں کے افعال واقوال کے مشابہ ہے، تو وہ بھی بالاتفاق کافر ہے۔ (کذا فی فتح الرحمٰن)

مسئلہ: اس کی مثال صنم (بت) کو سجدہ کرنا یا قرآن مجید کو گندگی میں ڈالنا یا کفریہ کلمات بکنا، یہ بھی بالاتفاق کفر ہے۔ کیونکہ یہ بھی تکذیب کی علامت ہے۔

ف: حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ جب یہی آیت پڑھتے تھے تو آسمان کی طرف سر اٹھا کر عرض کرتے:

اللھم زادنی خضوعا ما زاد اعداك نفورا۔

(یا الٰہی! میرے خشوع وخضوع میں اتنا اضافہ کر، جتنا دشمنوں کو دین سے نفرت ہے)

حدیث شریف ایک شخص نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کی کہ آپ دعا فرمائیے کہ جنت میں مجھے آپ کی رفاقت نصیب ہو۔ آپ نے اسے فرمایا:

اعنی بکثرۃ السجود۔

(کثرتِ سجود سے میری معاونت کیجئے)

مسئلہ: فتح الرحمٰن میں ہے کہ سجداتِ تلاوت میں ایک سجدہ اسی آیت پر ہے۔

ف: جناب کاشفی رحمہ اللہ نے فرمایا: سجداتِ تلاوتِ قرآن کا یہ ساتواں سجدہ ہے۔ یہی امام اعظم رحمہ اللہ کا مذہب ہے لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ آٹھواں سجدہ ہے۔

ف: فتوحات میں اس سجدہ کا نام سجدۂ نفور وانکار ہے اس لیے تلاوتِ قرآن مجید کے بعد سجدہ کرنے سے مومن، کافر وں سے ممتاز ہوجاتا ہے اس لیے اسے سجدۂ امتیاز بھی کہا جاسکتا ہے۔

مسئلہ: سجدہ کے وقت اللہ اکبر کہنا سنت ہے (کذا فی النہایہ) اور کافی میں یہاں اللہ اکبر کہنا مستحب ہے۔ اس میں دوسری بار اللہ اکبر کہنا رکن ہے (کذا فی الزاہدی) لیکن یہ کہیں سے نہیں ملا کہ دونوں رکن ہیں۔

مسئلہ: اگر تلاوت کے وقت سجدہ نہ کیا جائے تو یہ قضا ہوگی جیسا کہ قاضی ابویوسف رحمہ اللہ نے فرمایا لیکن اس کی قضا فی الفور ضروری ہے اور اسے قضا بھی نہیں سمجھا جائے گا، اس کی تاخیر مکروہ نہیں۔ (کذا فی کتب الاصول والفروع) امام طحاوی رحمہ اللہ نے فرمایا: اس کی تاخیر مکروہ ہے وہی صحیح تر ہے (کذا فی التجنیس) امام قہستانی رحمہ اللہ نے اپنی شرح میں ذکر کیا اسجدوا للرحمٰن یہ حکم دلالت کرتا ہے کہ سجدہ صرف رحمان کے لیے ہے اگر غیر اللہ کے لیے سجدہ روا ہوتا تو عورت کو حکم ہوتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

مسئلہ: شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ نے فرمایا:

تعظیم کے طور غیر اللہ کو سجدہ (عبادت) کفر ہے۔

مسئلہ: یہ جو عموماً علماء کے آگے جُھک کر زمین کو چُوما جاتا ہے حرام ہے [اُن کے ہاتھ پاؤں چُومنا جائز ہے]

حضرت صدر الشہید رحمہ اللہ نے فرمایا:

سجدۂ تعظیمی حرام نہیں (مکروہ ہے) کیونکہ اسے سجدۂ تحیۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور تحیۃ کے طور سجدہ بمنزلہ سلام کے ہوتا ہے۔ لیکن اس سے لازم نہیں کہ اسے لزوماً عمل میں لایا جائے کیونکہ سجدۂ تحیہ منسوخ ہوچکا ہے اور یہ یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں ہے ان کی شریعت میں سجدہ تحیۃ 'السلام علیکم' کے قائم مقام تھا جیسے تعظیماً کھڑا ہونا اور مصافحہ اور ہاتھ چُومنا وغیرہ لوگوں کی عادات میں شامل ہے اور وہ انہیں تعظیم وتکریم کے طور کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ یُوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا واقعہ دلالت کرتا ہے۔ کما قال تعالیٰ: وخرّوا لہٗ سجّدًا۔

مسئلہ: بادشاہ وغیرہ کے لیے سر جھکانا مکروہ ہے کیونکہ اس طرح یہود سے مشابہت ہوتی ہے جیسے ملاقات کے مصافحہ کے بعد اپنے ہاتھ چُومنا مکروہ ہے کیونکہ مجوس کے ساتھ مشابہت ہے۔

مسئلہ : تجددِ نعم یعنی حصولِ نعمت کے وقت شکر کے سجدہ میں ائمہ کا اختلاف ہے ۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں : سجدۂ شکر مکروہ ہے ۔ زبان کے ساتھ حمد و شکر کہنا کافی ہے لیکن امام ابُو یوسف و محمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ میں امام اعظم رحمہ اللہ سے اختلاف کرتے ہُوئے فرمایا ہے کہ یہ سجدۂ شکر قربتِ الٰہی کا موجب ہے فلہٰذا اس پر سجدہ کرنے والے کو ثواب نصیب ہوتا ہے ۔ اور امام شافعی و احمد رحمہما اللہ کے نزدیک سجدۂ شکر سنّت ہے ۔ اس کا وہی طریقہ ہے جو سجدۂ تلاوت کا ہے لیکن اسے نماز میں نہیں کیا جاتا ۔ (کذا فی فتح الرحمٰن)

مسئلہ : امام زاہدی نے شرح قدوری میں ذکر فرمایا ہے ، سجدے پانچ ہیں :

۱ - سجدۂ صلاتیہ ، یہ فرض ہے ۔

۲ - سجدۂ سہو اور

۳ - سجدۂ تلاوت ، یہ دونوں واجب ہیں ۔

۴ - سجدۂ نذر ، یہ بھی واجب ہے ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کہے :

للہ علیّ سجدۃ تلاوۃ (اللہ کے لیے مجھ پر سجدۂ تلاوت ہے) اگر اسے تلاوت سے مقید نہیں کیا جائے گا تو سجدہ واجب نہیں ہوگا ۔ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ کا اس میں اختلاف ہے ۔

۵ - سجدۂ شکر ، امام طحاوی فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ میرے (ابوحنیفہؒ) کے نزدیک یہ سجدہ کچھ نہیں ۔ حضرت ابوبکر رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ سجدہ نہ واجب ہے نہ سنّت ، ہاں مباح ہے لیکن بدعت نہیں ۔ امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ سجدہ مکروہ ہے لیکن حصولِ نعمت کے وقت اور تکالیف کے دفع ہو جانے کے بعد سجدہ کرنا مستحب ہے ۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سجدۂ شکر کا طریقہ یہ ہے کہ قبلہ رُخ ہو کر سجدہ ریز ہو جائے اور شکر کرتے ہُوئے تسبیح پڑھے اس کے بعد اللہُ اکبر کہتے ہوئے سر اٹھائے ۔ لیکن بغیر سبب ایسا سجدۂ شکر قربتِ الٰہی کا موجب نہیں ۔ تاہم مکروہ بھی نہیں ۔ ہاں نماز کی فراغت پر سجدہ کرنا مکروہ ہے کیونکہ جہّال اسے سنّت یا واجب سمجھیں گے ، اور ہر وہ مباح جس سے سنّت یا وجوب کا احتمال پیدا ہو جائے وُہ فعل مکروہ قرار دیا جاتا ہے ۔

خلاصہ یہ کہ سجدۂ شکر جائز بلکہ مستحب ہے ، واجب بھی نہیں اور مکروہ بھی نہیں ۔ (کما فی شرح المنیۃ) ؎

بشکر عشق بنہ جبہہ دائما بر خاک

کہ نعمتست نخوردست ساکن افلاک

ترجمہ : عشق کی نعمت پر شکرانہ کے طور پر ہمیشہ مٹی پر ماتھا رگڑ ، کیونکہ یہ وُہ نعمت ہے جو اہلِ افلاک کو نصیب نہیں ۔ اے اللہ ! ہمیں اندھیرے اور روشنی میں اپنے دربار کا متواضع بنا ۔ (آمین)

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ○ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ
الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ○ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ
يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ
سُجَّدًا وَّقِيَامًا ○ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ
غَرَامًا ۖ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ○ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا
وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ○ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ
حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۙ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۙ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ
اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى
اللّٰهِ مَتَابًا ○ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ○ وَالَّذِيْنَ
اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ○ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ
لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ○ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ
الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ○
قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ○ ع

ترجمہ : وہ ذات بڑی برکت والی ہے جس نے آسمان میں بُرج بنائے اور اس میں چراغ اور نورانی چاند رکھا اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے آگے پیچھے آنے والا بنایا اس کے لیے نصیحت حاصل کرنے کا ارادہ کرے یا شکر کرنا چاہے اور رحمٰن کے وہ بندے جو زمین پر آہستہ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے گفتگو کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہے تم سے ، اور وہ جو رات گزارتے ہیں اپنے رب کے سجدے اور قیام کرتے ہوئے ، اور وہ بارگاہِ حق میں عرض کرتے ہیں اے رب ہمارے! ہم سے جہنم کا عذاب پھیر دے بیشک اس کا عذاب گلے کا ہار، بے شک وہ بہت ہی بری ٹھہرنے کی جگہ اور بری قیام گاہ ہے اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں نہ حد سے بڑھتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ ان دونوں کے درمیان میں اعتدال پر ہے اور وہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کی عبادت نہیں کرتے اور جس کی اللہ تعالیٰ نے حرمت فرمائی اسے ناحق قتل نہیں کرتے اور زنا نہیں کرتے اور وہ جو یہ کام کرتا ہے تو سزا پائے گا قیامت کے دن اس پر عذاب بڑھایا جائے گا اور وہ ہمیشہ اس میں ذلیل و خوار ہو کر

رہے گا مگر وُہ جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اور جو توبہ کرے اور نیک عمل کرے تو اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف مکمل رجوع کیا اور جو لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ بیہودہ مشغلوں سے گزرتے ہیں تو دامن بچا کر گزر جاتے ہیں اور جب انھیں ان کے رب تعالیٰ کی آیات سے نصیحت کی جاتی ہے تو ان پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے اور وُہ جو عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں ہماری بیبیوں اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا امام بنا دے انہیں صبر کا بدلہ بہشت کا سب سے اونچا بالاخانہ انعام میں ملے گا اور اس میں ملائکہ کی طرف سلام کے ساتھ استقبال ہو گا۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ان کا کیا ہی اچھا ٹھکانا اور قیام گاہ ہے۔ فرمائیے میرے رب کے ہاں تمہاری کوئی قدر و قیمت ہو گی اگر تم اس کی عبادت نہ کرو گے تو تم نے تکذیب کی تو عنقریب یہی تکذیب تمہاری وبالِ جان ہو گی۔

تفسیر عالمانہ تَبٰرَكَ بکثرت خیر و برکت والا ہے، فیاض ہے، اس لفظ کی تحقیق ہم نے سورہ کے شروع میں لکھ دی ہے۔

نکتہ: اس مقام پہ تبارك لانے کی حکمت یہ ہے کہ اس سورت میں بہت بڑے امور کا ذکر ہے مثلاً بروج و سیارات، شمس و قمر، لیل و نہار۔ اگر یہ نہ ہوتے تو زمین پر نہ کوئی حیوان ہوتا، نہ کھیتیاں ہوتیں اور نہ کوئی اور شے۔ الَّذِىْ جَعَلَ جس نے اپنی قدرت کاملہ سے بنائے فِى السَّمَآءِ آسمان میں بُرُوْجًا بارہ بروج ہر بُرج میں دو منزلیں ہیں اور چاند کی تین منزلیں ہیں اور یہی کواکب سبعہ (سات ستاروں) کی منزلیں ہیں اور سورج کے تیس درجے۔

بروج کے اسماء

۱۔ حمل	۲۔ ثور
۳۔ جوزا	۴۔ سرطان
۵۔ اسد	۶۔ سنبلہ
۷۔ میزان	۸۔ عقرب
۹۔ قوس	۱۰۔ جدی
۱۱۔ دلو	۱۲۔ حوت

حمل و عقرب مریخ کے اور ثور و میزان زہرہ کے اور جوزا و سنبلہ عطارد کے اور سرطان قمر کے اور اسد سورج کے اور قوس و حوت مشتری کے اور جدی و دلو زحل کے مراکز ہیں اور یہ تمام بروج طبائع اربعہ پر منقسم ہیں ان میں ہر ایک کے تین تین ستارے ہیں:

(۱) حمل ، (۲) اسد، (۳) قوس ناریہ ؛
(۱) ثور ، (۲) سنبلہ، (۳) جدی ارضیہ ؛
(۱) جوزا، (۲) میزان، (۳) دلو ہوائیہ ؛
(۱) سرطان، (۲) عقرب، (۳) حوت مائیہ ۔

ف : ہر منزل کو بُرج سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ بروج بمعنے قصور (محلات)۔ چونکہ جملہ ستارگان کے لیے ہر ایک کی منازل اونچی اونچی ہیں جیسے مکین مقیم ہیں اور اس کا اشتقاق تبرج سے ہے بمعنے ظہور۔

ف : حضرت حسن و مجاہد و قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بروج بڑے بڑے ستارگان کو کہا جاتا ہے۔ جیسے زہرہ ، سہیل ، مشتری ، سماک ، عیوق وغیرہ۔ ان کی نورانیت اور حُسن اور روشنی کی وجہ سے انھیں مذکورہ ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ الابرج بمعنے دو ابروؤں کے درمیان کی وسعت۔ ہم نے بروج اور ان کے اسمأ سورہ یونس کے اوائل میں بیان کیے ہیں۔

وَّجَعَلَ فِيهَا اور ہم نے بنائے بروج میں نہ کہ آسمان میں، کیونکہ بروج قریب تر ہیں۔ فلہذا ضمیر اس کی طرف لوٹانا زیادہ موزوں ہے اگرچہ السماء کی طرف بھی لوٹایا جا سکتا ہے۔ **سِرَاجًا** چراغ یعنی سورج۔

حلِ لغات امام راغب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ السراج دراصل وہ جسے فتیلہ کے ذریعے روشن کیا جائے ۔ پھر ہر روشنی والی شے کو سراج سے تعبیر کیا جانے لگا۔ یہاں پر سورج مراد ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر فرمایا :

وجعل الشمس سراجا (اور بنایا سورج کو سراج)

اور سورج اور بڑے ستاروں کو سرج و مصابیح سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ کما قال تعالیٰ :

ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح۔
(اور ہم نے آسمان کو مصابیح سے مزین فرمایا)

وجہ تشبیہ انارۃ و اشراق ہے۔ **وَّقَمَرًا** اور چاند جسے فارسی میں ماہ کہا جاتا ہے اور تین راتوں کے چاند کو الهلال اور اس کے بعد کے چاند کو قمر کہا جاتا ہے بوجہ اس کی سپیدی کے (کذا فی المختار) یا اس لیے کہ اس سے زمین سفید نظر آتی ہے اور الاقمر بمعنے الابیض (سفید تر) کذا فی کشف الاسرار۔ **مُّنِيرًا** ۝ رات کو روشن کرنے والا۔

صُوفیانہ معنیٰ بعض اہلِ دل نے فرمایا کہ اس سے آسمان قرآن مراد ہے کیونکہ جملہ اہلِ ایمان اس کے بیان کے زیرِ سایہ ہیں اور اس کی ہر سُورۃ بمنزلہ برج کے ہے جیسے سات آسمانوں میں بُرج کی کیفیت ہے ایسے ہی سُورتوں میں سورۃ فاتحہ بمنزلہ برج کے ہے جو کوئی رات کے وقت ستارہ کو دیکھ کر زمین کی راہ طے کرتا ہے

تو اسے کسی قسم کی کمی نہیں آئے گی ایسے ہی جو فتنے کی شب شک و شبہ کے خوف سے دل کی چشم قرآن پاک کی کسی آیت کے ستارے پر ڈالتا ہے تو اس کے دین کی منزل میں بھی کمی نہیں آئے گی۔

ف : نفائس المجالس میں ہے کہ یہ کمال قدرت الٰہی کی دلیل ہے کہ اس قدر روشن ستارے انسان کی خدمت پر لگا دیئے (لیکن افسوس کہ انسان ایک چھوٹی سی مخلوق ہونے کے باوجود اللہ کی اطاعت سے دُور ہے)

تفسیر صُوفیانہ ۱ جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفوس میں حواس کے بروج بنائے اور ان میں رُوح کا چراغ رکھا اور قلب کا روشن قمر جو انوارِ روحانیت سے منور ہے، اس لیے انسان پر لازم ہے کہ وہ وجود کو منور بنائے اور قلب کو ظلماتِ نفسانیہ سے خالص مخلص بنائے تاکہ انوارِ تجلیات کی استعداد اور تاریکیوں اور ظلمات سے چھٹکارا نصیب ہو۔ اس کے بعد ہی کہیں منزلِ مقصود اور اصلی مطلوب حاصل ہو سکتا ہے۔ یعنی فنا بعد البقا کا مقام اور فقر کے بعد کمال غنا یعنی مشاہدۂ تام نصیب ہوگا۔ پھر قادر مالک کی قدرتِ کاملہ معلوم ہوگی۔

ف : عرائس القرآن میں ہے کہ آسمان کے بروج چاند اور سورج کی شاہراہ ہیں اور وہ بروج یہ ہیں، حمل، ثور وغیرہ۔

فائدہ صُوفیانہ قلب کے بوروج یہ ہیں :

(۱) برج الایمان	(۲) برج المعرفۃ	(۳) برج العقل
(۴) برج الیقین	(۵) برج الاسلام	(۶) برج الاحسان
(۷) برج التوکل	(۸) برج الخوف	(۹) برج الرجاء
(۱۰) برج الشوق	(۱۱) برج المحبۃ	(۱۲) برج الولہ

ان بارہ بروج سے قلب کی دائمی اصلاح یونہی ہوتی ہے جیسے بارہ برجوں حمل وغیرہ سے دار فانی اور اس کے مکینوں کی۔ آسمان میں سراج الشمس و نور القمر ہیں تو قلب میں سراج الایمان والاقرار اور قمر المعرفۃ ہیں کہ ان سے ایمان و معرفۃ کا نور چمک اٹھتا ہے زبان سے ذکر کے ساتھ اور آنکھوں میں عبرت کے ساتھ اور دیگر اعضاء میں طاقت و خدمت کے ساتھ۔

تفسیر صُوفیانہ ۲ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس میں سماء القلوب و بروج المنازل والمقامات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بھی بارہ ہیں :

(۱) توبہ	(۲) زہد	(۳) خوف	(۴) رجاء
(۵) توکل	(۶) صبر	(۷) شکر	(۸) یقین
(۹) اخلاص	(۱۰) تسلیم	(۱۱) تفویض	(۱۲) رضا

سیارگانِ احوال کی یہی منزلیں ہیں ان میں شمس تجلی و قمرِ مشاہدہ و زہرۂ شوق و مشتری محبۃ و عطارد کشوف و مریخ فنا

در حلِ بقا میں ہے

۱ ہر کہ خواہد بجان سیر بروج
آسماں را کند چو عیسیٰ عروج

۲ آسماں را طریق معراجست
دل بمعراج فلک محتاجست

۳ چوں گزر میکند ز برج فنا
یابد آخر تجلیات بقا

۴ ایں تجلی زسوے عرشی نہ
ایں تسلی زسمت فرشی نہ

۵ ایں تجلی خالق الا براج
بسراجش ندیدہ چشم سراج

ترجمہ: ۱ جو بروج کی روحانی سیر چاہتا ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان پر عروج کرے۔
۲ آسمان تو معراج کا راستہ ہے دل معراجِ فلک کی محتاج ہے۔
۳ جب بندہ برجِ فنا سے گزر کرتا ہے بالآخر وہ تجلیاتِ بقا حاصل کر لیتا ہے۔
۴ اس تجلی کو عرش کی طرف لیجا لیکن اسے فرش سے تسلی دی۔
۵ یہ خالق بروج کی تجلی ہے اس کے چراغ سے چراغ کی آنکھ نہیں دیکھی جا سکتی۔

تفسیر عالمانہ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ وہی وُہ ہے جس نے اپنی حکمتِ تامہ سے بنایا ہے اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا۔

حلِ لغات خِلفۃ مصدرِ نوعی ہے اس معنی پر یہ جعل کے مفعول ثانی کی صلاحیت نہیں رکھتا اور نہ ہی اس کا حال بن سکتا ہے۔ لازماً یہاں پر مضاف ذو مقدر کرنا ہوگا اور بمعنے خلیفہ بھی مستعمل ہے۔ اور ہر وہ جو کسی کے بعد آئے، کے معنی میں بھی آتا ہے۔ پہلے کے اعتبار سے معنیٰ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں خلیفہ بنایا ہے کہ ہر ایک اپنے دوسرے کا خلیفہ وجانشین بنتا ہے کہ ایک کا عمل اگر رہ گیا تو اسے دوسرے میں ادا کیا جا سکتا ہے اس میں بندوں کے لیے توسیع ہے کہ وہ عبادات و طاعات آسانی سے ادا کر سکیں۔ اس کی تائید ذیل کی حدیث شریف سے ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک دفعہ رات کے وقت تلاوتِ قرآن کا وظیفہ رہ گیا تو حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، آپ نے فرمایا:

"اے ابن الخطاب! اللہ تعالیٰ نے اس سوال کا جواب اس آیت وھوالذی جعل الّیل و النہار الخ میں نازل فرمایا ہے۔ تم سے اگر رات کے نوافل قضا ہوں تو انہیں دن میں ادا کرو، اور اگر دن کو کوئی وظیفہ رہ جائے تو اسے رات میں ادا کر لیا کرو۔"

دوسرے معنی پر تقریر یُوں ہوگی کہ رات اور دن کو ایک دوسرے کے بعد کو آنے والا بنایا ہے رات جائے تو دن آئے، ایسے دن جائے تو رات آئے۔ ایسے کبھی نہ ہوگا کہ دن ہو تو رات نہ ہو اور رات ہو تو پھر دن نہ ہو۔ یہ اس لئے ہے تاکہ لوگ سنین اور دیگر حساب وکتاب معلوم کر سکیں اور معاش کے لیے وقت معلوم میں آ جا سکیں اور انھیں معلوم ہو کہ اس وقت آرام وسکون کرنا ہے اور اس وقت کاروبار کرنا ہے۔

ف : آیۃ میں ایک اور نعمت کی تذکیر ہے اور اس کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ تامہ پر تنبیہ بھی۔

لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ اس کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی تذکیر اور اس کی صنعت میں تفکر کرنا چاہتا ہے تاکہ اسے یقین ہو کہ صانع حکیم اور واجب بالذات اور رحیم بالعباد ذات کا ہونا ضروری اور لازم ہے یہ تنبیہ دراصل کافر کے لیے ہے۔ اب مومن کے لیے فرمایا: **اَوْ اَرَادَ شُکُوْرًا** ۝ بضم الشین شکر کا مصدر ہے (یعنی اس کی دی ہوئی نعمتوں پر اطاعت کر کے اس کا شکر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے) اس تقریر پر لفظ اَوْ اپنے حقیقی معنی پر ہوگا۔ اور اگر بمعنی واؤ ہو تو معنی ہوگا کہ (انہیں ہم ایک دوسرے کا جانشین بنائیں گے تاکہ وہ دونوں شاکرین و ذاکرین کے لیے اوقات ہو جائیں تاکہ ان کے اوراد و وظائف اگر فوت ہو جائیں تو وہ اسے پُورا کر سکیں) پھر اسے اَوْ کے ساتھ لانے میں تنبیہ ہے کہ یہ دونوں جَعل کے مستقل طور پر مطلوب ہیں۔ اگر واؤ کے ساتھ عطف کیا جاتا تو معنی یہ ہوتا کہ دونوں مل کر جعل کے مطلوب ہیں۔

حلِ لغات : امام راغب نے فرمایا کہ شکر بمعنے نعمت کا تصوّر و اظہار۔ بعض نے کہا کہ یہ کشر کا مقلوب ہے بمعنے الکشف۔ اس کی نقیض کفر ہے بمعنے نعمت کا ستر و نسیان۔ بعض نے کہا یہ عین کشری (بمعنے بھرپور یعنی وہ چشمہ جو پانی سے پُر ہو) سے ماخوذ ہے۔ اور شکر کو بھی اسی لیے شکر کہا جاتا ہے کہ وہ منعم علیہ کے ذکر سے بھرپور ہوتا ہے۔

شکر کی قسمیں

شکر تین قسم ہے:

(۱) زبان سے، یعنی نعمت پر کسی کی ثنا کرنا۔

(۲) قلب سے، یعنی نعمت کا دل میں تصوّر اور اعتراف ہو۔

(۳) جملہ اعضاء سے، وہ یہ کہ بقدر استحقاق نعمت کا بدلہ اتارنا۔

ے

عطائیست ہر موئے از و بر تنم
چگونہ بہر موئے شکرے کنم

(ترجمہ : میرا ہر بال اس کی عطا ہے تو پھر میں اس کی ہر نعمت کا شکر کس طرح ادا کر سکتا ہوں)

مسئلہ : آیت میں اوراد و وظائف ایسے ہی جملہ نفلی عبادات کی قضا علی سبیل الاستحباب کا اشارہ ہے۔ اس سے ان کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔

صوفیانہ نسخہ اوراد و وظائف وغیرہا کی مداومت وارد کی مداومت کا موجب ہے اور وارد کی مداومت وصالِ یار سے ہمکنار کرتی ہے۔ مثلاً وہ دریا سمندر تک پہنچتا ہے جسے پہاڑوں سے مسلسل بذریعہ بارش پانی وغیرہ ملتا رہے۔ اگر درمیان میں کئی روز یہ سلسلہ منقطع ہو جائے تو وہ دریا کبھی سمندر تک نہیں پہنچ سکے گا۔

حضرت صائب نے فرمایا : ؎

از زاہداں خشک رسائی طمع مدار
سیل ضعیف واصل دریا نمی شود

(ترجمہ : زاہدانِ خشک سے رسائی کی طمع مت رکھو اس لیے کہ دھیمی بارش کبھی دریا تک نہیں پہنچا سکتی)

وہابیوں کا رد (وہابی لوگ اوراد اولیاء و وظائف مشائخ کے مخالف ہیں کہتے ہیں کہ یہ صاحبان اپنے مشاغل کی سختی سے پابندی کیوں کرتے کراتے ہیں۔ اس کا جواب صاحبِ روح البیان نے لکھا کہ)

ولذا اكب العبّاد والسلاك على الاوراد فى الليل والنهار و جعلوها على انفسهم بمنزلة الواجبات ولذا الوفات عنهم ورد الليل قضوه فى النهار ولوفات عنهم ورد النهار قضوه فى الليل يعنى اتوا ببدل له مما كان مثلاً له حتّى

اسی لیے سالکین صوفیہ کرام اوراد و وظائف میں شب و روز منہمک رہتے ہیں اور انہیں اپنے لیے لازم بنا رکھے ہیں اگر کوئی وردرات کو رہ جاتا ہے تو پھر دن کو پورا کرتے ہیں اگر دن کا رہ جائے تو رات کو مکمل کرتے ہیں اسے اس کا بدل سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہی ہمارا سلوک کا راستہ ہے تو پھر اسے

لا ینقطعوا دون السبیل فمن عرف الطریق الی اللہ لا یرجع ابدا ولو رجع عذب فی الدارین لم یعذب بہ احدا من العالمین فعلیك بالورد صباحًا و مساءً فانه من دیدن السلف الصالحین و ایاك والغفلۃ عنہ فانہا من دأب من بال علیٰ اذنہ الشیطان من الفاسقین۔ (ج ۲ ص ۲۳۹)

کیوں ترک کیا جائے جو اللہ تعالیٰ کا راستہ جانتا ہے تو وہ اسے کبھی نہیں چھوڑتا اور نہ ہی اس سے پیچھے ہٹتا ہے اگر کوئی ہٹ جاتا ہے تو دارین کے عذاب میں ایسا مبتلا ہو جاتا ہے کہ کسی کو اس جیسا عذاب نہ ملے اے سالک اپنے صبح وشام کے اوراد کو لازم پکڑ کیونکہ یہی اسلاف کا طریقہ ہے غفلت کو چھوڑ اس لیے کہ یہ ان غافلین کا طریقہ ہے جن پر شیطان کا تسلط ہے۔

حکایت شیخ ابوبکر ضریر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا ہمسایہ ایک نوجوان حسین وجمیل، جو صائم الدہر اور قائم اللیل تھا ایک دن اس نے آکر مجھے کہا کہ ایک رات میں اپنے وظیفے قضا کر بیٹھا، خواب میں دیکھا کہ میری عبادت گاہ کی دیوار پھٹ گئی ہے اس سے کئی حسین وجمیل لڑکیاں نکلی ہیں ان میں سے ایک ایسی نہایت قبیح صورت تھی میں نے کبھی ایسی قبیح شکل نہیں دیکھی۔ میرے پوچھنے پر سب نے کہا کہ ہم تیری ان راتوں کی عبادتیں ہیں جنہیں تو ہر رات ادا کرتا تھا اور یہ قبیح شکل والی تیری اس غفلت کا نتیجہ ہے جو تو ایک رات سو گیا تھا۔ اگر تو اسی رات کو مر جاتا تو یہی قبیح شکل والی لڑکی حصے میں آتی۔ پھر اس قبیح شکل والی نے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے:

اسئل لمولاك واردد نی الی حالی

فانت قبحتنی من بین اشکالی

لا ترقدن اللیالی ما حییت فان

نمت اللیالی فهن الدهر امثالی

(ترجمہ: اپنے مالک سے سوال کیجئے اور مجھے اپنے حال پہ لوٹا یئے کیونکہ تو نے ہی مجھے اپنی ہمجولیوں میں بدشکل بنایا ہے۔ جب تک تو زندہ ہے نیند نہ کر اس لیے کہ اگر تو راتوں کو سوئے گا تو تیری تمام زندگی میں تیرا حال ایسے ہی ہوگا)

حسین وجمیل لونڈیوں میں سے ایک نے جواباً کہا: ؎

نحن اللیالی اللواتی کنت تسهرها

تتلوا القران بترجیع ودنات

نحن اللسان اللواتی کنت تخطبنا

جوف الظلام بانات و من فرات

(ترجمہ: ہم ہیں وہ راتیں جنہیں تو زندہ رکھتا تھا، نہایت اچھے لہجوں سے قرآن کی تلاوت کرتا تھا
ہم ہیں وہ حسین راتیں جو تو ہم سے مخاطب ہوتا تھا آہ و زاریوں سے آدھی رات کے وقت۔)
اس پر وہ نوجوان چیخ کر گرا اور وہیں ڈھیر ہوگیا۔ (ذکرہ الامام الیافعی فی ریاض الریاحین)

ابلیس کی کہانی اس کی اپنی زبانی حضرت یحییٰ علیہ السلام نے ابلیس کو دیکھا کہ اس کا جسم چھوٹے چھوٹے زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے۔ یحییٰ علیہ السلام نے پوچھا: یہ کیا؟
اس نے عرض کی: یہ وہ شہوات ہیں جن کے ذریعے میں اولادِ آدم سے غلطیاں کراتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: کچھ میرے لیے بھی ہیں یا نہیں؟ اس نے کہا: ہاں، ہیں۔ جب آپ کھانا زیادہ کھاتے ہیں تو پھر میں آپ کو نماز اور ذکرِ الٰہی سے سستی کراتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: کچھ اور؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: بخدا آئندہ میں پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھاؤں گا۔ ابلیس نے کہا: بخدا آئندہ میں بھی اپنا راز کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ (کذا فے آکام المرجان)

حکایت ایک عابد مر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ مجھے دنیا اور اس میں خطایا و ذنوب پر کوئی افسوس نہیں۔ ہاں مجھے افسوس ان راتوں کا ہے جن میں میں سویا رہا اور ان دنوں کا جن کا میں روزہ نہ رکھ سکا اور اس گھڑی کا جو میں نے غفلت سے گزار دی ؎

۱ اے کہ پنجاہ رفت و در خوابے
مگر ایں پنج روز دریا بے

۲ خواب نوشین بامداد رحیل
باز دارد پیادہ را ز سبیل

(ترجمہ [1]: اے وہ کہ تیری عمر کے پچاس سال خوابِ غفلت میں گزر گئے شاید ان پانچ دنوں کو پالے تو ان میں کچھ بندگی کرے۔
(۲) اس نے سامان بھی درست نہیں کیا میٹھی نیند کوچ کی رات میں پیدل چلنے والے کو راستہ چلنے سے روک دیتی ہے۔)

ف: علماء مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلک کو پیدا فرما کر اس میں دو طرح کے دَور بنائے:
(۱) اندھیری رات کہ اس میں زمین کالی سیاہ نظر آتی ہے۔

(۲) روشن دن کہ جس سے زمین کافور کی طرح سپید محسوس ہوتی ہے۔
اس میں اشارہ کیا کہ اے دن کی روشنی میں دولت کما کر آرام سے زندگی بسر کرنے والو! تیار رہو ابھی رات کی تاریکی اس کے پیچھے آرہی ہے۔ اور اے رات کی تاریکی میں ایڑیاں رگڑنے والو! غم نہ کھاؤ ابھی دن کی روشنی اس کے بعد آنے والی ہے ؎

اے دل صبور باش و مخور غم کہ عاقبت
ایں شام صبح گردد و ایں شب سحر شود

(ترجمہ: اے دل! صبر کیجئے اور مت گھبرائیے اس لیے کہ انجام بکار اسی صبح کی شام ہوگی اور اس شب کی سحر لازماً ہوگی)

اللہ تعالیٰ سے سوال ہے کہ وہ ہمیں بیدار اور ہر مشہود میں مطالعۂ جمال کے واصلین کا مشاہدہ نصیب فرمائے اور دائمی ظلمت الوجود اور فیض الجود کی محرومی سے پناہ مانگتے ہیں۔ وہی رحیم اور ودود ہے۔

(وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ رحمٰن کے بندے نہ کہ دنیا اور شیطان اور نفس اور خواہشات کے بندے کیونکہ اگرچہ وہ بھی ایجاد کے لحاظ سے اسی کے بندے ہیں۔ لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہو کر شرافت اور بزرگی کے مستحق نہیں ہیں اس لیے کہ وہ آنے والے اوصاف سے موصوف نہیں ہیں کیونکہ وہ اوصاف رحمتِ الٰہی کے آثار سے ہیں اور وہ مخصوص بندوں کے ساتھ مختص ہیں۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے وہ مقبول بندے اور یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ ہے۔ وہ لوگ ہیں جو چلتے ہیں۔ المشی بمعنے ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف اپنے ارادہ سے منتقل ہونا عَلَى الْاَرْضِ زمین پر جو کہ نہایت طمانیت سکون وتحمل کی حامل ہے هَوْنًا درانحالیکہ وہ پرسکون اور پُروقار ہوتے ہیں۔)

ف: هَون بمعنے سکینہ و وقار ہے (کذا فی القاموس) هَوْنٌ انسان کی وہ کیفیت کہ اسے کسی وجہ سے طبع پر بوجھ محسوس نہ ہو (کذا فی المفردات) ٭ هيّن بمعنے لیّن۔ کبھی ان دونوں کو مخفف بھی پڑھا جاتا ہے۔

(یعنی وہ انسان جو پرسکون اور نرم اور ملائم اور رقیق القلب ہو۔ یعنی وہ لوگ ہر لحاظ سے نرم اور پرسکون رہتے ہیں اور زمین پر چلتے ہیں تو بھی نہایت مسکین صورت اور متواضع اور منکسر ہو کر۔ ان سے تکبر اور فخر و ریاء کا ذرہ برابر بھی نشان نہیں ہوتا کیونکہ انھیں عظمتِ حق و ہیبتِ ذات مدِنظر اور کبریائی وجلال کا مشاہدہ ہوتا اس سے سر اٹھانے کی سکت نہیں رکھتے اس لیے کہ ان کی ارواح کو خشوع اور ان کے نفوس و ابدان کو خضوع نصیب ہو چکا ہے۔)

حدیث شریف میں ہے؛
المومن هينون لينون كالجمل الانف ان قيد انقاد وان انيخ على صخرة استناخ۔

(مومن نہایت نرم اور رقیق ہیں جیسے اونٹ کی ناک میں نکیل ہو کہ اسے پکڑ کر باندھ لیا جائے تو سر جھکائے اور اگر بٹھایا جائے تو بیٹھ جائے)

حلِ لغات : صحاح میں ہے : انف البعیر یعنی سوئی کے چبھونے سے اونٹ کی ناک کو تکلیف ہوئی۔ انف بروزنِ کتف۔

حدیث شریف میں ہے :
المومن كالجمل ان قيد انقاد وان استنيخ على صخرة استناخ۔

(مومن اونٹ کی طرح ہے اگر اسے پکڑ کر لے جایا جائے تو سرِ تسلیم خم کرے اگر اسے پتھر پر بٹھایا جائے تو اس پر بیٹھ جائے)

(وہ اس لیے کہ اگرچہ اس سے اسے تکلیف ہوتی ہے لیکن فرمانبرداری میں کمی نہیں کرتا) ور قید بصیغہ مجہول از قاد والقود، السوق کی نقیض ہے فرق صرف یہ ہے کہ قود آگے چل کر اپنے پیچھے لگایا جانا ہے اور سوق اس کو آگے کر کے پیچھے سے ہانکا جانا ہے۔ انقیاد بمعنے کھینچنا اور گردن نہادن بمعنے فرماں برداری کرنا۔ اہلِ لغت کہتے ہیں :

انخت الجمل فاستناخ۔

(میں نے اونٹ کو بٹھایا تو وہ بیٹھ گیا)

حضرت شیخ سعدی رحمہ اللہ نے فرمایا : ؎

۱ فروتن بود ہوشمند گزیں
نہد شاخ پُر میوہ سر بر زمیں

۲ چو سیل اندر آمد بہول و نہیب
فتاد از بلندی بسر در نشیب

۳ چو شبنم بیفتاد مسکین و خرد
بمہر آسمانش بعیوق برد

ترجمہ: (۱) تواضع داناکو پسند ہے وہ شاخ سر زمین پر رکھتی ہے جو میووں سے پُر ہوتی ہے۔

(۲) جب سیلاب زوروں پر ہوتا ہے تو قطرات (بارش) سر کے بل زمین پر گرتے ہیں۔

(۳) چونکہ شبنم عاجزی سے نیچے گرتی ہے اسی لیے سورج اسے آسمان کی بلندیوں تک پہنچاتا ہے۔

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ اور جب انھیں جاہل خطاب کرتے ہیں۔

حلِ لغات: الجہل علم سے خالی ہونا اور کسی شئے کو واقع کے خلاف اعتقاد رکھنا اور کسی کام کو اس کی اصلی صورت کے خلاف کرنا۔ اعتقاد (صحیح ہو یا فاسد اس) کے برعکس کا نام جہالت ہے، جیسے نماز کو عمداً ترک کرنا، یہ اعتقادِ فاسد کی دلیل ہے اسی سے ہے:

اتتخذنا ھزوا قال اعوذ باللہ ان اکون من الجٰھلین۔

(یہودیوں نے کہا: کیا آپ ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔ موسٰی علیہ السلام نے فرمایا میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ میں ہو جاؤں جاہلوں سے)

یہاں پر مذاق ٹھٹھا مخول کو جہل سے تعبیر کیا گیا ہے (اب معنیٰ یہ ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کے بندوں سے جہال بالمشافہ قبیح بات کرتے ہیں تو قَالُوْا سَلٰمًا○ اللہ والے انہیں سلامتی کا جواب دیتے ہیں۔ یعنی انہیں کہتے ہیں کہ ہم تمہارے لیے سلامتی کے طالب ہیں) سلاماً فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے (کذا فی المفردات) یعنی کہتے ہیں کہ خدا کرے ہم تمہارے شر سے محفوظ رہیں اور تم ہمارے شر سے (کذا فی احیاء العلوم)

ف: بعض کے نزدیک سلاماً فعل محذوف کا مصدر ہے اور تسلّم کے قائم مقام ہے۔ اب معنی یوں ہوگا (کہ ہم تم سے سلامتی چاہتے ہیں یعنی تمہیں جاہل کہنے سے کنارہ کش ہیں) المجاھلۃ بمعنی کسی کے ساتھ سفاہت کرنا یعنی ہم تمہارے کسی معاملہ میں خلط ملط نہیں کرتے۔ اس سے وہ جہل مراد ہے جو انہوں نے اللہ والوں کو کہا، کیونکہ یہ خفت کی علامت ہے (یعنی خیر و شر میں ہم تم ایک دوسرے سے دور ہیں نہ تمہیں ہمارے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ نہ ہمیں تمہارے ساتھ۔)

ف: اکثر مفسرین کے نزدیک سلام سے اس کا معروف معنی مراد نہیں بلکہ یہ صفت ہے اس کا مصدر محذوف ہے دراصل عبارت یوں ہے: قالوا قولا سلاما۔ یعنی وہ ایسی بات کہتے ہیں جس سے وہ ان کے ایذاء واثم سے سالم ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اللہ والے سفہاء وجہلاء کے درپے نہیں ہوتے اور نہ ہی ان سے کوئی بات کرتے ہیں اور نہ جھگڑتے ہیں۔

حضرت محقق رومی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

۱ اگر گویند زراقی و سالوس
بگو ہستم دو صد چنداں و میرد

۲ وگر از خشم دشنامی دہندت
دعا کن خوش دل وخنداں و میرد

ترجمہ: (۱) اگر تجھے کہیں کہ تو مکار اور چاپلوس ہے تو تم کہو کہ میں تو اس سے کئی گنا بڑھ کر ہوں۔
(۲) اگر تجھے کوئی غصے سے گالی دے تو تو اُسے خوش دلی سے دعا دے اور ہنستا ہوا چلا جا۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا:

۱ یکے بربطی در بغل داشت مست
بشب در سر پارسائی شکست

۲ چو روز آمد آں نیک مرد سلیم
بر سنگ دل برد یک مشت سیم

۳ کہ دوشینہ معذور بودی و مست
ترا و مرا بربط و سر شکست

۴ مرا بہ شد آں زخم و برخاست بیم
ترا بہ نخواہد شد الا بسیم

۵ ازاں دوستاں خدا بر سر اند
کہ از خلق بسیار بر خر خورند

ترجمہ: ۱۔ ایک آدمی سارنگی بغل میں دبا کر مست رہتا تھا۔ ایک رات کسی نیک آدمی کے سر پر مار کر اسے توڑ دیا۔
۲۔ دن کو وہ نیک آدمی اس سنگدل کیلئے چند ٹکے تحفہ کے طور پر لے گیا۔
۳۔ اور کہا کہ تو گذشتہ شب معذور و مست تھا تیری سرنگی ٹوٹی اور میرا سر۔
۴۔ میرا سر تو اچھا ہو گیا اور درد بھی ختم ہے لیکن تیری سرنگی سوائے پیسوں کے درست نہ ہوگی (لہٰذا یہ پیسے لے لے)
۵۔ اس لئے بندگانِ خدا سب سے اونچے ہیں کہ وہ خلقِ خدا سے بہت زیادہ تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔

ربط: یہاں سے اللہ والوں کے حال کے بیان کے بعد ان کا وہ حال بیان کیا گیا ہے کہ وہ دوسروں سے کیسے پیش آتے ہیں۔

مسئلہ: اکثر کے نزدیک یہ آیت محکم ہے کیونکہ بیوقوف کی کڑوی بات سُننا مندوب ہے اور جاہل کی جاہلانہ بات سے چشم پوشی، ادب و مروت و شریعت کے لحاظ سے امرِ مستحسن ہے اور یہی عزت بچانے کا بہترین

طریقہ اور پرہیزگاری کے لیے زیادہ موافق ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ قیامت میں مخلوق کو جمع کرے گا تو منادی ندا دے گا کہ اہلِ فضل کہاں ہیں؟ ان میں بہت تھوڑے لوگ اُٹھ کھڑے ہوں گے ان سے پوچھا جائے گا تمہیں کون سی فضیلت حاصل ہوئی؟ وہ جواب دیں گے کہ جب ہم پر ظلم ہوتا تو ہم صبر کرتے اور جب ہمارے ساتھ کوئی بُرائی کرتا تو ہم بخش دیتے، اور جب ہمارے ساتھ زیادتی کی جاتی تو ہم حوصلہ کرتے۔ اس پر انہیں کہا جائے گا بہشت میں چلے جاؤ اس لیے کہ عمل والوں کا یہی بہتر عمل ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں نے اپنی امت کے چند ایسے افراد دیکھے ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے عنقریب پیدا ہونے والے ہیں میں ان سے محبت کرتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے سے خیر خواہی کریں گے اور راہِ خدا میں مال لٹا دیں گے اور لوگوں میں نورِ الٰہی کے ساتھ وقار و آرام سے چلیں گے اور خوفِ خدا سے بھرپور ہوں گے۔ وہ لوگوں کو تکلیف نہیں دیں گے اور ان کے حوصلہ و صبر کی وجہ سے لوگ ان سے آرام پائیں گے۔ ذکرِ الٰہی سے ان کے قلوب مطمئن ہوں گے اور ان کی نمازوں سے ان کی مساجد آباد ہوں گی اور وہ چھوٹوں پر رحم کریں گے اور بڑوں کی عزّت کریں گے اور آپس میں متفق ہوں گے ان کا دولت مند فقیر مسکین کی بیمار پُرسی کرے گا۔ اور وہ ایک دوسرے کے جنازے میں شامل ہوں گے۔"

اس کے بعد آپ نے یہی آیت وعباد الرحمٰن الذین یمشون الخ پڑھی۔

لطائف بعض مشائخ نے فرمایا کہ عباد الرحمٰن کی عبادت ان کا زیور ہے اور فقر ان کی کرامت، اور طاعتِ الٰہی ان کی حلاوت اور محبتِ الٰہی ان کی لذّت اور اللہ تعالیٰ کی طرف ان کی حاجت اور ان کا تقویٰ ان کا زادِ راہ ہوگا اور ہدایت ان کی سواری ہوگی اور ان کی گفتگو قرآن ہوگی اور ذکر ان کی زینت ہوگی اور قناعت ان کا مال ہوگا اور ان کا کسب عبادت ہوگی اور شیطان ان کا دشمن ہوگا اور حق ان کا نگہبان ہوگا اور دن ان کی عبرت گاہ ہوگی اور غور و فکر کرکے رات گزارتے ہیں۔ اور حیات ان کا مرحلہ اور موت ان کی منزل اور قبر ان کا قلعہ ہے اور فردوس ان کا مسکن ہے اور ان کی آرزو زیارتِ الٰہی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کے بندے مختلف اسماء رکھتے ہیں:

عبداللہ (۱) عبدالرزاق (۲) عبدالوہاب وغیرہ لیکن صرف نام سے اللہ تعالیٰ کی عبودیت حاصل نہیں جب تک کہ اس میں اسم کی تجلیات کی جھلک نہ ہو۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ عبداللہ وہ ہے جس میں

اللہ تعالیٰ اپنے جمیع تجلیات صفاتیہ سے متجلی ہو ۔ اور حقیقۃً عبداللہ یہی ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر اور کوئی مرتبہ نہیں اور نہ ہی اس سے اعلیٰ شان والا کوئی اور بندہ ہوسکتا ہے ۔ کیونکہ ایسے خوش قسمت انسان کو اسم اعظم نصیب ہوتا ہے ۔ اور وہ جمیع صفات الٰہیہ سے موصوف ہوتا ہے ۔ اسی لیے یہ اسم صرف ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے (کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات سے موصوف ہیں ۔ (ولکن الوہا بیہ قوم لا یعقلون) اسی تقریر پر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فرمایا ہے :

وانہ لما قام عبد اللہ یدعوہ ۔ اور بے شک جب اللہ تعالیٰ کا بندہ کھڑا ہوکر اسے پکارتا ہے (عبادت کرتا ہے)

اس معنیٰ پر عبداللہ کا نام حضور علیہ السلام کے لیے حقیقۃً اور آپ کے تابعداروں (اقطاب ، اغواث وغیرہ) کے لیے مجازاً ۔ (کیونکہ جنہیں بھی صفاتِ الٰہیہ سے کچھ نصیب ہوا ہے وہ نبی علیہ السلام کی اتباع کے طفیل ملا ہے)

عبد الرحمٰن وہ جو اسم رحمٰن کا مظہر ہو ۔ اسی معنی پر وہ جملہ عالمین کے لیے رحمت ہوتا ہے ۔ کسی بھی عالم کا کوئی ایک فرد بھی اس کی رحمت سے خارج نہیں ہوتا ہے جتنی کسی کی قابلیت و استعداد ہوتی ہے اتنی ہی اسے رحمت نصیب ہوتی ہے ۔

عبد الرحیم وہ جو اسم رحیم کا مظہر ہو ۔ یہ رحمت خاصہ ہے ۔ یہ اسے نصیب ہوتا ہے جو متقی صالح ہو اور جس پر اللہ تعالیٰ راضی ہو اور اس میں غیرت ہو کہ اس سے انتقام لے جو اللہ تعالیٰ کا مغضوب ہے ۔

عبد الرزاق وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ وسیع رزق عطا فرمائے اور وہ رزق کو اپنے بجائے خلقِ خدا پر صرف کرے ۔

عبد الوھاب وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ اسم جود کے ساتھ جلوہ فرمائے جو مستحق کو اس کے استحقاق پر بلا عوض اور بغیر کسی طمع ولالچ اور امید کے اللہ تعالیٰ کے دئے ہوئے عطا کرے اور امدادِ الٰہی سے اہل عنایت کی مدد کرے ۔ (اے اللہ ! ہم سب کو ان حضرات سے بنا جو اسمائے حسنیٰ کی تحقیق رکھنے والے ہیں کیونکہ وہی مطلب اعلیٰ اور مقصد اسنیٰ ہے ۔

وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ اس کا عطف موصوف اول پر ہے ۔ یبیتونۃ ، ظلال کی نقیض ہے بمعنی رات گزارنا ، نیند ہو یا نہ ہو ۔ اہل عرب کہتے ہیں :

بات فلان قلقا ۔

(فلاں نے اضطراب میں شب گزاری)

(اب آیت کا معنی یہ ہوگا کہ عبادِ رحمٰن وُہ لوگ ہیں جو رات گزارتے ہیں لِرَبِّهِمْ اپنے رب (پروردگار) کے لیے، انہیں اپنے نفس کے حظ کا کوئی خیال نہیں) اور یہ اپنے مابعد سے متعلق ہے اور تقدیم تخصیص کے لیے ہے چونکہ فاصلہ مطلوب ہے اسی لیے جار مجرور کو مقدم کیا گیا ہے سُجَّدًا ساجد کی جمع ہے یعنی (درانحالیکہ وُہ لوگ اپنے چہروں پر گر کر سجدہ کرتے ہیں وَّقِیَامًا یہ قایم کی جمع ہے جیسے نائم نیام کی جمع ہے یا مصدر ہے اور جمع کے صیغہ کے قائم مقام واقع ہے۔ یعنی درانحالیکہ وہ اپنے قدموں پہ کھڑے ہوتے ہیں) اور تقدیم سجود علی القیام فواصل کی رعایت سے ہے تاکہ یقین ہو کہ نماز میں قیام سجدہ سے پہلے ہوتا ہے حالانکہ سجدہ کی اہمیت کا تقاضا یہ تھا کہ سجدہ ہر عمل سے پہلے ہو۔

حدیث شریف اقرب ما یکون العبد من ربہ وھو ساجد۔
(بندہ سجدہ کے وقت اللہ تعالیٰ کے بہت زیادہ قریب ہوتا ہے)

اور کفار سجدہ سے نہ صرف کتراتے بلکہ اس سے تکبر کرتے ہیں یہاں تک کہ کافروں کے بعض بیوقوفوں سے سُنا گیا وُہ کہتے تھے کہ ہم دُبروں کو سر سے اوپر نہیں کرتے۔

اب معنی یہ ہُوا کہ وہ اپنے پروردگار کو سجدہ کرتے اور قائم ہیں۔ یعنی وہ ساری رات یا رات کا اکثر حصہ زندہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ متقین کے متعلق فرماتا ہے:

کانوا قلیلا من اللیل ما یھجعون۔

(وہ رات کے تھوڑے حصے میں سوتے ہیں)

نکتہ: عبادت کے لیے رات کی تخصیص اس لیے ہے کہ رات کو عبادت کرنا نفس کے لیے سخت کام اور ریا سے بعید تر ہے۔ اور ان کے اس معاملہ کا بیان ہے جو اپنے پروردگار کے ساتھ کرتے ہیں کہ دن کو ان کا کیا کام ہوتا ہے اور رات کو کیا۔

ف: بہت سے بزرگوں کی سوانح میں ہم نے پڑھا ہے کہ وہ رات کو عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھا کرتے جیسے حضرت سعید بن المسیّب، فضیل بن عیاض، ابوسلیمان دارانی، حبیب عجمی الخ، مالک بن دینار اور رابعہ عدویہ وغیرہم رضی اللہ عنہم۔ غوثِ اعظم و امام اعظم و دیگران جیسے محبوبانِ خدا رحمہم اللہ)

تفسیر صُوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے وہ اپنے رب کے لیے سجدہ کرتے ہوئے رات گزارتے ہیں تو صبح ہوتے ہی اپنے رب کو پا لیتے ہیں گویا انھیں رات کے سجدوں کا نتیجہ صبح کو مل جاتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:
من کثرصلاته باللیل حسن وجهه بالنهار۔
(جو رات کو سجدے بکثرت کرتا ہے دن کو اس کا چہرہ نورانی ہوتا ہے)
یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی عزت وعظمت بڑھ جاتی ہے اشیا کے ظاہر میں بہتر شے سجدہ ہے اور باطن انسان کا اسی سے مزین ہوتا ہے۔

حکایت بی بی حفصہ بنت سیرین یعنی محمد بن سیرین کی بہن ہر رات پندرہ پارے نوافل میں کھڑے ہو کر پڑھتی تھیں جب دیا بجھ جاتا تو صبح تک قدرتی طور پر اس کا گھر نور سے روشن رہتا اور یہ بی بی بصرہ کی بہترین عابدات میں سے تھیں یہاں تک ابن سیرین رضی اللہ عنہ کو اگر قرآن مجید میں التباس پڑجاتا تو فرماتے حفصہ سے جاکر سنو وہ اسے کیسے پڑھتی ہیں اور وہ فرمایا کرتی تھیں اے نوجوانو! جوانی میں ہی کچھ کرلو کیونکہ میں نے سب کچھ جوانی میں پایا ہے۔

حکایت بی بی رابعہ رضی اللہ عنہا ساری رات عبادت میں گزارتی تھیں۔ جب سحر قریب ہوتی تو تھوڑی دیر سو جاتیں اور پھر اپنے آپ کو کہتیں کہ اے نفس! کتنی دیر سوئے گا اور کتنی دیر ٹھہرے گا ابھی تیری نیند کا وقت آرہا ہے تو ایسا سوئے گا کہ پھر اٹھے گا نہیں۔

حدیث شریف میں ہے:
قم من اللیل ولوقدرحلب شاة۔
(رات کو عبادت کے لیے اٹھو اگرچہ بکری دوہنے کی دیر)

ف: جو بوجہ سستی اور غفلت یا اسے معمولی عمل سمجھ کر یا کسی اور خیال سے دھوکا کھا کر رات کو عبادت کےلئے نہیں اٹھتا وہ اپنی محرومی کا ماتم کرے کیونکہ اس نے اپنا بہت بڑا نقصان کیا ہے۔

ف: جو شخص امور دنیا کے مشاغل، دیگر کاروبار کے اہتمام، اعضاء کی تھکان، بسیار خوری، دیر تک باتوں میں لگے رہنے، لہو ولعب میں وقت گزارنے اور دن کو قیلولہ نہ کرنے کی وجہ سے رات کو عبادت کیلیے نہیں اٹھتا اس جیسا اور کون محروم ہوگا۔[1]

ف: اسے منجانب اللہ توفیق دیا ہوا سمجھو جو اپنے وقت کو غنیمت جانتا ہے اور اپنی بیماری اور اس کا علاج جانتا ہے اور اپنے اوقات کو ضائع نہیں کرتا۔

سوال: فقیر، اسے اللہ تعالیٰ فعل خیر کی قوت بخشے، کہتا ہے کہ اگر تجھ سے کوئی سوال کرے کہ اس حدیث شریف کا جواب کیا ہے جبکہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص عشاء کی نماز باجماعت

[1] صاحب روح البیان قدس سرہ ۱۲۔

پڑھتا ہے گویا وہ ساری رات جاگتا رہا اور جو صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتا ہے گویا وہ ساری رات عبادت میں رہا۔" اس حدیث شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ دو نمازوں کو باجماعت ادا کرنے پر ساری رات کی مشقت سے بھی بچ گیا اور ثواب بھی ساری رات کا پا گیا۔

جواب : حدیث شریف میں نماز باجماعت ادا کرنے کی ترغیب اور پھر رات کو آرام کرنے کی رخصت اور تاثیر نیت کا بیان ہے۔ مثلاً جو شخص رات کو عشاء کی نماز پڑھ کر سوتا ہے اور دل میں نیت رکھتا ہے کہ صبح کی نماز باجماعت ادا کرے گا تو وہ اگرچہ بستر پہ سو رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک گویا وہ مسجد میں نماز کا انتظار کر رہا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ بہت سی نیک نیتیں نیک عمل کرنے سے اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہیں اگرچہ نیت مع عمل افضل ہے اور رخصت سے عزیمت کو فوقیت حاصل ہے۔

ف : حضرت عبداللہ بن سہل تستری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سنن مؤکدہ فرائض کی اور نوافل سنن کی اور مستحبات نوافل کی تکمیل کے لیے ہوتے ہیں اور ترک دنیا بھی مستحبات میں سے ایک ہے۔

مسئلہ : فقہاءؒ کا اختلاف ہے کہ کیا نماز میں قیام طویل افضل ہے یا کثرتِ سجود و رکوع۔ (درر کتابِ فقہ) میں لکھا ہے کہ :

طول القیام اولیٰ من کثرت السجود۔

(کثرتِ سجود سے طویل قیام افضل ہے)

حدیث شریف حضور علیہ السلام نے فرمایا :

افضل الصلوات طول القنوت۔

(نمازوں میں وہ نماز افضل ہے جس میں قیام طویل ہو)

القنوت بمعنے القیام ہے اس لیے کہ قرأت میں طول قیام میں قرأت کی کثرت ہوتی ہے اور رکوع و سجود کی طوالت میں تسبیحات کی کثرت حاصل ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ قرأت کی کثرت تسبیح کی کثرت سے افضل ہے۔ بعض فقہاءؒ نے کثرتِ سجود کو افضل کہا ہے۔

حکایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کسی کو نماز میں طویل قیام کرتے دیکھ کر فرمایا کہ اگر میں اسے جانتا ہوتا تو اسے کہتا کہ رکوع و سجود کی کثرت کیجئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا، فرمایا کہ بندہ جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو گناہ اس کے سر اور کاندھوں پر رکھے جاتے ہیں۔ جب وہ رکوع و سجود کرتا ہے تو وہ تمام گناہ اس سے گر جاتے ہیں۔

حکایت حضرت معدان بن طلحہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ثوبان غلامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا اور عرض کی کہ مجھے ایسا عمل بتائیے جس سے بہشت کا داخلہ نصیب ہو۔ فرمایا کہ میں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق عرض کیا تھا تو آپؐ نے فرمایا:

علیك بکثرۃ السجود لله فانك لا تسجد لله سجدۃ الا رفعك الله بها درجة وحط عنك بها خطیئة۔

(کثرتِ سجود پر التزام کیجئے اس لیے کہ تیرے ایک سجدے سے تیرا ایک مرتبہ بلند ہوتا ہے اور ایک گناہ معاف ہوتا ہے)

مسئلہ: ہر نیک کام میں اچھی نیت اور خلوصِ کامل ضروری ہے۔

۱ . مشایخ ہمہ شب دعا خواندہ اند
سحرگہ مصلی بر افشاندہ اند

۲ کسے کو بتابد ز محراب روے
بکفرش گواہی دہند اہل کوے

۳ تو ہم پشت بر قبلہ در نماز
گرت در خدا نیست روئے نیاز

(ترجمہ: (۱) مشایخ تمام رات دعا میں مشغول رہ کر صبح کو مصلے وغیرہ لپیٹ لیتے ہیں تاکہ ریاء کا شائبہ نہ ہو۔

(۲) وہ شخص جو محراب یعنی عبادتِ الٰہی کا انکار کرتا ہے اس کے کفر کی اس کے ہمسائے گواہی دیتے ہیں۔

(۳) تیری پیٹھ بھی نماز کے وقت قبلہ کی طرف ہے اگر تیری نیت نیاز درگاہ خداوندی کی نہیں تو۔

ہم سب کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف متوجہ ہونے کی توفیق بخشے۔

تفسیر عالمانہ وَالَّذِينَ يَقُولُونَ اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کے بعد یا عام اوقات میں کہتے ہیں رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا اے ہمارے پروردگار! پھیر دے ہمیں عَذَابَ جَهَنَّمَ جہنم کے عذاب سے۔ العذاب بمعنے الایجاع الشدید (سخت درد پہنچانا) إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ؕ بے شک اس کا عذاب گلے کا طوق یعنی دائمی شر اور ہلاکت لازمی ہے یعنی

کافروں کو جو عذاب پہنچے گا اس سے ان کو فراغت نہ ملے گی۔

حلِ لغات: راغب رحمہ اللہ مفردات میں لکھتے ہیں کہ غرام، مغرمًا بالنساء سے ہے۔ یعنی وہ شخص جو عورتوں کا فریفتہ ہے ان کے پیچھے قرضدار کی طرح لگا رہتا ہے۔ الغریم وہ شخص جس پر قرض ہو۔

ف: حضرت محمد بن کعب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کفار سے اپنی نعمتوں کا ثمن مانگا وہ نہ ادا کر سکے تو انھیں اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا۔

اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا○ بے شک وہ بُرا ٹھکانا اور بُری آرام گاہ ہے۔ پہلے ان کے بُرے کردار کی بری جزا کا ذکر تھا اب ان کے بُرے ٹھکانے کا بیان ہے یہ کلام کا تتمہ ہے اور ساءت کی ضمیر تو ان کے اسم کی طرف راجع ہے نہ ہی کسی دوسرے معین اسم کی طرف۔ بلکہ یہ ایک مبہم ضمیر ہے جس کی تفسیر اس کے مابعد کی تمیز کرتی ہے۔ یعنی مستقرا و مقاما، اس لیے کہ افعال ذم کے فاعل کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ معرف باللام ہوتا ہے یا مضاف بہ معرف باللام یا مضمر ممیز بنکرۂ منصوبہ ہوتا ہے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ بُرا ہے وہ مقام جو ان کے ٹھہرنے اور رہنے کی جگہ ہے یعنی جہنم۔ آیت میں اشارہ ہے کہ یہ لوگ خلق کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آتے ہیں اور حق تعالیٰ کی عبادت میں بھی مشغول رہتے ہیں لیکن باوجود ایں ہمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں زاری و انکساری کرتے ہوئے ڈرتے رہتے ہیں اور آرزو کرتے ہیں کہ ان سے دوزخ کا عذاب پھیر دیا جائے۔ یعنی جدّوجہد کرتے ہیں اور امکانی صورت تک کوشاں رہتے ہیں۔ اور سوال و دُعا کے وقت اپنے آپ کو بہت بڑا مجرم اور گنہ گار سمجھتے ہیں اور نہایت ہی عذر کے ساتھ لسان تذلل سے بارگاہِ حق میں عرض کرتے ہیں جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

وما رمت الدخول علیه حتی

حللت محلة العبد الذلیل

(ترجمہ: میں نے اس کے ہاں حاضری کی کوشش نہیں کی۔ ہاں جب بھی گیا ہوں تو عبد ذلیل کی طرح حاضر ہوا ہوں)

ف: اس کی وجہ وہی ہے کہ انہوں نے اپنے اعمال کا کوئی اعتبار نہیں کیا اور نہ ہی اپنے احوال پر بھروسا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا حال بیان فرمایا ہے:

والذین یؤتون ما آتوا وقلوبهم وجلة۔

(اور وہ لوگ جن کو ہم نے مال و دولت دی ہے وہ راہِ حق میں خرچ کرتے ہیں تو ان کے دل خوفِ خدا سے ڈرتے ہیں)

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا ؎

طریقت ہمینست کاہل یقین
نکوکار بودند و تقصیر بین

(ترجمہ: طریقت یہی ہے کہ اہلِ طریقت وہ ہیں جو نیکی بھی کرتے ہیں لیکن پھر بھی اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتے ہیں)

اور فرمایا: ؎

بندہ ہمان بہ کہ ز تقصیرِ خویش
عذر بدرگاہ خدائے آورد
ورنہ سزاوار خداوندیش
کس نتواند کہ بجائے آورد

(ترجمہ: وہی بندہ بہتر ہے جو اپنی کوتاہیوں کا عذر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لائے۔ ورنہ اس کے خداوند ہونے کی حیثیت سے کوئی بھی اس کا شکر نہیں بجا لاسکتا)

مسئلہ: اس بندۂ خدا کو عبودیت سے ذرہ برابر بھی حصہ نصیب نہیں جو عبادت کرتا ہے تو ریا کی، اور زبانی جمع خرچ کے سوا اور کچھ اس کے پاس ہے نہیں۔

ف: نہر جوری رحمہ اللہ نے فرمایا اس بندے کے متعلق محبتِ حق کی علامت سمجھو جو اپنی ہر عبادت میں کوتاہی اور اخلاص میں کمی تصوّر کرے اور خیال رکھے کہ میں نے کبھی اللہ تعالیٰ کو یاد کیا ہی نہیں اور صداقت سے مجھے حصہ نصیب نہیں ہوا اور مجاہدہ میں کوتاہی ہی کوتاہی رکھتا ہُوں اور فقر کی میں نے کچھ رعایت نہیں کی غرضیکہ وہ اپنے احوال اللہ تعالیٰ کے ہاں غیر پسندیدہ سمجھتا ہے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کے فقر اور محتاجی کے اظہار میں بڑھتا رہتا ہے اور سیر الی اللہ میں بڑھتے بڑھتے فنا کے مقام کو پہنچ جاتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا تمام کو فانی دیکھتا ہے۔

دُعا مانگنا آیت سے ثابت ہوا کہ مطلقاً دعا مانگنا ہر وقت جائز ہے بالخصوص نمازوں کے بعد، کیونکہ دُعا عبادت کا مغز ہے اور نمازی کو چاہیے کہ نماز کے بعد دعا ضرور مانگے خواہ وہ اکیلا ہو یا جماعت کے ساتھ۔ امام ہو یا مقتدی۔

دعا کے الفاظ اللهم صلّ علىٰ (سيدنا) محمد وعلىٰ آل (سيدنا) محمد
اللهم انى اسئلك الجنّة وما قرب اليها من قول وعمل واعوذبك

من النار و ما قرب الیها من قول و عمل اللھم استر عورا تی و أمن روعا تی واقل عثراتی اللھم انی اسئلك ایما نا لا یرتد و نعیما لا ینفد وقرۃ عین الا بد ومرافقۃ نبیك محمد اللھم البس وجوھنا منك الحیاء و املاء قلوبنا بك فرحا واسکن فی نفوسنا عظمتك و ذلل جوارحنا لخدمتك واجعلك احب الینا مما سواك اللھم افعل بنا ما انت اھلہ ولا تفعل بنا ما نحن اھلہ اللھم اغفرلی ولوالدی وارحمھما کما ربیانی صغیرا واغفر لاعمامنا وعماتنا واخوالنا وخالاتنا وازواجنا و ذریاتنا ولجمیع المؤمنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات الاحیاء منھم والاموات یاارحم الراحمین و یا خیر الغافرین۔

(ترجمہ :۔ اے اللہ ! اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رحمت بھیج ۔ اے اللہ ! میں تجھ سے جنت کا اور اس قول و عمل کا سوال کرتا ہُوں جو جنت کے قریب کر دے اور پناہ مانگتا ہوں دوزخ سے اور اس قول و عمل سے جو دوزخ کے قریب کر دے اے اللہ ! میرے عیوب ڈھانپ دے اور گھبراہٹوں سے مجھے محفوظ فرما اور میری لغزشیں معاف فرما اے اللہ ! میں تجھ سے ایمان کا سوال کرتا ہُوں کہ وہ رد نہ ہو اور نعمتیں کہ ختم نہ ہوں اور آنکھوں کی دائمی ٹھنڈک اور تیرے پیارے نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنت کی رفاقت مانگتا ہوں اے اللہ ! اپنی طرف سے ہمارے چہروں پر حیاء کا لباس پہنا اور ہمارے دلوں کو اپنی طرف سے خوشی سے بھر دے اور ہمارے نفوس کو اپنی عظمت کی تسکین بخش اور اپنی خدمت کے لیے ہمارے نفوس کو اپنا فرمانبردار بنا دے اور ما سوا اپنے تُو اپنی ذات ہمیں زیادہ محبوب بنا دے اے اللہ ! ہمارے ساتھ وہی کر جس کا تو لائق ہے نہ کہ جس طرح ہم لیاقت رکھتے ہیں اے اللہ ! مجھے بخش دے اور میرے والدین کو بھی اور ان دونوں پر رحم فرما جس طرح انہوں نے ہماری تربیت فرمائی جبکہ میں چھوٹا تھا اور ہمارے چچاؤں کو بخش اور ہماری پھوپھیوں کو اور ہماری خالاؤں کو اور ہماری عورتوں کو اور ہماری اولاد کو اور تمام مرد و زن اہلِ ایمان واہلِ اسلام کو بخش دے ان میں جو زندہ ہیں یا مر گئے ہیں ، اے تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحیم اور تمام بخشنے والوں سے اعلیٰ)

ف : ان کے علاوہ اور دُعائیں عوارف المعارف میں قوت القلوب للامام المکی میں ہیں وغیرہ ۔

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا اور وہ لوگ جنہوں نے خرچ کیا۔

حل لغات : نفق الشئ بہ اس وقت بولتے ہیں جب شے جل جائے اور ختم ہو جائے بیع کے ذریعے۔ مثلاً کہتے ہیں :

نفق المبیع نفاقا۔

یا موت سے، جیسے : نفقت الدابۃ نفوقا۔

یا فنا سے، جیسے : نفقت الدراھم و انفقتھا۔

لَمْ یُسْرِفُوْا اور حد سے نہیں بڑھے یعنی احسان و کرم کی حد سے متجاوز نہیں ہوئے وَلَمْ یَقْتُرُوْا اور تنگی نہیں کی یعنی بخیل کی طرح مال کو چھپا کر رکھ نہیں دیا۔

حل لغات : قتر، اقتار، تقتیر بمعنے وہ تنگی جو اسراف کی نقیض ہے اور اسراف بمعنے خرچ کرنے کی حد سے بڑھ جانا۔

وَکَانَ اور ہے انفاق وہ جس پر انفقوا دلالت کرتا ہے بَیْنَ ذٰلِکَ تنگی اور انفاق مذکور کے درمیان۔ یہ کان کی خبر ہے۔ قَوَامًا ۝ یہ دوسری خبر ہے۔ یا یہ خبر ہے اور بین ذٰلک ظرف لغو ہے کان کی یہ اس مذہب پر ہے جو کان کو ظرف کا عامل مانتا ہے (اب معنی یہ ہوا کہ خرچ کرو جو تنگی اور اسراف کے درمیان ہے یعنی دونوں طرفوں کو مدِّنظر رکھ کر خرچ کیا جائے ان میں کسی کو بلا وجہ ترجیح نہ دی جائے یہ ایسے ہے جیسے دائرہ کا مرکز ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہر طرف کو برابر رکھتا ہے۔ قوام اور سواء ایک دوسرے کی نظیر ہیں چونکہ ان کی دونوں طرفیں برابر ہوتی ہیں اس لیے سواء سے موسوم ہے۔ یہ آیت :

ولا تجعل یدک مغلولۃ الٰی عنقک	اور نہ کر اپنے ہاتھ کو گردن سے بندھا
ولا تبسطھا کل البسط فتقعد ملوما	ہوا اور نہ ہی اسے پورا کھول دے
محسورا۔	سو تو بیٹھ جائے گا ملامت کیا ہوا اور
	حسرت خوردہ۔

کی نظیر ہے ؎

وسط را مکن ہرگز از کف رہا

کہ خیر الامور ست اوساطہا

(**ترجمہ** : درمیانی رفتار کو ہاتھ سے نہ جانے دے اس لیے کہ درمیانے امور بہتر ہیں۔)

انفاق کی قسمیں

انفاق دو قسم ہے :
(۱) محمود
(۲) مذموم

محمود وہ ہے جس کا مرتکب عدالت (برابری) کو مدِّنظر رکھے ۔ یعنی شرع کے احکام کے مطابق خرچ کرے جیسے صدقہ فرضیہ اور اپنے عیال پر خرچ کرنا ۔ اسی لیے حضرت حسن رحمہ اللہ نے فرمایا : انسان جو کچھ اپنے عیال پر خرچ کرتا ہے اس میں نہ اسراف کرنا ہے نہ فساد نہ تنگی، تو وہ راہِ خدا میں لٹانے کے معنی میں ہے۔ اور ایسے جو خرچ ثواب کی خاطر کیا جائے اور وہ وہی ہے جس کا خرچ کرنا شریعت نے بتایا ہے۔ اور وہ خرچ بھی محمود ہے جو انسان کی مروت پر دال ہو۔ یعنی وہ خرچ جسے شرع نے مندوب قرار دیا ہے ۔ یعنی خلقِ خدا سے مروّت کر کے ان کو شکریے کا موقع دینا ۔ اور نعمت کے مالک یعنی اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب حاصل کرنا۔

انفاق مذموم بھی دو قسم ہے :

(۱) افراط یعنی تبذیر و اسراف یعنی فضول خرچی ۔
(۲) امساک و التقصیر یعنی تنگی سے خرچ کرنا ۔

ان میں کیفیت و کمیت کی رعایت ضروری ہے ۔ تبذیر کیفیت کے لحاظ سے یوں ہے کہ اپنے حال سے بڑھ کر کوئی شے خرچ کرے ۔ اور کیفیت کے لحاظ سے یوں ہے کہ اسے غیر محل میں خرچ کیا جائے ۔ اس میں کمیت کے لحاظ سے کیفیت کا اعتبار زیادہ ہے بہت سے تھوڑا خرچ کرنے والے مسرف اور ظالم و مفسد کہلاتے ہیں جیسے فاجرہ عورت کو کچھ دینا اگرچہ معمولی سہی یا شراب خریدنا اگرچہ تھوڑی سی قیمت میں ۔ ہاں ہزاروں روپے خرچ کر دینا یہاں تک کہ گھر کا گھر راہِ خدا میں خرچ کر دینا اسراف میں داخل نہیں بلکہ وہ میانہ روی ہے اور ان کا خرچ کرنا محمود ہی محمود ہے جیسے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ نے غزوۂ تبوک میں اپنے گھر کا تمام اثاثہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لا کر رکھ دیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

ماذا ابقیت لاھلك یاابا بکر۔
(اے ابوبکر ! تم نے اپنے بچوں کے لیے کیا چھوڑا)

عرض کی :

الله و رسوله ۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ آیا ہوں)

(یہ ہے اہلسنت کا مذہب ، جو ہر وقت عقیدت سے کہا کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ و رسول (جل جلالہ ، و

صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کافی ہیں اور اسی سے حاضر و ناظر کے مسئلہ کی بھی دلیل ملتی ہے ۔ [1]

لطیفہ کسی دانا سے پوچھا گیا کہ وہ کون سا قلیل ہے جس کا خرچ اسراف سمجھا جائے اور جس کا کثیر حق۔ فرمایا جو باطل میں خرچ ہو اگرچہ کتنا ہی تھوڑا ہو وہ اسراف ہے اور راہِ حق میں جتنا کثیر ہو تو وہ اسراف نہیں بلکہ حق ہی حق ہے۔

مجاہد مفسر کا قول امام مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر کسی کے پاس ابوقبیس (پہاڑ) کے برابر سونا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لٹا دے تو وہ اسراف نہیں لیکن جسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ کیا جائے وہ اسراف ہے اگرچہ ایک درم ہی ہو۔

اور تقتیر از جہۃ کمیت یہ ہے کہ اپنی وسعتِ حال کے باوجود بہت کم خرچ کرے اور کیفیت یہ ہے کہ خرچ کرنے کی جگہ پر خرچ نہ کرے اور جہاں خرچ نہیں کرنا وہاں خرچ کرے۔

ف : بعض لوگوں کے نزدیک فضول خرچی اچھی ہے۔ لیکن چونکہ عندالشرع ضرورت سے زائد ہے اسی لئے وہ تبذیر ہے اور بخل اگرچہ لوگوں کی نظروں میں مذموم ہے لیکن اگر ضرورت کے مطابق ہو تو تبذیر نہیں ویسے سخاوت فی نفسہٖ ہر حال میں اچھی شے اور بخل بُرا ہے اس لیے کہ فضول خرچی سے سخاوت کی طرف رجوع کرنا آسان ہے لیکن بخل سے سخی بننا مشکل ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ فضول خرچ انسان کسی وقت نفع دیتا ہے اگرچہ فی نفسہٖ تبذیر مذموم ہے لیکن جب نفع دے گا تو وہ مذموم محمود ہو جائے گا۔ کنجوس نہ اپنے آپ کو فائدہ دیتا ہے نہ دوسروں کو۔ فضول خرچی درحقیقت من وجہ قبیح ترین ہے اس لیے کہ اسراف میں حق کو ضائع کرنا ہے اور اسراف مسرف کو ظلم کی طرف کھینچ لاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ بخیل ظالم کی بہ نسبت زیادہ معذور ہے اس لیے کہ اسے مال کی قدر و قیمت معلوم نہیں کیونکہ مال تو بقائے نفس کا سبب ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جہالت ہر شے کی سر ہے اور مال ضائع کرنے والا ظالم ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں :

۱ - مال کا لینا غیر محل میں ہے۔

۲ - مال کو خرچ کرنا بھی۔

فضیلتِ صحابہ حضرت یزید بن حبیب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت کا بیان ہے کہ ان کا کھانا پینا دنیا داری کی حیثیت سے نہیں تھا اور نہ ہی ان کا لباس سنگار کے لیے تھا۔ بلکہ اس قدر کھاتے پیتے کہ بھوک پیاس رفع ہو جائے اور عبادت میں مدد دے۔ اور

---

[1] اضافہ از اویسی غفرلہ

اور پہننے اس قدر کہ جس سے ستر پوشی ہو سکے اور گرمی وسردی سے بچا جا سکے۔

حدیث شریف میں ہے:

لیس لابن آدم حق فیما سوی ھذہ الخصال بیت یکنہ و ثوب یواری عورتہ و جرف الخبز والماء۔

(ابن آدم کا حق ذیل کے امور میں صرف اتنا ہے کہ گھر بنائے تو سر چھپانے کے لیے، کپڑے پہنے تو ستر ڈھانپنے کے لیے، روٹی کے ٹکڑے جینے کے لیے، پانی پینے اور نہانے دھونے کے لیے)

ف : جرف بمعنے روٹی کے ٹکڑے۔ جرفۃ بالکسر کی جمع ہے۔

مسئلہ : حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ بھی فضول خرچی ہے کہ نفس کسی چیز کی خواہش کرے تو فوراً اسے خرید کر دے دی جائے۔ ؎

اگرچہ باشد مرادت خوری

ز دوران لبی نامرادی بری

دریغ آدمی زادۂ پر محل

کہ باشد چو انعام بل ہم اضل

(**ترجمہ** : اگر تیرا مقصد صرف کھانا پینا ہے تو تجھے زندگی میں نامرادی حاصل ہوگی۔ اس آدمی زادے شہوت پرست پر افسوس ہے جو جانوروں سے بھی گیا گزرا ہے)

حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا : ؎

خواب و خورت ز مرتبہ خویش دور کرد

آنکہ رسی بخویش کہ بے خواب و خور شوے

(**ترجمہ** : اپنے سے خواب و خوراک دور کر دے۔ خودی کو اس وقت پائے گا جب تو خواب و خوراک کو دور کر دے گا)

فائدہ علمی اسراف صرف مال میں نہیں بلکہ ہر وہ امر اسراف میں داخل ہے جسے غیر محل میں رکھا جائے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کو مسرفین فرمایا ہے جبکہ انہوں نے بیج کھیتی کی جگہ میں نہ رکھا۔

چنانچہ فرمایا :

ائنکم لتاتون الرجال شھوۃ من دون النساء بل انتم قوم مسرفون۔

(بے شک تم مردوں کے پاس عورتوں کی بجائے شہوت رانی کرتے ہو بلکہ تم ہو حد سے بڑھنے والی قوم)

اور فرعون کو بھی مسرف فرمایا۔ کما قال :

انه کان عالیا من المسرفین۔

(بے شک وہ متکبر حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا)

اس لیے کہ غیر متکبر سے تکبر اسراف مذموم ہے اور متکبر کو میانہ روی اچھی ہے۔ اسی طرح باقی امور کا قیاس کیجئے۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ وہ خرچ کرنے والے اہل اللہ ہیں جو اپنے وجود کو اللہ کی ذات و صفات میں خرچ کرتے ہیں اور وہ مجاہدہ وریاضت میں حد سے نہیں بڑھتے کہ وہ اپنے آپ کو بالکل تباہ و برباد کر دیں۔ چنانچہ خود فرمایا :

ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکة۔

(اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو)

وَلَمْ يَقْتُرُوا اور تنگی نہیں کرتے یعنی وجود کے خرچ کرنے میں خواہشات وشہوات کے ترک کرنے میں نفس سے جہاد نہ کریں جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے داؤد علیہ السلام کو وحی بھیجی :

انذر قومك من اکل الشھوات فان القلوب المتعلقة بالشھوات محجوبة عنی۔

(اپنی قوم کو شہوانی اشیأ کے کھانے سے ڈرائیے اس لیے کہ وہ قلوب جو شہوات سے متعلق ہیں وہ مجھ سے محجوب ہیں۔)

وکان بین ذٰلك قواما اور وہ میانہ رو ہیں کہ نہ تو وہ زیادہ مجاہدہ کر کے ہلاکت کے گڑھے میں پڑتے ہیں اور نہ ہی مجاہدہ کے ترک سے شہوات کے پیچھے لگ کر قلب کو خراب کرتے ہیں۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

تفسیر عالمانہ **وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ**۔ لا یدعون بمعنے لا یعبدون یعنی وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کی عبادت نہیں کرتے۔ جیسے بت۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا شریک نہیں ٹھہراتے۔ (اس سے ہمارے دور کے وہابیوں دیوبندیوں کا رد ہو گیا یہاں دعا بمعنے عبادت ہے۔ اور اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو معبود ماننا ہے۔ اور وہابی لوگ دعا کا معنی پکارنا کر کے انبیاء و اولیاء کو وسیلہ کے طور پکارنے کو شرک اور انبیاء و اولیاء کو شریک قرار دے کر ہم اہل السنت والجماعت کو مشرک کہتے ہیں)[1]

---

[1] اضافہ از اویسی غفرلہٗ

شرک کے اقسام کہا جاتا ہے شرک تین قسم ہے :
(۱) اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت کرنا۔
(۲) گناہ کرنے میں کسی دوسرے کا حکم ماننا۔
(۳) غیر اللہ کے لیے کوئی نیک عمل کرنا۔
پہلی قسم کفر اور دوسری دونوں معصیت ہیں۔

تفسیر صوفیانہ (وہ لوگ اپنی حوائج ہر دکھ اور سکھ غیر اللہ کے ہاں نہیں لے جاتے (دنیا داری کی حیثیت سے، اور یہ توکل کا انتہائی درجہ ہے نہ کہ جو انبیاء و اولیاء کے لیے وسیلہ کے طور نفع و نقصان کا عرض کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ آگے والی عبارت بتاتی ہے[۱]) اور نہ ہی اپنے اعمال میں ریاء و سمعہ کو دخل دیتے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا مطلوب تلاش کرتے اور نہ اس کے سوا کسی دوسرے کو محبوب سمجھتے ہیں بلکہ صرف اسی کو چاہتے اور اسی سے محبت کرتے ہیں۔

جناب صائب نے فرمایا : ؎

غیر حق را می دہی رہ در حریم دل چرا
میکشی بر صفحۂ ہستی خط باطل چرا

(ترجمہ : اللہ تعالیٰ کے ماسوا کو حریم دل میں کیوں جگہ دیتا ہے اور صفحۂ ہستی پر باطل کی لکیر کیوں کھینچتا ہے)

تفسیر عالمانہ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ اور نہیں قتل کرتے اس نفس کو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے حرّم بمعنے حرّم قتلھا ہے مضاف حذف کر کے مضاف الیہ کھڑا کرنا تحریم کے معاملہ میں مبالغہ ہے اس سے نفس مومن مراد ہے یا جس سے معاہدہ ہوا ہو إِلَّا بِالْحَقِّ مگر حق سے یعنی جس کا قتل کرنا شرعاً مباح ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ نفس کو کسی ایک سبب سے قتل نہیں کرتے سوائے اس حق کے سبب کے جو اس کی حرمت و عصمت کو زائل کرنے والا ہے۔ جیسے کسی کو قتل کر دیا تو اس کے قصاص میں قتل کرنا یا شادی شدہ ہو کر زنا کرے تو اسے سنگسار کر کے مار دینا، یا مرتد ہو جائے یا زمین پر فتنہ و فساد برپا کرے تو ان تمام صورتوں میں قتل کرنا حق ہے وَلَا يَزْنُونَ اور نہ ہی زنا کرتے ہیں۔

زنا کی تعریف : عقدِ شرعی کے بغیر کسی عورت سے وطی کرنے کو شرعاً زنا کہا جاتا ہے۔

---

[۱] اضافہ از اویسی غفرلہٗ

ربط : خواص عباد کے اصول طاعات تواضع ومقابلہ القبیح بالجمیل واحیاء اللیل والدعاء والانفاق العدل کے بعد امہات المعاصی عبادۃ الغیر وقتل النفس المحرمہ والزنا کا ذکر فرمایا ۔ یہ ان کے کمال کا اظہار ہے کیونکہ انسان کا کمال اسی میں ہے کہ جہاں وہ فضائل سے آراستہ ہو وہاں رذائل سے بھی پاک وصاف ہو۔ نیز اس میں اشارہ ہے کہ اجر کامل وثواب مکمل اسی صورت میں نصیب ہوگا جب انسان ان دونوں کا جامع ہو۔ اور اشارہ ہے کہ یہ بُرے کام کافروں کے علامات میں سے ہیں ۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے وہی ہیں جو ان کبائر کے مرتکب نہیں ہوتے جن کے عامل کفار ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بھی وہی شریک کرتے ہیں اور نفوس محرمہ کے قتل کرنے والے بھی یہی ہیں منجملہ ان کے زندہ درگور کرنا بھی ہے ۔ اور زنا کے خوگر بھی یہی ہیں جبکہ یہ اسے مباح سمجھتے ہیں ۔

حدیث شریف حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ سب سے بڑے (کبیرہ) گناہ کون سے ہیں ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

ان تجعل للہ ندا وھو خلقك ۔

(اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا کیونکہ وہ سب کا خالق ہے)

میں نے پھر عرض کیا ، آپ نے فرمایا :

ان تقتل ولدك مخافة ان یطعم معك ۔

(بچوں کو اس ارادہ پر قتل کر دینا (زندہ درگور کر دینا) کہ یہ بڑے ہوں گے تو ان کی معاشں کا کیا بنے گا)

(جیسے آج کل برتھ کنٹرول کی وبا پھیلی ہے ۔ ایسے لوگوں کا تو سم بھی انہی لوگوں جیسا ہے ۔ یہ بھی سمجھتے ہیں اولاد زیادہ ہوگی تو ان کی معاش کا کیا بنے گا)[1]

پھر سوال کیا کہ (اس کے بعد کونسا بڑا گناہ ہے ؟) فرمایا :

ان تزنی بحلیلة جارك

(اپنے ہمسایہ کی عورت سے زنا کرنا)

---

[1] اضافہ از اویسی غفرلہ

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے ولا یزنون وہ لوگ بوڑھی دنیا میں شہوات نفسانیہ حیوانیہ کو مدِنظر رکھ کر تصرف نہیں کرتے بلکہ اس میں ان کا تصرف اللہ کے لیے اللہ کے حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہے بخلاف عوام کے کہ وہ اس میں بیجا تصرف کرتے ہیں۔

تفسیر عالمانہ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ اور وہ ان مذکورہ امور میں سے کسی امر کا ارتکاب کرتا ہے جیسے کفار کا طریقہ ہے يَلْقَ اَثَامًا ۝ گناہوں کا مرتکب ہو رہا ہے تو اسے سزا ملے گی اور وہ عذاب میں مبتلا ہوگا۔

حلِ لغات: اثام نکال و بال کے وزن اور معنیٰ میں ہے (یعنی اپنے گناہوں کی سزا پائے گا۔ اہلِ عرب کہتے ہیں: اثم (بالکسر) الرجل واثمہ یعنی اس نے گناہ کیا تو اس کی سزا پائی۔ قاموس میں ہے: اثام جہنم کی ایک وادی کا نام ہے بروزن سحاب۔ اور عقوبت کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

الغی والاثام بئران یسیل فیہما صدید اھل النار۔

(غی اور اثام دونوں کنوئیں ہیں جن میں اہلِ نار کی پیپ جمع ہوتی ہے) (پناہ بخدا)

يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اس کے لیے قیامت میں عذاب دُگنا کیا جائے گا۔

حلِ لغات: المضاعفۃ بمعنے زیادہ کرنا اور ایک سے دو کرنا یعنی دُگنا کرنا۔ جیسا کہ امام راغب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ضعف بمعنے ایک کے ساتھ اس جیسا دوسرا ملانا۔ کہا جاتا ہے: اضعفت الشئ وضعفتہ وضاعفتہ (میں نے اس کے ساتھ اس جیسا دوسرا یا اس سے زاید کو ملایا) یہ جملہ یلق اثاما سے بدل ہے اس لیے کہ دونوں کا معنیٰ ایک ہے۔

اب مطلب یہ ہُوا کہ ان کا عذاب ہر وقت بڑھتا رہے گا وُہ اس لیے کہ وُہ بھی زندگی بھر کفر کے بعد گناہوں پر گناہ کرتے چلے جاتے تھے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ ان کو عذاب کے اضافہ کا یہ معنی ہے کہ ایک طرف ان کے لیے درکات جہنم کا اضافہ دوسری طرف درجاتِ جنان سے محرومی کا غم تیسری طرف دیدار الٰہی کے قربات کی بدنصیبی۔

تفسیر عالمانہ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝ اور وہ اس عذاب میں ہمیشہ رہے گا درانحالیکہ وہ ذلیل وخوار ہوگا اور جسمانی و روحانی دونوں عذابوں میں ایسا مبتلا رہے گا کہ اس کی نجات کی بات تک نہ ہوگی۔

ف : مُهان بمعنے ذلیل وخوار اور حقیر و بیکار و بے اعتبار۔

قاعدہ تجوید ابن کثیر وحفص نے فِیهی پڑھا ہے یعنی ھِی کی کسرہ کے اشباع کے ساتھ اسے بحالت وصل یا سے پڑھنا تاکہ تنبیہ ہو کہ ایسے عذاب کے اسباب سے دُور بھاگنا اور بچنا ضروری اور لازمی ہے۔

اِلَّا مَنْ تَابَ مگر وہ جو شرک وقتل وزنا سے توبہ کرے وَ اٰمَنَ اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی تصدیق کرے وعَمِلَ عَمَلاً صَالِحًا اور ایمان کی تکمیل کے لیے نیک عمل کرے۔

سوال : عمل موصوف کے اضافہ کی کیا ضرورت تھی جبکہ صالح کا لفظ بھی اسماً نیک عمل پر دلالت کرتا ہے۔

جواب : عمل کو مہتم بالشان ظاہر کرنے کے لیے اس سے اہلسنت کے مذہب کی تائید ہوتی ہے کہ عمل ایمان کے مغایر ہے اور استثناء میں مستقل ہے لیکن ہے ہی مستثنیٰ یعنی توبہ و ایمان کی جنس سے (کہ اگر وہ نہ ہو تو ایمان و توبہ میں خلل واقع نہ ہوگا) کیونکہ اس وقت بتانا یہ ہے کہ امور مذکورہ بالا کا مرتکب عذاب میں مبتلا ہوگا مگر یہ کہ توبہ کرے۔ آیت میں واضح کرنا ہے کہ استثناء کے بعد بھی تین امور مطلوب ہیں :

۱۔ایمان ۲۔توبہ ۳۔عمل

اس میں عذاب کے تعرض وعدم تعرض کو کوئی تعلق نہیں۔

فَاُولٰٓئِكَ پس وہ لوگ جو ایمان و توبہ و عمل صالح سے موصوف ہیں یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے سیّاٰت (برائیوں) کو تبدیل فرمائے گا یعنی وہ برائیاں جو اس نے دنیا میں کیں تو اللہ تعالیٰ ان کو بدل دے گا حَسَنٰتٍ نیکیوں سے قیامت میں بایں طور کہ اس کی ہر برائی کے عوض نیکی عطا فرمائے گا اور ہر سزا کے بدلے جزا بخشے گا۔

حلِ لغات : امام راغب مرحوم نے فرمایا کہ تبدیل بمعنے ایک شے کے بدلے دوسری شے رکھنا۔ اور بدل ' عوض سے اعم ہے۔ عوض یہ ہے کہ ایک دو' دوسرا لو۔ لیکن تبدیل میں یہ نہیں بلکہ اس میں تغییر ہوتی ہے وہ یہی کہ دوسرا عوض میں دو یا نہ دو۔

کریم کا کرم سیّدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت میں کسی ایک بندے کو لایا جائے گا پھر حکم ہوگا کہ اسے اس کے صغیرہ گناہ پیش کرو جب وہ اپنے صغائر پر نگاہ ڈالے گا تو اقرار کرے گا کہ یہ واقعی میری ہی غلطیاں ہیں لیکن دل ہی دل میں خوفزدہ ہوگا کہ نامعلوم میرے کبائر (بڑے گناہوں) کا کیا بنے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ ملائکہ کو فرمائے گا کہ اسے ہر برائی کے بدلے میں نیکی دو۔ پھر وہ شخص کہے گا کہ میرے تو اور بھی بڑے بڑے گناہ تھے لیکن اب وہ مجھے نظر

نہیں آرہے (اس حرص پر کہ اسے برائیوں کے بدلے نیکیاں مل رہی ہیں) حضور علیہ السلام اس کی اس کاروائی سے ایسے ہنسیں گے کہ آپ کی داڑھ مبارک کھل جائیں گی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیۃ فاولٰئك یبدل اللہ (الآیۃ) پڑھی۔ (آپ نے گویا اپنے ارشاد گرامی کی تائید میں قرآن مجید سے دلیل بیان فرمائی)

۴ **اقوالِ مشایخ فی تفسیر ہٰذہ الآیۃ** (۱) زجاج نے فرمایا اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہی برائی نیکی بن جاتی ہے بلکہ اس کی تاویل یہ ہے کہ برائی تو توبہ سے مٹ جاتی ہے۔ پھر ہر برائی پر توبہ نیکی بن جاتی ہے۔

(۲) مولانا جامی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ہر برائی نیکی کے حکم میں آجاتی ہے کیونکہ اعیان کا تبدل نہیں ہوتا بلکہ ان کے احکام کا تبدل ہوتا ہے۔ (شرح فصوص الحکم)

(۳) حضرت الشیخ صدرالدین قنوی قدس سرہٗ اپنی اربعین (چہل حدیث) میں فرماتے ہیں کہ طاعات سب کی سب مطہرات (پاک کرنے والی ہیں) پھر کبھی تو گناہوں کو مٹا دیتی ہیں۔ جیسے اسی آیت میں ہے۔ اور حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اتبع الحسنۃ تمحھا۔

(برائی کے بعد نیکی کیجئے)

تاکہ وہی نیکیاں برائیوں کو ختم کر ڈالیں کبھی تبدیل کی جاتی ہیں۔ اسی کی طرف الا من تاب وا من الخ میں اشارہ ہے یہ محو مذکور حقیقی عفو اور تبدیل مقام مغفرت ہی ہے۔ میری مذکور تقریر کو غور سے پڑھو گے تو تمہیں عفو و مغفرت کا فرق معلوم ہو جائے گا۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ الا من تاب مگر وہ جو دنیا کی عبادت و ہوائے نفس سے توبہ کرتا ہے وا من اور ان کمالات وکرامات پر ایمان لاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لیے تیار فرمائی ہیں کہ جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی قلب بشر پر اس کا تصور آسکتا ہے وعمل عملاً صالحًا اور وہ نیک عمل کئے جو اسے انہی کمالات کی طرف پہنچانے والے ہیں اور وہ عمل یہ ہے کہ ماسوی اللہ سے بالکل روگردانی ہو اور کلی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف اس امید پر متوجہ ہو کہ اس کے احسان وکرم کا مستحق ہو جائے۔

نکتہ: کسی کامل کو کسی نے کہا کہ آپکا آج کل مشغول ہے۔ انہوں نے فرمایا بلکہ میرا کل اسی پہ فدا ہے بخدا ابھی ایک ایسا اکسیر اعظم ہے کہ اگر اس کا ایک ہی ذرہ زمین پر ڈالا جائے تو اس کے گناہوں کا

تانبہ خالص حسنات کے سونے سے تبدیل ہو جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے اکسیر اعظم والوں کی طرف سے خبر دی ہے فاولئك يبدل الله سيأتهم حسنات یعنی توبہ وغیرہ سیئات کو حسنات سے ایسے تبدیل کر دیتی ہے جیسے اکسیر تانبے کو سونا بناتی ہے۔

عقلی دلیل فقیر (صاحب روح البیان رحمہ اللہ) کہتا ہے کہ انقلاب الاعیان اور ان کا ایک دوسرے کی شکل وصورت اختیار کرنا اہل اللہ کے نزدیک محال نہیں کیا عالم صناعی میں تم نے نہیں دیکھا کہ بہت سی چیزیں اپنے مادہ اصلیہ سے اپنے غیر میں حلول کر جاتی ہیں جب ایک مزاج حلول کرتا ہے اور مادہ صورت ہیولانیہ میں داخل ہوتا ہے تو صورت ہیولانیہ میں صلاحیت ہوتی ہے کہ اس سے فلسفی انسان پیدا ہو۔

ف: امام جلدکی نے فرمایا کہ زمین پانی بن جاتی ہے اور پانی ہوا بن کر اڑتا ہے اور ہوا آگ بن جاتی ہے۔ ایسے ہی برعکس یعنی آگ ہوا بن جاتی ہے اور ہوا پانی اور پانی مٹی ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اربعہ عناصر ایک دوسرے میں حلول کر جاتے ہیں باوجودیکہ وہ آپس میں طبیعت کے لحاظ سے دو علیحدہ مزاج رکھتے ہیں ان میں بعض فاعلہ بعض منفعلہ اصول کا یہی قاعدہ مشہور ہے کہ ایک مزاج دوسرے میں حلول کرتا ہے۔

دلیل دوم فصول میں یہ قاعدہ موجود ہے۔ مثلاً زمین انگوری بن جاتی ہے اور انگوری حیوان بنتی ہے۔ اس دوسرے کلیہ میں ابن سینا نے توقف فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں کہ انگوری تو حیوان میں حلول کر جاتی ہے لیکن حیوان کسی میں حلول نہیں کرتا۔ مگر فاسد ہو کر عناصر کی طرف لوٹتا ہو اطبائع میں حلول کرتا ہے۔ اسی پر ہم کہتے ہیں کہ اگر زمین اور پانی کی صورت اپنی ہیئت سے نہ بدل جاتے تو پھر انگوری کیسے ہو سکتے تھے ایسے ہی نبات اپنی ہیئت سے نہ بدل جاتی تو حیوان میں کیسے حلول کر تی تعجب ہے کہ ابن سینا پر یہ امر کیسے پوشیدہ رہا کہ نبات وحیوان کو مطبوخ کرنے سے فاسد ہو کر انسانی غذا بنتے ہیں اور ان کا مزاج کیموس غذائی میں حلول کر کے انسان کے پیٹ میں خون بن جاتے ہیں اور یہی خون مرد اور عورت کی حرکت شوقیہ سے منی بن جاتا ہے اس کے بعد یہی خون بچہ کا ڈھانچہ بنتا ہے۔ پھر چند روز کے بعد کامل انسانی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یوں ہی انسان کے جسم کے متعلق سمجھئے کہ بعد فساد ممکن ہے کہ وہ انگوری بن جائے اور پھر وہ مختلف حیوانوں کی غذا بن کر ان میں حلول کر جائے اور ان میں ایسے ہو جیسے مختلف کیڑوں اور حیوانات وغیرہ میں ہوتے ہیں۔ اسی معنی پر اس کا جسم حلول کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہڈیوں کے متعلق بھی یہی تقریر کی جا سکتی ہے کہ وہ ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو کر بے حس پڑی ہوں لیکن جب ان پر آبِ حیات کا چھینٹا پڑ جائے تو وہ جان دار ہو جائیں گی۔ مگر انسانی ڈھانچے کے اجزاء اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ و معلوم ہیں اگر وہ ایک صفت سے کسی دوسری صفت میں حلول کر جائے یا ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل جائے بلکہ اس کے کل اجزاء کسی دوسری شے میں کالجزء ہو جائیں۔

انسان کے اجزا کی بقا انسانی ڈھانچہ اگرچہ گل سڑ کر کیسے ہی کہیں چلا جائے لیکن اس کی روح، عقل، نفس، ذات باطنی برزخ میں باقی رہتی ہیں ان کو فنا نہیں۔ حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا:

دمت از مس وجود چو مردان رہ بشوی
تا کیمیائے عشق بیابی زر شوی

(ترجمہ: تم مردانِ راہِ ہدیٰ کی طرح تانبے سے ہو جاؤ گے جب عشق کے کیمیا سے کچھ ملے گا تو زر ہو جاؤ گے)

تفسیر عالمانہ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا اور اللہ تعالیٰ غفور ہے اسی لیے وہ برائیوں کو نیکیوں سے تبدیل فرماتا ہے رَّحِيْمًا ○ مہربان ہے اسی لیے وہ نیکیوں پر اجر و ثواب بخشتا ہے وَمَنْ تَابَ اور وہ تائب ہوتا ہے یعنی تمام گناہوں کے ترک کرنے پر مطلقاً رجوع کر لیتا ہے اور ان کے ارتکاب پر نادم ہوتا ہے وَعَمِلَ صَالِحًا اور نیک عمل کرتا ہے یعنی اپنی گزشتہ کوتاہی کا تدارک کرتا ہے یا گناہوں سے نکل کر طاعات میں داخل ہوتا ہے فَاِنَّهٗ پس بے شک وہ جو عمل کئے يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مرنے کے بعد ان اعمال کے ساتھ لوٹے گا اللہ تعالیٰ کی طرف۔

ف: امام راغب نے فرمایا کہ لفظ الیٰ میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ضرور جانا ہے۔

مَتَابًا ○ عظیم الشان رجوع اور پسندیدہ اللہ کے ہاں کہ وہ عذابِ الٰہی کو مٹائے گا اور اجر و ثواب کو حاصل کرے گا) اس سے واضح ہو گیا کہ اس عبارت میں شرط و جزاء میں اتحاد لازم نہیں آیا اس لیے کہ جزاء میں ایک زائد معنی ہے اس لیے کہ توبہ یعنی شرط میں ہے رجوع عن المعاصی فقط اور جزاء میں ہے ایسا رجوع الی اللہ جو اسے پسندیدہ ہے۔

ف: امام راغب نے فرمایا کہ متابًا بمعنی التوبۃ التامۃ یعنی ترک القبیح و تحری الجمیل (برائیوں کو مکمل طور پر چھوڑنا اور نیکیوں کو مکمل طور حاصل کرنا)۔

ف: اس میں تخصیص کے بعد تعمیم ہے اس لیے کہ آیت اولیٰ میں توبہ کا تعلق صرف شرک و قتل و زنا سے تھا اور اس آیت میں مطلقاً جمیع معاصی سے ہے۔

توبہ کا شرعی معنی شریعت میں توبہ چار امور کے اجتماع کا نام ہے:
(۱) گناہ کو قبیح سمجھ کر چھوڑنا۔
(۲) سابقہ کوتاہی اور زیادتی پر ندامت۔

(۳) دوبارہ ایسی غلطی کے ارتکاب کے ترک پر پختہ ارادہ کرلینا۔
(۴) سابقہ خامیوں کے عوض نیکیوں کا تدارک۔
جب یہ چار شرائط پائی جائیں تو توبہ کامل سمجھی جائے گی۔
حضرت مولانا جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

با خلق لاف توبہ و دل بر گنہ مصر
کس پے نمی برد کہ بدیں گونہ گمرہم

(ترجمہ: مخلوق کے ساتھ تو توبہ کا دعویٰ لیکن گناہوں پر بدستور اصرار ہے۔ پھر کون ہے جو مجھے اس کے باوجود گمراہ تصور نہ کرے گا)

اقوال مشائخ (۱) حضرت ابن عطاؒ نے فرمایا کہ توبہ بمعنے ہر مذموم عادت سے باز آجانا اور نیک عادت کی عادت بنا لینا، لیکن یہ خواص کی توبہ ہے۔
(۲) بعض مشایخ نے فرمایا کہ توبہ یہ ہے کہ ماسوی اللہ کی ہر شے سے توبہ کرے لیکن یہ اخص الخواص کی توبہ ہے۔
سبق: سالک پر لازم ہے کہ وہ ہر وقت توبہ واستغفار کو اپنائے اس لیے کہ یہ گناہوں کا صابن ہے۔

(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے)

حدیث قدسی انین المذنبین احب الی من زجل المسبحین۔
(گنہگار کی مغموم آواز مجھے زیادہ محبوب ہے تسبیح پڑھنے والوں کی سریلی آواز سے)
ف: زجل بمعنے تسبیح پڑھتے وقت کی آواز۔
انتباہ: گناہ بار بار کرنا شرک وکفر اور غیر ملتِ اسلامیہ کی طرف کھینچ کرلے جاتا ہے۔

حکایت حضرت ابو اسحاق رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ ہر وقت اپنے چہرے کا آدھا حصہ چھپائے رکھتا تھا، میں نے سبب پوچھا تو کہا کہ میں قبر کھود کر کفن چرانے کا عادی مجرم تھا ایک دن ایک بی بی کی قبر کھودی اور کفن کو پکڑا تو اس بی بی نے میرے منہ پر طمانچہ مارا جس کا نقش تا حال میرے چہرے پر موجود ہے۔ میں نے امام اوزاعی رضی اللہ عنہ کے ہاں یہی واقعہ لکھا تو انہوں نے فرمایا اس سے سوال کیجئے کہ اس نے مُردوں کو کس حال میں پایا۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اکثر کے چہرے قبروں میں قبلہ سے پھرے ہوئے تھے۔ امام اوزاعی رضی اللہ عنہ کو واپس لکھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ لوگ وہی ہوں گے جن کی موت غیر ملتہ اسلامیہ پر واقع ہوئی (العیاذ باللہ) کیونکہ وہ لوگ گناہ کا بار بار ارتکاب کرتے رہے تو پھر خاتمہ خطرہ میں پڑ گیا۔

قاعدہ : مامور بہ کے ترک کی بہ نسبت منہی عنہ یعنی جس فعل کے نہ کرنے کا حکم ہو، اس کے ارتکاب میں زیادہ گناہ ہے اسی لیے شیطان ابلیس مردود ہوا۔ مثنوی شریف میں ہے : ؎

۱ توبہ را از جانب مغرب دری
باز باشد تا قیامت بر دری

۲ تا ز مغرب بر زند سر آفتاب
باز باشد آں دراز دی رومتاب

۳ ہشت جنت را ز رحمت ہشت در
کہ در توبہ است زاں ہشت آیسر

۴ آں ہمہ کہ باز باشد کہ فراز
واں در توبہ نباشد جز کہ باز

۵ ہین غنیمت دار در بازست زود
رخت آنجا کش بکوریٔ حسود

(ترجمہ :(۱) توبہ کا دروازہ از جانب مغرب بند ہے۔ وہ قرب قیامت تک کھلا رہے گا
(۲) جب سورج مغرب سے طلوع ہوگا۔ پھر وہ دروازہ بند ہوجائے گا۔ اس کا انکار نہ کرنا۔
(۳) بہشت کے آٹھ دروازے رحمت کے آٹھ دروازوں کے مطابق ہیں اسی لیے یہ توبہ کا دروازہ انہی آٹھوں سے ہے۔
(۴) وہ آٹھوں دروازے جب تک کھلے ہیں یہ بھی کھلا ہے۔ جب وہ بند ہوں گے تو پھر یہ کیسے کھلا رہ سکتا ہے۔
(۵) اب یہ دروازہ کھلا ہے اسے غنیمت سمجھ۔ وہاں پر سامان باندھ کر جا بیٹھ تاکہ تیرے دشمنوں کے دل جلیں)

ہم اللہ تعالیٰ سے خالص توبہ کا سوال کرتے ہیں اور اس کے آثار رحمت سے فیض اور نعمت و فتوح مانگتے ہیں۔ (آمین ثم آمین)

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ اور وہ جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

حل لغات : الشہادۃ مشاہدہ وعیان سے، کسی شے کی صحیح خبر دینا (اسی سے حاضر و ناظر کا مسئلہ ثابت کیا جاتا ہے کیونکہ شاہد و شہید اسی سے مشتق ہیں[1]) الزور بمعنے الکذب، اصل میں کسی شے کو ایسے رنگ میں

---

[1] اضافہ از اویسی غفرلہ

ظاہر کرنا کہ گویا وہ حق ہے، کو کہا جاتا ہے۔

امام راغب نے فرمایا کہ الازور بمعنیٰ مائل الزور یعنی سینے کو ٹیڑھا کرنے والا۔ اور زور کو جھوٹ سے اس لیے تعبیر کیا جاتا ہے کہ وہ سچائی کی جانب سے ہٹا ہوا ہے۔

ترکیب: الزور کا منصوب ہونا علی المصدریہ ہے۔ دراصل لا یشہدون شہادۃ الزور تھا باضافۃ العام الی الخاص مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ اس کے قائم مقام کیا گیا ہے۔

اب معنی یہ ہوا کہ وہ لوگ جھوٹی گواہی قائم نہیں کرتے یعنی جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جھوٹے گواہ کی سزا یہ ہے کہ اسے اپنی برادری میں کھڑا کر کے کہا جائے کہ یہ جھوٹا گواہ ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ نے فرمایا کہ اسے سزا دے کر برادری میں کھڑا کر کے کہا جائے اس نے جھوٹی گواہی دی ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کی جامع مساجد اور بازاروں اور مجمعوں میں تشہیر کی جائے کہ یہ جھوٹا گواہ ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اسے ان مقامات پر پھرایا جائے اور اعلان کیا جائے کہ اس کو ہم نے جھوٹا گواہ پایا ہے۔ فلہذا آئندہ اس سے بچ کر رہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اسے چالیس کوڑے مارے جائیں اور اس کا منہ کالا کر کے بازاروں میں پھرایا جائے۔ (کذا فی کشف الاسرار)

ف: حضرت ابن عطاء رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے وہ گواہی مراد ہے جو مشاہدہ قلب کے بغیر صرف زبان سے ہو۔[1]

حاضر و ناظر کا ثبوت ممکن ہے کہ یہ یشہدون از شہود ہو بمعنیٰ حضور (ہم اہل السنت و الجماعت شاہد و شہید کا مادہ شہود سے لیتے ہیں بمعنیٰ حاضر۔ دلائل ہماری کتاب "تسکین الخواطر المعروف بہ دلوں کا چین" میں دیکھئے)[2] اور اس معنی پر الزور کا منصوب ہونا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ اصل میں تھا: لا یشہدون مجالس الزور (وہ لوگ جھوٹی مجلسوں میں حاضر نہیں ہوتے مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کیا گیا ہے۔

---

[1] روح البیان ج ۶ ص ۲۴۹

[2] اضافہ از اویسی غفرلہٗ

۱۳ اب معنیٰ یہ ہوا کہ وُہ لوگ مجالس کذب و محافلِ فحش میں شریک نہیں ہوتے۔ باطل محافل میں صرف شریک ہونا اس میں شامل ہونے کے مترادف ہے کیونکہ شرکت اس فعل سے رضا کی نشانی ہے جیسے کوئی شرابیوں کے ساتھ بلاضرورت بیٹھے تو وہ بھی گناہ میں ان کے ساتھ شریک سمجھا جائے گا۔)

ملامیہ فرقہ ملامیہ فرقہ (اولیاء اللہ کے ایک گروہ کا نام ہے) وہ ایسے حضرات ہیں جو نیکی کو چھپاتے اور برائی کو ظاہر کرتے ہیں وہ مستثنیٰ ہیں اس لیے کہ ان کا دل صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ لگا رہتا ہے اسی لیے وہ بازاروں کا چکر بھی لگاتے ہیں۔ عوام میں گھل مل کر رہتے ہیں بلکہ بعض شرور کی مجالس میں بھی شریک ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ ہر قضا و قدر کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اسی لیے وہ عوام کے ساتھ صرف ظاہراً شر کی موافقت کرتے ہیں ورنہ حقیقی اولیاء الرحمٰن وہی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حدیث شریف اولیائی تحت قبائی لا یعرفهم سوائی۔

(میرے اولیاء میری قبا میں چھپے رہتے ہیں انہیں میرے سوا اور کوئی نہیں پہچانتا)

حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

مکن بنامہ سیاہی بلامت من مست
کہ آگہت کہ تقدیر بر سرش چہ نوشت

۱۴ (ترجمہ: مست کو نامۂ سیاہی سے ملامت نہ کر اس لیے کہ وہ اس سے باخبر ہے کہ اس کی تقدیر کا لکھا ہوا کیا ہے)

حضرت خجندی رحمہ اللہ نے فرمایا: ؎

برخیز کمال از سر ناموس کہ رندان
کردند اقامت بسر کوئے ملامت

(ترجمہ: اے کمال از سر ناموس رندان اٹھ جا، اس لیے کہ انہوں نے ملامت کی گلی میں اقامت رکھی ہوئی ہے)

ف: بعض علماء نے فرمایا کہ الزور سے اعیاد المشرکین والیهود والنصارٰی یعنی مشرکین اور یہود و نصارٰی کی عیدیں مراد ہیں یعنی ان کی کھیل کود کے مقام۔ (کذا فی تفسیر الکاشفی)

فتوحات مکیہ فتوحات کے ترجمہ میں ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اہلِ ذمہ (مشرکین) شرک کا فریب دیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تیری ہلاکت و تباہی اسی میں ہو۔ حضرت شیخ اکبر قدس سرہٗ نے فرمایا کہ اس کا

ہم نے دمشق میں مشاہدہ کیا کہ مسلمان اپنے بچوں کو نصاریٰ کے گرجے میں لے جا کر معمودیہ کے پانی سے تبرک لیتے اور ان کو ان کے گرجوں سے نذر دیتے جس کا نتیجہ خراب نکلا۔ ایسا کام کفر کے قریب ہے۔ اسے عین کفر کہا جائے تو بجا ہے اسے کوئی مسلمان پسند نہیں کرتا۔

مسئلہ: قاضی خان میں ہے کہ اگر کوئی شخص نیروز (نصاریٰ کی عید میں) میں کوئی شے خریدے اور سوائے اس دن کے وہ شے کہیں سے نہیں خریدتا اور اس کی تعظیم و تکریم کے طور خریدتا ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے کفار اس کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ تو ایسا کرنا کفر ہے۔ مگر اسی نیروز میں اگر کھانے پینے اور تعیش کے لیے کچھ خریدتا ہے تو کفر نہیں۔

ف: نیروز سے نصاریٰ کا نیروز مراد ہے اس سے عجم کا نیروز مراد نہیں، جیسا کہ قاضیخان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔

مسئلہ: مجلس زُور میں لہو و لعب اور کذب اور نوحہ اور غناء داخل ہیں۔

ف: محمد بن المنکدر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جو اپنے کانوں کو لہو اور مزامیر شیطان سے بچاتے تھے، انھیں مشک کے باغات میں لے جاؤ۔ پھر ملائکہ کو حکم ہو گا کہ میرے بندوں کو میری تحمید و ثنا و تمجید سناؤ اور انہیں خبر دو کہ انہیں آج نہ کوئی غم ہے نہ خوف۔ (کذا فی کشف الاسرار)



مسئلہ: روزے کی سنتوں میں سے ایک یہ ہے کہ روزہ میں کذب و غیبت اور فضول کلامی، گالی گلوچ، چغلخوری، مزاح، بے جا مدح اور غلط شعر گوئی سے زبان کو روکا جائے۔

ف: غناء سے غناء باطل مراد ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا غنا جو شیطان کی مراد و مقصد کو قلب میں حرکت پیدا کر دے یعنی شہوت اور مخلوق کی محبت کا سبب بنے۔ ہاں وہ غنا جو شوق الی اللہ کا متحرک ہو تو وہ غناء حق ہے۔ (کذا فی الاحیاء)

مسئلہ: الحان کے ساتھ قرآن کی تلاوت میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور اسے مکروہ سمجھتے ہیں اس لیے کہ قرآنی حقوق کے لحاظ سے خشوع نہیں ہو سکتا اور نہ ہی قرآنی مفہوم سمجھ میں آتا ہے اسی لیے قاضیخان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تراویح میں خوش خوان بلکہ درست خوان کو کھڑا کیا جائے اس لیے کہ خوش خوان خشوع اور تدبر و تفکر سے باز رکھتا ہے۔ اور حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اور اسلاف رحمہم اللہ کی ایک جماعت اسے مباح سمجھتی ہے کیونکہ اس کے متعلق احادیث وارد ہیں اور اس طرح رقت اور خشیت الٰہی پیدا ہوتی ہے۔ (کذا فی فتح القریب)

مسئلہ: اصولِ حدیث میں ہے کہ محدّث جب احادیث کا درس شروع کرے تو لازم ہے کہ وہ اس محفل و مجلس کا آغاز تلاوتِ کلام اللہ سے کرائے اور قاری بھی خوش الحان ہو۔

مسئلہ: خوش الحانی سے پڑھنے میں یہ ضروری ہے کہ حدِ قرأت سے بڑھ نہ جائے اور نہ کم ہو۔ یعنی خوش الحانی کے اصول کی ادائیگی میں قرآن مجید کے کلمات میں کسی حرف کی کمی و بیشی نہ ہو اس لیے کہ ایسا کرنا حرام ہے۔ (کذا فی ابکار الافکار)

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

بہ از روے زیباست آواز خوش
کہ ایں حظ نفست و آں قوت روح

(ترجمہ: حسین چہرے سے اچھی آواز بہتر ہے اس لیے کہ یہ لذتِ نفس ہے اور وہ روح کی غذا)

شبِ معراج حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شبِ معراج ایک فرشتہ دیکھا جس کو آپؐ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ جب سبحان اللہ کہتا تو اس کے حُسنِ صوت کی وجہ سے عرشِ الٰہی ہل جاتا اس کے آگے نور کے دو بڑے بڑے صندوق پڑے تھے اس میں روزہ داروں کی براٴت لکھی ہوئی تھی۔ اس کی تفصیل مجالس النفائس میں ہے جو حضرت الہدائی قدس سرہٗ کی تصنیف ہے۔

ف: حضرت سہل قدس سرہٗ نے فرمایا: الزور سے مجالس المبتدعین مراد ہیں۔ اور حضرت ابو عثمان قدس سرہٗ نے فرمایا: اس سے مجالس المدعین مراد ہیں۔

قاعدہ شرعیہ: ہر وہ مجلس جس میں انسان کے دین کا نقصان اور فساد ہو وہ مجلسِ زُور میں داخل ہے۔

وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ اور جب اتفاقیہ طور کہیں کسی راستہ سے گزرتے ہیں باللغو ایسی باتوں سے جو لغو ہیں اور ایسی بیکار کہ انہیں چھوڑنا لازمی ہو۔ یعنی لغو سے مراد وہ شے ہے جو ناپسندیدہ ہو۔

ف: فتح الرحمٰن میں لکھا ہے کہ اس میں کل معاصی مراد ہیں اور ہر وہ قول و فعل جو نظروں سے گرا ہوا ہے۔ اور امام راغب قدس سرہٗ نے فرمایا: لغو سے وہ کلام مراد ہے جس کا کوئی اعتبار نہ ہو اور ذوق اسے ردی اور بیکار اور فکری طور بالکل غیر معتبر ہو دراصل چڑیوں اور دوسرے پرندوں کی بیکار آواز کو کہا جاتا ہے۔

كِرَامًا۝ درانحالیکہ وہ باعزت ہو کر گزرتے ہیں۔

حلِ لغات: کرام، کریم کی جمع ہے۔ اہلِ عرب کہتے ہیں:
تکرم فلان عمّا یشینہ۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب انسان ایسے کلام سے احتراز کرے

جو اس کی خفت و حقارت کا موجب ہو۔ امام راغب نے فرمایا : لفظ کریم جب اللہ تعالیٰ کی صفت واقع ہو تو مراد ہو گی اس کی صفت احسان و انعام جو اس کی طرف سے اس کی مخلوق کو نصیب ہوتا ہے ۔ اگر انسان کی صفت ہو تو اس سے اس کے وہ اخلاق و افعال حمیدہ مراد ہوں گے جو اس سے صادر ہوتے ہیں اور ایسے ہی ہر ایک کو کریم نہیں کہا جائے گا جب تک کسی سے اخلاق و افعال کا صدور نہ ہو (اب معنی یہ ہوا کہ وہ بندگانِ خدا برائیوں سے اجتناب کرتے اور ایسے افعال سے کنارہ کش ہوتے ہیں جو ان کی حقارت و خفت کا سبب بنیں ۔ فواحش سے بچنا ، ذنوب سے رُوگردانی اور ایسے افعال سے بھی بچنا جن سے طبع گھبراہٹ محسوس کرے ۔)

ف : کشف الاسرار میں ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وُہ لوگ جب نکاح وغیرہ اور فروج وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں تو تصریح کے بجائے اشارہ و کنایہ سے بات کرتے ہیں ۔ اس معنی پر یہاں کرم بمعنے کنایہ و تعریض ہے جیسے :

کانا یاکلان الطعام ۔

اس سے بول و براز کنایہ ہے ۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے جماع کے لیے غشیان ، نکاح ، سِرّ ، اتیان ، افضاء ، لمس ، مس اور دخول و مباشرت و مقاربۃ کے الفاظ سے کنایہ فرمایا ہے ۔ چنانچہ دو آیتیں ملاحظہ ہوں ۔

فرمایا : ولا تقربوھن ۔

اور فرمایا : لم یطمثھن ۔

اور عربیت میں یہ باب وسعت رکھتا ہے ۔

ف : امام غزالی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ فحش کی حد و حقیقت یہ ہے کہ جس لفظ کو زبان پر لانا قبیح سمجھا جاتا ہو جیسے جماع یا اس جیسے اور الفاظ ۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے بندے ان الفاظ کو زبان پر لانے سے احتراز کرتے ہیں ان کے بجائے ایسے الفاظ لاتے ہیں جو ان سے کنایہ ہوں اور رمزاً ان پر دلالت کرتے ہوں جیسے ابھی گزرا کہ جماع کی بجائے مس یا دخول یا صحبت اور پیشاب کی بجائے قضائے حاجت بولا جائے ایسے ہی یُوں نہیں کہا جاتا کہ تیری جورو نے کہا ، بلکہ کہتے ہیں گھر سے یہ بات ہوئی یا پردہ والی نے کہا یا بچّوں کی ماں نے کہا وغیرہ وغیرہ ۔ ایسے ہی دیگر وہ امراض جن کا ذکر اچھا نہ ہو مثلاً برص ، قرع اور بواسیر ۔ ایسے ہی وہ بیماریاں جو انسان کو لاحق ہوں لیکن ان کے صریح الفاظ ننگ و عار ہوں تو ایسے (وہ امور جن کا چھپانا ضروری ہے اور بیان کرنے سے شرم و حیا آئے ، تو یہ بندگانِ خدا ان کو بیان نہیں کرتے کیونکہ یہ فحش ہے اور فاحش کو قیامت میں کُتّے کی شکل میں اٹھایا جائے گا ۔)

حکایت سعدی شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ مجھے ایک زخم ہو گیا جو کپڑے کے اندر تھا۔ روزانہ مجھ سے شیخ صاحب فرماتے کہ زخم کا کیا حال ہے؟ لیکن یہ کبھی نہ پوچھتے کہ زخم ہے کہاں! اس سے میں سمجھا کہ آپ اس کے ذکر سے احتراز فرما رہے ہیں کیونکہ ایسے اعضاء کا ذکر اچھا نہیں۔ اسی لیے بزرگوں نے فرمایا کہ جس سخن سے کسی کو رنج پہنچے اس کا بیان کرنا اچھا نہیں ؎

تا نیک ندانی کہ سخن عین صوابست
باید کہ بگفتن دہن از ہم نکشائی
گر راست سخن گوئی و در بند بمانی
بہ زانکہ دروغت دہد از بند رہائی

(ترجمہ: جب تک تمہیں یقین نہ ہو کہ یہ سخن اچھا ہے اسے منہ سے باہر نہ نکالئے۔ اگر سچا کلام کہنے سے قید میں جانا پڑے تو اس سے وہی جھوٹ بہتر ہے جس سے تجھے قید سے چھٹکارا نصیب ہو)

شرح بیت مذکور اس سے مراد یہ ہے کہ سچائی ہر لحاظ سے بہتر ہے اگرچہ اس سے قائل کو کیسا دکھ اٹھانا پڑے سچائی کا دامن نہ چھوڑے اور جھوٹ سے نجات اپنی نجات مراد نہیں بلکہ دوسرے کو نجات دلانا مراد ہے اور ایسا فتنہ دور کرانا جس میں عام لوگ مبتلا ہوں ایسے ہی "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" سے بھی یہی مراد ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہیں کہ وہ ہمیں صادقین مخلصین بلکہ صدیقین مخلصین سے بنائے بروز قیامت کرماء، حلماء، علماء، ادباء سے اٹھائے وہی اقوال حسنہ و افعال مستحسنہ کی توفیق بخشنے والا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا اور وہ لوگ جو نصیحت کیے جاتے ہیں بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ ایسی آیات کے ساتھ جو پند و نصیحت پر مشتمل ہیں لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا نہیں گرتے۔

حل لغات: خر بمعنے سقط سقوطا يسمع منه خریر ایسا بری طرح گرا کہ اس سے خریر کی آواز۔

ف: خریر پانی اور ہوا اور ان اشیاء کی آواز کو کہا جاتا ہے جو اوپر سے نیچے کو گریں۔ **صُمًّا** اصم کی جمع ہے وہ شخص جس کی سمع کی حس مفقود ہو ایسے ہی اس سے اس شخص کی تشبیہ دی جاتی ہے جو حق کی طرف متوجہ نہ ہو اور نہ ہی اسے قبول کرے۔

وَّعُمْيَانًا○ اعمٰی کی جمع ہے وہ شخص جس کی بصارت کی حس مفقود ہو۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ

بندگانِ خدا وہ ہیں جو آیات پر ایسے حال میں نہیں ٹھہرتے کہ وہ گونگے اور اندھے ہوں بلکہ وہ تو ان پر گرویدہ ہو جاتے ہیں درانحالیکہ وہ کان لگا کر سنتے اور نگاہِ تیز سے دیکھتے ہیں اور مکمل طور پر ان سے بہرہ یاب ہوتے ہیں۔

ف : جناب کاشفی مرحوم نے فرمایا کہ وہ سنتے ہیں تو باہوش ہو کر اور دیکھتے ہیں تو جلوات دلبر کے جلووں سے۔ خلاصہ یہ کہ وہ آیاتِ الٰہی سے غفلت نہیں کرتے۔

نکتہ : ان کے سننے کو اس طرح تعبیر کرنا کفار و منافقین پر تعریض ہے کہ وہ لوگ گویا گونگے و اندھے ہیں کہ ان آیات کو سننے اور دیکھنے کے بعد کورے رہ گئے۔ اس معنی پر ان سے گونگے اور اندھے کی نفی مراد ہے نہ کہ خرور کی۔ اگرچہ حرف نفی خرور پر ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہمیں عطا فرما۔

حلِ لغات : هب وهب يَهبُ کا امر ہے وهبًا وهِبةً اس کا مصدر آتا ہے کسی کو اپنی شے کا بلا عوض مالک کر دینا۔ اللہ تعالیٰ کو واهب و وهاب اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ہر ایک کو اس کے استحقاق پر عطا فرماتا ہے۔

مِنْ اَزْوَاجِنَا ہماری عورتوں میں سے۔

حلِ لغات : ازواج ' زوج کی جمع ہے ہر وہ جو دوسرے کو مقترن ہو اس کا مماثل ہو یا نقیض۔ زوج و زوجہ دونوں طرح، لیکن زوجہ کی لغت ردیئہ ہے۔ (کما فی المفردات)

وَذُرِّيّٰتِنَا اور ہماری اولاد میں سے۔

حلِ لغات : ذرّیّات ذرّیّة کی جمع ہے۔ در اصل چھوٹی اولاد کو کہا جاتا ہے پھر عرف میں بڑی اولاد میں بھی استعمال ہونے لگا۔ قاموس میں ہے، ذراء الشئ بمعنے کثرہ (اسے زیادہ کیا) اسی سے ہے الذریة (مثلثہ) جن و انس کی انس کو کہا جاتا ہے۔

قُرَّةَ اَعْيُنٍ آنکھوں کی ٹھنڈک کہ جن سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں یعنی ان کی معاونت سے طاعتِ الٰہی و فضائل کے جمع کرنے پر ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں کیونکہ مومن کو جب اس کے اہل و عیال طاعتِ الٰہی میں مدد دیں تو اس کا دل خوش ہوتا ہے اور آنکھوں کو ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ جب دیکھتا ہے کہ اس کے اہل و عیال دین میں اس کے موافق ہیں پھر اس سے پُرامید ہوتا ہے کہ وہ جنت میں ان کے ساتھ ہوں گے

---

[1] اس آیت سے وافر حصہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نصیب ہوا کہ آپ نے اپنی آنکھوں سے اپنے والدین اور اولاد تمام ذکور و اناث پھر پوتوں اور نواسوں کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں پایا اور انہیں درجہ صحابیت نصیب ہوا اس مرتبہ میں حضرت ابوبکر جملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ممتاز ہیں۔ اویسی غفرلہٗ

جیسے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا:

الحقنا بھم ذریاتھم۔

(اور ہم ان کے ساتھ ملا دیں گے ان کی اولاد)

اُس معنے پر یہاں قرۃ (آنکھوں کی ٹھنڈک) سے ان کا فضائل دینیہ سے مزین ہونا مراد ہے مال و جاہ وجمال وغیرہ سے نہیں۔

ترکیب: قرۃ اعین کا منصوب ہونا ھَبْ کی مفعولیۃ کی وجہ سے ہے۔

ف: قرۃ یا تو قرار سے ہے بمعنے قلب کو ایسے امر کا حاصل ہونا جس سے وہ خوش ہو کہ اس کے دیکھنے سے آنکھ دوسری طرف نہ اُٹھے گی اور نہ ہی اس سے اونچی شے ہوگی جو اس طرف اوپر کو اٹھے۔ یا القُر (بالضم) سے ہے بمعنے البرد (ٹھنڈک) چونکہ عربی گرمی سے تکلیف محسوس کرتے ہوئے ٹھنڈک تلاش کرتے ہیں۔ اس معنی پر قرۃ العین سے مراد فرح و سرور ہے۔

دمع العین عند السرور بارد وعند الحزن حار۔

اعجوبہ (سرور و فرح کے آنسو ٹھنڈے اور حُزن و ملال کے آنسو گرم ہوتے ہیں)

ترکیب: مِن ابتدائیہ ہے اب معنیٰ یہ ہُوا کہ ہماری آنکھیں ان کی جہت سے ہوں کہ وہ طاعت وعبادت کریں گے اور نیکیوں کے خوگر ہوں گے تو ان سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی یا مِن بیانیہ ہے اس وقت وہ جملہ حالیہ ہے گویا کہا گیا کہ اے پروردگارِ عالم! ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک عطا فرما۔ اس کے بعد اس کی تفسیر میں کہا گیا کہ من ازواجنا و ذریاتنا (ہماری ازواج و اولاد کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنادے۔

یہ ایسے ہے جیسے:

رأیت منك اسدا (میں نے تجھ سے شیر دیکھا)

یعنی تُو بعینہٖ شیر ہے۔ کسی شاعر نے خوب فرمایا: ؎

نعم الالہ علی العباد کثیرۃ

واجلھن نجابۃ الاولاد

(ترجمہ: ویسے تو بندوں پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کوئی شمار نہیں لیکن سب سے بڑی نعمت اولاد کا نیک ہونا ہے)

شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

زن خوب فرمان بر پارسا

کند مرد درویش را پادشا

چو مستور باشد خوب روئے

بدیدار وے دربہشت است شوے

(ترجمہ: عورت حسین فرمانبردار نیک ہو تو وہ مرد درویش کو بادشاہ بنا دے گی۔ عورت اگر پردہ دار حسین ہو تو اس کے دیکھنے سے مرد دنیا میں ہی بہشت میں ہے)

وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ اور ہمیں متقیوں کا امام بنا دے۔

حلِ لغات: الامام ہر وہ جس کے قول و فعل کی اقتداء کی جائے وہ انسان ہو یا کتاب یا کوئی اور شے، وہ حق پر ہو یا بطلان پر۔ (کذا فی المفردات)

لہ شیعوں میں امام کا وہی تصور ہے جو اہلسنّت کے نزدیک نبی کا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ جیسا کہ فقیر اویسی غفرلہ نے اپنی کتاب "آئینۂ مذہب شیعہ" میں تفصیل سے لکھا ہے یہاں بقدرِ ضرورت لکھا جاتا ہے۔
جس امام کا تصوّر شیعہ نے ظاہر کیا ہے اسے اہلسنّت غلط اور بے بنیاد سمجھتے ہیں کیونکہ جس امام کا تصوّر شیعہ نے کیا ہے اس کا ثبوت نہ قرآن مجید میں ہے نہ احادیثِ مبارکہ میں۔ یہ ابنِ سبا کی پارٹی کا من گھڑت عقیدہ ہے ورنہ جب اس عقیدہ کا مرتبہ عقیدۂ نبوت سے بھی فزوں تر ہے تو اس کا تقدس بھی اتنا ہی لازمی ہے پھر جس طرح نبوّت کی صفت کا سوائے نبی کریم کے کسی دوسرے پر اطلاق حرام ہے جیسے کہ مرزا قادیانی کے اطلاقِ نبوت پر اسے کافر قرار دے دیا گیا ہے اسی طرح امامت کی صفت کا اطلاق بھی سوائے امام معصوم کے کسی دوسرے پر حرام ہوگا۔ حالانکہ آیت ہذا میں امام کا اطلاق ہر نیک نمازی پر ہے اور آیۃ ائمۃ الکفرین کفار کے لیڈروں پر۔ اب سُنیئے شیعوں کا عقیدہ۔

عقیدہ شیعہ

شیعہ کہتے ہیں کہ مسئلہ امامت اصولِ دین میں ہے اور اس مسئلہ کی ایجاد پر ان کو اس قدر ناز ہے کہ اگر ان کو امامیہ کہا جائے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔

سُنّی عقیدہ

اہلسنّت کہتے ہیں کہ شیعوں کا مفروضہ مسئلۂ امامت دینِ الٰہی کی سخت ترین بغاوت ہے کیونکہ اس کا

(باقی ص ۱۳۹ پر)

ا؎ اب معنی یہ ہوا کہ اے اللہ! ہمیں ایسا بنا دے کہ اہل تقویٰ مراسم دین کی اقامت اور افاضۂ علم و توفیق عمل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۸) کوئی ثبوت نہیں۔ ہاں جن دلائل سے یہ لوگ امامت کا عقیدہ ثابت کرتے ہیں وہ ہے خلافت۔ اور خلافت ہمارے نزدیک حق ہے لیکن اس کے وہ شرائط نہیں جو شیعوں نے گھڑے ہیں کیونکہ شیعہ کی بیان کردہ شرائط کا کوئی وجود نہیں۔

شرائط

شیعہ کہتے ہیں کہ رسول کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اگر انہی کا مثل کوئی معصوم دُنیا میں موجود نہ ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اس کی اطاعت لوگوں پر فرض نہ ہو۔ تو لوگوں کو ہدایت کس سے حاصل ہوگی۔ غیر معصوم کی اتباع میں سوا گمراہی کے اور کیا حاصل ہوسکتا ہے۔ کیونکہ غیر معصوم سے ہر وقت خطا کا صادر ہونا ممکن ہے۔ لہٰذا ضروری ہُوا کہ رسول کے بعد ہر زمانے میں قیامت تک ایک معصوم مفترض الطاعۃ دنیا میں موجود رہے تاکہ سعادت مند لوگ اس سے دین حاصل کریں اور خدا کی حجت بندوں پر قائم رہے۔ اسی معصوم مفترض الطاعۃ کو جو ہر صفت میں رسول کا مثل اور مانند ہے امام کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کے لیے خدا کی طرف سے بارہ امام مقرر ہو چکے ہیں اور بارھویں امام پر دنیا کا خاتمہ ہے۔

اہلسنت کا موقف

اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ہدایت خلق اللہ اور بندوں پر حجتِ خداوندی قایم رکھنے کے لیے جو چیزیں کافی ہیں اور جو قیامت تک موجود رہیں گی قرآن اور سنت یہی دو ثقلین ہیں جن کے اتباع کا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم حکم دے گئے اور فرما گئے کہ ان کا اتباع کرنے سے تم میں ہرگز گمراہی نہ آئے گی۔ یہ بھی فرما گئے کہ دونوں چیزیں قیامت تک موجود رہیں گی۔ لہٰذا آپ کے بعد نہ کسی کو آپ کا مثل اور معصوم مفترض الطاعۃ ماننے کی ضرورت اور نہ کسی غیر معصوم کے اتباع کی حاجت۔

قیامِ خلافت اور سُنّی شرائط

ہاں یہ ضرور ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو شاہانہ اقتدار کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب بن کر دین کے ان مہمات کو انجام دیتا رہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

میں ہماری پیروی کریں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۹) جن کی انجام دہی بغیر شاہانہ اقتدار کے نہیں ہوسکتی۔ مگر اس شخص کے معصوم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ رسول کی طرح دین کا ماخذ نہیں۔ قرآن وسنّت کی پیروی جس طرح اور مسلمانوں پر فرض ہے بالکل اسی طرح اس شخص پر بھی۔ دین میں ذرہ برابر تغیر و تبدّل کرنے کا اس شخص کو اختیار نہیں۔ نہ حرام کو حلال کرسکتا ہے نہ حلال کو حرام۔ اس شخص کی اطاعت بھی صرف انہیں باتوں میں ضروری ہے جو قرآن وسنّت کے خلاف نہ ہوں۔ جیسا کہ آیت اولی الامر میں اس کو صاف ارشاد فرمایا ہے۔ اسی شخص کو خلیفہ یا امام کہتے ہیں۔

سُنّی وشیعہ کی اختلافی نوعیت

خلیفہ یا امام کا انتخاب بھی اُمت کے ذمہ ہے بالکل اسی طرح جیسے امام نماز کا تقرر مقتدیوں کے ذمّہ ہے اگر اُمت کسی نالائق شخص کو خلافت کے لیے منتخب کرے گی تو گنہ گار ہوگی جس طرح مقتدی کسی نالائق شخص کو امام بنا لینے سے گنہ گار ہوتے ہیں۔

سوال: قرآن وسنّت ہدایت کے لیے کافی نہیں ہیں اس لیے کہ بہت لوگ ایسے ہوں گے جو قرآن وسنّت کے مطالب معلوم کرنے کے لیے کسی بیان کرنے والے کے محتاج ہوں گے اور وہ غیر معصوم ہوگا تو لامحالہ ان کو غیر معصوم کی اتباع کرنی پڑے گی اور وہی سب خرابیاں لازم آئیں گی جو غیر معصوم کے اتباع میں ہوتی ہیں۔

جواب: اس چیز کو اگر غیر معصوم کا اتباع قرار دیا جائے تو اس سے کسی حال میں مفر نہیں ہوسکتا۔ معصوم کی موجودگی میں بھی یہ کام کرنا پڑتا ہے کیونکہ معصوم کسی ایک مقام میں ہوں گے۔ اس مقام کے بھی سب لوگ ہر ہر بات میں معصوم کی طرف رجوع نہیں کرسکتے۔ اور دوسرے مقامات کے لوگوں کا تو ذکر ہی کیا لامحالہ ان کو کسی غیر معصوم سے معصوم کے احکام معلوم کرنا پڑیں گے، خواہ وہ معصوم کا نائب ہی کیوں نہ ہو۔ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلافت بھی حاصل ہُوئی پھر بھی وہ کوئی ایسا انتظام نہ کرسکے کہ ہر معاملہ میں لوگ ان سے ہدایت حاصل کرتے بلکہ خاص کوفہ میں اُن کی طرف سے ایک غیر معصوم قاضی مقرر تھا جو مقدمات کے فیصلے کرتا تھا۔

شیعہ مذہب میں اختلافاتِ ائمہ

شیعہ نے ایک عذر کیا تھا کہ نبی علیہ السلام کے بعد غیر معصوم لوگوں کا اختلاف ہوگا ہم کہتے ہیں کہ ائمہ کی موجودگی میں بھی اصحاب ائمہ میں باہم دینی مسائل میں اختلاف ہوتا تھا اور وُہ اختلاف نزاع کی (باقی ص ۱۴۱ پر)

ف : الارشاد میں ہے کہ گویا یہ دُعا ہر ایک سے فرداً فرداً علیحدہ علیحدہ صادر ہوتی ہے اور ان کا ہر ایک دعا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۰) اس حد تک پہنچتا تھا کہ باہم ترکِ کلام وسلام کی نوبت آجاتی تھی اور کسی طرح اس کا تصفیہ نہ ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ مجتہدین شیعہ کہتے ہیں کہ اصحاب ائمہ پر واجب نہ تھا کہ ائمہ سے یقین حاصل کریں۔ ائمہ کی موجودگی ہی میں غیر معصوم کا اتباع برابر جاری تھا اور اب تو کسی شیعہ کو کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ قدرت نے اس طرح ان کے خانہ ساز مسئلۂ امامت کو خاک میں ملایا ہے۔

شیعہ کے دُوسرے مفروضہ کا جواب : شیعہ کہتے ہیں کہ ہر زمانے میں ایک معصوم کا موجود ہونا ضروری ہے تاکہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کریں۔ مگر جناب حسن عسکری کے بعد جن کی وفات ۲۶۰ھ میں ہوئی آج تک کہ گیارہ سو سینتالیس اُوپر کئی سال ہوئے کوئی امام معصوم نہیں ہے اور شیعہ بھی غیر معصومین ہی کا اتباع کر رہے ہیں اور روایات ہی پر ان کا بھی عمل ہے اب کوئی پُوچھے کہ غیر معصوم کا اتباع کر کے تم گمراہ ہُوئے یا نہیں۔ اور جب روایات ہی پر عمل کرنا ٹھہرا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات نے کیا قصور کیا ہے کہ ان کو چھوڑ کر کسی دوسرے غیر نبی کی باتوں پر عمل کیا جاتے۔

شیعہ کی بڑ

شیعہ کہتے ہیں کہ امام معصوم موجود تو ہیں مگر وہ نظروں سے پوشیدہ ایک غار کے اندر تشریف فرما ہیں ان کو کوئی دیکھ نہیں سکتا اور نہ اُن سے ہدایت حاصل کر سکتا ہے۔

ہم اہلسنت کہتے ہیں کہ جب انھیں کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا اور ان سے ہدایت بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ تو پھر ان کا وجود عدم کے برابر ہے۔ اور پھر اگر ایسا موجود ہونا کافی ہے تو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی قبر انور میں زندہ موجود ہیں اور ایسی زندگی کے ساتھ کہ اس عالم کی کروڑوں زندگیاں اس پر قربان ہیں یعنی حقیقی حیات کے ساتھ زندہ ہیں جس میں شیعہ کو بھی اختلاف نہیں اگر بالواسطہ احکام کا اجراء شرعاً جائز ہے تو پھر اس کے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام زیادہ حقدار ہیں کیونکہ آپ ہی اپنے احکام کے ذمہ دار ہیں۔ پھر یہ کہاں کا اصول ہے کہ نبی علیہ السلام کا در چھوڑ کر سرمن غار غیر معروف مقام کے لیے امام مہدی کو تلاش کرتے پھریں جبکہ شیعہ مذہب میں ان کے وجود کا اقرار ہے باقی فرقے ان کی موجودگی کے قائل ہی نہیں۔

اصل حقیقت بانیانِ مذہب شیعہ کا مقصود اصلی دینِ اسلام کو خراب کرنا تھا اور وہ اسی لیے مسلمانوں کے لباس میں آکر اپنی کارروائیاں کر رہے تھے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کے وقت عرض کرتا ہے : واجعلنی للمتقین اماما (اے اللہ! مجھے متقیوں کا امام بنا)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱) لہٰذا انہوں نے ایک طرف تو قرآن کو محرف کہنا شروع کر دیا، دو ہزار سے زیادہ روایتیں قرآن میں ہر قسم کی تحریف کی تصنیف کر لیں، اور دوسری طرف قرآن کو معمّہ اور چیستان مشہور کیا۔ تیسری طرف تمام صحابہ کرام کو کاذب قرار دیا تاکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور تعلیمات جو انہیں صحابہ کرام سے منقول ہیں قابلِ اعتبار نہ رہیں۔ اور چوتھی طرف یہ کارروائی کی کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بارہ شخص آپ کے مثل معصوم اور مفرض الطاعۃ تجویز کیے اور ان کے اختیارات یہ بیان کیے کہ :

فهم يحلّون ما يشاءون ويحرّمون ما يشاءون ..... (اصول کافی ص ۲۷۰)

یعنی یہ ائمہ جس چیز کو چاہیں حلال کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں تاکہ مسلمانوں کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے استغنا ہو جائے۔

یہ وہ باتیں ہیں کہ بانیانِ مذہب شیعہ کے اصلی مقصود کو عالم آشکارا کر رہی ہیں۔ غضب خدا کا کہا تو یہ جاتا ہے کہ ہم غیر معصوم کے اتباع سے بچنے کے لیے دوازدہ اماموں کو مانتے ہیں اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں چونکہ غیر معصومین سے منقول ہیں اس لیے نہیں لیتے اور پھر غیر معصومین کا اتباع بھی کیا جائے اور غیر معصومین کی نقل کی ہوئی روایات بھی لی جائیں مگر رسول کی نہیں بلکہ ائمہ کی۔

فقیر کی بیان کردہ باتوں پر غور فرمائیں۔ اب دلائل پڑھیے :

قرآن اور امامت

قرآن مجید کو شروع سے اخیر تک کوئی پڑھے تو اس کو سینکڑوں آیتیں اس مضمون کی ملیں گی کہ رسول کی اطاعت نجات کے لیے کافی ہے اور رسول ہی کے مبعوث ہونے سے خدا کی حجت قایم ہوتی ہے۔ خدا کی طرف سے رسول ہی کی اطاعت مخلوق پر فرض کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں سوائے رسول کے اور کسی کی اطاعت کو خدا نے اپنی اطاعت نہیں فرمایا۔ نمونہ کے طور پر چند آیتیں حاضر ہیں باقی آیات مجموعی طور پر فقیر کی کتاب "مرأۃ الدلائل" میں ہیں۔

(۱) قل ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله ويغفر لكم ذنوبكم۔

کہہ دیجئے اے نبی! اگر تم دوست رکھتے ہو اللہ کو تو میری پیروی کرو محبت کرے گا تم سے اللہ اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔

(باقی بر صفحہ ۱۴۳)

نکتہ : اس طرح سے جملہ لانا یعنی صیغۂ متکلم لاکر اس سے فرداً فرداً مراد لیا جانا ایجاز کے طور پر ہے۔ جیسے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۲)

(۲) قل اطیعوا اللہ والرسول فان تولوا فان اللہ لا یحب الکافرین۔ (پارہ ۱۸)
فرمائیے اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی پھر اگر منہ پھیریں یہ لوگ تو اللہ نہیں پسند کرتا کافروں کو۔

(۳) من یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنّٰت تجری من تحتھا الانھٰر خالدین فیھا و ذٰلک الفوز العظیم۔ (پارہ ۴)
جو شخص اطاعت کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی تو داخل کرے گا اللہ باغوں میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ہمیشہ رہیں گے ان میں اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

(۴) وما ارسلنا رسول الا لیطاع باذن اللہ۔ (پارہ ۵)
جو رسول ہم نے بھیجا وہ اسی لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے۔

(۵) من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ (پارہ ۵)
جس نے رسول کی اطاعت کی تحقیق اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

(۶) رسلا مبشرین و منذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل۔ (پارہ ۶)
رسول خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تاکہ نہ رہے کوئی حجت لوگوں کی اللہ پر رسول کے بھیجنے کے بعد۔

(۷) واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واحذروا۔ (پارہ ۱۸)
اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی نافرمانی سے بچتے رہو۔

(۸) یا معشر الجن والانس لم یاتکم رسل منکم یقصون علیکم اٰیاتی وینذرونکم لقاء یومکم ھٰذا۔ (پارہ ۸)
اے گروہ جن و انس! کیا نہیں آئے تمہارے پاس رسول تم میں سے کہ بیان کرتے میرے احکام اور ڈراتے تم کو اس دن کے ملنے سے۔

(۹) یا بنی اٰدم اِمّا یاتینکم رسل منکم یقصون علیکم اٰیاتی فمن اتقٰی و
اے بنی آدم! آئیں گے تمہارے پاس رسول جو تمہی میں سے ہوں گے بیان کریں گے تم سے میرے احکام پھر جو لوگ پرہیزگاری

(باقی ص ۱۴۴ پر)

یا ایھا الرسل کلوا من الطیبات میں فرداً فرداً ہر ایک نبی علیہ السلام کو حکم ہوتا رہا اور اب آخر

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۳)

اصلح فلا خوف علیھم و لا ھم یحزنون - (پارہ ۸)	کریں گے اور اچھے کام کریں گے ان پر نہ کچھ خوف ہوگا نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔
(۱۰) یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعو اللہ و رسولہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ - (پارہ ۲۱)	اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی۔ تحقیق تمہارے لیے رسول اللہ کی ذات میں اچھی پیروی ہے۔
(۱۱) و من یطع اللہ و رسولہ فقد فاز فوزاً عظیما - (پارہ ۲۲)	جو اطاعت کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول کی، تو بتحقیق وہ بڑی کامیابی کو پہنچ گیا۔
(۱۲) و قال لھم خزنتھا الم یاتکم رسل منکم - (پارہ ۲۴)	اور کہیں گے ان سے داروغہ جہنم کے کہ کیا نہیں آئے تھے تمہارے پاس رسول تم میں سے۔
(۱۳) ما اتاکم الرسول فخذوہ و ما نھاکم عنہ فانتھوا - (پارہ ۲۸)	جو حکم دیں تم کو رسول اس پر عمل کرو اور جو منع کریں اس سے باز رہو۔

قاعدہ کلیہ

قرآن مجید میں ہر جگہ رسول ہی کی اطاعت کا حکم ہے انہی کی اوامر نواہی کو واجب الاتباع قرار دیا گیا ہے انہی کی اطاعت پر فوزِ عظیم اور جنّت کا وعدہ ہے۔ قبر سے لے کر حشر تک انہی کی اطاعت کا سوال ہوگا۔ انہی کی اطاعت لعینہٖ خدا کی اطاعت قرار دی گئی ہے۔

مسئلہ امامت کی تاریخی حیثیت

شیعہ مذہب کے عقاید و مسائل کو غور سے دیکھا جائے تو ۹۸ فیصد ایجاد بندہ ثابت ہوں گے۔ چنانچہ فقیر نے "آئینۂ شیعہ مذہب" میں ان کے ہر عقیدہ و مسئلہ پر واضح ثبوت لکھے ہیں۔ سو یہ عقیدہ امامت بھی انہی ایجادات سے ہے جہاں تک فقیر اویسی غفرلہ نے کتبِ شیعہ کے مطالعہ سے (باقی ص ۱۴۵ پر)

میں ہمارے رسول علیہ السلام کو حکم ہُوا تو گویا جمع سے فرد واحد مراد ہے (نہ کہ جمع جس طرح مرزائیوں نے سمجھا ہے) ۔

سوال : امام کو واحد کیوں لایا گیا بقاعدۂ نحو ائمۃ ہونا چاہیے ۔

جواب : اسی مذکورہ بالا مقصد کے پیشِ نظر ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۴) نتیجہ نکالا ہے کہ امامت کا عقیدہ شیعوں نے تیسری صدی ہجری میں ایجاد کیا ہے اس کے اخفا میں انہوں نے اور زیادہ کوشش کی اور اس بارے میں تقیہ سے کام لیتے رہے ۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ سُنّی اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کی تصانیف میں ائمہ پر لفظ علیہ السلام کا اطلاق کرتے تھے اور ان کو دوسرے بزرگوں کی طرح لفظ امام سے یاد کرتے تھے ان کو اس کا خیال بھی نہ ہُوا کہ ان بزرگوں کے نام کے ساتھ امام اور علیہ السلام کے الفاظ استعمال کرنے سے شیعوں کا باطل عقیدۂ امامت اہلسنت میں جگہ حاصل کرے گا ۔ شیعہ کے اسلاف اہلسنت سے اپنے دین کو چھپاتے تھے اور ناواقف سُنّیوں میں تدریجاً اپنے عقاید و اعمال پھیلاتے تھے ۔

سوال : اسلاف صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ کے بعد بھی یہ استعمال پایا جاتا ہے ۔

جواب : بعد والوں میں اختلاف ہوگیا ان میں جو حضرات بلا تکلّف یہ الفاظ استعمال کرتے رہے تو انہوں نے بھی اپنے پیشرو اکابر علماء کی پیروی کی اور ان الفاظ کا رواج بڑھ گیا مگر ان حضرات کے حاشیہ خیال میں بھی امامت کے مذکورہ مخصوص معنی نہ تھے بلکہ یہ امام بمعنی مقتدا اور پیشوا استعمال کرتے تھے ۔ علیہ السلام بھی محض تبعاً لکھ دیتے تھے جس میں اس لفظ کے لغوی معنی ملحوظ ہوتے تھے جیسے ہر مسلمان کو السلام علیکم کہتے ہیں ۔ اس کا ثبوت ان بزرگوں کے حالات ہیں جن پر نظر کرنے کے بعد کوئی بھی فہیم آدمی ان حضرات کے بارے میں اس قسم کا وہم نہیں کر سکتا ۔ یہ حضرات اس معاملے میں معذور تھے ان پر کوئی اعتراض نہیں مگر اس معاملے میں ان کی پیروی نہ کی جائے گی کیونکہ اب یہ واقعہ بالکل واضح ہو چکا ہے کہ ان الفاظ کے استعمال سے شیعوں کے عقیدۂ امامت کو تقویت پہنچتی ہے یعنی اہلسنت میں اس عقیدۂ باطلہ کی اشاعت ہوتی ہے اور اہلسنت میں جو لوگ ~~اس سے متاثر ہیں~~ ان کے فاسد عقیدہ کو اس سے قوت حاصل ہوتی ہے اب اس روش کو ترک کرنا لازم ہے ۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ حضرت علی ، حضرت حسن ، حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے اسماءِ گرامی کے ساتھ حضرت یا سیدنا اور رضی اللہ عنہ لکھنا اور بولنا چاہیے کیونکہ یہ سب حضرات صحابی ہیں ۔ بزرگان مذکورہ میں سے باقی حضرات مثلاً حضرت زین العابدین حضرت باقر رحمہم اللہ کے اسماءِ گرامی کے ساتھ رضی اللہ عنہ یا رحمہ اللہ لکھنا پڑھنا چاہیئے تاکہ سُنّی و شیعہ کے درمیان فرق ہو ۔ مزید تفصیل فقیر کے رسالہ ”علیہ السلام“ میں پڑھئے ۔ اویسی غفرلہٗ

سوال : اسم موصول کو بار بار کیوں لایا جا رہا ہے ؟

جواب : تاکہ معلوم ہو کہ ہر موصول کے بعد کا مضمون مستقل طور پر علٰحدہ علٰحدہ مہتم بالشان ہے اور وہ ایسے اوصافِ جلیلہ ہیں کہ ان کے لیے موصوف کا ذکر بار بار ہو اور معلوم ہو کہ ہر ایک صفت کسی دوسری صفت کا تتمہ یا طفیلی نہیں اور واؤ حرف عاطفہ بھی اسی لیے بار بار ہے کہ ہر وصف اپنی دوسری صفت کے مغایر ہے ۔ یہ اختلاف عنوانی بمنزلہ اختلاف ذاتی کے ہے ۔

حکومت و جاہ طلبی واجب ہے قفال و دیگر مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ طلب ریاست دینی یعنی دینی حکومت اور جاہ و مرتبت کی طلب واجب ہے ۔

ف : ریاست وحکومت اور جاہ و مرتبت کی طلب سے مراد اسلامی ریاست وحکومت اور جاہ و مرتبت کی طلب ہے نہ کہ دنیوی ۔

دُعاءِ مستجاب حضرت عُروہ رضی اللہ عنہ ہمیشہ دعا مانگتے تھے کہ " اے اللہ ! ان لوگوں سے بنا جن کے علم کی اشاعت بہت زیادہ ہو ۔"[۱] اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا مستجاب فرمائی ۔

دنیوی حکومت طلبی کی تحقیق ہماری مراد حکومتِ دنیوی نہیں اس لیے کہ اس میں سنت یہ ہے کہ دنیوی لحاظ سے کسی قسم کی سرکاری ملازمت قبول نہ کی جائے نہ قضاۃ نہ افسری نہ فتوٰی نہ دیگر دنیوی عہدے ۔ دلی طور پر انہیں اپنے لیے زہرِ قاتل سمجھنا چاہیے ۔ ایسے عہدوں پر رضامندی کی بجائے نفرت کا اظہار کرنا چاہیے ۔ ہاں اگر کوئی جبر و اکراہ اور سخت وعیدوں یعنی دھمکیوں میں آ جائے تو الگ بات ہے ۔ کیونکہ جب ہمارے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے دل سے قبول نہیں کیا تو ہم کون ہیں قبول کرنے والے ۔[۲]

بُوحنیفہ قضا نکرد و بمرد
تو بمیری اگر قضا نکنی

---

[۱] فقیر اویسی ہمیشہ اس دعا کو نماز کی ماثورہ دعا کے بعد پڑھا کرتا ہے مجھے امید ہے کہ فقیر کی اولاد تا قیامت دینِ اسلام کی خادم ، نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی غلام اور آپ کے صحابہ کرام و اہلبیت عظام اور اولیائے امت و علماءِ اہلسنت کی نیازمند رہے گی ۔

[۲] بحمدہٖ تعالیٰ فقیر اویسی اسی کھاتے کا ایک فرد ہے خدا کرے میری اولاد اور میرے احباب و متعلقین کو بھی حکومت اور سرکاری تعلق سے حفاظت نصیب ہو ۔ آمین اویسی غفرلہٗ

(ترجمہ: امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے قضا قبول نہ فرمائی اور اسی میں فوت ہُوئے تُو بھی مرے گا اگر قضا قبول نہ کرے گا)

سوال: حضرت شیخ ابو مدین قدس سرہٗ نے فرمایا:

آخر ما یخرج من رؤس الصدیقین حب الجاہ۔

یہاں یخرج سے یظہر مراد ہے۔ معنی یہ ہے کہ صدیق وُہ ہے جس کا انتہائی مرتبہ یہ ہے کہ اس سے جاہ و مرتبت کی محبت کا اظہار ہو گا۔

جواب: جب صدیقین اسم باطن کی تکمیل کر لیتے ہیں تو پھر خواہش کرتے ہیں کہ وہ اسم ظاہر کے مرتبہ کو بھی ظاہر کریں تاکہ تمام اسماءِ الٰہیہ کے کمالات سے کلی طور پر انہیں حصہ نصیب ہو۔ اس طرح سے ابناء الدنیا (دنیاداروں) پر ان کا قیاس نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی وُہ دنیا داروں کی طرح دنیاوی مراتب پر فائز ہونا چاہتے ہیں بلکہ وہ دنیا کے انتظامات میں دخیل بننا چاہتے ہیں جس طرح بھی ان سے بن پڑتا ہے۔

صاحبِ روح البیان کے پیرو مرشد قدس سرہٗ کا کارنامہ

ہمارے شیخ اجل و کامل و اکمل قدس سرہٗ نے اپنے بعض مکاشفات میں دیکھا کہ وُہ عنقریب بادشاہ بنا دئے جائیں گے تھوڑا عرصہ گزرا کہ باغیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے بادشاہ کو، اس کے ارکانِ دولت اور قریبی رشتہ داروں کو قید کر دیا۔ پھر یہ فتنہ ہمارے شیخ قدس سرہٗ کی حسنِ تدبیر سے فرو ہُوا اور بادشاہ اور جملہ اہلِ اسلام کو نجات ملی اور باغیوں کی بنیاد جڑ سے کٹ گئی۔ اس طرح سے ہمارے شیخ کو اسم ظاہر کی تکمیل کا موقع میسر آیا۔ اس کی تفصیل ہماری کتاب "تمام الفیض" میں ہے۔

شانِ نزول و فضیلتِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

کشف الاسرار میں ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضرت امیر المومنین علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی: اے امیر المؤمنین! یہ آیت کہاں اور کس کے حق میں نازل ہوئی۔ عباد الرحمٰن الخ سے کون لوگ مراد ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے جابر! تمہیں معلوم ہے یہ لوگ کون ہیں اور یہ آیت کہاں اُتری؟ میں نے عرض کی: یا حضرت! یہ آیت مدینہ طیبہ میں اُتری۔ آپ نے فرمایا: نہیں یہ آیت مکّہ شریف میں اُتری اور الذین یمشون علی الارض ھونا سے حضرت ابوبکر ابن ابی قحافہ رضی اللہ عنہ مراد ہیں کیونکہ آپ کو ہی حلیم قریش کہا جاتا تھا۔

صدیقِ اکبر اور عشقِ نبوی

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ جب اللہ تعالےٰ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اسلام کی دولت سے نوازا تو میں نے انہیں ایک دن دیکھا کہ وہ مسجد حرام میں بیہوش پڑے ہیں اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انھیں بنی مخزوم و بنو امیہ کے کفار نے زد و کوب کیا تھا۔ میں انہیں ان کے گھر لے گیا۔ جب ہوش میں آئے تو والدہ (جو ان کے سرہانے بیٹھی تھی) سے پوچھنے لگے کہ اماں! میرے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہیں اور ان کا کیا حال ہے۔ ان کے والد ابو قحافہ نے فرمایا، بیٹا! تو بار بار محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں کیوں پوچھتا ہے جبکہ تم انہی کی وجہ سے زخم خوردہ ہو۔ اور تم ان کو ایسے دل دے چکے ہو کہ اب اپنی پرواہ تک نہیں، ہر وقت انہی کا خیال رکھتے ہو حالانکہ تمہاری اس روش سے ہمارے ساتھ بنی مخزوم بائیکاٹ کر گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ یہ اپنے باپ دادا کے دین میں جب تک واپس نہ آئے گا ہمارا تم سے بائیکاٹ ہی رہے گا۔ اب بھی اگر تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ تو ہم ان سے تمہارا بدلہ لے سکتے ہیں ایسا بدلہ کہ تم اس سے خوش ہو جاؤ گے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بہت بڑے حلیم اور بُردبار تھے اور متواضع بھی، سر اٹھا کر دعا کی:

"اے اللہ! بنو مخزوم کو ہدایت سے نواز، وہ بے خبر ہیں، الٹا مجھے حق سے موڑ کر باطل کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔"

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے اور انہیں حلیم کی صفت سے نوازا ہے۔ انہی کے حق میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما۔

(وہ لوگ جو زمین پر منکسر و متواضع ہو کر چلتے ہیں اور جب ان سے جہّال غلط باتوں سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ ان کو دعائیں دیتے ہیں۔)

حضرت سالم رضی اللہ عنہ کی فضیلت

اے جابر! والذین یبیتون لربھم سجّداً و قیاماً (اور وہ لوگ جو رات اپنے رب کے ہاں سجود و قیام میں گزارتے ہیں) حضرت سالمؓ جو حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہا کے غلام ہیں، کے حق میں ہے کہ وہ ہمیشہ رات کو عبادت کرتے اور تہجد پڑھتے گزارتے تھے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی فضیلت

اے جابر! والذین یقولون ربنا اصرف عنّا عذاب جھنّم (اور وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنّم کا عذاب پھیر دے) یہ آیت حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے حق میں ہے کہ آپ ہمیشہ

حزن وغم میں گزارتے اور دوزخ کے عذاب سے ڈرتے رہتے تھے یہاں تک کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوذر! یہ جبریل ہیں اور مجھے اللہ تعالیٰ سے خبر دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دوزخ کے عذاب سے پناہ دے دی ہے۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت والذین اذا انفقوا و لم یسرفوا الخ (اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے اور حد سے نہیں بڑھتے) یہ آیت حضرت ابوعبیدہ کے حق میں ہے کہ انہوں نے اپنا بہت سا مال اپنے لیے اور اپنے اقربا کے لیے خرچ کیا اللہ نے ان سے راضی ہوکر یہی فرمایا جو اُوپر مذکور ہُوا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا آخر (اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کی عبادت نہیں کرتے) یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں ہے کہ آپ نے کبھی بُت پرستی نہ کی اور نہ ہی زنا کیا اور نہ کبھی قتلِ ناحق کا ارتکاب فرمایا۔

سعید بن زید بن عمر بن نفیل رضی اللہ عنہ کی فضیلت خطاب بن نفیل نے ایک زِرہ بیچ ڈالی، پھر پشیمانی ہُوئی خطاب نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ تم یہ دعویٰ کرو کہ یہ زرہ میرے دادا کی ہے خطاب کو اسے بیچنے کا حق نہ تھا فلہذا مجھے واپس دی جائے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو میں تمہیں معقول رشوت دُوں گا۔ آپ نے فرمایا: مجھے تیری رشوت کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی مجھے جھُوٹ بولنا آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے راضی ہوکر اس آیت میں ان کی تعریف کی: والذین لا یشھدون الزور۔

سعید بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی فضیلت والذین اذا ذکروا الخ میں حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا بیان ہے (کہ وہ اسی آیت کے مصداق تھے)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی فضیلت والذین یقولون ربنا ھب لنا الخ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا بیان ہے (کیونکہ آپ اسی آیت کے صحیح مصداق تھے)

ربط: مذکورہ بالا اوصافِ مبارکہ بیان کرنے کے بعد اب ان کی جزاء کا ذکر فرمایا۔

اُولٰٓئِكَ یہی وُہ لوگ ہیں جو ابھی آٹھ صفات کے موصوف بیان ہُوئے اپنے ان صفات سے

موصوف ہونے کی وجہ سے یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر یُجْزَوْنَ الْغُرْفَۃَ ہے یعنی جزا دئے جائیں گے بالاخانوں سے۔ جزاء بمعنے غناء و کفایۃ ہے یعنی عمل کے مقابلہ کی کفایۃ کرنے والی شے۔ اگر خیر ہے تو جزاء بھی بھلی، اگر برائی ہے تو جزا بھی بری۔

حلِ لغات : الغُرف بمعنے شے کو اٹھانا اور کسی شے سے کچھ لینا۔ کہا جاتا ہے :

غرفت الماء والمرق۔ (میں نے پانی اور شوربہ لیا)

اور منازل عالیہ سے ایک بلند منزل بھی مراد ہوتی ہے (یہاں یہی مراد ہے) یعنی وہ جنت کے بلند و بالا منازل میں سے جزا دئے جائیں گے۔ یہ اسم جنس ہے اس سے جمع مراد ہے۔ جیسے دوسرے مقام پہ فرمایا :

وھم فی الغرفات آمنون۔

(وہی لوگ بالاخانوں میں امن وچین کے ساتھ ہوں گے)

ف : فصول عبدالوہاب میں ہے کہ وہ چار کونوں والے محلّات ہوں گے جو زر و سیم اور لؤلؤ و مرجان سے تیار کیے گئے ہیں۔

بِمَا صَبَرُوْا بسبب اس کے کہ انہوں نے صبر کیا۔ ما مصدریہ ہے اور صبر کو کسی عمل سے متعلق نہیں فرمایا بلکہ مطلق رکھا گیا تاکہ مصبر علیہ (جس امر پہ صبر کیا گیا) کو شامل ہو۔ اب معنی یہ ہوا بوجہ ان کے صبر کرنے کے طاعات کی تکالیف اور ترکِ شہوات کی پریشانیوں کے اور مجاہدات کے برداشت کے منجملہ ان کے روزہ بھی ہے۔

فضیلتِ روزہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

الصوم نصف الصبر والصبر نصف الایمان۔

(روزہ نصف صبر ہے اور صبر نصف ایمان ہے)

لہ جیسا کہ ہمارے امام اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک واقعۂ صبر یوں ہے کہ ایک دفعہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھنے لگا : "کیا آپ کے والد کا انتقال ہو چکا ہے ؟" آپ نے فرمایا : "ہاں"۔ اس نے پھر پوچھا : آپ کی والدہ زندہ ہیں ؟" آپ نے فرمایا : "ہاں"۔ وہ کہنے لگا : "میں نے سنا ہے آپ کی والدہ بڑی حسینہ و جمیلہ ہیں میں ان سے نکاح کرنے آیا ہوں آپ میرے ساتھ ان کا نکاح کر دیں۔" آپ نے فرمایا : "وہ عاقل و بالغ ہیں انہیں نکاح کا اختیار ہے میں جبر نہیں کر سکتا البتہ ان سے پوچھ سکتا ہوں"۔ آپ پوچھنے جا رہے تھے اتفاق سے آپ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ شخص تڑپ کر جان دے رہا تھا۔ آپ نے فرمایا : "ابوحنیفہ کے صبر نے اس کی جان لے لی۔ اویسی غفرلہٗ

شرح الحدیث حدیث شریف کے حکم پر روزہ ایمان کا ایک چوتھائی ہے کیونکہ یہ دشمنِ خدا کے لیے قہر ہے اس لیے کہ شہوات شیطان کا وسیلہ ہیں اور شہوات کو خورد و نوش سے تقویت ملتی ہے اسی لیے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان الشیطان لیجری من ابن آدم مجری الدم فضیقوا مجاریہ بالجوع -

(شیطان ابنِ آدم میں خُون کی طرح چلتا پھرتا ہے اس کے راستے بھوک سے روکو)

۱ جوع باشد غذاے اہلِ صفا
محنت و ابتلاے اہلِ ہوا

۲ جوع تنویر خانۂ دل تست
اکل تعمیر خانۂ گِل تست

۳ خانۂ دل گذاشتی بے نور
خانۂ گل چہ میکنی معمور

(ترجمہ: (۱) بُھوک صُوفیہ کرام کی غذا ہے لیکن شہوت پرستوں کو محنت اور دُکھ محسوس ہوتی ہے۔
(۲) بھُوک دل کو نورانی بناتی ہے، کھانا مٹی کے گھر یعنی جسم کی تعمیر ہے۔
(۳) دل کی روشنی کو چھوڑ کر مٹی کے گھر (جسم) کو کیوں آباد کر رہا ہے)

حدیث شریف میں ہے:
ان فی الجنۃ لغرفا مبنیۃ فی الھوا لا علاقۃ من فوقھا ولا عماد لھا من تحتھا لا یأتیھا اھلھا الا شبہ الطیر لا ینا لھا الا اھل البلاء۔

(بہشت میں ایسے بالا خانے بھی ہیں جو ہوا پر تیار کیے گئے ہیں انہیں نہ اوپر سے کوئی تعلق ہے اور نہ ان کے نیچے کوئی ستون ہے اس میں آنے والے پرندوں کی طرح ہی جائیں گے لیکن اہلِ شہوت کو ان میں داخلہ نہ ملے گا۔ بلکہ یہ دُکھ درد والوں کو نصیب ہوں گے)

تفسیر صُوفیانہ (اولٰئک یجزون الغرفۃ یہ وہ لوگ ہیں جن کو مالک قادر کے ہاں (جو قیام گاہ مقام عندیہ میں ہے) ٹھہرایا جائے گا بما صبروا بسبب ان کے صبر کرنے کے)

ابتداے سلوک میں بوجہ ادائیگی اوامر و ترک نواہی کے اور وسطانی دور میں اخلاق ذمیمہ کو اخلاق حمیدہ سے تبدیل کرنے میں اور انتہا میں وجودِ انسانی کو وجودِ ربانی میں فنا کرنے میں۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

صبر بمعنے ترک شکوٰی از الم البلوی لغیر اللہ لا الی اللہ۔

ف: بعض اکابر نے فرمایا: سالک کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ دکھ درد کا شکوہ اللہ تعالیٰ کی طرف اسی طرح لے جائے جیسے ایوب علیہ السلام نے عرض کی تھی تاکہ ادبِ الٰہی بھی نصیب ہو اور اظہارِ عجز بھی، نہ یہ کہ قہرِ الٰہی کا مقابلہ کرنے لگ جائے۔ جیسے جاہل صُوفی کرتے ہیں پھر مدعی بنتے ہیں کہ ہم ہی اہلِ تسلیم و تفویض ہیں۔ یوُں وہ دو جہالتوں کو جمع کرتے ہیں۔

تفسیر عالمانہ وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا اور انہی بالاخانوں میں ملتے ہیں ملائکہ کی طرف سے تَحِيَّةً

حلِ لغات: تلقیۃ ہراس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی کو پیش کی جائے۔ یہ دوسرے مفعول کی طرح بواسطہ باء و بلاواسطہ متعدی ہوتا ہے۔ جیسے: لقیتہ کذا و بکذا۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی کو آگے چل کر ملے۔ (کما فی المفردات)

اب معنی یہ ہوا کہ ملائکہ کرام ان کا تحیۃ سے استقبال کرتے ہیں وَسَلٰمًا ○ اور سلام سے۔ یعنی ملائکہ کرام ان کے پاس آکر السلامُ علیکم کہتے ہیں اور ان کی درازیٔ عمر کی دُعا بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کرے کہ تم ہر بلاّ و آفت سے محفوظ رہو اس لئے تحیۃ و سلام میں درازیٔ عمر اور سلامتی از آفات کی دعا ہوتی ہے۔

حلِ لغات: المفردات میں ہے کہ التحیہ یہ ہے کہ کسی کو کہا جائے: حیّاكَ اللہ (اللہ تجھے تادیر زندہ رکھے) یہ اصل میں اخبار ہے لیکن دعا کے معنی میں مجازاً (انشاء) مستعمل ہے جیسے کہا جاتا ہے:

حیی فلان فلانا تحیۃ۔ (فلاں نے فلاں کے لیے درازیٔ عمر کی دعا کی)۔

اور تحیۃ دراصل حیاۃ سے ہے پھر ہر دُعا (مطلق) کو تحیہ سے تعبیر کیا گیا ہے اس لیے کہ ہر دعا حیٰوۃ سے متعلق ہے یا دعا حیٰوۃ کا سبب ہے یا دنیا میں یا آخرت میں۔ اسی سے ہے: التحیّات للہ۔ اور السلام والسلامۃ بمعنے آفات ظاہرہ و باطنہ سے خالی ہونا۔ اور حقیقی سلامتی جنت میں ہی ہے اس لیے کہ اس میں بقاء بلا فنا اور غناء بلا فقر اور عزت بلا ذلت اور صحت بلا مرض ہے۔

تفسیر صُوفیانہ بعض مشایخ نے فرمایا کہ تحیۃ و سلام میں یہ فرق ہے کہ سلام بمعنے سلامۃ العارفین فی الوصال عن الفرقۃ (عارفین کا وصال فرقت و جدائی کے خطرہ سے سلامتی) اور تحیہ بمعنے روح تجلی حیاۃ الحق الازلی علی ارواحهم واشباحهم فیحیون حیاۃ ابدیۃ (حیاۃ حق کی تجلی ازلی ان کے ارواح و اجسام پر جس سے وہ ابدی حیات پاتے ہیں) اور بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ بہشت میں حیاتِ الٰہی اور سلامِ ربانی پاتے ہیں جس سے وہ زندہ رہیں گے

اور استہلاک کلی سے نجات پائیں گے جیسے ابراہیم علیہ السلام آفت برد سے سلام ربانی سے محفوظ ہوئے۔
اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

کونی بردًا و سلاما علی ابراھیم۔
(ٹھنڈی ہوجا اور سلامتی والی ہو ابراہیم پر) ؎

سلامت من دلخستہ در سلام تو باشد
زہے سعادت اگر دولت سلام تو یابم

(ترجمہ : مجھ دل خستہ کی سلامتی آپ کے سلام علیکم کہنے میں ہے۔ میری خوش بختی کا کیا کہنا اگر آپ سے مجھے ایک بار سلام علیکم نصیب ہو)

تفسیر عالمانہ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ یجزون کے فاعل سے ہے کہ حال یعنی ان کا حال یہ ہوگا کہ وہ نہ تو مریں گے اور نہ ہی بالاخانوں سے نکالے جائیں گے حَسُنَتْ بہترین ہیں وہ بالاخانے مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا۝ وہ ٹھہرنے کی جگہ اور قیام گاہ ہونے کے لحاظ سے۔ یعنی ان کی قرارگاہ اور قیامگاہ بہتر سے بہتر ہوگی) یہ ساءت مستقرا کے بالمقابل لایا گیا ہے اسی لیے معنی و اعراب کے لحاظ سے اسی کی طرح ہوگا۔

سبق : عاقل پر لازم ہے کہ وہ ایسے بلند قدر اور اعلیٰ بالاخانوں کے حصول کے لیے آج ہی سے اعمال صالحہ کے ذریعے کوشش جاری کردے صرف خیالی تصوّر اور آرزومند رہنے سے کام نہ بنے گا کیونکہ خیالی تصورات موت کی طرح ہیں اور بس۔ کیونکہ ؎

و بقدر الکدّ و التعب تکتسب المعالی
و من طلب العلی جد فی الایام و اللیالی

(ترجمہ : دُکھ اور تکلیف کے مطابق ہی انسان کو ترقی نصیب ہوتی ہے جو بلند مرتبے کا خواہشمند ہے وہ دن رات اس کے حصول کے لیے کوشاں رہتا ہے)

محبّت الٰہی کی علامات بعض مشایخ نے فرمایا کہ جو شخص چاہے کہ اُسے زندگی میں ہی معلوم ہو جائے کہ اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہے۔ اور وہ اس کا سچّا محب ہے تو اپنے اندر جھانکے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے سچے جانشینوں، صحابہ کرام و ائمہ مجتہدین کی اتباع میں ہے یا نہیں، اور ان کے عادات و اخلاق، سیرۃ و اعمال مثلاً زہد، تقویٰ اور شب بیداری اور جمیع مامورات شرعیہ اور جمیع منہیات پر کس قدر کاربند ہے اور وہ بلاؤ مصیبت اور دُکھ درد اور تنگیٔ معاش

کے ورود سے قلبی طور پر خوش ہے اور دُنیا کی گونا گوں رنگینیوں اور اس کی چہل پہل سے رُوگردان ہے یا نہیں ۔ اگر اس کا حال ان کے عین مطابق ہے تو یقین کرلے کہ اس پر اس کا خدا راضی ہے ورنہ سمجھے کہ اس سے اس کا خدا ناراض ہے ۔ (اب اختیار بدستِ مختار)

نفلی عبادات بکثرت کرنا محبت الٰہی کی تمہید ہے ۔

نوافل اور دوگانے ، حدیثِ قدسی حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ سے بیان کرتے ہیں :

ما تقرب المتقربون الیّ بمثل اداء ما فرضت علیھم و لا یزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتی احبہ ۔

(میرے قرب کے متلاشی میرے فرائض کی ادائیگی اور نوافل کی کثرت کرتے ہیں تو میں ان سے محبت کرتا ہُوں)

آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ جس سے محبت کرتا ہوگا اسی کو بہشت کے بالاخانوں میں جگہ دے گا ۔ اور اسی پر ہی تجلیِ الٰہی کا ورود ہوگا ایسے حضرات اللہ تعالیٰ کے قُرب میں خلوت نشین ہوں گے ان میں سب سے اعلیٰ منبروں پر انبیاء علیہم السلام جلوہ افروز ہوں گے ۔ ان کے بعد اولیاءِ کرام تختوں پر ، پھر علماءِ ربانیین کرسیوں پر ، ان کے بعد ان کے ماننے والے اور ان کی تقلید میں زندگی بسر کرنے والے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے اہلِ ایمان حسبِ مراتب بیٹھے ہوں گے ۔ اور یہ نشست جنت عدن کے کثیب ابیض کے قریب ہوگی ۔

ف : جس نے توحید کا اقرار صرف دلائل کی روشنی میں کیا ہوگا وہ زمین پر بغیر کسی اونچے مرتبے کے بیٹھے گا ۔ مقلد فی التوحید سے بھی اس محقق براہِ راست کا مرتبہ بہت ہو گا (ثابت ہُوا کہ محبوبانِ خدا کا وسیلہ فائدہ دیتا ہے)

نکتہ : محقق کا مقلد[1] سے مرتبہ اس لیے گھٹایا گیا ہے کہ محقق اپنے طور اگرچہ منزلِ مقصود پر پہنچ بھی جائے تب بھی ہزاروں ٹھوکریں کھانے کے بعد بخلاف مقلد کے کہ وہ شارع کے قدموں پر چل رہا ہے ۔ اسی لیے اسے کسی قسم کی دقّت نہ ہوگی کیونکہ محقق ذات وصفاتِ باری تعالیٰ میں اپنی عقلی دلیلوں کے بل بوتے کم و بیش گر جائے گا بخلاف مقلد کے کہ وہ نبی علیہ السلام کے بتائے ہُوئے اصولوں کے مطابق ذات وصفات

---

[1] یہاں مقلد سے لغوی معنیٰ مراد ہے ۔ اویسی غفرلہٗ

میں عقیدہ رکھتا ہے اس لیے اس کا ایمان ویقین زیادہ پختہ اور مضبوط ہوگا۔

تفسیر صوفیانہ غرفہ (بالاخانوں) کا ذکر محض لالچیوں اور نفس کے بندوں کے لیے ہے ورنہ خواص کو تو سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے کسی قسم کا طمع و لالچ نہ ہوگا۔ اسی لیے وہ اور بالاخانوں جوان کے اوپر ہوں گے ان جیسی نعمتوں سے نوازے جائیں گے جن کا اشارہ تحیۃ وسلام میں ہے یہ اس وقت ہوگا جب تحیہ وسلام منجانب اللہ ہو کیونکہ عاشق تو صرف جمالِ یار کے دیدار سے ہی لذت پاتا ہے اور بس یا پھر اس کی گفتگو سے۔

حکایت ایک نصرانی کا ہمسایہ مسلمان تھا۔ مسلمان نے نصرانی کو اسلام کی دعوت دی۔ نصرانی نے پوچھا: اسلام پر مجھے ملے گا کیا؟ مسلمان نے کہا: بہشت۔ نصرانی نے کہا: بہشت تو مخلوق ہے اس کے ملنے سے مجھے کیا فائدہ! پھر مسلمان نے کہا: حُور عطا ہوگی۔ نصرانی نے کہا: میں اس سے بھی اعلیٰ انعام چاہتا ہوں ع

صحبتِ حُور نخواہم کہ بود عین قصور

(ترجمہ: میں حور کی صحبت نہیں چاہتا اس لیے کہ یہ تو سراپا نقصان ہے)

مسلمان نے کہا، تو پھر تجھے دیدارِ الٰہی نصیب ہوگا۔ اس پر نصرانی نے کہا: اب تم نے میرے مقصد کو پا لیا کیونکہ دیدارِ یار سے بڑھ کر ہمیں کوئی انعام نہیں چاہیے۔ نصرانی اسلام لے آیا۔ پھر چند دنوں کے بعد فوت ہو گیا۔ اسے خواب میں دیکھا گیا کہ وہ بہشت میں گھوڑا دوڑا رہا ہے اس سے پُوچھا گیا تم فلاں نصرانیت سے اسلام لانے والے تو نہیں ہو؟ اس نے کہا، وہی ہُوں۔ پُوچھا گیا: تیرے ساتھ اللہ نے کیا کیا؟ کہا: جب میری رُوح نے پرواز کی تو مجھے عرش پر پہنچایا گیا، مجھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے بندے! تُو نے میرے اشتیاقِ دیدار میں اسلام قبول کیا ہے فلہذا جا تیرے لیے دائمی خوشنودی اور بقا ہے۔

تفسیر عالمانہ قُلْ اے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تمام لوگوں سے فرمائیے مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ

ربط: مذکورہ اہل ایمان کا حال بیان کرنا ہے۔

ترکیب: ما استفہامیہ محلاً منصوب علی المصدریہ یا نافیہ ہے مایعبأ ما یبالی ولا یعتد ہے: (کذا فی القاموس)

حلِ لغات: ما اعبأ بفلان ما ابالی، لولا کا جواب محذوف ہے۔ اس کا ماقبل اس پر دلالت کرتا ہے اور دعاءکم مبتداء اور اس کی خبر موجودٌ یا واقعٌ ہے اور یہ مصدر مضاف

بسوئے فاعل ہے بمعنے عبادت[1] ۔ دُعا بمعنے عبادت کی نظیر آیۃ و الذین لا ید عون مع اللہ الٰھا آخر (اور وُہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے کی عبادت نہیں کرتے) ہے۔ اور اس جیسی اور آیات جن میں دعاؑ بمعنے عبادت ہے بکثرت ہیں۔

ما استفہامیہ ہو تو معنی ہوگا کہ اے محبوب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ! فرمائیے کہ میرے پروردگار کے ہاں تمہاری کیا قدر و قیمت ہے اگر تم اسے نہ پوجو اور اس کی اطاعت نہ کرو کیونکہ بندے کی قدر و منزلت عبادت سے ہی ہوتی ہے ورنہ عبادت نہ کرنے والا انسان اور جانور برابر ہیں ۔

ف : زجاج نے فرمایا : اس کا معنی یہ ہے کہ اے مومنو ! اللہ کے ہاں تمہاری کوئی قدر اور وزن نہیں اگر تم اس کی عبادت نہ کرو ۔ دراصل عبئ بالکسر و بالفتح بمعنے الثقل و الحمل (بوجھ) ہے جس حیثیت کا ہو ۔ ما اعباء بہ بمعنے ما ادی لہ وزنا یں اسے وزنی نہیں سمجھتا اور نہ ہی میرے نزدیک اس کی قدر و منزلت ہے ۔ آیۃ میں امام راغب رحمہ اللہ تعالیٰ کا رجوع بھی اسی معنی کی طرف ہے ۔ آیت کے اور معانی بھی ہیں لیکن محققین کے نزدیک یہی معنیٰ[2] بہتر ہے[3] ۔

فَقَدْ كَذَّبْتُمْ ۔

ربط : یہاں سے کافروں کا حال بیان کرنا ہے ۔ یعنی اے کافرو ! میری بتائی ہوئی خبر کو تم نے جھٹلایا اور تم اس حد سے گزر گئے ہیں کہ جس سے تمہیں اللہ تعالیٰ قدر و منزلت بخشے یا تمہاری قدر اور وزن کا اعتبار فرمائے ۔

---

[1] یہ معنیٰ صاحبِ رُوح البیان نے بیان فرمایا ہے جو نہ بریلوی ہیں نہ بریلویت سے انہیں کوئی تعلق ہے لیکن افسوس کہ وہابیوں دیوبندیوں نے دُعاء بمعنے عبادت کا الزام لگا کر بریلوی ترجمہ کہہ کر حق کو دبانے کی کوشش کی ہے یہ ان کی خام خیالی ہے ۔

[2] صاحبِ روح البیان کے ایک مضمون کو ناظرین غور سے پڑھیں کہ یہ ترجمہ اُس وقت کر رہے ہیں جب بریلویت و وہابیت و دیوبندیت کا نام و نشان تک نہ تھا ۔ اب اسی ترجمہ کو اعلیٰحضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ نے کنز الایمان میں اپنایا تو وہابی دیوبندی چیخ پڑے کہ یہ معنی ایجاد بندہ ہے حالانکہ وہ لوگ دعاء بمعنے پکارنا کر کے مطلقاً شرک کا فتوٰی دیتے ہیں انہیں تحریف قرآنی کا خوف نہیں ہوتا ۔ اب فیصلہ ناظرین فرمائیں کہ صدیوں پہلے جو مفسرین لکھ گئے ہیں وہی ہم اور ہمارے امام اعلیٰحضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ لکھتے ہیں ۔ اس پر ہمیں ناز ہے کہ ہم اپنے اسلاف صالحین کے نقشِ قدم پر ہیں ۔

[3] اعلیٰحضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ نے کنز الایمان میں یہی ترجمہ کیا ہے ۔ اویسی غفرلہٗ

فَسَوۡفَ یَکُوۡنُ لِزَامًا ۝ قتال کے وزن پر مصدر ہے۔ عدل کی طرح فاعل کے قائم مقام آتا ہے یعنی جیسے عدل بمعنے عادل ہے۔ ایسے ہی یہ الزام بمعنے ملازم ہے۔ یعنی تمہاری تکذیب پر جو بھی سزا مقرر ہوگی وُہ تم پر ایسی لازم ہوگی کہ تمہیں ایسے گھیر لے گی کہ جس سے تمہارا نجات پانا مشکل ہوجائے گا۔ وہی سزا تمہیں جہنم میں جھونک دے گی۔ یہ معنیٰ ہم نے فا کی وجہ سے کیا ہے کہ اس کو ماقبل کا مابعد کا لزوم چاہیے اور اسے چھپایا اس لیے گیا ہے کہ گویا وہ اتنا ظاہر ہے کہ اس کے اظہار کی ضرورت ہی نہیں اور تاکہ اس کے ہولناک ہونے پر دلالت کرے۔ یعنی یہ ایک ایسی سزا ہے کہ جس کی کُنہ وحقیقت کو کوئی نہیں پا سکتا۔

ف : بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس سے دنیوی سزا مراد ہے اور وُہ ہے بدر کے جنگ کا موقعہ کہ اس میں بعض بُری طرح مارے گئے اور بعض قیدی بنائے گئے یعنی ستّر آدمی قیدی بنے۔ پھر اس کے ساتھ انہیں آخرت کا عذاب متصلاً لازم ہوگیا۔ حضرت شیخ سعدی رحمہ اللہ نے فرمایا : ؎

رطب ناورد چوب خر زھرہ بار
چہ تخم افگنی بر ہمان چشم دار

(ترجمہ : جھاؤ کی لکڑی سبز کھجور کا پھل نہ دے گی۔ جیسا بیج ڈالو گے اس سے ویسا ہی پھل پاؤ گے۔)

تفسیر صُوفیانہ کفار نے استعداد فطری ضائع کر دی تھی اور قویٰ کو بیکار کر دیا تھا۔ ان کا حال گٹھلی کی طرح ہوگیا تھا کیونکہ اس سے اب سیب نہیں اگایا جا سکتا تھا۔ قاعدہ ہے کہ شے کی اصل تخلیق وقوت مفقود نہیں ہوتی مثلاً گٹھلی سے کھجور تو پیدا ہوسکتی ہے اس کے لوازمات پورے کیے جائیں تو۔ اگر اسے بیکار اور لاوارث چھوڑ دیا جائے تو کچھ نہ اُگے گا۔ ایسے ہی انسان کا حال ہے کہ اس میں فساد و صلاح دونوں مادّے ہیں اگر دونوں مادّے نہ ہوتے تو مواعظ و وصایا کا کوئی فائدہ نہ ہوتا حالانکہ وعد و وعید اور اوامر و نواہی اسی صلاح وفساد کے لیے مقرر ہوئے ہیں اور نہ ہی عقل کا تقاضا ہے کہ ان دونوں مادوں کے نہ ہونے پر اسے زجر و توبیخ ہوگی اور پھر یہ انسان کے لیے کیسے ممکن نہ مانا جائے جبکہ ہم بعض جانوروں میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ مثلاً وحشی جانور مانوس ہونے سے عادت بدل لیتا ہے اور رذیل جانور سلامتی قبول کر لیتا ہے۔ اس سے ثابت ہُوا کہ توحید و تصدیق و طاعت انسان میں ممکن ہے اور وُہ قدرت رکھتا ہے کہ اپنے سے شرک وتکذیب وعصیان دُور کرے۔ اور اس کی تخلیق بھی اسی توحید و تصدیق و طاعت کے لیے ہوئی ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

ما یعبأ بخلقکم ربی لولا عبادتکم وطاعتکم ایاہ۔

(میرے پروردگار کو تمہارے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں اگر تم اس کی عبادت و طاعت نہ کرو)

یعنی اس نے تمہیں محض عبادت کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔

(اور میں نے جن و انس کو محض اس لیے پیدا کیا کہ وہ عبادت کریں)

نتیجہ نکلا کہ انسان کی تخلیق میں حکمتِ الٰہیہ و مصلحتِ ربانیہ یہی ہے کہ وہ طاعت و عبادت کرے۔ اگرچہ اشاعرہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے افعال معلّلہ بالاغراض نہیں لیکن غایاتِ جلیلہ کے ساتھ متعلق تو ہیں۔

ملفوظِ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ امام راغب فرماتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں مسافر ہے جیسا کہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

الناس سفر والدار دار ممر لا دار مقر۔

(لوگ مسافر ہیں اور یہ دنیا گزرگاہ ہے قیام گاہ نہیں)

انسان کے سفر کی ابتدا ماں کے پیٹ سے ہے اور اس کی اصل منزل آخرت ہے اور اس کی زندگی اس کے سفر کی مسافت ہے اور اس کی عمر کے مہ و سال فراسخ اور اس کے ایام میل (کلومیٹر) اور سانس چلنے کی رفتار۔ اور ایسے چل رہا ہے جیسے کشتی اپنے سوار لے کر چلتی ہے۔ کسی شاعر نے فرمایا: ؎

رأیت اخا الدنیا وان کان ثاویا

اخا سفر یسری بہ وھو لا یدری

(ترجمہ: میں نے دنیا کے مقیم کو سفری دیکھا ہے اگرچہ وہ مقیم ہے لیکن رات دن چل رہا ہے اگرچہ وہ اسے نہیں جانتا)

اصلی غرض انسان کو دراصل اللہ تعالیٰ نے اپنے دارالسلام میں پہنچنے کی دعوت دی ہے لیکن چونکہ راستہ پُر ظلمات اور مشکلات سے بھرپور ہے اسی لیے انسان کو عقل کا نور بمنزلہ رہبر کے بنایا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ یا اس پر سوار ہو کر راستہ طے کرے اور عبادات کو بمنزلہ مضبوط قلعوں کے بنایا ہے تاکہ ان کے ذریعے باحفاظت اور امن و سلامتی کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچ سکے۔[1]

---

[1] عموماً انسان عبادتِ الٰہی سے گھبراتا ہے حالانکہ سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کے جتنے طریقے بتائے ہیں وہ سب کے سب انسان کی تندرستی (باقی اگلے صفحہ پر)

مسئلہ: جو شخص کہے کہ یہ عبادات تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے عذاب مقرر فرمایا ہے تو وہ کافر ہوگیا بشرطیکہ وہ اپنے قول میں تاویل نہ کرتا ہو۔

ف: ایک تاویل یہ ہے کہ وہ کہے عذاب سے میری مراد دکھ اور تکلیف ہے۔

مسئلہ: اگر کہے کہ کاش اللہ تعالیٰ ہم پر کوئی امر فرض نہ کرتا۔ اور اس کی تاویل کرتا ہو تو کافر ہو جائے گا۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی کرتا ہے وہ ہمارے لیے بہتر ہے۔ ہاں اگر وہ شخص تاویل کرتا ہو کہ خیر سے آسانی مراد ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ باطن وظاہر اور اول و آخر میں ہمیں آسانی وسہولت سے نوازے۔ (آمین ثم آمین) صاحب روح البیان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ

سورۂ فرقان کا اختتام ہفتہ کے دن ۶ رمضان ۱۱۱۸ھ کو ہوا۔

فقیر اویسی غفرلہٗ نے اس کے ترجمہ سے ۲۶ ذیقعدہ ۱۴۰۲ھ شب منگل عند اذان العشاء فراغت پائی۔ فصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) صحت کے لیے ہیں۔ مثلاً قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر نماز فرض کی ہے اور حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ادا کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے انہوں نے یہاں تک کہا ہے کہ "اگر مجھے عورتوں اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو جو مسلمان پانچ وقت کی نماز باجماعت ادا نہیں کرتے ہیں ان کے مکانوں کو نذرِ آتش کر دینے کا حکم دیتا۔" اب چودہ سو سال کے بعد حال ہی میں امریکہ میں ہارورڈ میڈیکل سکول کے ایک پروفیسر ہربرٹ ولسن نے لندن میں طب کے متعلق ایک کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ جدید طبی تحقیق کے مطابق دل کے دورے روکنے، ہائی بلڈ پریشر کو نارمل رکھنے، شدید درد اور کینسر کو ختم کرنے میں عبادات انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہیں اب ذرا ملاحظہ کیجئے کہ مسلمانوں میں تو عیسائیوں کی نسبت بہت زیادہ عبادت کرنی پڑتی ہے۔ پانچ وقت کی نماز تو فرض ہے لیکن اس کے علاوہ تین نفلی نمازیں یعنی تہجد، اشراق اور چاشت بھی ہیں۔ اس طرح سے مسلمانوں کو عبادات میں زیادہ مشقت کرنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ سال کے بعد رمضان شریف کے تیس روزے اور حج کے ایام میں کئی روز تک نماز طواف اور سعی میں مشغول رہنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے بدن کی شریانوں میں کولسٹرول کی کمی واقع ہو جاتی ہے اور بلڈ پریشر نارمل ہو جاتا ہے اس لیے مسلمانوں کے لیے فرائض خداوندی ادا کرنے کے علاوہ طبی فوائد کے لیے بھی عبادات ضروری ہیں۔ میرا ذاتی مشاہدہ بھی یہی ہے کہ حج کے ایام میں زیادہ ریاضت کی وجہ سے بغیر دوائی لیے بلڈ پریشر نارمل ہو جاتا ہے اور دل کی تکلیف عارضی طور پر دور ہو جاتی ہے۔ ہم پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل اور احسان ہے کہ اس نے ہمیں مسلمان پیدا کیا اور دین اسلام پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائی۔ مزید تفصیل فقیر کی کتاب "طب اور اسلام" میں ہے۔ اویسی غفرلہٗ

سُورَةُ الشُّعَرَاء

سورة الشعراء مكية • هي مائتان وسبع وعشرون آية واحد عشر ركوعاً

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

طٰسٓمّٓ ○ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ○ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○
اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ○ وَمَا
يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ○ فَقَدْ كَذَّبُوْا
فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا
فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ○ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○
وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ○ ع

ترجمہ: یہ روشن کتاب کی آیات ہیں کہیں تم اس غم میں جان گنوا دو کہ وہ ایمان کیوں نہیں لاتے اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ان پر کوئی نشانی نازل کردیں تو پھر اونچی گردنوں والے اس کے سامنے سر جھکا دیں ان کے ہاں رحمٰن کی طرف سے کوئی نئی نصیحت نہیں مگر وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں سو انہوں نے جھٹلایا تو عنقریب ان کے پاس وہ خبریں آئیں گی جس کے ساتھ وہ ٹھٹھہ کرتے تھے

کیا انہوں نے زمین کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس پر کتنی عمدہ کھیتیوں کے جوڑے اُگائے ہیں بے شک اس میں ایک بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بیشک تمہارا رب البتہ عزت والا مہربان ہے۔

سورۃ شعراء مکیہ ہے اور اس کی ایک سو بائیس یا ستائیس آیتیں ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

تفسیر عالمانہ طٰسٓمّٓ ○ حروفِ مقطعہ جو سورتوں کے اول میں ہیں۔ ان کا مجموعہ ہے: سر حصین قطع کلامہ۔

ان حروف کے متعلق وہی قول موزوں تر ہے جو جمہور مفسرین نے اختیار فرمایا کہ:

اللہ اعلم بمرادہ۔ (اللہ تعالیٰ اپنی مراد کو خود خوب جانتا ہے)

اس لیے کہ یہ مخفی اسرار سے ہیں۔

قولِ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان لکل کتاب سرا و سر القرآن فی المقطعات۔ (ہر کتاب میں اسرار ہوتے ہیں اور قرآن مجید کے اسرار مقطعات ہیں) (ریاض الاذکار)

(صاحبِ روح البیان صدیوں پیشتر اپنا عقیدہ لکھ گئے، وہ فرماتے ہیں:)

ردِّ وہابیہ المعانی المتعلقۃ بالاسرار والحقایق لا یعلمها الا اللہ ومن اطلعہ اللہ علیها من الراسخین فی العلم[1]۔

(وہ معانی جو اسرار و حقائق سے متعلق ہیں انہیں اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا یا وہ اولیاءِ کرام و علمائے راسخین جانتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے علوم سے نوازا)

تنبیہ ان علوم پر بحث فضول ہے جن پر نہ زبان کو رسائی اور نہ قلم کو امکانِ بیان۔ ہاں وہ لوازم جن کے ذریعہ حقایق کی طرف راستہ ملتا ہے انہیں ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ یہ بھی حقایق سے ہے اور مرتبۂ فہم کے قریب تر ہے۔ ہماری تقریر اول کی طرف سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اشارہ کرتا ہے کہ: طٰسمٓ، عجزت العلماء عن تفسیرها۔ (طٰسم کی تفسیر سے علماء عاجز ہیں) (کذا فی فتح الرحمٰن)

---

[1] الحمد للہ یہی عقیدہ ہمارا ہے جو ہمیں اسلاف صالحین کے توسط سے نصیب ہوا۔ ولکن الوہابیۃ قوم لا یعقلون۔ اویسی غفرلہ

روایتِ علی رضی اللہ عنہ

اور ہماری تقریرِ ثانی کی طرف کشف الاسرار کی بیان کردہ روایتِ علی (رضی اللہ عنہ) اشارہ کرتی ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب طٰسم کا نزول ہُوا تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”طا سے طورِ سینا، سین سے سکندریہ اور میم سے مکّہ (معظمہ) مراد ہے۔“

اس کی حقیقی مراد تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مقامات کی قسم یاد فرمائی ہے۔

چنانچہ فرمایا:

لا اقسم بھذا البلد۔

جبلِ طُور

طُورِ سینا شام و مدینؑ کے درمیان واقع ہے اور یہی موسیٰ علیہ السلام کی مناجات کی جگہ ہے۔ اسی مقام پر موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہُوئے اور یہیں پر انہیں جلوۂ حق نصیب ہُوا۔ کما قال تعالیٰ:

فلما تجلّی ربہ للجبل۔

اعجوبہ

اس پہاڑ (طورِ سینا) کے پتھر کو توڑا جائے تو اس کے درمیان سے عوسج (درخت) کی صورت کا ایک ڈھیلا نکل آتا ہے اور یہ ہر ایک پتھر میں دائمی طور پر ہے۔ اسی لیے یہودی عوسج درخت کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں اسی لیے یہ درخت شجرۃ الیہود کے نام سے مشہور ہے۔

اسکندریہ

یہ مغربی ممالک کا آخری شہر ہے اور رُوئے زمین پر اس جیسا کوئی اور شہر نہیں تھا۔ ایک وقت اس شہر کی مساجد بیس ہزار تھیں۔ منقول ہے کہ اس کے مسلسل سات قصبے ایک دوسرے سے متصل تھے پھر دریا میں ڈوبا تو باقی صرف ایک قصبہ رہ گیا اور آئینہ سکندری جو ایک مینار پر نصب تھا وہ دریا میں غرق ہوگیا تھا اب آئینۂ سکندری کا کوئی وجود نہیں۔

آئینۂ سکندری

سکندر نے اسی شہر میں ایک مینار بنوایا جس کا طول تین سو گز تھا اس کے اُوپر ایک قُبہ تھا جس میں یہی آئینہ رکھا گیا اس دور کے حکما (سائنسدانوں) نے سکندریہ کے لیے تیار کیا تھا جس سے ایک ماہ کی مسافت تک سے جہاز وغیرہ دیکھ لیے جا سکتے تھے۔ آئینہ میں عجائب و غرائب رکھے گئے تھے۔ مثلاً جب دشمن کا جہاز دُور سے دکھائی دیتا تو اس کے شیشے کی تاثیر سے جہاز کو آگ لگ جاتی۔

آئینہ کی بربادی

رومی بادشاہ نے مصر کے بادشہ کو غچّا دیا کہ سکندر نے اس شیشے میں بہت بڑے خزینے چھپا رکھے تھے۔ اگر تجھے میری بات کی تصدیق ہو جائے تو آئینۂ سکندری

سے خزانوں کو ابھی قبضہ میں لے لے ورنہ اس کے عوض میرا سو نے چاندی اور جواہرات سے لدا ایک جہاز قبول کر کے مجھے اجازت دے تا کہ وہ خزانے میں نکال لوں۔ ان خزانوں میں تیرا بھی حصہ ہوگا۔ مصری بادشہ رومی بادشہ کے جھانسے میں آگیا اور آئینہ سکندری کا قبہ توڑ دیا۔ اس میں سے شے تو کوئی برآمد نہ ہوئی بلکہ الٹا نقصان یہ ہوا کہ آئینے کا طلسم ٹوٹ گیا۔

مکّہ معظّمہ مکہ معظمہ کے تعارف کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ قدیم الایام سے موجود چلا آ رہا ہے۔ اسی میں مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ اسلام کے ارکان کا ایک رُکن حج یہیں پر ادا کیا جاتا ہے۔

طٰسٓمّٓ کی دوسری تفسیر بعض مفسرین نے فرمایا کہ طٰسم کی "طا" سے طول یعنی قدرتِ ایزدی اور "سین" سے سنا یعنی رفعتِ حق اور "میم" سے ملک و مجد الٰہی مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی ان شانوں کی قسم یاد فرمائی ہے۔

تفسیر نمبر ۳ "طا" سے طائرین باللہ کا طیران اور "سین" سے سائرین الی اللہ کی سیر اور "میم" سے ماشین للہ کی مشی مراد ہے۔ پہلا مرتبہ اہلِ نہایہ کا، دوسرا اہلِ توسط کا اور تیسرا اہلِ بدایۃ کا ہے۔ ہر سالک کا اپنا مقام اور ہر ایک کی اپنی پرواز ہے۔

تفسیر نمبر ۴ "طا" میں اہلِ توحید کے اسرار کی طہارت اور "سین" میں ان کے قلوب کی سلامتی، اور "میم" میں خالق کی منۃ علی المخلوق کی طرف اشارہ ہے۔

تفسیر از جنید بغدادی رضی اللہ عنہ سید الطائفہ سیدنا جنید بغدادی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "طا" سے میدان الرحمٰن میں تائبین کی طرب اور "سین" سے وصلۃ کے میدان میں عارفین کا سرور اور "میم" سے میدانِ قربۃ میں مقامِ محبین مراد ہے۔

تفسیر صوفیانہ حضرت مولانا نجم الدین قدس سرہٗ نے فرمایا کہ "طا" سے حضور علیہ السلام کے قلب مبارک کا تعلقاتِ کونین سے طاہر ہونا اور "سین" سے حضور نبی پاک علیہ السلام کی جملہ انبیاءؑ و مرسلین پر سیادت اور "میم" سے رب العالمین کے جمال کا مشاہدہ مراد ہے۔

تفسیر از امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ طٰسم میں اللہ تعالیٰ نے شجرۂ طوبیٰ کی "طا" اور سدرۃ المنتہیٰ کے "سین" اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے "میم" کی قسم یاد فرمائی ہے۔ اس معنیٰ پر "طا" سے طوبیٰ کا درخت اور "سین" سے سدرۃ المنتہیٰ اور "میم" سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مراد ہیں۔

طوبیٰ کے فضائل اللہ تعالیٰ نے طوبیٰ کو اس لیے برگزیدہ بنایا ہے کہ جب جنۃ عدن کو بلا واسطہ پیدا فرمایا تو اس میں ایک ایسا قلعہ تیار کیا جو بادشاہوں کے لیے ہوتا ہے اور اس میں ایک ایسا ٹیلہ رکھا جو تجلی گاہِ حق ہے۔ اسی میں ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقامِ وسیلہ ہے۔ اسی جنتِ عدن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے طُوبیٰ کا درخت بویا اور اسے ایسا لمبا بنایا کہ اس کی ٹہنیاں جنت عدن کی دیواروں تک پھیلی ہُوئی تھیں اور اس کا سایہ جنت عدن کے جملہ باغات پر سایہ فگن تھا اور اس کی ٹہنیوں پر سوائے سنہری حلوں کے اور کوئی ثمرہ نہ تھا اور یہی اہلِ جنت کا لباس اور زیب و زینت بنیں گے۔ اور طُوبیٰ کو اسی لیے فضیلت حاصل ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ پیدا فرمایا۔ یہی تمام بہشتوں کی جملہ نعمتوں کی جامع الحقائق اور برکت کے لحاظ سے تمام نعمتوں کو اعم ہے۔ اور طوبیٰ اشجارِ جنت کے لیے ایسے ہے جیسے آدم علیہ السلام اپنی تمام اولاد کے لیے اصل ہیں اور بہشت کی ہر نہر کی اصل طوبیٰ ہے، گویا یہ محمدیۃ المقام ہے۔

سدرۃ المنتہیٰ کے فضائل سدرۃ المنتہیٰ کو برگزیدہ بنانے میں یہ نکتہ ہے کہ یہ وہ مقام ہے جو کرسی اور ساتویں آسمان کے درمیان واقع ہے۔ اس کی ٹہنیوں میں تسبیح و تحمید و ترجیع کی ایسی خوش کن آواز ہے جس سے ارواح و قلوب کو وجد آجاتا ہے دارین کے درمیان یہ برزخی حد ہے اور اسے منتہیٰ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ارواح یہاں تک پہنچتے ہیں اور زمین میں رہنے والے سعادت مندوں کے اعمال یہاں سے اُوپر کو جاتے ہیں اور احکامِ شرعیہ کا نزول اولاً یہیں پر ہوتا ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ملائکہ کی امامت فرمائی اسی مقام (سدرۃ المنتہیٰ) پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ملائکہ آسمانی کی نمازِ وتر کی امامت فرمائی۔

ف: بیت المقدس میں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انبیاء علیہم السلام کے امام بنے اور سدرۃ المنتہیٰ پر ملائکہ کرام کے۔ اس سے ہمارے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جملہ عالم (آسمان و زمین) والوں پر فضیلت ثابت ہُوئی۔ (کذا فی تفسیر التیسیر)

مقامِ جبریل علیہ السلام سدرۃ المنتہیٰ کی چوٹی پر جبریل علیہ السلام کا مسکن ہے جیسے وسطِ دماغ عقل کا مسکن ہے اور اس لیے کہ جبریل علیہ السلام عقل کی سدرہ و مقام ہیں اس میں عقل کے مقام کی طرف اشارہ ہے اور عقل کا مقام دماغ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس نے جبریل

علیہ السلام کو دیکھا اس نے گویا عقل کی صورت دیکھا کیونکہ جبریل علیہ السلام اپنے مقامِ تعین میں سوائے انبیأ علیہم السلام کے اور کسی کو نہیں دیکھتے۔

نکتہ : طٰسٓمٓ میں میم کو مؤخر کرنے میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ختم المرسلین ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کیا جیسے حروف ہجا کو یا (وہ جو میم کے درمیان واقع ہے) پر ختم فرمایا۔

نکتہ : طٰسٓمٓ قسم ہے اور اس میں جملہ تین اصول حقایق جمع فرمائے :

(۱) حقیقت جنانیہ تعمیرجامعہ۔ اور یہ شجرۂ طوبیٰ ہے اسی لیے اسے مقامِ محمدی میں امانت رکھا کیونکہ مقامِ محمدی جمع نعم جنانیہ کا جامع ہے اور یہ مقام یہی شجرۂ طوبیٰ ہے۔ اسی لیے اسے اللہ تعالےٰ نے مقامِ محمدی میں امانت کے طور پر رکھا کیونکہ یہ نعم جنانیہ کا جامع ہے اور یہاں سے ہی ایسی تمام نعمتیں تقسیم ہوتی ہیں جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام علوم ومعارف وانواع کمالات تقسیم ہوتے ہیں۔

(۲) حقیقتِ برزخیہ۔ یہ حقائق دارین کی جامع ہے اور یہی شجرۂ سدرۃ المنتہیٰ ہے اس کی شاخیں تمام اہلِ جنت کی نعمتیں ہیں اور اس کی جڑیں اہلِ نار کے لیے زقوم ہیں کیونکہ فلک البروج یعنی فلک اعظم کا مقعر یہی ہے اور فلک اعظم کو فلک الافلاک بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ جمیع افلاک کا جامع ہے۔ اسے فلک اطلس بھی کہتے ہیں کیونکہ اس پر ستارے نہیں ہیں۔ یہ اس کپڑے کی طرح ہے جو سادہ یعنی نقش ونگار سے خالی ہو۔ اور فلک اعظم کی دونوں سطحیں فلک ثوابت کے محدب کو مس کرتی ہیں لیکن اس کے محدب کی کوئی شئے مس نہیں کرتی کیونکہ اس کے آگے اور کوئی شے نہیں ہے نہ خلا نہ ملا، بلکہ اس محدب پر عالم کے امتدادات منقطع ہوجاتے ہیں۔

ف : بعض نے کہا اس کے آگے نورانی افلاک غیر متناہیہ ہیں اور فلک اعظم کے ماتحت میں خلا کا کوئی قائل نہیں۔ ہاں اس کے تحت ملا ہے۔ (کذا فی کتب الٰہیہ)

ف : صوفیہ کرام فرماتے ہیں کہ وہ مقام جہاں نہ خلا ہے نہ ملا۔ وہ عالمِ ارواح کے اوپر ہے نہ کہ عرشِ الٰہی کے آگے۔

ف : شرح التقویم میں ہے کہ چونکہ کتبِ الٰہیہ میں مذکور ہے کہ آسمان سات ہیں اسی لیے اسلامی حکمأ نے سمجھا کہ آٹھواں آسمان کرسی اور نواں عرشِ الٰہی ہے اور انہی کے اس قول کی تائید وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض سے ہوتی ہے۔

(۳) حقیقۃ الحقائق الکلیہ۔ یہی حقیقتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے طٰسٓمٓ میں

جامع حقائق کی قسم یاد فرمائی ہے کیونکہ اسے جمیع حقائق پر فضیلت حاصل ہے اس لیے حقیقۃ محمدیہ (علیٰ صاحبہ التحیۃ والثناء) جمیع حقائق کی حقیقت (جامعہ) ہے، دنیوی ہوں یا برزخی یا اُخروی۔ اسی لیے آپ کو جمیع حقائق کا خاتم بنایا ہے

ہر دو عالم بستۂ فتراک او
عرش و کرسی کردہ قبلہ خاک او

پیشوائے ایں جہان و آں جہاں
مقتدائے آشکارا و نہاں

(ترجمہ: تمام عالم آپ کی فتراک سے وابستہ ہے۔ عرش وکرسی کا قبلہ آپ ہی ہیں۔ آپ ہی اِس جہان اور اُس جہان کے پیشوا ہیں۔ آشکارا و نہاں کے مقتداٰ ہیں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم))

ف: بعض مشایخ اہلِ مکاشفہ نے فرمایا کہ اوائل سور کے حروف مقطعہ کے حقایق صرف اہلِ کشف و وجدان جانتے ہیں کیونکہ یہ ملائکہ ہیں اور ان کے نام ان حروف کے نام پر ہیں اور وُہ چودہ ہیں اور حروفِ مقطعہ بھی بلا تکرار چودہ ہیں جن کا آخری حرف نٓ والقلم ہے۔

ف: یہ منازل قرآن پر وجوہِ مختلفہ سے ظاہر ہُوئے۔ بعض منازل تو ایسے ہیں جن میں ایک فرشتہ ظاہر ہُوا جیسے نٓ و صٓ۔ اور بعض وُہ ہیں جن میں دو ظاہر ہُوئے۔ جیسے طٰسٓ و یٰسٓ و حٰمٓ۔ اور بعض وہ ہیں جن میں تین ظاہر ہوئے جیسے الٓمٓ و طٰسٓمٓ اور بعض وہ ہیں جن میں چار ظاہر ہوئے جیسے الٓمٓصٓ بعض وہ ہیں جن میں پانچ ظاہر ہوئے جیسے کٓھٰیٰعٓصٓ و حٰمٓ عٓسٓقٓ۔ اور ان کی صورتیں مع التکرار ننانوے ملائکہ ہیں اور ہر فرشتے کے ہاتھ میں ایمان کے شعبوں میں ایک شعبہ ہے اور ایمان بھی بضع وسبعون ہے اور بضع کا اطلاق تین سے نو تک آتا ہے اور یہاں بضع آخری حد میں استعمال ہوا یعنی نو اور نوّے۔ کُل ننانوے ایمان کے شعبے ہوئے۔ پھر جب کوئی ان مقطعات میں سے کسی ایک کو پڑھتا ہے، مثلاً کہتا ہے: الٓمٓ تو تینوں فرشتے بول اُٹھتے ہیں اور کہتے ہیں: اے قاری کیا کہتے ہو! تو قاری ان حروف کے بعد والا مضمون عرض کرتا ہے۔ پھر اسے کہا جاتا ہے تیرے لیے ابوابِ عجائبات کھول دئے گئے ہیں اور تو ان سے عجائب وغرائب دیکھے گا۔ ارواحِ ملکیہ (جن کے اجسام یہی حروف ہیں جو قرآن مجید کے تحت تسخیر ہیں اور انہی ارواح کے قبضے میں ایمان کے شعبے ہیں) اس کی مدد اور اس کے ایمان کی حفاظت کرتی ہیں۔

ایمان کے شعبے: وصایا الفتوحات کے ترجمہ میں ہے کہ ایمان کے شعبوں میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ توحید کی شہادت
۲۔ نماز ادا کرنا

۳ - زکوٰۃ دینا
۴ - روزہ رکھنا
۵ - حج کرنا
۶ - وضو کرنا
۷ - جنابت کا غسل
۸ - جمعہ کا غسل
۹ - صبر
۱۰ - شکر
۱۱ - پرہیزگاری
۱۲ - حیا
۱۳ - امان
۱۴ - نصیحت
۱۵ - اولوالامر کی طاعت
۱۶ - ذکرِ حق
۱۷ - خلقِ خدا سے دُکھ درد ٹالنا
۱۸ - امانت ادا کرنا
۱۹ - مظلوم کی مدد کرنا
۲۰ - ظلم کا ترک
۲۱ - کسی کی تذلیل نہ کرنا
۲۲ - ترکِ غیبت
۲۳ - ترکِ نمیمت (چغلخوری)
۲۴ - ترکِ بخس یعنی کھوٹ نہ کرنا
۲۵ - کسی کے گھر میں جانا ہو تو اس کے طریقۂ کار کو مدنظر رکھنا
۲۶ - غصہ پینا
۲۷ - عبرت حاصل کرنا
۲۸ - اچھی بات کو غور سے سننا اور اس پر عمل کرنا
۲۹ - بُری بات کو نہ اچھالنا
۳۰ - اچھی بات بولنا
۳۱ - حفظِ فرج (زنا سے بچنا)
۳۲ - حفظِ زبان (بُری باتوں سے زبان کو روکنا)
۳۳ - توبہ
۳۴ - توکّل
۳۵ - خشوع
۳۶ - ترکِ لغو یعنی بیہودہ باتوں کو چھوڑنا
۳۷ - لایعنی گفتار کا ترک
۳۸ - حفظِ عہد (وعدہ پورا کرنا)
۳۹ - تقوٰی پر مداومت
۴۰ - گناہ پر مدد نہ کرنا
۴۱ - ظلم کی مدد نہ کرنا
۴۲ - نیکی اور پرہیزگاری کے لیے مدد کرنا
۴۳ - سچائی اپنانا
۴۴ - امر بالمعروف کرنا
۴۵ - برائی سے روکنا
۴۶ - دو مسلمانوں کے درمیان صلح وصفائی کرانا
۴۷ - خلقِ خدا کے لیے دعا و رحمت طلب کرنا
۴۸ - بڑوں اور بزرگوں کی تعظیم و تکریم
۴۹ - حدود اللّٰہ کی پابندی
۵۰ - جاہلیت کی رسوم کا ترک
۵۱ - پیٹھ کے پیچھے کسی کو بُرا نہ کہنا
۵۲ - آپس میں دشمنی نہ رکھنا

۵۳ - جھوٹی گواہی سے احتراز
۵۴ - جھوٹ سے پرہیز
۵۵ - منہ پر کسی کو بُرا کہنے سے اجتناب
۵۶ - منہ پر عیب بیان کرنے سے بچنا
۵۷ - بُرے اشاروں سے بچنا
۵۸ - غائبانہ اور منہ پر کسی کو بُرا نہ کہنا
۵۹ - آنکھوں سے بُرے اشارے نہ کرنا
۶۰ - کسی کی غلط بات دوسرے سے نہ کہنا
۶۱ - نماز باجماعت ادا کرنا
۶۲ - نیک اجتماعات میں حاضر ہونا
۶۳ - ایک دوسرے کو ہدیہ دینا
۶۴ - السلام علیکم کہنے کی عادت ڈالنا
۶۵ - حسنِ خلق
۶۶ - حسنِ عہد
۶۷ - راز کی نگہداشت کرنا
۶۸ - نکاح دینا (یعنی اپنی بچیوں اور رشتہ داروں کا بیاہ کرنا)
۶۹ - نکاح لینا
۷۰ - حُبِّ اہلبیتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)
۷۱ - اپنی عورت سے محبت
۷۲ - خوشبو سے محبت
۷۳ - حُبِّ انصار
۷۴ - تعظیمِ شعائر
۷۵ - ترکِ عیش
۷۶ - اہلِ ایمان پر حملہ نہ کرنا
۷۷ - میّت کی تجہیز و تکفین
۷۸ - اہلِ اسلام کی نمازِ جنازہ پڑھنا
۷۹ - بیمار پُرسی
۸۰ - راستہ سے وہ چیز ہٹانا جو مسلمانوں کو ایذا دے
۸۱ - جو شے اپنے لیے پسند کریں وہی اہلِ اسلام کے لیے پسند کرنا
۸۲ - خدا و رسول جل جلالہٗ وصلی اللہ علیہ وسلم کو ہر شے سے محبوب جاننا
۸۳ - کفر و زنا کے مرتکب کو قتل کرنا
۸۴ - ملائکہ اور ان کتب پر ایمان لانا (جو انبیاءؑ لائے ہیں)

اور دیگر وہ جملہ امور جو قرآن و سنت میں موجود ہیں اور بے ان گنت ہیں۔

حدیث شریف میں ہے:
الایمان بضع وسبعون شعبۃ افضلھا قول لا الٰہ الا اللہ وادناھا اماطۃ الاذی عن الطریق والحیاء شعبۃ من الایمان۔

(ایمان کے کئی شعبے ہیں ان کا افضل شعبہ لا الٰہ الّا اللہ کی گواہی اور ادنیٰ شعبہ راستے سے ایذا دینے والی چیز ہٹانا، اور حیا بھی ایمان کا شعبہ ہے)

ف: ایمان کے شعبوں پر عمل کرنا ایمانداروں کا کام ہے۔

مسئلہ: ایمان کے شعبوں کی مخصوص تعداد کسی ایک روایت میں نہیں۔ ہاں اہلِ علم نے اس کی گنتی بتائی ہے زیادہ سے زیادہ ایک حدیث سے اس کے ننانوے شعبے ثابت ہیں۔

امام نسفی کا قول حضرت امام نسفی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تفسیر تیسیر میں لکھا ہے کہ میں ان شعبوں کو لکھتا ہوں اور یہ میرا اپنا پسندیدہ قول و اجتہاد ہے وہ شعبے یہ ہیں :

١ - تہلیل (یعنی لا الٰہ الّا اللہ کی گواہی)
٢ - تکبیر (یعنی اللہ اکبر کہنا)
٣ - تسبیح (یعنی سبحان اللہ کہنا)
٤ - تحمید (یعنی الحمد للہ کہنا)
٥ - تمجید (یعنی اللہ تعالیٰ کی بزرگی بیان کرنا)
٦ - تجرید
٧ - تفرید
٨ - توبہ
٩ - انابت (یعنی رجوع الی اللہ)
١٠ - نظافت (صفائی و ستھرائی)
١١ - طہارت
١٢ - صلوٰۃ
١٣ - زکوٰۃ
١٤ - روزہ
١٥ - قیام برائے نماز
١٦ - اعتکاف
١٧ - حج
١٨ - عمرہ
١٩ - قربانی
٢٠ - صدقہ
٢١ - غزوہ
٢٢ - عتق (غلام آزاد کرنا)
٢٣ - تلاوتِ قرآن
٢٤ - احسان
٢٥ - گناہوں سے اجتناب
٢٦ - ترکِ طغیان
٢٧ - کسی سے بول چال نہ چھوڑنا
٢٨ - ترکِ عداوت
٢٩ - قلب کا تقویٰ
٣٠ - حفظِ لسان
٣١ - ثناء
٣٢ - دُعاء
٣٣ - خوف
٣٤ - رجاء
٣٥ - حیاء
٣٦ - صدق
٣٧ - صفا
٣٨ - نصیحت
٣٩ - وفا
٤٠ - ندامت
٤١ - بکاء (گریہ وزاری)
٤٢ - اخلاص
٤٣ - ذکاء
٤٤ - حلم
٤٥ - سخاء
٤٦ - عطائے الٰہی پر شکر

۴۷۔ بلیات ومصائب پر صبر
۴۸۔ تقدیر پر رضا
۴۹۔ نیک نیتی کی استعداد
۵۰۔ اتباعِ سنّت
۵۱۔ موافقتِ صحابہ بہ عقاید واعمال
۵۲۔ بڑوں، بزرگوں اور بوڑھوں کی تعظیم
۵۳۔ صغار (چھوٹوں) سے محبت
۵۴۔ علمائے امت کی اقتداء
۵۵۔ عوام الناس پر شفقت
۵۶۔ خواص کا احترام
۵۷۔ اہلسنّت کی تعظیم وتکریم
۵۸۔ ادائے امانت
۵۹۔ اظہارِ صیانت
۶۰۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا
۶۱۔ غرباء ومساکین پر انعام
۶۲۔ یتیم پروری
۶۳۔ صلہ رحمی
۶۴۔ افشاء السلام یعنی السلام علیکم کہنا
۶۵۔ تسلیم ورضا
۶۶۔ برائیوں سے بچنے کی تدابیر
۶۷۔ زہد
۶۸۔ رغبۃ الی العقبیٰ
۶۹۔ راضی بر رضائے آقا
۷۰۔ مخالفت خواہشاتِ نفسانی
۷۱۔ جہنم کی آگ سے بچنے کا خوف
۷۲۔ جنۃ الماوٰی یعنی بہشت کی طلب
۷۳۔ جُودوکرم عام رکھنا
۷۴۔ حفظ الحرم یعنی محرمات سے بچنا
۷۵۔ خدام (نوکرچاکر) کے ساتھ نیک برتاؤ۔
۷۶۔ توفیقِ خیر کی طلب
۷۷۔ حفظ التحقیق
۷۸۔ ہمسایہ کے حقوق کی پاسداری
۷۹۔ دوستوں کے حقوق کی پاسداری
۸۰۔ غلاموں کے ساتھ نیک سلوک
۸۱۔ راستہ سے موذی چیزوں کو ہٹانا اور یہ ان کا درجۂ اُولیٰ ہے۔

ف : جوبھی ایمان کے شعبوں کی تکمیل کرتا ہے وُہ اللہ تعالیٰ کے وعدۂ کرم کو پائے گا بلکہ اس سے کمال ارکان حاصل کرے گا جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولٰئك لھم الامن وھم مھتدون۔
(وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کو برائیوں سے نہ ملایا تو ان لوگوں کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں)

تفسیر عالمانہ

وَ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ تلك مبتدأ ہے اس کی خبر اس کا مابعد ہے یہی وُہ سورۃ ہے جو قرآنی آیات ہیں جن کا اعجاز ظاہر ہے اور صحیح یہ ہے کہ

یہ کلامِ الٰہی ہے۔ اگر یہ کلامِ الٰہی نہ ہوتا تو کفارِ عرب اس جیسا کلام لانے کی قدرت رکھتے اور اس کے معارضہ سے عجز کا اظہار نہ کرتے۔

حلِ لغات: المبین، ابان سے ہے بمعنے بان یا اظہر۔ یا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ احکامِ شرعیہ اور ان کے متعلقات کو ظاہر کرنے والا ہے۔

تفسیرِ صوفیانہ اس میں اشارہ ہے کہ حروفِ مقطعہ اسی سورت کے ہوں یا دوسری سورتوں کے، یہ از قبیل حروف مخلوقہ نہیں بلکہ یہ قدیم کتاب مبین کی آیات سے ہیں اس لیے کہ ان کا ہر حرف آیاتِ قرآنیہ کی طرح کثیر معانی پر دلالت کرتا ہے۔

تفسیرِ عالمانہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ یہاں پر لفظ لعل۔ اشفاق یعنی اظہارِ خوف کے لیے ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ اس صفت سے منزّہ ہے اس لیے اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوگی۔

حلِ لغات: اہلِ لغت بخع نفسہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی غم کی وجہ سے اپنے آپ کو ختم کر ڈالے۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

حدیث شریف اتاھم اھل الیمن ھم ارق قلوبا وا بخع طاعۃ۔

یعنی حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اہلِ یمن حاضر ہوئے ان کا حال یہ تھا کہ وہ رقیق القلب اور طاعت میں جان پر کھیل جانے والے تھے (یعنی طاعتِ خداوندی میں اپنے نفوس پر اتنی سختی کرتے تھے کہ اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتے تھے)۔

بخع کی تحقیق دراصل بخع ذبح کے اس مقام کو کہتے ہیں جو چھری پھیرنے کا آخری حصّہ ہے۔ یعنی بخاع تک چھری کا پہنچ جانا۔ اور بخاع بالکسر نخاع کے علاوہ پیٹھ کی ایک رگ کا نام ہے، نخاع (بالنون) ایک دھاگا نما رگ ہے جو فقار کے جوف میں واقع ہے۔ وہ دماغ سے نیچے اُترتی ہے پھر اس سے جسم میں رگیں پھیلتی ہیں۔

اب معنیٰ یہ ہُوا کہ اے حبیبِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ اپنے اوپر شفقت کیجئے اور بلا وجہ حزن سے اپنے آپ کو نہ ماریئے۔

ف: اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ترکِ تاسّف کی ترغیب، صبر کی تلقین اور تسلّی ہے۔

کاشفی کا بیان جناب کاشفی مرحوم نے فرمایا کہ جب قریش نے قرآن کو ٹھکرایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انتہائی خواہش تھی کہ یہ لوگ ایمان لے آئیں اور ان کا انکار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناگوار تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ تسلی کیجئے جان کی بازی نہ لگائیے۔

اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۝ یہ کہ وُہ ایمان نہیں لاتے۔ یہ مفعول لہ ہے اور اس کا مضاف محذوف ہے۔ دراصل عبارت یُوں تھی:

خیفۃ ان لا یؤمن قریش۔ یعنی آپ اس خوف سے جان کی بازی لگا رہے ہیں کہ قریش ایمان نہیں لا رہے۔ ایسے موقعہ پر خوف و حُزن غیر مفید ہوتا ہے جب کہ ان کے لیے مقدر ہو چکا ہے کہ وُہ ایمان نہیں لائیں گے یہ ایسے ہے جیسے تم آزما چکے ہو کہ ان کو قرآن مجید کی نصیحتیں کوئی فائدہ نہیں دیتیں فلہذا آپ غم نہ کھائیے۔

ف: کشف الاسرار میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا کہ اے محبوب! یہ لوگ بیگانے اور میرے قہر و غضب کے مارے ہوئے اور راندۂ درگاہ ہیں فلہذا آپ ان کے ساتھ دل نہ لگائیے اور نہ ہی ان کے انکار پر تشویش کیجئے انہیں ہمارے حکم کے سپرد کر دیجئے اور خود میرے ساتھ مشغول ہو جائیے۔

تفسیر صُوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ادب سکھایا ہے کہ آپ اپنی اُمّت پر شفقت و رحمت میں اس حد تک نہ بڑھ جائیے جس سے آپ مشقت میں پڑ جائیں اور پھر اس طرح سے آپ زیادہ تر انہی کے ساتھ منسلک ہو جائیں گے۔ اور یہ آپ کے شایانِ شان نہیں نیز اس میں تفریط سے بھی روکا گیا ہے آپ اپنی امت کے لیے سخت دل بھی نہ ہوں۔ بہرحال اعتدال کا درس دیا گیا ہے تاکہ آپ خالق سے بھی واصل رہیں اور مخلوق میں بھی شاغل ہے

۱ ترا مہر حق بس ز جملہ جہاں
برو از نقوش سوے سادہ باش

۲ بہار و خزاں را ہمہ در گزر
چو سرو سہی دائم آزادہ باش

(ترجمہ): (۱) تجھے لطفِ حق جملہ جہان سے کافی ہے ماسوی اللہ کے نقوش سے فارغ ہو جا۔
(۲) بہار و خزاں دونوں سے گزر جا، سرو سہی کی طرح ہمیشہ آزاد رہ۔

ربط: اب بیان فرماتے ہیں کہ ان کے ایمان کو مشیّتِ ایزدی سے کوئی تعلق نہیں۔

تفسیر عالمانہ اِنْ نَّشَاْ اگر ہم چاہیں نُنَزِّلْ عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَةً ان پر آسمان سے کوئی آیۃ نازل فرمائیں جو دلیل بن کر انہیں ایمان پر مجبور کرے۔ جیسے

ملائکہ کا نزول ۔ یا آفت جو انھیں تباہ و برباد کر ڈالے ۔ جیسے آثارِ قیامت کا کوئی نشان ۔ فَظَلَّتْ تو ہو جائیں اور ڈھلک جائیں پھر تم سمجھو گے اَعْنَاقُهُمْ ان کی گردنیں ہو جائیں لَهَا ان آیات کے لیے خٰضِعِيْنَ۝ جھکنے والی ۔ پھر ان میں کوئی ایک ایسا نہ ہو گا جس کا قلب معصیت کی طرف مائل ہو ۔ لیکن ہم ایسا نہیں کرتے کیونکہ اس ایمان کا کوئی اعتبار نہیں جو قہر و غلبہ سے مجبور کر کے منوایا جائے ۔ جیسے قیامت کے دن ان کا ایمان لانا۔[1]

ف : یہ عبارت دراصل فظلوا لہا خٰضعین تھی اس لیے کہ خضوع درحقیقت اصحاب اعناق کی صفت ہے ۔ لیکن اسے اعناق کی صفت بنایا گیا ہے تاکہ بات زیادہ سے زیادہ ذہن نشین ہو کہ جب محل خضوع کا حال ہے تو صاحبِ حال اس کا زیادہ مستحق ہے ۔

ف : ظلیت کی خبر حال یعنی خاضعین کی وجہ سے کی گئی ہے ۔

تفسیر صوفیانہ اس میں اشارہ ہے کہ ایمان و معرفت عطائے خاص ہے جس میں درحقیقت کسب مخلوق کو کسی قسم کا دخل نہیں ۔ جب عطائے الٰہی دستگیری فرماتی ہے تو پھر انذار و بشارت نفع بخشتی ہے ورنہ وہ اپنی بدبختی پر ماتم کرے جسے شقاوۃ نے گھیر لیا ہے ۔

حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ نے فرمایا : ؎

چوں حسن عاقبت نہ برندی و زاہدیست
آں بہ کہ کار خود بعنایت رہا کنند

(ترجمہ : جب کسی کو حسنِ عاقبت اور زُہد نصیب نہ ہو تو اسے چاہیئے کہ وُہ اپنا کام عنایتِ الٰہی کے سپرد کرے)

تفسیر عالمانہ وَمَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ اور ان کے ہاں قرآنی نصائح میں سے کوئی نصیحت نہیں آئی یا قرآن مجید کا کوئی حصہ نہیں آیا جو انہیں مکمل طور پر نصیحت کرتا اور کامل وجہ سے متنبہ کرتا ۔

سوال : قرآن کی نصیحت اور اس کے حصہ کو ذکر سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے ؟

---

[1] اسی لیے اعلٰحضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ نے فرمایا : ؎

آج لے اُن کی پناہ آج مدد مانگ اُن سے
پھر نہ مانیں گے کبھی قیامت میں اگر مان گیا

جواب : مبالغہ کے طور پر کہ قرآن کی ہر آیت اور اس کا ہر مضمون بجائے خود ذکر ہے۔
مِّنَ الرَّحْمٰنِ رحم والے خدا تعالیٰ سے بذریعہ وحی، جو اپنے نبی علیہ السلام کے ہاں بھیجتا ہے۔
ف : صفت رحمٰن لانے میں اشارہ فرمایا کہ قرآنی نصائح بھیجنا اس کی رحمت کی دلیل ہے جو وہ اپنے بندوں پر فرماتا ہے۔
مُحْدَثٍ (نیا۔)
سوال : یہ لفظ دلالت کرتا ہے کہ قرآن حادث مخلوق ہے۔
جواب : چونکہ اس کا نزول تکرار تذکیر اور عجیب طرز سے ذہنوں میں بٹھانے کے لیے ہوتا ہے اس لیے اس کا یہ نزول حدوث پر دلالت نہیں کرتا۔
اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ○ مگر ہیں یہ روگردانی کرنے والے۔ یعنی ہر نزول پر اس ذکر سے روگردانی کرتے اور ایمان سے منہ موڑتے اور اپنے طرز کفر پر دائماً اصرار کرتے رہتے ہیں۔
ف : یہ استثناء مفرغ اعم الاحوال سے ہے اور اس کا منصوب ہونا علی الحالیۃ ہے یعنی مایأتیھم کے مفعول کا حال ہے۔ اس میں قد محذوف ہے اور کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے جیسا کہ نحویوں کا خلاف مشہور ہے۔
اب معنیٰ یہ ہوا کہ ان کے ہاں جس وقت بھی ذکر آتا ہے ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں فَقَدْ كَذَّبُوْا اعراض کے بعد پھر وہ اس ذکر کی تکذیب کرتے ہیں۔ فاء تعقیب کے لیے ہے یعنی کبھی اسے سحر سے تعبیر کرتے ہیں کبھی شعر سے، اور کبھی اسے بناوٹی باتیں بتاتے ہیں فَسَيَاْتِيْهِمْ سوعنقریب ان کے ہاں بلا خلاف اور یقیناً آئیں گی۔ یہ فاء سببیہ ہے یعنی بہ سبب ان کے اعراض کے بعد تکذیب کے جو ان سے استہزاء کا سبب بنا ہے اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ قرآن کی وہ خبریں جن کے ساتھ یہ استہزاء کرتے ہیں یعنی وہ عاجلہ یا آجلہ سزاؤں میں مبتلا ہوں گے جن کا انہیں مشاہدہ ہوگا اور یقین کریں گے کہ قرآن مجید نے جو کچھ بتایا تھا وہ حق اور سچ ہے، اور ہم جو کچھ کہتے تھے وہ سراسر باطل ہے اور قرآن مجید اس لائق تھا کہ ہم اس کی تصدیق کرتے، اس کی تعظیم بجا لاتے اور اس کی قدر و منزلت کو مانتے۔ اس کی تکذیب کرنے اور احترام نہ کرنے کے باعث ہمیں یہ وقت دیکھنا پڑا۔ لیکن اب یہ اس کی خبروں پر کان نہیں دھرتے۔
ف : اس میں انہیں سخت ترین عذاب سے ڈرسنایا گیا ہے۔ اسی لیے نبا ہر اس خبر کو کہا جاتا ہے جو عظیم الشان ہو اور اس میں کوئی بڑا واقعہ رونما ہونے والا ہو۔
ف : کاشفی مرحوم نے فرمایا تکذیب کے نتائج کے ظہور کے بعد پشیمانی مفید نہیں ہوتی ابھی سے انسان کو سمجھ جانا

چاہیے ورنہ کل پریشانی ہوگی جس سے کوئی فائدہ مرتب نہ ہوگا۔

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا او کا ہمزہ استفہام انکار توبیخی اور واؤ عاطفہ ہے اس کا عطف فعل مقدر پر ہے جیسا کہ مقام کا تقاضا ہے کہ دراصل افعل المکذبون من قریش ہے یعنی مکذبینِ قریش نے جو کچھ تکذیب و اعراض استہزاء کا ارتکاب کیا انہوں نے نہ دیکھا اِلَی الۡاَرۡضِ زمین کے ان عجائبات سے جو انہیں ان کے غلط کردار سے روکنے والے ہیں اور ان کے وہ کردار جنہوں نے انہیں اعراض و روگردانی وغیرہ پر اُبھارا کَمۡ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا ہم نے اس میں کس قدر (پھل پھول اور نباتات وغیرہ) اگائے ہیں جبکہ وہ بالکل ویران اور بیکار ہے مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍ كَرِيۡمٍ ○ ہر قسم کے اچھے اچھے گھاس و انگوری اور پھول، گل نسرین، بنفشہ، یاسمین، رنگارنگ شگوفے، عجیب و غریب نباتات نافعہ جسے لوگ اور جانور کھاتے ہیں۔

ف : اہلِ تفاسیر فرماتے ہیں کہ لفظ کم خبریہ منصوبہ بما بعدہا علی المفعولیۃ، محاط بہ کی کثرت پر دلالت کرتا ہے کہ نباتات وغیرہ کے جوڑے بکثرت ہیں۔ اور لفظ کل اگرچہ محیط ہر شے ہے لیکن یہاں اس سے مطلق کثرت مراد ہے۔

ف : زوج یعنے صنف قسم مراد ہے اور یہ کم کی تمیز ہے اور کریم بمعنے پسندیدہ اور محمود شے۔ مثلاً کہا جاتا ہے :

وجہ کریم یعنی وہ چہرہ جس کا حُسن و جمال مرغوب ہو۔

اور کہتے ہیں :

کتاب کریم۔ یعنی وہ کتاب جس کے معانی و فوائد محبوب ہوں۔

اور فارس کریم یعنی وہ جس کی شجاعت اور جنگجوئی پسندیدہ ہو۔

اب معنی یہ ہُوا کہ زمین کی نباتات وغیرہ کثیر ہیں جن کے فوائد کثیر اور مرغوب ہیں جنہیں ہم نے اگایا۔

سوال : نباتات نافعہ کے ذکر کی تخصیص کیوں، حالانکہ نباتاتِ ضرر رساں بھی تو اسی زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔

جواب : اگرچہ ہر نبات اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے لیکن انسان کو نافع نعمت محسوس ہوتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا اظہار اپنی نباتات نافعہ سے فرماتا ہے۔

تفسیر صُوفیانہ جیسے اللہ تعالیٰ نے ظاہری زمین میں نباتات نافعہ پیدا فرماتا ہے ایسے ہی قلوبِ عارفین کی زمین میں عجیب و غریب نباتات وغیرہ پیدا فرماتا ہے جیسے ایمان، توکل، یقین، اخلاص، اخلاقِ کریمانہ۔ جیسا کہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے فرمایا :

لا الٰہ الا اللہ ینبت الایمان کما ینبت البقل۔

(لا الٰہ الا اللہ ایمان کو ایسے اگاتا ہے جیسے پانی سبزی کو)

ف : حضرت ابوبکر بن طاہر رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زمین کی نباتات میں سے مکرم تر جوڑا آدم و حوا علیٰ نبینا و علیہما السلام ہیں کیونکہ یہ دونوں انبیاء و رسل اور اولیاء و عارفین علیٰ نبینا و علیہم السلام کے ظہور کے سبب ہیں۔

ف : شعبی نے فرمایا کہ زمین کی انگوری میں سے جو بہشت میں داخل ہوئی وہ کریم ہے اور جو دوزخ میں داخل ہوئی وہ لئیم ہے۔

تفسیر عالمانہ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ بے شک اس انبات مذکور میں یعنی ان کی ہر ایک قسم میں لَاٰیَةً ط عظیم نشانی ہے جو اگانے والے کی کمال قدرت اور اس کے دفور اور اس کی وسعت رحمت پر دلالت کرتی ہے وہ ایمان کی موجب کفر سے روکنے والی ہے وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوم کے اکثر لوگ ایسے ہیں مُّؤْمِنِیْنَ ○ جو ایمان لانے والے نہیں باوجودیکہ ان کے سامنے دلائل روشن اور واضح موجود ہیں اس لیے کہ وہ کفر و ضلالت کی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اور گمراہی جہالت میں منہمک ہیں۔

ف : سیبویہ کے نزدیک لفظ کان صلہ ہے کیونکہ اگر اسے اپنے معنیٰ پر باقی رکھا جائے تو معنی ہوگا کہ ان کے اکثر اللہ تعالیٰ کے علم و قضا میں مومن نہیں تھے تو اس سے وہم پیدا ہوگا کہ وہ لوگ ایمان نہ لانے سے معذور تھے، کیونکہ ظاہری معنیٰ کا تقاضا یہی ہے اور یہ مذہب حق کے خلاف ہے۔ اور اگر ایسی بات ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے ایمان کے موجبات کا بیان کرنا عبث ہوگا۔

صاحب روح البیان کی تحقیق فقیر (اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ) کہتا ہے کہ ان نشأ ننزل الخ اور اس قسم کی دوسری آیات دوسرے معنیٰ کی تائید کرتی ہیں اور اس سے ان کی معذوریت لازم نہیں آتی کیونکہ انہوں نے اپنا اختیار کفر و معصیت میں صرف کردیا اور ازل میں اللہ تعالےٰ کے علم میں ان کا کافر ہونا ان کے اختیار کی وجہ سے تھا۔

ف : عدمِ ایمان کی نسبت ان کے اکثر کی طرف اس لیے کی گئی ہے کہ ان کے بعض کے متعلق ایمان مقدر تھا جو بعد کو مسلمان ہوئے۔

وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ○ع اور بے شک وہ پروردگار عزیز یعنی کافروں سے انتقام لینے پر قادر اور غالب ہے۔ الرحیم بہت بڑا رحم والا ہے اسی لیے انہیں مہلت دیتا ہے اور جرائم پر اچانک ان کی گرفت نہیں فرماتا۔

نکتہ : کشف الاسرار میں ہے کہ اہلِ ایمان پر رحم فرماتا ہے کیونکہ وہ قلیل ہیں جو ان کی کثرت سے جدا ہوئے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ وُہ اپنے غلبہ و قدرت سے سرکش دشمنوں کے لیے قہر اور اپنے لطف و رحمت سے جذباتِ عنایت کے ساتھ اپنے اولیاء کی دستگیری فرماتا ہے۔

حکایت حضرت سری سقطی قدّس سرّہٗ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں اپنے شہر کی جامع مسجد میں وعظ کر رہا تھا کہ دورانِ تقریر ایک حسین و جمیل نوجوان بہترین لباس پہنے آیا اس کی معیت میں اور نوجوان بھی تھے۔ میں اس وقت کہہ رہا تھا تعجب ہے کہ بندہ ضعیف ہو کر اپنے مالکِ قوی کی نافرمانی کرتا ہے۔ میرے ان الفاظ سے اس نوجوان کا چہرہ متغیر ہو گیا اور پیچھے کو ہٹ گیا۔ دوسرے روز پھر وہی نوجوان دورانِ تقریر آیا اور السلامُ علیکم کہہ کر دوگانہ پڑھنے لگا۔ فراغت کے بعد مجھے کہنے لگا: اے سری سقطی! میں نے کل آپ سے سُنا تھا کہ اس ضعیف پر تعجب ہے جو قوی کی نافرمانی کرتا ہے، اس کا کیا معنیٰ ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے قوی تر اور بندے سے ضعیف تر اور کون ہے، جبکہ بندہ اپنے پروردگار کی نافرمانی کرتا ہے۔ یہ سُن کر وُہ نوجوان اُٹھ کر چلا گیا۔ پھر تیسرے روز حاضر ہُوا اس پر دو سفید کپڑے تھے لیکن آج تھا اکیلا۔ اور آ کر مجھ سے پُوچھا، اے سری سقطی! بتائیے اللہ تعالیٰ کے ملنے کا راستہ کون سا ہے؟ میں نے اسے کہا: اگر تو عبادت کرنا چاہتا ہے تو کثرت سے روزے رکھ اور رات کو نوافل پڑھا کر۔ اگر اللہ تعالیٰ کو ملنا چاہتا ہے تو ماسوی اللہ کو ترک کر، امید ہے واصل باللہ ہو جائے گا، اور یہ وصول مساجد و محاریب و مقابر سے ہی حاصل ہوگا۔ یہ سُن کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور کہتا جا رہا تھا: بخدا! میں سخت ترین راہ طے کرنے جا رہا ہوں۔ چند دنوں کے بعد بہت سے نوجوان میرے ہاں آئے اور پُوچھا: احمد بن یزید الکاتب کا کیا بنا؟ میں نے کہا: میں اسے تو نہیں جانتا، ہاں البتہ چند روز پہلے ایک وجیہ نوجوان آیا تھا اور میرے اور اس کے درمیان فلاں فلاں باتیں ہُوئیں لیکن مجھے یہ علم نہیں کہ وہ گیا کہاں۔ انہوں نے کہا: آپ کو اپنے پیدا کرنے والے کی قسم! اگر آپ کو اس کا کوئی سراغ مل جائے تو ہمیں ضرور مطلع کیجئے۔ چند سال یوں ہی بیت گئے۔ ایک رات اسی نوجوان نے عشاء کی نماز کے بعد میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے کہا: آجائیے۔ جب وہ اندر آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک پھٹی پرانی کملی اس کے جسم سے لپٹی ہوئی ہے اور دوسری چادر کی طرح بندھی ہُوئی ہے اور ایک گدڑی اس کے پاس ہے جس میں کھجور کی گٹھلیاں تھیں۔ آتے ہی میری دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دے کر مجھے کہا: اے سری سقطی! اللہ تعالیٰ آپ کو جہنم کی آگ سے دُور رکھے آپ نے مجھ پر احسان کیا کہ مجھے دنیا کی قید سے آزاد کیا۔ میں نے اپنے ساتھی کے ذریعہ اس کے گھر والوں کو مطلع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی بیوی چھوٹا بچّہ اٹھائے وہاں پہنچ گئی اس کے ساتھ اور بھی بہت سے نوجوان تھے۔ عورت نے آتے ہی بچّہ اس نوجوان کی گود میں پھینک دیا جو بہترین کپڑوں میں ملبوس اور زیورات سے لدا ہوا تھا۔ وہ عورت کہتی تھی: تونے جیتے جی مجھے بے شوہر اور بیٹے کو یتیم

بنا دیا ۔ یہ سُن کر اس نوجوان نے میری طرف دیکھ کر کہا : اے سری سقطی ! اس کا کیا جواب دوں ؟ پھر اپنی عورت کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا : بخدا تو میرے دل کا ثمرہ اور جگر کی محبوبہ ہے اور یہ بچہ بھی میری عزیز ترین متاع ہے ۔ لیکن مجھے اسی بزرگ (سری سقطی) نے بتایا کہ جب تک ماسوا کو ترک نہ کرو گے اللہ تعالیٰ کو نہیں مل سکتے ۔ اس کے بعد بچے کے کپڑے اور زیورات اتار کر عورت کو دیکھ کر کہا کہ یہ غریبوں مسکینوں اور بھوکوں میں بانٹ دو ۔ پھر اپنی کملی سے تھوڑا سا کپڑا پھاڑ کر بچے کو لپیٹا ۔ عورت نے کہا : میں بچے کو ایسی حالت میں نہیں دیکھنا چاہتی ۔ فوراً بچے کو شوہر سے لے لیا ۔ نوجوان نے دیکھا کہ عورت بچے کے پیار میں مشغول ہے ، وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا : آج رات کی عبادت تم نے ضائع کر دی ۔ چلتے ہوئے کہنے لگا : اللہ حافظ ۔ عورت اپنے شوہر کے فراق میں دھاڑیں مار کر رونے لگی اور جاتے وقت کہا : اے سری سقطی ! پھر اگر آپ کو اس کے متعلق کبھی علم ہو تو مجھے ضرور آگاہ کرنا ۔ میں نے کہا : اِن شاءاللہ تعالیٰ ۔ چند دنوں کے بعد ایک بڑھیا میرے پاس آئی اور کہا : اے سری سقطی ! شونیزیہ میں ایک نوجوان آپ کو یاد کر رہا ہے ۔ میں وہاں گیا ، دیکھا کہ وہی نوجوان اینٹ سرہانے رکھ کر لیٹا ہوا ہے ۔ میں نے کہا : السلام علیکم ۔ اُس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے آنکھیں کھول کر کہا : میرے پچھلے گناہ بخشے گئے یا نہیں ؟ میں نے کہا : ضرور بخشے گئے ہوں گے ۔ کہا : مجھ جیسے مجرم کے گناہ بخشے گئے ہوں گے ! حالانکہ میں سرتاپا گناہوں میں غرق ہوں ۔ میں نے کہا : گناہوں میں غرق ہونے والوں ہی کو تو وہ نجات دینے والا ہے ۔ اس نے کہا : مجھ پر لوگوں کے حقوق ہیں ۔ میں نے کہا : حدیث شریف میں ہے :

انہ یؤتی بالتائب یوم القیامۃ ومعہ خصومہ فیقال لھم خلوا عنہ فان اللہ تعالیٰ یعوضکم ۔

(اللہ تعالیٰ نے جس کی توبہ قبول کر لی ہوتی ہے تو قیامت میں جب اسے لایا جائے گا اور اس سے حقوق کا مطالبہ کرنے والے بھی ہوں گے ، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اسے چھوڑ دو اس کے جملہ حقوق میں خود ادا کرتا ہوں)

پھر مجھے کہا : اے سری سقطی ! میرے پاس چند دراہم ہیں جو میں نے گٹھلیاں بیچ کر جمع کئے ہیں آپ پر لازم ہے کہ ان سے میری تجہیز و تکفین کریں ، اور میرے گھر والوں کو خبر نہ دینا تاکہ وہ حرام کے مال سے میری تجہیز و تکفین نہ کر ڈالیں ۔ میں تھوڑی سی دیر اس کے پاس بیٹھا پھر آنکھ کھول کر کہا : لمثل ھذا فلیعمل العاملون یعنی اس جیسے عمل کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ عمل کریں ۔ یہ کہہ کر وہ فوت ہو گیا ۔ میں نے اس کے دراہم لے کر بازار سے اس کی تجہیز و تکفین کا سامان خریدا ، لوٹا تو لوگ جوق در جوق آ رہے تھے اور کہہ رہے تھے : اللہ کا ولی فوت ہو گیا ، جلدی چلو ، اس کی نمازِ جنازہ میں شرکت کرو ۔ میں نے اُسے غسل دیا پھر کفن دے کر نمازِ جنازہ

(باقی ص ۱۸۰ پر)

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۙ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ ○
قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۭ○ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ
فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ○ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۚ○ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا
بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ○ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ○
اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۭ○ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ
عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۙ○ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ○ قَالَ فَعَلْتُهَآ
اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ۭ○ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّ
جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۭ○
قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۭ○ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ
كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ○ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ○ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ
الْاَوَّلِيْنَ ○ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ○ قَالَ رَبُّ
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰــهًا
غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ○ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ۚ○ قَالَ فَاْتِ
بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۚ○ وَّنَزَعَ يَدَهٗ
فَاِذَا هِىَ بَيْضَاۗءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ○

ترجمہ: یاد کیجئے جب تمہارے رب نے موسیٰ کو پکارا یہ کہ ظالم لوگوں کے پاس جائیے جو فرعون کی
قوم ہے کیا وہ ڈرتے نہیں۔ عرض کی اے میرے پروردگار! میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے
اور میرا سینہ تنگ ہو جاتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی تو تو ہارون کو میرے ساتھ بھیج اور ان کا
مجھ پر ایک الزام ہے سو مجھے خوف ہے کہ کہیں وہ مجھے قتل کر دیں فرمایا ہرگز نہیں ہوگا سو تم دونوں میری
آیات لے کر جاؤ بے شک ہم تمہارے ساتھ سنتے ہیں سو تم فرعون کے پاس جا کر کہو کہ ہم دونوں اس
کے رسول ہیں جو سارے جہان کا پروردگار ہے یہ کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔ کہا
کیا ہم نے تمہیں بچپن میں نہیں پالا تھا اور تو نے ہمارے ہاں اپنی عمر کے کئی برس بسر کئے اور تو نے
کیا اپنا وہ فعل جو تو نے کیا اور تو ناشکر تھا۔ فرمایا میں نے وہ کام کیا تھا جبکہ مجھے بے خبری تھی سو میں
تمہارے ڈر سے تمہارے یہاں سے نکل گیا پھر میرے رب نے مجھے حکم عطا فرمایا اور مجھے پیغمبروں

میں شامل فرما دیا اور یہ بھی کوئی نعمت ہے جس کا تو مجھے احسان جتلا رہا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا فرعون نے کہا رب العالمین کیا ہے فرمایا وہ آسمانوں اور زمین اور جو ان کے درمیان ہے ان سب کا پروردگار ہے اگر تمہیں یقین ہو اپنے ارد گرد والوں کو کہا کیا تم سُن نہیں رہے موسٰی نے فرمایا اور وہ تمہارا اور تمہارے پہلے بڑوں کا رب ہے فرعون نے کہا تمہارا یہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے بے عقل ہے موسٰی نے فرمایا وہ مشرق و مغرب اور جو ان کے درمیان ہے ان سب کا رب ہے اگر تم عقل رکھتے ہو فرعون نے کہا اگر تُو نے میرے سوا کسی دوسرے کو خدا ٹھہرایا تو میں تجھے قیدیوں میں بنا دوں گا فرمایا اگرچہ میں تیرے پاس کوئی روشن چیز لاؤں کہا لائیے اگر تو سچا ہے تو موسٰی نے اپنا عصا ڈال دیا تبھی تو وہ نمایاں اژدہا بن گیا اور اپنا ہاتھ نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے لیے چمکدار ہو گیا۔

(بقیہ صفحہ ۱۷۸) پڑھا کر دفن کر دیا تھوڑی دیر کے بعد اس کے گھر والے پہنچ گئے اور پوچھا کہ ہمارے نوجوان کا کوئی اتا پتا دیجئے۔ میں نے کہا وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ یہ سن کر اس کی بیوی آٹھ آٹھ آنسو روئی۔ پھر میں نے اس کا حال سُنایا۔ مجھ سے اس کی قبر کے بارے میں پُوچھا۔ میں نے کہا مجھے خطرہ ہے کہ تم اس کی قبر کھود کر اس کو نیا کفن دو گے۔ عورت نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہرگز نہ ہونے دے گی۔ میں نے اس کی قبر دکھائی۔ وہ دھاڑیں مار کر روئی اور کہا دو گواہ لاؤ۔ دو گواہ لائے گئے۔ اس نے گواہوں کے سامنے کہا گواہ ہو جاؤ کہ میں نے اس کی تمام کنیزیں آزاد کر دیں اور اس کا جملہ مال راہِ خدا میں تقسیم کر دیا۔ یہ کہہ کر اس کی قبر سے چمٹ گئی اور وہیں جان دے دی۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں پر رحم فرمائے ؎

چوں کند کحل عنایت دیدہ باز
ایں چنیں باشد بدنیا اہل راز

ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ کی عنایت کا سُرمہ کسی آنکھ کو بینائی بخشتا ہے تو وہ دنیا میں اس طرح اس کا اہلِ راز بن جاتا ہے۔

تفسیر عالمانہ وَاِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰی اور یاد کرو جب موسٰی علیہ السلام کو تمہارے رب نے ندا دی
اِذ اذکر محذوف کی وجہ سے منصوب ہے۔

حلِ لغات المناداۃ والنداء بمعنے آواز بلند کرنا۔ یہ الندی سے ہے بمعنے رطوبت۔ آواز کے لیے استعارہ کیا گیا ہے اس لیے کہ جس کے منہ میں رطوبت بہت زیادہ ہوتی ہے اس کے

کلام میں حُسن و حلاوت پائی جاتی ہے۔ اسی لیے وہ شخص فصیح ہوتا ہے۔

اب معنی یہ ہُوا اے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم! اپنی قوم کو وُہ وقت یاد دلائیے جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو شجرہ کی شب نار دیکھنے پر گفت گو فرمائی جب وہ مدین سے گھر لوٹ رہے تھے۔ یا انہیں موسیٰ علیہ السلام کا وُہ دور یاد دلائیے جب فرعون کی قوم نے تکذیب کی، اور ڈرائیے کہ کہیں ان کے ساتھ بھی وہی نہ ہو جو ان کے ساتھ ہوا۔ اَنِ ائۡتِ الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ۝ یہ کہ تشریف لے جائیے اس قوم کے ہاں جنہوں نے کفر و معاصی کے ارتکاب سے اور بنی اسرائیل کو غلام بنا کر اور ان کے بچّوں کو قتل کر کے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ قَوۡمَ فِرۡعَوۡنَ القوم الظالمین سے بدل ہے۔

سوال : قوم ظالم تھی اور فرعون اظلم تھا۔ پھر صرف قوم کے ذکر کا کیا معنی؟

جواب : چونکہ اس فعل میں وہ سب سے پیش پیش ہونے کی وجہ سے مشہور تھا اسی لیے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں کیونکہ جسے جس فعل پر شہرت حاصل ہو بوجہ شہرت اس فعل کے ذکر کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ف : ان ائت میں ان مفسرہ ہے جو نادٰی کی تفسیر کے لیے آیا ہے بمعنے ای یعنی الاتیان بمعنے آرام سے آنا۔

(اب مطلب یہ ہُوا کہ اے موسیٰؑ! آپ آرام سے ظالم قوم کے ہاں تشریف لے جائیے اَلَا یَتَّقُوۡنَ ۝) یہ جملہ مستانفہ ہے جس کا اعراب میں کوئی محل نہیں۔ الا تحضیض کے لیے ہے جو اس فعل پر برانگیختہ کرتا ہے (جس کے لیے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تاکہ وہ لوگ ڈریں) انھیں تعجب دلانا بھی مطلوب ہے کہ تم لوگ کتنے ظالم اور حد سے متجاوز ہو۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ وُہ اللہ تعالیٰ سے کیوں خوف نہیں کھاتے اور اس پر ایمان لا کر اور اس کی اطاعت کر کے اپنے نفوس سے عذاب و عقابِ خداوندی کو کیوں نہیں ہٹاتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ کیوں نہیں ڈرتے، یعنی انہیں لازم ہے کہ وُہ عذابِ الٰہی سے ڈریں اور کفر سے کنارہ کش ہوجائیں اور بنی اسرائیل کو بھی آزاد کر دیں قَالَ (یہ جملہ مستانفہ ہے اور سوال مقدر کا جواب ہے) گویا کسی نے سوال کیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کیا عرض کیا؟ اس کے جواب میں فرمایا: موسیٰ علیہ السلام نے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کی رَبِّ اے میرے پروردگار! اِنِّیۡۤ اَخَافُ) الخوف معلوم یا مظنون علامات پا کر کسی فعل سے ناگواری کرنا طمع و رجاء کی نقیض ہے یعنی طمع و رجاء بمعنے معلوم یا مظنون علامات پا کر کسی فعل سے محبت کرنا۔ (بے شک مجھے خوف ہے اَنۡ یُّکَذِّبُوۡنَ ۝ کہ وہ میری نبوت کی تکذیب اور میری بات کی سماعت سے انکار کر دیں گے۔

سوال : انبیاء علیہم السلام تو سوائے خدا کے اور کسی سے ڈرتے ہی نہیں لیکن یہاں موسیٰ علیہ السلام قومِ فرعون کے پاس جانے سے گھبرا رہے ہیں۔

جواب : بعض کبار نے فرمایا کہ وُہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم فرعون پر شفقت کرتے ہوئے گھبرا رہے تھے (کہ اگر میں ان کے ہاں چلا گیا اور انہوں نے میری نبوت کا انکار کر دیا تو ان پر عذابِ الٰہی نازل ہو جائے گا جیسے سابقہ امتوں میں ہُوا تو پھر کیوں نہ اللہ تعالیٰ سے معذرت کر لوں۔ اس معنی پر موسیٰ علیہ السلام کا ڈرنا اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے تھا۔ اور یہ ان کے رحیم ہونے کی دلیل ہے) [1]

ف : یکذبون دراصل یکذبونی تھا۔ یاءِ متکلم حذف کر دی گئی ہے اس لیے کہ ماقبل کی کسرہ اس کے محذوف ہونے پر دلالت کرے گی اور اس کی ضرورت بھی پُوری کرے گی کیونکہ کسرہ یا ُسے مستغنی کر دیتی ہے۔

وَيَضِيْقُ صَدْرِىْ اور ان کی تکذیبِ نبوّت اور احکامِ شریعت کے انکار سے میرا سینہ تنگ ہو گا (یعنی مجھے غم لاحق ہوگا) اور موسیٰ علیہ السلام میں فطرةً تیزی بھی تھی۔

ف : اس کا عطف اخاف پر ہے۔

وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِىْ اور میری زبان بھی نہ چلے گی بلکہ اس پر جو ثقالت ہے اور بڑھ جائے گی۔ الانطلاق بمعنے کھلنا اور چلنا ہے یہاں پہلا معنیٰ مراد ہے اور لسان عضوِ مخصوص کو کہا جاتا ہے اور اس کی قوت کو بھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

واحلل عقدة من لسانی۔ بمعنے من قوة لسانی۔ (یعنی میری زبان کی قوت کھول دے) اس لئے کہ ثقالت زبان پر نہ تھی بلکہ اس کی قوت پر تھی (یعنی بولنے پہ) (کذا فی المفردات)

ف : اس کا عطف اَخَافُ پر ہے۔

فَاَرْسِلْ سو جبریل علیہ السلام کو بھیجئے **اِلٰى هٰرُوْنَ** ○ ہارون کے ہاں تاکہ وہ تبلیغ میں میرا ہاتھ بٹائیں کیونکہ میری نسبت وہ مجھ سے زیادہ فصیح ہیں۔

ف : ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی تھے۔

یعنی ہارون علیہ السلام کو تبلیغ کے کام میں میرا حامی بنا تاکہ میں اس کو ساتھ لے کر قومِ فرعون کے ہاں جاؤں۔

نکتہ : کسی کی بات نہ ماننا اس کے تنگ دل ہونے کا سبب ہے اور تنگ دلی بولنے پر اثر انداز ہوتی ہے کہ ایسی حالت میں گفتگو کرنا بوجھل ہو جاتا ہے بالخصوص اس کے لیے جس کی زبان میں ثقالت ہو۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ قلب کی تنگی پر روح و حرارت عزیزیہ قلب کے باطن میں منقبض ہو جاتے ہیں۔ جب یہ دونوں

---

[1] اضافہ از اویسی غفرلہٗ

منقبض ہو جائیں تو زبان کی ثقالت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے موسٰی علیہ السلام نے پہلے خوفِ تکذیب کا اظہار فرمایا پھر تنگدلی کا عذر کیا۔ آخر میں زبان نہ چلنے کی عرض کر کے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو تبلیغی امور میں شریک کرنے کی تمنّا کی۔

ف: اگر موسٰی علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کو تبلیغی امور میں شریک کار نہ رکھتے تو ان کی بعثت کا مقصد فوت ہو جاتا۔

ف: موسٰی علیہ السلام کی زبان کی ثقالت کا موجب وہی انگارہ تھا جو آپ نے فرعون کے امتحان کے وقت خود اپنی زبان پر رکھ لیا تھا۔ حضرت عطار قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

ہمچو موسٰی این زمان در طشتِ آتش مانده ایم
طفل فرعونیم ما کان و دہان پر اخگر ست

ترجمہ: ہم اس وقت موسٰی علیہ السلام کی طرح آگ کے طشت میں ہیں اور ہم فرعون کے طفل ہیں ہماری زبان اور منہ میں انگارے ہی انگارے ہیں۔

مُعجزۂ موسٰی علیہ السلام انگارے سے ہاتھ نہ جل سکا۔ یہ بھی معجزہ اور زبان کا جلنا بھی معجزہ، باوجودیکہ وہ جل گئی۔ لیکن جب فرعون کے ہاں تبلیغ کے لیے تشریف لے گئے تو فصاحت میں کوئی فرق نہ آیا (فرعون کا یہ سوچنا ہی تھا کہ جس کی زبان جل گئی اور بولنے کے قابل نہ تھی اب وہ بلا تکلف گفتگو فرماتے ہیں بدقسمتی نے اسے سوچنے کا موقعہ نہ دیا۔ ایسے ہی منکرینِ ولایت کا حال ہے اور ایسے ہی پہلے منکرینِ نبوت کا حال رہا)[1]

عظمتِ نبوت بعض واعظین کہہ دیتے ہیں کہ حضرت موسٰی علیہ السّلام اعلانِ نبوت کے بعد بھی توتلے تھے (یعنی اس انگارے کے جلانے کا اثر موجود تھا)۔ ایسے کہنے والا خطاکار ہے۔

(انتباہ ہمارے دور میں بےادب اور گستاخ لوگ ادّعائے علم وفہم اور دین واسلام کی علمبرداری کے باوجود نبوت کے عظمت و احترام میں کوتاہی کرتے ہیں ان کو انتباہ کیا جائے تو اسے غلو سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن صدیوں پہلے صاحبِ روح البیان ہماری تائید اس طرح فرما گئے[2]:)

قال بعض الکبار ینبغی للواعظ ان	بعض مشایخ نے فرمایا کہ واعظ کو لازم ہے
یراقب اللہ فی وعظہ و یجتنب	کہ وعظ و تقریر میں خدا کا خوف نگاہ میں رکھے

---

[1] و [2] اضافہ از اویسی غفرلہٗ

عن تکلم ما یشین بجمال الانبیاء و بهتك حرماتهم و یطلق السنة العامة فی حقهم و یسیئ الظن بهم والا مقته الله و ملائکته۔

(روح البیان ج ۶ ص ۲۶۶)

کہ اپنے وعظ و تقریر میں ایسی بات منہ سے نہ نکالے جو انبیاء علیہم السلام کے حُسن و جمال میں نقص و عیب کا شائبہ پیدا کر دے یا جس سے ان کی ہتک اور گستاخی کا پہلو نکلتا ہو۔ اس طرح عوام کی زبانیں انبیاء علیہم السلام کے بارے میں نہ رک سکیں گی اور وہ ان (انبیاء) متقین اور ملائکہ کے متعلق بدگمانی کا شکار ہو جائیں گے۔ [1]

---

[1] الحمدللہ یہی ہمارا منشور ہے۔ ہم نجدیوں، وہابیوں، دیوبندیوں، مودودیوں اور دیگر مذاہب باطلہ سے اسی لیے اختلاف رکھتے ہیں کہ ان کی تقریر و تحریر میں انبیاء علیہم السلام کی گستاخی پر نہ صرف اشارہ و کنایہ ہوتا ہے بلکہ واضح توہین اور بے ادبی ہوتی ہے جس کو پڑھ سن کر ادنیٰ سمجھ رکھنے والا بھی خدا سے پناہ مانگتا ہے۔
رہا یہ سوال کہ وہ لوگ دین کا دم بھرتے ہیں، اس کی تردید قرآن مجید میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ منافقین کے متعلق فرماتا ہے:

ومن الناس من یقول اٰمنّا باللہ و بالیوم الاٰخر وما هم بمؤمنین۔

اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے حالانکہ وہ مومن نہیں۔

منہ سے تو یہ سبھی لوگ ایمان دار ہونے کے مدعی ہیں لیکن ان کی عباراتِ ذیل ان کے ایمان کی تصدیق نہیں کرتیں:

باری تعالیٰ کی طرف جھوٹ کی نسبت

"امکانِ کذب سے مراد دخولِ کذب تحت قدرت باری تعالیٰ ہے۔" (فتاویٰ رشیدیہ، ص ۱۹۔ براہین قاطعہ ص ۲۷۵)

افعالِ قبیحہ

"افعالِ قبیحہ کو مثل دیگر ممکنات ذاتیہ مقدور باری جملہ اہلِ حق (علماءِ دیوبند) تسلیم فرماتے ہیں۔"
(جہد المقل، ج ۱، ص ۴۱)

(باقی برصفحہ آئندہ)

وَلَهُمْ اوران لوگوں یعنی فرعونیوں کا عَلَیَّ میرے ذمہ ذَنْبٌ ایک جرم کی سزا اور اس کا موجب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۴) "چوری، شراب خوری، جہل، ظلم سے معارضہ کم فہمی معلوم ہوتا ہے، حالانکہ یہ کلیہ ہے جو مقدور العبد ہے مقدور اللہ ہے۔" (مولوی محمود حسن، اخبار نظام الملک ۲۵ر اگست ۱۸۸۹ء)

علمِ نبی کی تنقیص

"شیطان و ملک الموت کا حال دیکھ کر علم محیط زمین کا فخرِ عالم کو خلاف نصوص قطعیہ کے بلا دلیل محض قیاس فاسدہ سے ثابت کرنا شرک نہیں تو کون سا ایمان کا حصہ ہے۔ شیطان و ملک الموت کو یہ وسعت نص سے ثابت ہوئی۔ فخرِ عالم کی وسعتِ علم کی کون سی نصِ قطعی ہے۔" (براہین قاطعہ مؤلفہ مولوی خلیل احمد مصدقہ مولوی رشید احمد گنگوہی ص ۵۱)

علم کے بعد عمل کی تنقیص

"انبیاء اپنی اُمت سے اگر ممتاز ہوتے ہیں تو علوم ہی میں ممتاز ہوتے ہیں، باقی رہا عمل، اس میں بسا اوقات بظاہر اُمتی مساوی ہو جاتے بلکہ بڑھ جاتے ہیں۔" (تحذیر الناس، مولوی محمد قاسم نانوتوی ص ۴)

انکارِ ختم نبوت

"عوام کے خیال میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم ہونا بایں معنیٰ ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء سابق کے زمانے کے بعد اور آپ سب میں آخری نبی ہیں مگر اہلِ فہم پر روشن ہوگا کہ تقدم یا تاخر زمانہ میں بالذات کچھ فضیلت نہیں۔" (تحذیر الناس ص ۳)

"اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی کوئی نبی پیدا ہو تو پھر بھی خاتمیتِ محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا، چہ جائیکہ آپ کے معاصر کسی اور زمین میں یا فرض کیجئے اسی زمین میں کوئی اور نبی تجویز کیا جائے۔" (تحذیر الناس ص ۲۴)

نوٹ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا آپ کی عظیم الشان فضیلت اور بہت بڑا اعزاز ہے۔ اور خاتم النبیین کا معنیٰ باجماعِ اُمت آخری نبی ہے۔ خود حضورؐ کا مشہور ارشاد ہے:

انا خاتم النبیین لا نبی بعدی۔ (میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں)

(باقی بر صفحہ آئندہ)

یہاں مضاف محذوف ہے اور اس کے قائم مقام مضاف الیہ کو رکھا گیا ہے اس سے قبطی کا قتل مراد ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۵) مگر اس کے سراسر برعکس تحذیر الناس کی پہلی عبارت میں اس اجماعی معنی کو "عوام کا خیال" قرار دے کر ختم نبوت کی اہمیت کو ختم کیا ہے اور پھر "بالذات کچھ فضیلت نہیں" کہہ کر اس کی فضیلت ہی کا انکار کر دیا ہے۔ اور مزید ستم ظریفی یہ کہ دوسری عبارت میں:

"خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا"

لکھ کر ختم نبوت کی بنیاد ہی ختم کر دی کہ چونکہ بقول نانوتوی "خاتم النبیین بمعنی آخری نبی نہیں ہیں اس لیے اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نبی پیدا ہو تو پھر بھی خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا۔" الخ
ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

نیا کلمہ اور درود

دیوبندی حکیم الامت مولوی اشرف علی تھانوی کے ایک مرید نے لکھا کہ "میں پہلے خواب میں اور پھر بیداری میں لا الہ الا اللہ اشرف علی رسول اللہ اور اللھم صل علیٰ سیدنا ونبینا ومولانا اشرف علی پڑھتا ہوں حالانکہ اب بیدار ہوں خواب میں نہیں۔"

اس پر تھانوی صاحب نے اس بدنصیب کو تجدید ایمان و توبہ کی تلقین کی بجائے یہ کہہ کر تسلی دی کہ "جس کی طرف تم رجوع کرتے (اور اس کا کلمہ و درود پڑھتے) ہو وہ متبع سنت ہے۔" (رسالہ الامداد ص ۳۵ صفر المظفر ۱۳۳۶ھ)

نبی کی استادی

"مدرسہ دیوبند کی عظمت حق تعالیٰ کی درگاہ پاک میں بہت ہے۔ صدہا عالم یہاں سے پڑھ کر گئے۔ اور خلق کثیر کو ظلمات ضلالت سے نکالا۔ یہی سبب ہے کہ ایک صالح (دیوبندی) فخر عالم علیہ السلام کی زیارت سے خواب میں مشرف ہوئے تو آپ کو اردو میں کلام کرتے دیکھ کر پوچھا آپ کو یہ کلام کہاں سے آگئی، آپ تو عربی ہیں؟ فرمایا کہ جب سے علمائے مدرسہ دیوبند سے ہمارا معاملہ ہوا ہم کو یہ زبان آگئی۔ سبحان اللہ! اس سے رتبہ اس مدرسہ کا معلوم ہوا۔" (براہین قاطعہ ص ۲۶)

(باقی بر صفحہ ۱۸۷)

جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے سبطی اپنے قومی فرد کے لیے قتل کردیا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۶)

رحمۃٌ للعالمین سے انکار

"استفتاء: رحمۃ للعالمین مخصوص آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ہے یا ہر شخص کو کہہ سکتے ہیں؟
الجواب: لفظ رحمۃ للعالمین صفت خاصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہے بلکہ دیگر اولیاء و انبیاء اور علمائے ربانیین بھی موجب رحمتِ عالم ہوتے ہیں اگرچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے اعلیٰ ہیں۔ لہذا اگر دوسرے پر اس لفظ کو بتاویل بول دیوے تو جائز ہے۔" (فتاویٰ رشیدیہ ج ۲ ص ۹)

○ "حضرت گنگوہی صاحب کو حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب کی وفات کی خبر ملی تو بظاہر یہ معلوم نہ تھا کہ اس قدر محبت حضرت کے ساتھ ہوگی۔ حضرت گنگوہی صاحب کی نسبت بار بار رحمۃ للعالمین فرماتے تھے۔" (افاضات الیومیہ، تھانوی، ج ۱ ص ۱۰۵)

○ "آج نمازِ جمعہ کے موقعہ پر خبر جانکاہ سُن کر دلِ حزیں پر بے حد چوٹ لگی کہ حضرت قبلہ (مفتی محمد حسین) رحمۃ للعالمین دُنیا سے سفرِ آخرت فرما گئے۔" (عزیز الرحمٰن مہتمم مدرسہ امداد العلوم ایبٹ آباد تذکرہ حسن ۲۰۶)

رسول کا حال

"میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے میں محض رسول ہوں۔"
"رسول عاجز بندے ہیں رسولوں کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں ہے۔" (بلغۃ الحیران، مولوی حسین علی، ص ۱۰۲ - ۲۸۴)

رسول کا کمال

"لائق عبادت ایک اللہ تعالیٰ ہے اور رسولوں کا کمال عذابِ الٰہی سے نجات پالینی ہے۔" (بلغہ ص ۲۴۴)

ذرّہ ناچیز سے کمتر

"سب انبیائُ و اولیائُ اس (اللہ) کے رُوبرو ایک ذرّہ ناچیز سے بھی کمتر ہیں۔" (بلغہ ص ۶۸)

(باقی بر صفحہ ۱۸۸)

سوال : انبیاء علیہم السلام تو گناہوں سے معصوم ہیں پھر یہاں ذنب (گناہ) کو موسیٰ علیہ السلام کی طرف کیوں منسوب کیا گیا ہے؟

جواب : چونکہ فرعونیوں کے نزدیک یہ گناہ تھا ان کے گمان کے مطابق ذنب (گناہ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ف : کاشفی مرحوم نے لکھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: ان کا مجھ پر قتل کا دعویٰ ہے یعنی قبطی کے قتل کا، اور وہ ان کے گمان پر میرے ذمہ ایک جرم ہے۔

فَاَخَافُ سو مجھے خوف ہے کہ اگر میں ان کے ہاں اکیلا چلا گیا اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ۝ تو وہ مجھے قتل کر دیں گے قبل اس کے کہ میں انہیں تیرا پیغام پہنچاؤں، اور ہارون کے متعلق ان کا کوئی دعویٰ نہیں۔ (فلہذا یہ ڈیوٹی انہی کے ذمہ لگائیے))

سوال : اولیاءؑ بھی خوف و حزن سے مامون ہوتے ہیں چہ جائیکہ انبیاء علیہم السلام، لیکن یہاں پر موسیٰ علیہ السلام خوف ظاہر کر رہے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۷)

چوہڑے چمار

"ہمارا جب خالق اللہ ہے اور اس نے ہم کو پیدا کیا تو ہم کو بھی چاہیے کہ اپنے تمام کاموں پر اسی کو پکاریں اور کسی سے ہم کو کیا کام؛ جیسے جو کوئی ایک بادشاہ کا غلام ہو چکا ہے تو وہ اپنے ہر کام کا علاقہ اسی سے رکھتا ہے دوسرے بادشاہ سے بھی نہیں رکھتا۔ چمار کا تو ذکر ہی کیا ہے"۔ (بلغہ ص ۲۱)

لرزہ خیز تشبیہ

"آپ کی ذاتِ مقدسہ پر علمِ غیب کا حکم کیا جانا اگر بقولِ زید صحیح ہو تو دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس غیب سے مراد بعض غیب ہے یا کُل غیب۔ اگر بعض علومِ غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور (صلی اللّٰہ علیہ وسلم) کی ہی کیا تخصیص ہے ایسا علمِ غیب تو زید و عمرو بلکہ ہر صبی و مجنون بلکہ جمیع حیوانات و بہائم (چوپایوں) کے لیے بھی حاصل ہے"۔ (حفظ الایمان اشرف علی تھانوی ص ۸)

نوٹ : مذکورہ عبارت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علمِ غیب کو زید و عمرو، بچہ و پاگل اور حیوانات و بہائم کے ساتھ تشبیہ دے کر جس شقاوت و جسارت کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ اویسی غفرلہٗ

جواب : جملہ امور کا دار و مدار قلب پر ہوتا ہے اگرچہ بشری تقاضا پر، اور انسانی طبیعت کے مطابق کسی فعل کا صدور ہو تو حرج نہیں۔ بنا بریں ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا قلب بالکل مطمئن تھا اگر بتقاضائے بشریت خوف کا اظہار فرمایا تو کیا حرج ہے۔

سوال : انبیاء علیہم السلام کو فرمانِ الٰہی پر پس و پیش نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے احکام کی ادائیگی میں حیلہ و حجت پیش کرتے ہیں لیکن موسیٰ علیہ السلام نے حکمِ الٰہی پر کئی اعذار پیش کئے۔ یہ ان کی شانِ نبوت کے خلاف ہے۔

جواب : موسیٰ علیہ السلام عذر نہیں کر رہے ہیں بلکہ آنے والے واقعات و حوادث کے لیے دفاع کے اسباب ظاہر فرما رہے ہیں اور اپنے مالک سے ان اسباب کو عمل میں لانے کا سوال کر رہے ہیں اور یہ کوئی قباحت نہیں۔ (علامہ اسمٰعیل حقی قدس سرہٗ فرماتے ہیں) دراصل بات یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی تلوین کا اظہار فرمایا تاکہ انہیں اپنے مالک سے تمکین نصیب ہو (چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر طرح کی آسائش بخشی اور ان کے تمام خدشات زائل کر دئے۔ چنانچہ فرمایا : **قَالَ** اللہ تعالیٰ نے فرمایا **كَلَّا** کوئی بات نہیں تم اپنے ان امور کو خیال میں نہ لائیے، وہ آپ کو شہید نہیں کر سکیں گے میں ان کو تم پر مسلط نہیں ہونے دوں گا بلکہ الٹا تم ہی ان پر غالب رہو گے **فَاذْهَبَا** سو دونوں بھائی جائیے، جیسا کہ تم ہارون کا ساتھ چاہتے ہو۔ اسے ساتھ لے لو اور اللہ تعالیٰ کا نام لے کر چل پڑو۔)

سوال : اس مکالمہ میں ہارون علیہ السلام تو موجود نہ تھے پھر ان کو خطاب میں کیسے شامل کیا جا سکتا ہے۔

جواب : تغلیب الحاضر علی الغائب کے قبیل سے ہے۔

بِاٰيٰتِنَآ جائیے اور ہماری آیات یعنی نو معجزات بھی ساتھ رکھئے کیونکہ یہی میری قدرت کے دلائل قاہرہ اور حجت نبوت سے ہے اس میں ان آنے والے حوادث کے دفعیہ کی طرف اشارہ ہے **اِنَّا مَعَكُمْ** یہ اسی موعودہ دفعیہ کی علت ہے (اور مزید تسلی بھی کہ اے پیارے کلیم! گھبراتے کیوں ہو جبکہ تم میری حفاظت میں ہو۔ ہر وقت میری مدد تمہارے شامل حال ہو گی۔

سوال : خطاب تو تھا موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو، لیکن یہاں صیغہ جمع کا ہے۔

جواب : یہاں فرعون کو بھی خطاب میں شامل کیا گیا ہے بایں معنیٰ کہ میں تمہارے ساتھ ہوں مدد کے لیے۔ اور فرعون کے ساتھ ہوں اس پر قہر و جبر کے لیے۔

انا معکم مبتدا ہے، خبر ہے **مُّسْتَمِعُوْنَ** ۞ اس مبتدا کی دوسری خبر ہے یا مستمعون انا کی خبر ہے اور معکم ظرف لغو ہے۔

حلِ لغات : الاستماع بمعنے کان لگا کر کسی بات کو سننے کی طلب۔ یعنی کان لگانا۔

سوال : اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا اطلاق ناجائز ہے اور وہ منزّہ ہے کہ کوئی بات اعضاء سے سُنے۔

جواب : یہاں پر استماع سمع کے معنی میں استعارہ کیا گیا ہے یعنی کان لگائے بغیر حروف واصوات کا ادراک (یعنی میں تمہارے اور فرعون کے درمیان میں جو کچھ واقعات ہوں گے میں انہیں سنوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام کے لئے تسلی دی گئی ہے کہ جیسے کوئی کسی مہم کو سر کرنے جائے اور اس کے ساتھ بہت بڑی طاقت خفیہ طور پر مدد کے لئے ہو اور عین موقع پر اس کی اعانت کرے۔)

مسئلہ : اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کی خفیہ طور پر مدد فرماتا ہے جس کے متعلق کسی کو خبر تک نہیں ہوتی اور ان کے مخالفین و اعدا نابود ہو جاتے ہیں۔

مسئلہ : اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کی مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔

ف : یہ استعارہ تمثیلیہ ہے اس میں وجہ شبہ چند امور سے ہیئۃ منتزعہ ہے۔

فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ پس فرعون کے پاس آؤ۔

فرعون کا تعارف فرعون کا نام ولید بن مصعب اور کنیت ابو العباس ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس کا نام مغیث اور کنیت ابو مرہ ہے۔ چار سو سال زندگی پائی تھی۔

فَقُولَا إِنَّا اسے جا کر فرمائیے کہ ہم سب کے سب رَسُولُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ پروردگارِ عالم کے پیغمبر ہیں۔

سوال : بعض نے کہا کہ صرف رسول کیوں نہ کہا۔

جواب : حضرت موسیٰ علیہ السلام مستقل رسول تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام ان کے امدادی تھے جو ان کی رسالت کی تائید و تصدیق کے لیے ساتھ چلے جاتے تھے۔

أَنْ أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ أن مفسرہ ہے۔

سوال : تفسیر اس وقت ہو جب پہلے ارسال مذکور ہو۔

جواب : لفظِ رسول پہلے مذکور ہے اور وہ ارسال کو متضمن ہے۔

سوال : أن مفسرہ کے لیے باب قال یقول کا ہونا ضروری ہے۔

جواب : اِرسال قول کے معنی کو متضمن ہے کیونکہ یہاں تخلیہ و اطلاق کا معنی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے :

ارسلت الکلب الی الصید بمعنے خلھم و شأنھم۔ انہیں اور ان کے شان کو راہ دو تاکہ وہ شام کے علاقہ کو جا سکیں اور وہ ان کے آباء کا مسکن ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیجئے اور ان سے ہاتھ اٹھائیے تاکہ ہم انہیں علاقہ شام کو لے جا سکیں کیونکہ وہ ان کا آبائی مسکن ہے۔

ف : فرعون نے بنی اسرائیل کو چار سو سال تک غلام بنائے رکھا اور وہ اس وقت چھ لاکھ تیس ہزار افراد تھے۔

بہر حال یہ حکم سُن کر حضرت موسیٰ و ہارون علیٰ نبینا و علیہما السلام مصر کی طرف چل پڑے اور فرعون کے دروازے پر جاکر دستک دی۔ رات کا وقت تھا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا مبارک سے دروازہ کھٹکھٹایا تو فرعون کے دربان گھبرا گئے اور پُوچھا آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں پروردگارِ عالم کا رسول ہُوں۔ دربانوں نے جاکر فرعون سے کہا کہ ایک مجنون دروازے پر کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ میں پروردگارِ عالم کا رسول ہُوں۔ فرعون نے آپ کو اندر آنے کی اجازت دے دی جیسا کہ سدی نے کہا ہے، یا یہ ہُوا کہ صبح تک نہ آنے دیا۔ صبح ہوتے ہی اپنے پاس بُلایا۔ جب وہ دونوں فرعون کے پاس پہنچے تو فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو پہچان لیا اور گالی دی قَالَ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا۔

ف : حضرت قتادہ نے فرمایا کہ فرعون نے موسیٰ و ہارون علےٰ نبینا و علیہما السلام کو سال تک اندر آنے کی اجازت نہ دی۔ ایک دن دربان نے فرعون سے جاکر کہا کہ ایک شخص دروازے پر آیا ہے وہ کہتا ہے کہ میں پروردگارِ عالم کا رسول ہُوں۔ فرعون نے کہا اسے لے آؤ تاکہ اس سے ہنسی مذاق کریں۔ دربان موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس لے گیا۔ فرعون نے موسیٰ کو پہچان لیا، اسے اپنے پچھلے احسانات جتاتے ہُوئے کہا اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا ہم نے تجھے بچپن میں اپنے گھر میں نہیں پالا تھا؟ حضرت کاشفی نے اس کا ترجمہ یُوں کیا کہ کیا ہم نے اپنے گھر میں تیری پرورش نہیں کی؟ ولیداً حال ہے یعنی تمہاری پرورش تمہارے بچپن میں ہم نے کی وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ○ اور تم نے ہمارے گھروں میں اپنی زندگی کے کافی سال بسر کئے۔ یہ من عمرك، سنین سے حال ہے۔

عمر (بضمتین) عمر سے ہے بمعنے عاش حیی یعنی بسر کیا اور زندگی گزاری۔

حلِ لغات امام راغب رحمہ اللہ نے فرمایا: عمر اس مدّت کا نام ہے جس میں حیات بدن میں رہ کر بدن کو معمور رکھے، وہ مدت قلیل ہو یا کثیر۔

ف : بعض کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے ہاں تیس سال کا عرصہ رہ کر مدین کو چلے گئے۔ وہاں دس سال گزار کر واپس فرعون کے ہاں تشریف لائے اور دعوتِ اسلام کے لیے اس کے ہاں تیس سال بسر کیے۔ فرعون کے غرق ہونے کے بعد پچاس سال زندہ رہے۔ اس لحاظ سے آپؑ کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ الفعلۃ (بالفتح) ایک بار کام کرنا، یعنی قبطی کا قتل کرنا جو فرعون کا باورچی تھا۔ اس کا نام فاتون تھا۔

ربط: اپنی نعمتوں کو گننے کے بعد اب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو تنبیہ کی کہ اے موسیٰ! میں نے تجھے پالا پوسا اور جوان کیا لیکن تُو نے میرے باورچی کو قتل کر ڈالا۔ یہ تیرے لیے اچھا نہ تھا۔

سوال: تم نے اس فعل کو بڑا متہم بتایا کہ فرعون کی تنبیہ کا ذکر کر دیا یہ تم نے کہاں سے سمجھا؟

جواب: جس فعل کی تصریح کے بجائے اسے مبہم طور پر ذکر کیا جائے وہ اس کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ تنکیر کبھی تعظیم کا فائدہ دیتی ہے۔ (کذا قال الشیخ)

وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۝ یہ انت ضمیر فعل سے حال ہے۔ یعنی اے موسیٰ! تم میری نعمت کو ٹھکرانے والے اور میری تربیت کے حق کے منکر ہو کہ تم نے میرے باورچی کو قتل کر ڈالا۔ قَالَ مُوْسٰے علیہ السلام نے فرمایا فَعَلْتُهَاۤ وُہ کام کیا اِذًا جبکہ میں نے قبطی کو قتل کیا (اذ حرفِ جواب ہے فقط یہاں جزا کا تصور بعید ہے) وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ ۝

حلِ لغات ضل فلان الطریق سے ہے بمعنے فلاں سیدھے راستے سے ہٹ گیا۔ یعنی میں صواب کے راہ سے ہٹ گیا، میں نے بلا قصد خطا کی۔ یہ اس شخص کی طرح ہے جس نے تیر تو کسی پرندے کو مارا لیکن جا لگا آدمی کو۔ کیونکہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کا قبطی کو ادب سکھلانا مطلوب تھا قتل کرنا مقصد نہ تھا۔م

خلاصہ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: مجھے کیا خبر تھی کہ میرے مُکّے سے یہ قبطی مر جائے گا فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ تو میں اس خوف سے مدین چلا گیا کہ کہیں اس کے بدلے میں مَیں نہ قتل کر دیا جاؤں لَمَّا خِفْتُكُمْ جب مجھے خوف ہُوا کہ تم مجھے ضرر پہنچاؤ گے اور جس کا میں نے ارتکاب بھی نہیں کیا تم اس پر میرا مواخذہ کرو گے فَوَهَبَ لِیْ رَبِّیْ جب میں مدین سے لَوٹا تو مجھے میرے پروردگار نے عطا فرمایا ہے حُكْمًا علم اور حکمت وَّجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ اور مجھے تمہاری طرف رسول بنا دیا ہے۔)

ف: فتح الرحمٰن میں ہے کہ حُکمًا سے مراد نبوت ہے وجعلنی من المرسلین نبوت کے دوسرے درجہ یعنی رسالت کی طرف اشارہ ہے، اس لیے کہ ضروری نہیں کہ ہر نبی رسول بھی ہو۔

تفسیرِ صُوفیانہ بعض اکابر مشایخ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو اعلیٰ مقام عطا فرمانا چاہتا ہے تو اس کے دل میں ایک رُعب ڈالتا ہے جس سے وہ مخلوق سے ہٹ کر اس کی طرف رجوع کرتا ہے جس سے اس پر خصوصی اسرار و رموز منکشف ہو جاتے ہیں، جیسے موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہُوا۔

منکرینِ عصمتِ انبیاء علیہم السلام کا ردّ

(بعض لوگ انبیاءؑ علیہم السلام کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام سے بھی ہماری طرح غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں ان کے استدلال میں ایک یہی واقعۂ موسیٰ علیہ السلام کا بھی ہے۔ ان کے رد میں صاحب روح البیان قدس سرہٗ جلد ۶ ص ۲۶۸ میں تحت آیت ہذا لکھتے ہیں:)

و معاصی الخواص کمعاصی غیرھم — خواص لوگوں کی غلطیاں ہماری غلطیوں جیسی
فانھم لا یقعون فیھا بحکم الشھوۃ — نہیں ہوتیں کیونکہ ان کا ایسے امور کا ارتکاب
الطبیعۃ بل بحسب الخطا و ذٰلک — خواہشِ نفسانی سے نہیں ہوتا بلکہ خطأً ہوتا ہے
مرفوع۔ — اور وہ مرفوع ہے۔

تفسیر عالمانہ

وَتِلْكَ یہ اس تربیت کی طرف اشارہ ہے جو الم نربك میں ہے نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ وہ نعمت جو تم نے مجھے ظاہری طور پر عطا کی جو دراصل اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ بنی اسرائیل کو تیرا عبادت کرانا اور ان کے بچوں کو ذبح کرنا تھا۔ یعنی میرا تیرے پاس پہنچنا اور تیری تربیت کا حاصل ہونا ایک سبب تھا۔ یعنی اگر وہ کام فرعون نہ کرتا یعنی بنی اسرائیل پر قہر و غضب نہ کرتا اور ان کے بچوں کو قتل نہ کرتا تو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ خود ان کی کفالت کرتی اور انھیں دریا کے سپرد نہ کرتی۔ نہ موسیٰؑ فرعون کے ہاں پہنچتے اور نہ وہ ان کی تربیت کرتا۔ پھر اس کا احسان جتلانا کیسا جبکہ وہی امر اس کے لیے ایک عظیم مصیبت کا سبب بن گیا۔

ترکیب : تلك مبتدا ہے اور نعمۃ اس کی خبر ہے تمنھا علیّ، نعمۃ کی صفت ہے اور ان عبدت مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی یہ درحقیقت میری قوم کی عبادت کرانا ہے۔

حلِ لغات : تعبید بمعنے قید کرنا اور بندگی میں لینا۔ اہلِ عرب کہتے ہیں عَبَّدْتُّهٗ یعنی میں نے اسے اپنا بندہ بنایا اور اس پر غلبہ پایا اور اسے ذلیل کیا۔

ربط : پہلے موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کا رد فرمایا جب اس نے آپ کی نبوت پر جرح و قدح کی اور آپ کو جھڑکا پھر جب اس نے اپنا احسان جتلایا تو اس کو کھری کھری سنائیں لیکن کھل کر اس کی تردید نہیں کی کیونکہ من وجہ فرعون کی بات سچی تھی، اسے آپ کی نبوت سے مفر نہ تھا۔ اس کا وہی منت و احسان اس کے لیے نقصان کا سبب بنا۔ جس پر موسیٰ علیہ السلام نے صرف اسے متنبہ فرمایا۔

فٓ : بعض علماءؒ نے فرمایا کہ فرعون نے گھٹیا رویہ اختیار کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو اپنی منت و احسان جتلایا جس پر اسے امید تھی کہ موسیٰ علیہ السلام انہیں خدائی دعویٰ سے نہیں روکیں گے۔

منّت کی وضاحت منّت بھاری نعمت کو کہا جاتا ہے اور یہ دو قسم ہے ؛
(۱) فعل سے ۔ جیسے کہا جاتا ہے ، منّ فلان علی فلان ۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی کو بھاری احسان سے نوازے ۔ اسی سے ہے قولِ باری تعالیٰ ؛

لقد منّ اللہ علی المؤمنین۔

(اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان پر بھاری احسان فرمایا)

اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہوسکتا ہے ۔

(۲) قول سے ۔ یہ عوام لوگوں کے لیے ظاہر کرنا قبیح ہے ۔ ہاں اس وقت جائز ہے جب دوسرا کفرانِ نعمت کرے ۔ اسی قباحت پر اہلِ عرب کہتے ہیں ؛

المنّۃ تھدم الصنیعۃ ۔

(احسان جتلانا کئے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے)

مگر کفرانِ نعمت پر اظہار جائز ہے اسی لیے کہا گیا ہے ؛

اذا کفرت النعمۃ حسنت المنّۃ ۔

(جب نعمت کی ناشکری ہو تو منّت جتلانا اچھا ہے)

ف : حضرت محمد بن علی ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ جوانمردی نہیں کہ کسی پر احسان کر کے منت جتلائی جائے ۔ کیا نہیں دیکھتے ہو کہ فرعون میں جواں مردی کا فقدان ہوا تو اس نے اپنے احسانات موسیٰ علیہ السلام کو جتلاتے ۔

ے

از ناکساں دہر ثبوت طمع مدار

از طبع دیر خاصیت آدمی مجوی

ترجمہ : کمینے لوگوں سے ثبوت طمع نہ رکھ ۔ گندی طبیعت والوں سے آدمی کی خاصیت طلب نہ کر ۔

تفسیر صوفیانہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت لطف کا مظہر بنایا کہ انھیں نبی مرسل بنایا، اور یہ ایسا مرتبہ ہے کہ اسے تربیت اور انتہائی تکالیف کے بعد حاصل کیا جاتا ہے ۔
جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے تکالیف و شدائد دیکھے فرعون کو وہ تمرد و تکبر تھا جو ابلیس سے بھی بازی لے گیا ۔ اس سے ظاہر کرنا مطلوب تھا کہ انسان ایسے مراتب یونہی پاتا ہے جو ملائکہ کو بہت نصیب نہ ہو۔ اسی لیے انسان مسجود بنا اور ملائکہ ساجد ۔ اگر موسیٰ علیہ السلام فرعون کے لیے داعی الی نہ ہوتے تو فرعون کبھی ایسی

سرکشی و تکبّر کو نہ پہنچا کیونکہ قہر و غضب کی صفت انہی کا مظہر تھا (کذا فی التاویلات النجمیہ) ایسے ہی ہر زمانہ کے موسیٰ و فرعون کا قیامت تک قیاس کرتے جائیے اس لیے ہر شے اپنی ضد سے اپنے کمال تک پہنچتی ہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

تفسیر عالمانہ **حلِ لغات** : ما استفہامیہ ہے بمعنے ایّ شیءٍ۔ یعنی وُہ کون سی شے ہے۔ الرب بمعنے المربی والمتکفل یعنی مصلحت موجودات کا تربیت کنندہ اور کفیل کار۔ العالم نام ہے ما سوی اللہ کا۔ وہ جواہر ہوں یا اعراض۔

اب معنیٰ یہ ہُوا کہ وہ رب العالمین کیا شے ہے جس کی طرف سے تم اے موسیٰ علیہ السلام ! مدعی ہو کہ میں اس کا رسول ہُوں۔ اس کا خاصہ کیا ہے اور وہ کون سی جنس سے ہے۔ فرعون اس کا منکر تھا کہ اس کے سوا کوئی اور رب العالمین ہو۔

ف : جناب کاشفی مرحوم نے لکھا کہ جب فرعون نے سُنا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں رب العالمین کا رسول ہُوں تو اس نے اپنے سخن کا اسلوب بدلا اور بطورِ امتحان کہا کہ پروردگارِ عالم کیا شَے ہے۔ گویا اس نے رب العالمین کی ماہیّت کے بارے میں سوال کیا۔

ربط : پھر چونکہ اللہ کی تعریف صرف لوازم خارجیہ سے ہو سکتی ہے اس لیے جنس و فصل سے اس کی ذات کی ترکیب محال ہے۔

اسی لیے قَالَ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اسی طرح جواب دیا جو ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے کہا جائے رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا آسمانوں، زمینوں اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا رب ہے۔

ف : موسیٰ علیہ السلام نے بعینہٖ وہی ارادہ کیا جو عالمین کا معنیٰ ہے تاکہ وُہ لعین اس پر محمول نہ کرے کہ وُہ اللہ تعالیٰ اس کی ملکت کے ماتحت ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝ اگر تم اشیاء کا یقین رکھتے ہو اور نظر صحیح سے تمہیں تحقیق ہو کہ واقعی یہ اشیاء ہیں اور ان کا کوئی رب ہے یعنی بلا شک و گمان تم جانتے ہو کہ عالم وُہ ہے جس سے معلوم ہو کہ ان آسمانوں اور زمینوں اور ان کے درمیان کی جملہ اشیاء کا کوئی صانع ہے اور میرا رب تعالیٰ وہی ہے جس نے انہیں پیدا کیا اور جو ان کے اندر ہیں ان کو رزق دیتا ہے اور ان کے جملہ امور کی تدبیر کرتا ہے۔ یہی اس کی تعریف ہے اور یہی تمہارے سوال کا جواب ہے۔

ف : کُم کے مخاطب فرعون اور اس کے ساتھی حاضرینِ مجلس ہیں۔

ف : جناب کاشفی مرحوم نے فرمایا کہ کسی کو حق کی ذات کی آگاہی نہیں اور نہ ممکن ہے جو کچھ عقل وفہم و وہم و حواس وقیاس میں آتا ہے ان تمام سے ذاتِ خداوندی منزّہ و مقدس ہے کیونکہ یہ جملہ اشیاء محدث (نئی ایجاد) اور محدث (نوایجاد) صرف محدث (نوایجاد) کو معلوم کر سکتا ہے اور بس ؎

آنکہ او از حدث بر آرد دم

چہ شناسد کہ چیست سرِ قدم

علم را سوئے حضرتش رہ نیست

عقل نیز از کمالش آگہ نیست

ترجمہ : وُہ جو حدوث کا دم مارتا ہے اسے کیا معلوم کہ قِدم (قدیم ذات) کیا ہے ۔ علم کو ذاتِ حق کی بارگاہ تک رسائی نہیں ۔ عقل بھی اس کے کمال سے بے خبر ہے۔

ف : علم باللہ کا بھی یہی معنی ہے کہ اس حیثیت سے کہ بین الخلق والخالق ایک رابطہ ہے اور جہان کو اس نے پھیلایا ہے ۔ یہ علم بطاقت بشریہ ہے کیونکہ جیسے کہ وُہ ہے طاقتِ بشریہ کا کوکب ممکن کہ اسے پُورے طور سمجھ سکے بہت بڑے باکمال لوگ اسی دریا کی گہرائی میں حیران وسرگردان اور اپنے عجز کے معترف کہ ہم کون ہیں کہ اس کی کُلی معرفت کے عارف ہوں۔

قَالَ فرعون بولا جب موسیٰ علیہ السلام کا جواب سنا تو اسے خطرہ لاحق ہُوا کہ اس کی قوم میں موسیٰ علیہ السلام کی تقریر کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے ممکن ہے کہ اس کی قوم موسیٰ علیہ السلام کی مطیع و فرمانبردار ہو جا ۔ لِمَنْ **حَوْلَهٗ** جو اس کے اردگرد بیٹھے تھے ۔ اس کے سردارانِ قوم یعنی قبطی ۔ یہ پانچسو تھے جو زیوروں سے آراستہ پیراستہ سنہری کرسیوں پر براجمان تھے ۔

حلِ لغات : حول الشئ شے کا وہ کنارہ جہاں اسے پھرنا اور بدلنا ممکن ہو ۔

اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۝ کیا نہیں سُن رہے یہ کیا کہہ رہے ہیں سُنو اور تعجب کرو اس سے اس کی مراد یہ کہ میری ربوبیت کے علاوہ دوسرے کی ربوبیت کی بات کیوں ہو رہی ہے ۔ **قَالَ** موسیٰ علیہ السلام بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے اور فرعون کو مرتبۂ ربوبیت سے اتار کر مرتبۂ مربوبیت میں ظاہر کر کے فرمایا ۔ کاشفی نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان آیات سے عدول فرمایا جو بعید تھیں اور ان آیات کو ظاہر فرمایا جو ان کے قریب تر تھیں تاکہ وہ ان میں غور وفکر کریں اگر غور وفکر کرنا چاہیں ۔ **رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝** تمہارا اور تمہارے پچھلے آباؤ اجداد کا رب ہے ۔

ف : فرعون صرف موجودہ لوگوں کے لیے ربوبیت کا مدعی تھا اس سے پہلے گزشتہ لوگوں کے لیے اس کا دعوٰی

نہ تھا ۔ موسٰی علیہ السلام کے اس بیان سے آیت میں بتایا گیا ہے کہ ربوبیت کا مستحق ہے جو ہر زمانے والوں کے لیے رب ہو۔

قَالَ فرعون نے اپنی بیوقوفی اور اپنی قوم کو قبولِ حق سے پھیرنے کے ارادے پر کہا اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۝ بے شک تمہارا رسول جو تمہارے ہاں بھیجا گیا ہے مجنون ہے ایسی باتیں کہتا ہے جو کوئی عقلمند نہیں کہہ سکتا۔

سوال: جب فرعون موسٰی علیہ السلام کی رسالت کا منکر تھا تو پھر انہیں رسول کی صفت سے کیوں موصوف کیا؟

جواب: فرعون کا موسٰی علیہ السلام کو رسول کہنا ازراہِ تمسخر و مذاق تھا۔

سوال: جب وہ موسٰی علیہ السلام کی رسالت کا قائل ہی نہ تھا تو پھر مخاطبین کو رسولکم کے لفظ سے کیوں مخاطب کیا۔

جواب: ازراہِ تکبر۔ تاکہ انہیں معلوم ہو کہ بفرضِ محال تم نے انہیں رسول مان بھی لیا تب بھی میں اسے رسول ماننے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔

حلِ لغات: نفس و عقل کے درمیان جو شے حائل ہو اسے جنون کہا جاتا ہے۔ (کذا فی المفردات)

قَالَ موسٰی علیہ السلام نے اپنے رب کی تعریف میں مزید فرمایا اس کی سفاہت و بیوقوفی کی طرف دھیان نہ کیا اور نہ ہی اس کا جواب دینا مناسب سمجھا۔ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا وہ مشرق اور مغرب اور جو ان کے درمیان ہے کا پروردگار ہے۔

سوال: جب پہلے آسمانوں اور زمینوں اور ان کے درمیان کی اشیاء کے لیے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ذکر ہو چکا ہے تو اب مشرق و مغرب و ما بینہما کی تصریح کی کیا ضرورت ہے جب کہ متضمناً ان کا ذکر ہو چکا ہے۔

جواب: چونکہ مشرق و مغرب سے نور و ظلمات کا آنکھوں سے مشاہدہ ہوتا رہتا ہے اور مخالف کو جب تصریح نہ کی جائے وہ سمجھتا نہیں اسی لیے ان کے لیے دوبارہ تصریح کی گئی تاکہ ان پر واضح کیا جا سکے کہ جب تم ان چیزوں کے قائل ہو تو لازماً ماننا پڑے گا کہ ان کا کوئی بنانے والا ہے وہ ان کو جانتا اور ان کے متعلق حکمتیں بھی رکھتا ہے فلہذا لازماً ماننا پڑے گا وہی مستحقِ عبادت و ربوبیت ہے اور بس۔

تفسیر صوفیانہ ابن عطاء رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہی اپنے دوستوں کے قلوب کو ایمان کی روشنی سے نور بخشنے والا اور ان کے ظواہر کو روشن کرنے والا اور اپنے دشمنوں کے قلوب کو کفر کی تاریکیوں سے تاریک کرنے والا اور آثارِ ظلمت ان کی شکلوں اور صورتوں پر ظاہر کرنے والا ہے۔

تفسیر عالمانہ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ اگر تم کچھ سمجھتے ہو یا منجلہ ان لوگوں سے ہو جن کو عقل و تمیز نصیب ہے۔ پھر جان جاؤ گے کہ حق وہی ہے جو میں نے کہا ہے اور استدلال کر سکو گے کہ ان جملہ امور کا کوئی مؤثر (خالق) ضرور ہے۔

ف : اس میں اشارہ ہے کہ وہ لوگ دائرہ عقل سے کوسوں دُور تھے وہ خود جنون کی صفت سے موصوف تھے تبھی تو موسیٰ علیہ السلام کو مجنون کہہ دیا۔

تفسیر صُوفیانہ جیسے موسیٰ علیہ السلام و فرعون آپس میں ایک دوسرے کی نقیض تھے ایسے ہی قلب و نفس بھی آپس میں نقیضین ہیں۔ یہ ہر ایک اپنے دوسرے کے صادر ہونے والے ہر فعل کو جنون سے تعبیر کرتے ہیں ایسے ہی عاشق و زاہد کی مثال ہے کہ عشق کا جنون کچھ اور ہے اور زہد کا جنون کچھ اور ہے

زد شیخ نارسیدہ بعشق تو طعنہ ام
دیوانہ را ز سرزنش کو دکاں چہ باک

ترجمہ : عشق سے محروم شیخ نے تیرے عشق پر مجھے مطعون کیا بچّوں کی ملامت سے دیوانہ کب گھبراتا ہے !

تفسیر عالمانہ قَالَ فرعون نے کمال تمرد اور سزا دینے کے گھمنڈ میں کہا جیسا کہ ظالم و جابر حکمرانوں کی عادت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے دلائل کے جواب دینے کی بجائے سزا سنانے پر اُتر آیا ہے ایسے ہی تصوّف کی باریکیوں سے محجوب انسان کی عادت ہوتی ہے (جبکہ وہ صوفیہ کرام کے دلائل سے عاجز ہوتا ہے تو ان کی تنقیص و تحقیر پر اُتر آتا ہے) فرعون کو اپنی ربوبیت کے علاوہ دوسرے کی ربوبیت کے ادّعا پر غصّہ آ گیا۔

فرعون دہریہ تھا (صاحبِ رُوح البیان قدس سرہٗ نے فرمایا :)

لعله كان دهريا اعتقد ان من ملك قطرا وتولى امره بقوة طالعه استحق العبادة من اهله۔

شاید وہ دہریہ تھا اور اس کا اعتقاد تھا کہ جو بھی کسی علاقے پر اپنے زورِ بازو سے قابض ہو جائے اسے حق ہے کہ اس علاقے کے لوگوں سے اپنی عبادت کرائے۔

فرعون بد مذہب تھا بعض علماءؒ نے فرمایا کہ وہ فرقہ مشبّہ سے تعلق رکھتا تھا جبکہ اس ملعون نے وما رب العالمین کہا یعنی ربّ العالمین کون سی شے ہے کہ جسے ہم اپنے وہم و خیال سے کچھ سمجھ سکیں۔

لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ○ (لام عہدی ہے) یعنی میں تمہیں یقیناً ان لوگوں کے ساتھ قید خانے میں شامل کر دوں گا جو میری قید میں ہیں جن کا حال تمہیں معلوم ہے۔ اور وہ یوں کیا کرتا تھا کہ قیدیوں کو گہرے گڑھے میں پھینک دیتا تھا پھر اس وقت نکالتا جب وہ مر جاتے۔ اسی لیے لاسجننک نہیں کہا تاکہ اس سے جدید قید کا وہم نہ ہو۔

ف : حضرت کاشفی مرحوم نے ترجمہ لکھا کہ میں تمہیں اپنے قیدیوں میں شامل کر دوں گا۔ اس کی قید کے متعلق مشہور ہے کہ وہ قیدیوں کو ایسے گہرے گڑھے میں پھینک دیتا تھا کہ جہاں نہ کچھ نظر آئے اور نہ کچھ سنائی دے۔ انھیں وہ اس وقت باہر نکالتا تھا جب اسے یقین ہو جاتا کہ اب وہ مر چکے ہوں گے۔ یہ سزا قتل سے بھی بدتر تھی۔

تفسیر صوفیانہ اس میں اشارہ ہے کہ حُبِّ دنیا پر بھی اسی طرح کی سزا ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور صرف اس کی طلب اس کا مطمحِ نظر ہو نفس اور اس کی شہوات سے کوسوں دُور ہو تو پھر نفس قلب کو پھنساتا ہے حُبِّ جاہ و مرتبہ کے جال میں۔ یہی آخری بدقسمتی ہوتا ہے جسے حبِ جاہ و مرتبہ کی وجہ سے صدیقین کے زمرہ سے علیٰحدہ کر دیا جاتا ہے ؎

باشد اہلِ آخرت را حبِ جاہ
ہمچو یوسف دراں شہر اہ جاہ

ترجمہ : اہلِ آخرت کے لیے حبِ جاہ ایسے ہے جیسے یوسف علیہ السلام کے لیے۔

تفسیر عالمانہ قَالَ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اَوَلَوْ جِئْتُكَ اگرچہ میں تیرے سامنے لاؤں بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ○ کوئی شے واضح۔ یعنی اے فرعون! کیا میرے لیے قید لائے گا، جب میں تیرے ہاں ایسی چیز لاؤں جو میرے دعویٰ کی سچائی پر روشن دلیل ہو۔ یعنی ایسا معجزہ لاؤں جو میرے رب تعالیٰ کے وجود کی جامع دلیل اور میری نبوت کی واضح برہان ہو۔ اس معنی پر واو حالیہ ہے جس پر ہمزہ استفہام انکاری داخل ہے جس میں فعل محذوف ہے یعنی درانحالیکہ میں روشن دلیل لانے والا ہوں۔ بعض مفسرین نے اسے واو عاطفہ بنایا ہے۔ دراصل عبارت یوں ہے :

اتفعل بی الی ان قال ولو جئتك الخ

یعنی میرے لیے قید کا حکم صادر کرے گا اگر میں تیرے ہاں کوئی دلیل نہ لاؤں۔ تاہم تو یہ تہیہ کر چکا ہے کہ تو مجھے قید ہی کرے گا چاہے میں کوئی دلیل لاؤں یا نہ لاؤں۔ قَالَ فرعون نے کہا فَاْتِ بِهٖ تو لائیے اسے اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ اگر تو سچے لوگوں میں سے ہے۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کے

ہاتھ میں جنت مورد درخت کا عصا تھا جسے آدم علیہ السلام بہشت سے لائے تھے۔ جب ان کا وصال ہوا تو اسے جبریل علیہ السلام اٹھا کر لے گئے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نبی مبعوث ہوئے تو انہیں دے دیا گیا۔ اسی عصا کے متعلق فرعون نے پوچھا، یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا، عصا ہے۔ فَاَلْقٰی تو موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ سے چھوڑ کر زمین پر ڈال دیا عَصَاهُ اپنا عصا (ڈنڈا)۔

حل لغات : الالقاء بمعنے شے کو ایسی جگہ پھینکنا جہاں اسے دیکھا جا سکے۔ لیکن عرف میں مطلقاً پھینکنے کو کہتے ہیں۔

فَاِذَا هِیَ پس پھینکنے کے بعد اچانک اس جگہ پر وہی عصا تھا ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ ○ اژدہا کھلم کھلا۔ یعنی وہ شے جو اژدہا کے مشابہ تھی جادو کے ذریعے یا کسی اور عمل سے۔

حلِ لغات : ثعبان دراصل تمام سانپوں سے بڑے سانپ کو کہا جاتا ہے جسے اژدہا سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ثعبت الماء فانثعب سے ہے بمعنے میں نے پانی بہایا تو وہ بہ نکلا۔

ف : حضرت کاشفی نے فرمایا کہ جب فرعون نے اس (اژدہے) کو دیکھا تو ڈر گیا، اس کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ اس بھگدڑ میں پچیس ہزار افراد ہلاک ہو گئے۔ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا میں تمہیں اس ذات کا واسطہ دیتا ہوں جس نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے اس اژدہے کو پکڑ لے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسے پکڑا تو وہی ڈنڈا تھا جو پہلے ان کے ہاتھ میں تھا، اس میں معمولی تغیر و تبدل بھی نہ تھا۔

سوال : اس آیت میں ثعبان ہے۔ لیکن دوسری آیت میں کا نّھا جانّ ہے۔ دونوں آیتوں میں تغایر ہے اس لیے کہ بقول شما ثعبان بڑے سانپ کو کہا جاتا ہے اور جانّ چھوٹے سانپ کو۔

جواب : اس کی ظاہری شکل و صورت تو اژدہا جیسی تھی لیکن اس کی چال اور حرکت چھوٹے سانپ جیسی تھی۔ (کذا فی کشف الاسرار)

(اس معنی پر اب تناقض نہیں رہا کہ ایک مقام پر اسے شکل و صورت کی وجہ سے ثعبان کہا گیا ہے اور دوسرے مقام پر اس کی حرکت اور چال کی وجہ سے جانّ کہا گیا ہے۔ ایسے اطلاقات قرآن مجید میں بہت ہیں تفصیل فقیر کی کتاب احسن البیان حصہ دوم میں دیکھئے)[1]

تفسیر صوفیانہ اس میں اشارہ ہے کہ جب قلب ذکر الٰہی کا سانپ نفس پر چھوڑتا ہے تو لا اللہ کی نفی سے ما سوی اللہ کو لقمہ بنا لیتا ہے۔

---

[1] اضافہ از اویسی غفرلہ

تفسیر عالمانہ وَنَزَعَ يَدَهٗ اور اپنے ہاتھ کو گریبان سے نکالا فَاِذَا هِيَ پس اس جگہ پر وہ ہاتھ تھا بَيْضَآءُ نورانی اور سفید، جس پر برص کے مرض کا شائبہ تک نہ تھا۔ یعنی نورانی سفید تھا لیکن اس کے اصلی گندم گوں رنگ میں سرِمو فرق نہ تھا لِلنّٰظِرِيْنَ ۝ دیکھنے والوں کے لیے۔

نبی علیہ السلام کے حسّی نور ہونے پر استدلال (صاحبِ رُوح البیان رحمہ اللہ اسی مقام پر رقمطراز ہیں کہ) موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کا نُور سورج کی روشنی کی طرح تھا، جیسے سورج کی روشنی سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں ایسے ہی موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی روشنی سے آنکھیں چُندھیا گئیں[1]

ف: مروی ہے کہ جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کا پہلا معجزہ دیکھا تو سوال کیا کہ کچھ اور بھی ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنا سیدھا ہاتھ دکھا کر فرمایا: یہ کیا ہے؟ فرعون نے کہا: یہ تمہارا ہاتھ ہے۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں بغل میں دبا کر ظاہر فرمایا تو وہ ایسا چمکدار تھا کہ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور اس کا نور افق میں پھیل گیا۔

تفسیر صُوفیانہ تاویلاتِ نجمیہ میں ہے:
ونزع یدہٗ اور موسیٰ علیہ السلام نے قدرت کا ہاتھ ظاہر فرمایا فاذا ھی بیضاء تو اس جگہ پر وہ تائیدِ الٰہی سے نورِ ربّی سے منور تھا اور اس سے شعلے بھڑک اُٹھے للنا ظرین ان اہلِ نظر کے لیے جو نورِ الٰہی سے دیکھتے ہیں کیونکہ نور نور سے دیکھا جا سکتا ہے۔

(اگلا صفحہ ملاحظہ کیجئے)

---

[1] اسی معنے پر ہم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسّی نور بھی ہیں اگر وہ اسے ظاہر فرماتے تو۔ اگر موسیٰ علیہ السلام کا معجزۂ یدِ بیضا پر ایمان ہے تو اسے حسّی نور ماننا بھی ضروری ہے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حسی نور کو کبھی کبھار ظاہر بھی فرمایا لیکن معمولی۔ ورنہ اگر پورے طور نورانیت کا اظہار فرماتے تو کسی کو دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اویسی غفرلہٗ

قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ ○ يُرِيدُ أَن يُخْرِجَكُم مِّنْ أَرْضِكُم
بِسِحْرِهِ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ○ قَالُوا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ○
يَأْتُوكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيمٍ ○ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ○ وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ
أَنتُم مُّجْتَمِعُونَ ○ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ إِن كَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ ○ فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ
قَالُوا لِفِرْعَوْنَ أَئِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ ○ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّمِنَ
الْمُقَرَّبِينَ ○ قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنتُم مُّلْقُونَ ○ فَأَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ
وَقَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ ○ فَأَلْقَىٰ مُوسَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا
يَأْفِكُونَ ○ فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ ○ قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ○ رَبِّ مُوسَىٰ وَ
هَارُونَ ○ قَالَ آمَنتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ
فَلَسَوْفَ تَعْلَمُونَ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ○
قَالُوا لَا ضَيْرَ إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ ○ إِنَّا نَطْمَعُ أَن يَغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطَايَانَا أَن كُنَّا
أَوَّلَ الْمُؤْمِنِينَ ○

ترجمہ : فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا یہ بیشک دانا جادوگر ہے یہ جادو کرکے تمہیں تمہارے ملک سے نکالنا چاہتا ہے بتاؤ اب تمہارا کیا مشورہ ہے انہوں نے کہا اسے اور اس کے بھائی کو اپنے پاس ٹھہراؤ اور شہروں میں جمع کرنے والوں کو بھیجئے تاکہ وہ تمہارے ہاں بڑے ماہر جادوگر لائیں سو ایک مقرر دن کے وعدہ پر جادوگروں کو جمع کرلیا گیا اور لوگوں کو کہا گیا کہ کیا تم جمع ہوگے شاید ہم ان جادوگروں کی اتباع کریں اگر یہ غلبہ پا جائیں پھر جب جادوگر آگئے تو فرعون سے کہنے لگے کیا ہمیں کچھ انعام ملے گا اگر ہم غالب آگئے کہا ہاں اور اس وقت تم میرے مقرب ہوجاؤ گے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا ڈالو جو تمہیں ڈالنا ہے تو انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں اور کہا کہ ہمیں فرعون کی عزت کی قسم بیشک غلبہ ہمیں ہی ہوگا پھر موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنا عصا ڈالا تو اسی وقت ان کی بناوٹوں کو نگلنے لگا سو تمام جادوگر سجدے میں گر گئے جادوگروں نے کہا ہم رب العالمین پر ایمان لائے جو موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کے رب ہیں فرعون نے کہا تم میری اجازت سے

پہلے اس پر ایمان لائے بے شک وہ تمہارا استاد ہے کہ جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے سو عنقریب تم معلوم کر لوگے مجھے قسم ہے کہ بیشک میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا اور تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا انہوں نے کہا کوئی حرج نہیں بیشک ہم اپنے مالک کے جا ملیں گے۔

تفسیر عالمانہ قَالَ فرعون نے کہا لِلْمَلَاِ اپنی قوم کے سرداروں سے، جو اس کے ساتھ بیٹھے تھے حَوْلَهٗ یہ ظرف ہے حال کے قائم مقام ہے اس کی تحقیق پہلے گزری ہے۔

حل لغات : الملا دراصل اس جماعت (جو ایک رائے پر متفق ہو) کو کہتے ہیں جو لوگوں کی آنکھوں اور نفوس کو جلالت اور رونق کے لحاظ سے سیر کر دے۔

اِنَّ هٰذَا بے شک یہ (موسیٰ علیہ السلام) لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝ علم سحر میں بہت سمجھدار ہے یعنی دانا جادوگر، اور اس فن کا استاد ہے۔ اس سے اسے خطرہ ہوا کہ لوگ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے اس لئے کہا کہ یہ جادوگر ہے اور اس فن کا بہت بڑا ماہر ہے۔

حل لغات : وہ تخیلات جن کی کوئی حقیقت نہ ہو اسے السحر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ساحر بھی حیلہ گری اور ایسے تخیلات سے کام لیتا ہے جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

سوال : یہاں مقولہ فرعون کا ہے دوسری آیت میں یعنی سورۂ اعراف میں یہی مقولہ قومِ فرعون کی طرف منسوب ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب : دراصل یہ مقولہ ہے تو فرعون کا، جو اس نے حاضرین سے کہا۔ پھر اسے قومِ فرعون کی طرف اس لیے منسوب کیا کہ انہوں نے غیر موجود لوگوں تک اسے پہنچایا۔ (کذا فی الاسرار)[1]

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ اس کا ارادہ ہے کہ وہ تمہیں تمہارے ملک سے نکال دے اور غلبہ پا کر اپنی قوم کو یہاں بسا دے بِسِحْرِهٖ اپنے جادو کے بل بوتے پر فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝ تو بتاؤ تم اس کے بارے میں کیا مشورہ دیتے ہو۔

سوال : بڑا چھوٹے کو مشورہ دیتا ہے نہ کہ چھوٹا بڑے کو۔ یہاں فرعون نے انہیں تأمرون کیوں کہا؟

جواب : (۱) یہ تامرون، امرٌ کے محاورہ سے نہیں بلکہ مؤامرہ سے ہے بمعنی مشورہ دینا۔

---

[1] اس قسم کے مضامین قرآن مجید میں بکثرت ہیں جن کی تفصیل فقیر نے احسن البیان جلد دوم میں بیان کی ہے۔
اویسی غفرلہٗ

(۲) بعض نے کہا مجلسِ مشاورت میں ایک دُوسرے کے مشورہ کو قبول کر کے ثابت کیا جاتا ہے کہ گویا اس نے دوسرے کا حکم مانا ہے۔ (کما فی کشف الاسرار)

خلاصہ یہ کہ فرعون نے اپنے شورٰی کے اراکین سے کہا کہ تم مجھے موسٰی علیہ السلام کے بارے میں کیا مشورہ دیتے ہو۔

سوال : جب وہ ان سب کا رب تھا تو پھر ان سے مشورہ لینے کی کیا ضرورت تھی، یہ تو اس کے عجز کی دلیل ہے۔

جواب : دراصل موسٰی علیہ السلام کے معجزات کے اظہار کے بعد فرعون کا حوصلہ پست ہوگیا اور اپنے ربوبیت کے دعوٰی کو غلط محسوس کرنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے قبل وہ کسی کے مشورہ و رائے کو جبہ بھر اہمیت نہ دیتا۔ اب یہ حال ہے کہ اپنے غلاموں اور ماتحتوں کو مشورہ میں شریک کر رہا ہے۔ اسے اپنی سلطنت اور شاہی میں ضعف پیدا ہوتا نظر آنے لگا۔

سوال : جب وہ خدا بنا بیٹھا تھا تو اس آیت میں قوم کو نکالنے کی نسبت موسٰی علیہ السلام کی طرف کیوں کر دی؟

جواب : تاکہ قوم کو موسٰی علیہ السلام سے نفرت ہو کہ یہ کون ہے ہمیں ہمارے ملک سے نکالنے والا!

اسی نفرت کی وجہ سے قَالُوْٓا قبطیوں کے لیڈروں (اراکینِ شورٰی) نے کہا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ

حلِ لغات : ارجہ بمعنے معاملہ کو اپنے وقت سے پیچھے ہٹا دینا (کذا فی القاموس)

یعنی موسٰی علیہ السلام اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کے معاملہ میں سوچ بچار سے کام لے ان کے قتل میں عجلت نہ کر جب تک کہ ان کا جھوٹ واضح نہ ہو جائے تاکہ تیرے عبادت گزاروں کو تجھ سے بدگمانی نہ ہو اور تجھے ان کے قتل پر ان سے معذرت نہ کرنی پڑے۔ وَابْعَثْ اور بھیج دے فِى الْمَدَآئِنِ شہروں میں اور اپنی مملکت کے چھوٹے بڑے قصبوں میں۔ یعنی اپنی مملکت کے مختلف مقامات پر۔ فتح الرحمٰن میں ہے مدائن سے ایک قصبہ مراد ہے جو حدودِ مصر کے آخری حصہ میں آباد تھا حٰشِرِيْنَ ۝ بہت زیادہ ارکان کو جمع کیا جائے۔ اس معنٰی پر حاشر موصوف محذوف کی صفت ہوگی اور وہ ابعث کا مفعول بہ ہے۔

حلِ لغات : شرط جمع شرطا بالضم وسکون الراء وفتحہا۔ وُہ جماعت جو اراکینِ سلطنت کی وجہ سے مشہور و معروف ہو۔ (کذا فی القاموس)

الشرط بالفتح بمعنے علامت، اسی سے شرطا ماخوذ ہے کیونکہ اسی سے لوگ اپنے لیے علامت مقدر کرتے ہیں جس سے وُہ پہچانے جاتے ہیں۔

يَاْتُوْكَ لائیں تمہارے پاس بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ۝ ہر جگہ سے اچھے اچھے جادوگر جو اپنے فن میں مہارت تامہ رکھتے ہوں پھر وہ موسٰی علیہ السلام کا اپنے جادو کے ساتھ معارضہ کریں بلکہ اس سے بڑھ جائیں تاکہ عوام پر

موسیٰ علیہ السلام کا کذب واضح ہو۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالو۔

تفسیر صوفیانہ یہی نفس اور القا نے شیطانی کی تدبیر ہے جب وہ حق صریح کو دفع کرنے پہ آتے ہیں، ان کی جملہ تدابیر یُونہی ہوتی ہیں بلکہ ہر دور میں ہر کوئی اپنے مخالف کی مخالفت میں یُونہی تدبیر کرتا ہے اور خبث قول و فعل نفس سے ہی سرزد ہوتا ہے کیونکہ برتن سے وہی چیز ٹپکتی ہے جو اس میں ہو۔ اگر فرعون اور اس کی قوم موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اپنی جملہ تدابیر کر کے ان کے ارشاد پہ عمل کرتے تو تمام آفات و بلیات سے بچ جاتے۔ لیکن اسے حُبِ جاہ و مرتبۂ دنیوی نے ایسی سوچ سے محروم رکھا۔ اور قاعدہ ہے کہ جسے جس سے محبت ہوتی ہے وہ اس کے خلاف سے اندھا اور بہرہ ہو جاتا ہے۔ وہ زمین کو یعنی دنیوی مراتب کو چمٹ گئے اور ایمان و اتباع موسیٰ علیہ السلام سے ان پر غفلت کے بادل چھا گئے۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ تخت بندست آنکہ تختش خواندۂ
صدر پنداری و بر در ماندۂ

۲ پادشاہان جہان از بدرگی
بو نبردند از شراب بندگی

۳ ورنہ ادہم وار سرگردان و دنگ
ملک را برہم زدندی بے درنگ

۴ لیک حق بہر ثبات این جہان
مہرشان بنہاد بر چشم و دہان

۵ تا شود شیرین بریشان تخت و تاج
کہ ستانیم از جہانداران خراج

۶ از خراج ار جمع آری زر چو ریگ
آخر آن از تو بماند مردہ ریگ

۷ ہمرہ جانت نگردد ملک و زر
زر بدہ سرمہ ستان بہر نظر

۸ تا ببینی کین جہان چاہیست تنگ
یوسفانہ آن رسن آری بچنگ

۹ ہست در چاہ انعکاسات نظر
کمترین آنکہ نماید سنگ زر

۱۰ وقت بازیٔ کودکاں را ز اختلال

می نماید این خزفہا زر و مال

ترجمہ : (۱) جسے تم تخت کہتے ہو وہ تمہاری جیل ہے ، جسے تم صدارت کی کرسی کہتے ہو وہ تمہارے لیے وبالِ جان ہے۔

(۲) دنیا کے بادشاہ اپنے امور میں منہمک رہنے کی وجہ سے شرابِ بندگی کا ایک قطرہ بھی اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔

(۳) ورنہ حضرت ادھم رحمہ اللہ کی طرح سرگردان وحیران ہو کر ملک کو یک لخت خیر باد کہہ دیتے ۔

(۴) لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے انہماک کو دیکھ کر اس جہان کے تصورات یوں ڈال دئے کہ ہم نے یہاں ہمیشہ رہنا ہے اسی لیے پھر ان کی آنکھوں اور مُنہ پر مہر لگادی۔

(۵) یہاں تک کہ ان کو تخت و تاج میٹھے لگے اور سوچا کہ دوسرے بادشاہوں سے خراج لیں گے ۔

(۶) خراج کو اگرچہ ریت کے ذرات کے برابر بھی جمع کرو گے تب بھی یہی نتیجہ نکلے گا کہ وہ تم سے چِھن جائے گا اور وہ تمہارے لیے بیکار ریت کی طرح رہ جائے گا ۔

(۷) ملک وزر تیرے ساتھ نہیں جائیں گے ۔ زر اور دولت راہِ خدا میں لٹا دے ، یہ تیری نگاہ کا سُرمہ ثابت ہوگا۔

(۸) خبردار ! یقین کرلے کہ یہ دُنیا تیرے لیے اندھے کنُویں کی مانند ہے یُوسفی رسّی ہاتھ میں لے (تب نجات ملے گی)

(۹) اس دُنیا کے اندھے کنُویں میں نظریں اُلٹی ہوجاتی ہیں ہر ذرّہ اس کا سونا اور زر نظر آتا ہے ۔

(۱۰) بچّوں کو دیکھئے کہ وہ کھیل کُود میں مٹّی کے تودوں کو بہترین زر و مال سمجھتے ہیں ۔

تفسیر عالمانہ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ تو فرعون نے شہروں میں آدمی بھیج کر شاہی نوکروں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے علاقہ کے بہترین جادوگر لے کر حاضر ہوں ۔ اس حکم پر شاہی نوکروں نے بہتر یا ستّر ہزار جادوگر جمع کئے ۔ جیسا کہ آیت میں لفظ حبال وعصی (رسّیاں اور ڈنڈے) دلالت کرتے ہیں جنہیں انھوں نے موسٰی علیہ السلام کے مقابلہ میں میدان میں ڈالا جن کو لوگوں نے سانپ سمجھا اور یہ اجتماع (مناظرہ) شہر اسکندریہ میں ہوا ۔ (رواہ الطبری) لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۙ

حلِ لغات : میقات وہ وقت جو کسی خاص امر کے لیے مقرر کیا جائے ۔

یعنی فرعون نے ان کے لیے معیّن دن کی گھڑی مقرر کی اور وہ فرعون کی قوم کا دن تھا اور چاشت کا دن مقرر ہوا۔

اس دن وہ سنگار کر کے ہر سال جمع ہوتے ہیں۔

ف: حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ سال کے پہلے دن پروگرام بنا تھا اور وہ ہفتہ کا دن تھا) اسے یوم النیروز سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہی فرودین ماہ کا پہلا دن ہے جسے لغتِ قبط میں "طلع الماء" کہا جاتا ہے۔ یعنی دریائے نیل کا پانی چڑھ گیا۔ اور لغتِ عجم میں اسے نوروز یعنی یومِ جدید سے تعبیر کرتے ہیں اور وہ ان کے نزدیک نئے سال کے پہلے دن کا نام ہے۔

نکتہ: موسیٰ علیہ السلام نے اسی وقتِ چاشت کو یومِ عید مقرر فرمایا۔ کما قال تعالیٰ:

موعدکم یوم الزینۃ وان یحشر الناس ضحی۔

(تمہارا وعدہ عید کے دن کا ہے اور یہ کہ لوگوں کو چاشت کے وقت جمع کیا جائے)

تاکہ برسرِ میدان حق غالب ہو اور باطل مٹ کر رہ جائے۔ اور فرعون نے بھی اس وقت کو اس لیے پسند کیا تاکہ موسیٰ علیہ السلام کا کذب کھل کر عوام کے سامنے آجائے۔ لیکن ہوا وہی جو خدا کو منظور تھا۔

وَقِيْلَ اور فرعون کی طرف سے اعلان ہوا لِلنَّاسِ اہلِ مصر کو اور دیگران لوگوں کو جو اس اجتماع (مناظرہ) میں آسانی سے پہنچ سکیں۔ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ○ کیا تم جمع ہو گے یا نہیں۔

ف: یہ استفہام اس لیے نہیں کہ فرعون ان کو اجتماع کے لیے اختیار دے رہا ہے بلکہ جلد تر پہنچنے کے لیے برانگیختہ کر رہا ہے۔

لَعَلَّنَا شاید ہم تمام بالاتفاق نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ○ جادوگروں کا اتباع کریں اگر وہ غلبہ پا جائیں نہ کہ موسیٰ علیہ السلام کا۔

ف: اس سے فرعون کے نوکر شاہیوں کی یہ مراد نہیں کہ وہ جادوگروں کے دین پر آجائیں گے۔ بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ اس طرح سے وہ موسیٰ علیہ السلام کی اتباع سے بچ جائیں گے۔ کلام کو اس اسلوب سے ذکر کرنے میں ان جادوگروں کے غلبہ پا جانے کی طرف اشارہ ہے) اور لَعَلَّ کا لفظ بھی باعتبارِ غلبہ کے ترجی کے طور پر استعمال کیا جائے جو کہ ان کی مذکورہ اتباع کا مقتضی ہے نہ کہ ان کے مذہب کا اتباع۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ پس جب جادوگر فرعون کے ہاں حاضر ہوئے، فرعون نے ان کی خوب آؤ بھگت کی اور انھیں اپنے قرب میں بٹھایا لیکن انہوں نے اس کے دربار کی گستاخی کرتے ہوئے قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ فرعون سے کہہ دیا اَئِنَّ لَنَا کیا ہمارے لیے لَاَجْرًا بہت بڑا انعام مقرر ہے یا نہیں اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ○ اگر ہم غلبہ پا جائیں یعنی یقیناً ہم غلبہ پا جائیں گے اور موسیٰ علیہ السلام کو شکست فاش ہو گی تو پھر ہمیں کتنا انعام ملے گا قَالَ نَعَمْ ہاں تمہیں بہت بڑا انعام ملے گا وَاِنَّكُمْ اور باوجود اینہمہ بے شک تم

اِذًا جب تم غالب ہو جاؤ گے لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ○ تو تم میرے ہاں ان مقربین سے ہو گے جو میری بارگاہ میں سب سے پہلے حاضر ہوتے ہیں اور کچہری برخاست ہونے کے بعد سب سے آخر میں جاتے ہیں۔ اور یہی مرتبہ فرعون کے ہاں سب سے بڑے مراتب سے تھا۔ اور یہی طریقہ دنیا داروں کا ہے جو حُبِ دنیا میں غرق ہو جاتے ہیں ایسے لوگ دنیا والوں کا قُرب چاہتے ہیں۔ اللہ والوں کے نزدیک یہ سب سے بڑی مصیبت ہے۔

ف : اس معاہدہ پختہ کے بعد جادوگروں کو میدان میں لایا گیا اور وہ موسٰی علیہ السلام کے بالمقابل صف بستہ ہو کر کھڑے ہو گئے اور موسٰی علیہ السّلام سے کہا : آپ پہلے جادو چھوڑیں گے یا ہم چھوڑیں ؟

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا موسٰی علیہ السلام نے فرمایا ڈالو مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ○ جو تم ڈالتے ہو۔

سوال : ساحروں نے جب جادو چھوڑنے کا کہا تو موسٰی علیہ السلام نے ان کی تردید کی بجائے اجازت کیوں دے دی ؟

جواب : (۱) اس سے سحر کی اجازت کا پہلو نہیں نکلتا بلکہ اجازت سے صرف اظہارِ حق کی تمہید مطلوب تھی اور وہ سوائے اس طریقہ کے نہیں ہو سکتا کیونکہ بالمقابل مخالف صرف جادو کے ذریعے سے ہی بات ماننے کو تیار ہوا تھا اور ناچار موسٰی علیہ السلام نے باطل کو مٹانے اور حق کو ظاہر کرنے کے لیے اجازت دے دی۔

(۲) کشف الاسرار میں ہے کہ اگرچہ بظاہر اس میں جادو کی اجازت کا امر ہے لیکن درحقیقت اس سے ان کی ذلت و رسوائی کا حکم ہے اور موسٰی علیہ السلام نے لاپروا ہو کر ایسے فرمایا کہ جب یہ میرا کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتے تو پھر مرعوب ہونے کا کیا معنیٰ ! گویا اسی لیے کہہ دیا : کرو جو چاہو۔

فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ حبل کی جمع ہے۔ پس انہوں نے پھینک دیں اپنی رسّیاں وَعِصِيَّهُمْ عصا کی جمع ہے۔ اور پھینک دئے ڈنڈے ، اور وہ سیماب سے تیار کردہ اور اندر سے کھوکھلے تھے ستر ہزار رسّیاں اور ستر ہزار ڈنڈے تھے وَقَالُوْا رسّیاں اور ڈنڈے چونکہ سیمابی تھے اس لیے سورج کی حرارت سے حرکت میں آ گئے۔ اس سے لوگوں میں شور برپا ہُوا۔ رسّیاں اور ڈنڈے ڈالتے وقت ساحروں نے قسم کھا کر کہا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ قسم ہے فرعون کی بزرگی اور قوّت اور غالبیت کی اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ○ بیشک ہم ہیں موسٰی و ہارون (علٰی نبینا وعلیہما السلام) پر غلبہ پانے والے۔

ف : انہوں نے قسم اس لیے کھائی کہ انہیں یقین تھا کہ وہ ضرور غلبہ پا جائیں گے کیونکہ وہ سحر کے ذریعے اپنی پُوری قوّت صرف کر کے آخری وار کر رہے تھے۔

مسئلہ : غیر اللہ کی قسم جاہلیت کی قسموں سے تھی۔

حدیث شریف میں ہے : اپنے آباء و اُمّہات اور بُتوں کی قسمیں مت کھاؤ، قسم صرف اللہ تعالیٰ

کی ہی ہے اور قسم اس وقت کھاؤ جب تمہیں اپنی سچائی کا یقین ہو۔

لطیفہ جادوگر اپنے ڈنڈوں اور رسیوں کی کثرت پر بہت اترائے اور موسیٰ علیہ السلام کے تنہا ہونے اور ہاتھ میں صرف ایک ڈنڈا لیے ہوئے کھڑے ہونے پر ان کو حقارت سے دیکھا لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ حق اگرچہ قلیل ہو باطل کثیر پر غالب آجاتا ہے، جیسے نور تھوڑا سا بھی ہو تب بھی ظلمات کو مٹا دیتا ہے۔
حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ نے فرمایا:

تیغے کہ آسمانش از فیض خود دہد آب

تنہا جہان بگیرد بے منت سپاہی

ترجمہ: جس تلوار کو آسمانی فیض نصیب ہو تو صرف ایک سپاہی تمام جہان کو مٹا سکتا ہے۔

فَاَلْقٰی مُوْسٰی عَصَاهُ پھر موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنا ڈنڈا ڈالا فَاِذَا هِیَ پس اس وقت وُہ ڈنڈا تَلْقَفُ تیزی سے انہیں نگلتا تھا۔

حلِ لغات: لقفہ بروزن سمعہ سے ہے یعنی تناولہ بسرعۃ یعنی اس نے جلدی سے لیا۔ (کما فی القاموس)

مَا یَاْفِکُوْنَ ○ جنہیں وہ دھوکا سے بنانے اور سانپ کی شکل و صورت میں گھڑتے تھے۔

تفسیر صُوفیانہ بعض اکابر مکاشفین سے ہے جادوگروں کی دھوکا سازی سے ان کی رسیاں اور ڈنڈے سانپوں کی صورتوں میں تھے اور لوگوں کو وہ رسیاں اور ڈنڈے ہی دکھائی دئیے جیسے وہ اصلی شکلوں میں تھے۔ جیسے جب اہلِ حق باطل کے بطلان کو توڑتے ہیں تو بطلان اصل صورت میں ظاہر ہوجاتا ہے۔ اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ رسیاں اور ڈنڈے ہی باطل تھے جیسے جمہور کے نزدیک ہے ورنہ موسیٰ علیہ السلام کے ڈنڈے کو دیکھ کر جادوگروں پر بھی یہی تصوّر گزرتا اور ان کے آگے بھی یہی التباس پڑتا تو وہ اس پر ایمان نہ لاتے جو احکام موسیٰ علیہ السلام لائے اگر وُہ بھی اسی طرح کا جادُو ہوتا جو ساحروں کا تھا یا یہ کہ وہ ان کے جادو سے قوی تر جادو سمجھا جاتا، پھر بات وہی ہے جو ہم نے کہی تلقف ما یافکون نگلتا تھا اسے جو گھڑ کر لاتے اور جو انہوں نے رسیوں اور ڈنڈوں کو جادو سے سانپ بنا کر دکھایا اور یہ جو ہم نے کہا ہے کہ جادوگروں نے جادو سے لوگوں کی نظروں میں سانپ بنا کر دکھائے جنہیں عصائے موسیٰ (علیہ السلام) نے لقمہ بنا لیا۔ اسے حضرت امام شعرانی قدس سرہٗ نے اپنی کتاب "الکبریت الاحمر" میں ذکر کیا ہے۔

تفسیر عالمانہ فَاُلْقِیَ السَّحَرَۃُ تو جادوگر منہ کے بل گر کر سٰجِدِیْنَ ۝ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے لگے جب انہوں نے یقین کر لیا کہ عصا کا ثعبان (اژدہا) ان کی رسیوں اور ڈنڈوں کو ہڑپ کر گیا ہے تو وہ جان گئے کہ یہ جادو نہیں۔ یہ معجزہ دیکھنے کے بعد وہ سجدہ میں گر ے۔ اس میں انہیں کسی قسم کا شک اور تردد نہ تھا۔ اس سجدے میں وہ اپنی قوت و طاقت کھو بیٹھے۔ گویا انہیں کسی دوسری طاقت نے سجدے میں گرایا ہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ کرشمے جادو کے قوانین سے باہر ہیں۔ ایسا سوائے امرِ الٰہی کے اور کسی سبب سے ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے وہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہُوا کہ ہر فن میں مہارت نافع ہے۔ جادوگروں کا موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ہتھیار ڈال دینا اسی مہارت فی فن السحر کی وجہ سے تھا۔ انھیں ان کے فن کے کمال نے بتایا کہ یہ امر فنی نہیں بلکہ امر ربی ہے نیز اس لیے کہ منتہائے سحر یہ ہے کہ مکر و فریب اور دھوکا سے دوسروں کے خیالات بدل دئے جائیں جس کی دراصل کوئی حقیقت ہی نہیں۔

سوال: تم نے یہ اضافہ بار بار کیا ہے کہ جادو ایک خیالی امر ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ تم نے یہ اضافہ کہاں سے سمجھا؟

جواب: جادوگر اپنے فن میں کامل تھے۔ حقیقۃ الشئ اگر دوسری حقیقت سے بدل جائے تو وہ کمالِ فنِ سحر ہے۔ اگر وہ عاجز نہ ہوتے تو عصائے موسیٰ کو سانپ بن جانے کو معجزہ تصوّر نہ کرتے، کیونکہ یہ بات فنِ سحر کے قاعدہ سے خارج ہے۔ نہ اسے دیکھ کر ایمان لاتے نہ ہی بارگاہِ الٰہی میں سربسجود ہوتے۔ سورۂ طٰہٰ میں جادو کے متعلق تفصیل گزر چکی ہے۔

ف: بعض مشایخ نے فرمایا: سحر، السحر سے ماخوذ ہے۔ یعنی وہ وقت جو فجرِ اول و فجرِ ثانی کے درمیان ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں روشنی اور تاریکی کا اختلاط نہیں ہوتا۔ نہ تو اسے رات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں صبح کی روشنی کی ملاوٹ ہوتی ہے اور نہ ہی اسے دن کہا جا سکتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے طلوعِ شمس کے آثار مفقود ہوتے ہیں۔ ایسے ہی جو کام جادوگر دکھلاتے ہیں اس میں حق و باطل کی ملاوٹ ہوتی ہے کیونکہ وہ باطل محض بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے اس وقت آنکھ کو جو ادراک ہوتا ہے آنکھ اسے حقیقت سمجھتی ہے حالانکہ وہ حقیقت نہیں ہوتا۔

ف: حضرت امام شعرانی قدس سرہٗ یہ تقریر لکھ کر فرماتے ہیں کہ یہ وہ کلامِ نفس ہے جسے ہم نے پہلے کبھی نہیں سنا۔

قَالُوْٓا جادوگروں نے صدق دلی سے کہا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ ہم رب العالمین پر ایمان لائے۔ یہ القی سے بدل الاشتمال ہے اس لیے کہ ان کے درمیان حرف عاطف نہیں ہے۔

غور کیجئے کہ ان خوش قسمتوں کی قسمت کیسے بدلی کہ صبح کو جادوگر (کافر) تھے اور شام کو مومن۔ اس سے
سبق ہر شخص کو خصوصیت سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے جو اپنے اقوال و اعمال و احوال پر نازاں ہے۔

برعمل تکیہ مکن زانکہ دران روز ازل
تو چہ دانی قلم صنع بنامت چہ نوشت

ترجمہ: عمل پر بھروسا نہ کر اس لیے کہ نجانے ازل میں تیرے نام پر قلم لم یزل تعالیٰ نے کیا لکھا۔

اور فرمایا:

مکن بنامہ سیاہے ملامت من مست
کہ آگہست کہ تقدیر برسرش چہ نوشت

ترجمہ: مجھ مست پر میری نامہ سیاہی پر ملامت نہ کر، کسے کیا خبر کہ اس کی تقدیر نے میرے لیے کیا لکھا ہے۔

رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝ یہ رب العالمین سے بدل ہے۔

سوال: اس اضافہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

جواب: فرعون کی قوم جاہل تھی۔ وہ اپنے آپ کو رب کہلواتا تھا۔ جب جادوگروں نے اٰمنّا بربّ العٰلمین کہا تو فرعون نے قوم سے کہا کہ یہ مجھ پر ایمان لا رہے ہیں پھر انہوں نے رب موسٰی و ھٰرون کا اضافہ کیا کہ ہم اس رب العالمین پر ایمان لائے ہیں جو موسٰی و ہارون (علیٰ نبینا وعلیہما السلام) کا رب ہے۔

قَالَ فرعون نے جادوگروں سے کہا **اٰمَنْتُمْ** بصیغۂ خبر یا ہمزۂ استفہام محذوف ہے **لَهٗ** موسٰی علیہ السلام پر ایمان لائے ہو **قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ** اس سے پہلے کہ میں تم کو موسٰی علیہ السلام پر ایمان لانے کی اجازت دیتا۔ یعنی تم میری اجازت کے بغیر ایمان لائے ہو۔ یہ لنفد البحر ان تنفد کلمات ربّی کے محاورہ پر ہے کیونکہ اس سے نہ ایمان کا اذن ممکن تھا اور نہ متوقع۔ **اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ** تمہارا بڑا (استاذ) ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا تمہیں اس پٹڑی پہ لے آیا، جو کچھ تم نے کر دکھایا اور اس کے ساتھ موافقت کر لی۔ یعنی تم نے مل کر میرے ملک پر قبضہ کرنے اور مجھے ہلاک کرنے کا منصوبہ بنالیا ہے۔

جیسا کہ سورۂ اعراف میں ہے:

ان هذا لمكر مكرتموه في المدينة۔
(یہ ایک مکر اور فریب ہے جو تم نے شہر میں پھیلایا)

اس سے پہلے کہ تم اس سے نکل جاتے۔ یا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ مُوسٰی علیہ السّلام تمہارا استاد ہے کہ اس نے تمہیں کچھ سکھایا اور کچھ اپنے پاس محفوظ رکھا جس کی وجہ وہ آج تم پر غالب آگیا ہے۔

ف : یہ تقریر بھی فرعون نے اپنی قوم کو طفل تسلّی کے طور پر سُنائی تاکہ وُہ یہ نہ سمجھیں کہ جادوگروں نے ایمان قبول کیا ہے تو کسی دانشمندی اور حق کے ظہور سے۔

فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۵ؕ پس عنقریب تم اپنے کیے کا مزہ چکھ لوگے۔ یہ لام تاکیدی ہے حالیہ نہیں اسی لیے یہ حرف استقبال کے ساتھ جمع ہوگئی ہے۔

ربط : اب فرعون جادوگروں کو بتاتا ہے کہ ان کے ساتھ وہ کیا کرے گا۔

چنانچہ کہا لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ البتہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹوں گا۔

ف : تفصیل کا باب ایدی (ہاتھ) و ارجل (پاؤں) کی کثرت کی وجہ سے ہے ورنہ قطع و تقطیع میں کوئی خاص فرق نہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے:

فتحت الباب (بصیغۂ مجرد) و فتحت الابواب بصیغۂ مزید بوجہ کثرت افراد کے۔

مِّنْ خِلَافٍ خلاف سے یعنی ہر طرف سے، اس کی دوسری جانب سے۔ مثلاً یہ کہ سیدھا ہاتھ کاٹوں گا اور اس کے ساتھ بایاں پاؤں۔ اس طرح سے تمام بدن بے طاقت ہوجاتا ہے۔ (کذا فی کشف الاسرار)

ف : یہی فعل سب سے پہلے فرعون نے کیا۔ اس سے پہلے ایسا کسی ظالم وجابر یا عادل حکمران نے نہیں کیا تھا۔ (کذا فی فتح الرحمٰن)

ف : بعض نے فرمایا کہ یہ من تعلیلیہ ہے۔ یعنی یہ کام میں اس لیے کروں گا کہ تم نے میرے خلاف کیا ہے۔ یہ قطع مذکور ایک معمولی سزا ہے۔ اور کسی کو کاروبار سے محروم کردینا فرعون جیسے جابر بادشاہ کے لیے بھی جائز نہیں کہ اپنے مخالف کو ایسی سزا دے۔ اسے اس کی حماقت پر محمول کیا جائے گا کہ سخت غلط عمل پر ایک معمولی سزا سے ڈرایا۔ لیکن یہ قول وہم پر مبنی ہے کیونکہ اس نے اپنی مخالفت کی سزا کو آگے یُوں بیان کیا:

وَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۵ میں تم سب کو دریا کے کنارے پر سُولی پہ لٹکادُوں گا اور تم تڑپ تڑپ کر مرجاؤ گے۔ اس سے دوسروں کو عبرت حاصل ہوگی۔

ف : کشف الاسرار میں ہے کہ ان دونوں سزاؤں کو جمع کروں گا (یعنی قطع کرنا اور سُولی پہ لٹکانا)

ف : مروی ہے کہ فرعون نے انہیں کھجور کے تنوں پہ لٹکایا یہاں تک کہ وُہ مرگئے۔ سورۂ اعراف میں ثم لاصلبنکم ہے۔ اس سے مہلت دے کر ان کے عذاب میں اضافہ مطلوب ہے کہ قطع ید کے بعد سُولی پہ لٹکائے جانے پر مغموم ومحزون رہیں گے۔

قَالُوْا اُن جادوگروں نے کہا جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے لَا ضَیْرَ یہ ضاد یضیر ضیرا کا مصدر ہے بمعنی ضرر یعنی تمہاری اس تہدید سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں اور نہ ہی ہم موت سے ڈرتے ہیں اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ہ بے شک ہم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہی ہمیں تیرے عذاب پر صبر کا اور توحید پر ثابت قدم رہنے کا ثواب عطا فرمائے گا۔

مسئلہ: آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان پر لازم ہے کہ وہ حق کو ظاہر کر دے اگرچہ قتل ہونا پڑے۔

فائدہ صوفیانہ حضرت عطاء رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جسے حقیقت کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے اس پر لازم ہے کہ ہر دکھ سکھ اٹھائے۔ دیکھئے جادوگروں کو جب مشاہدہ نصیب ہوا تو فرعون کو بے دھڑک کہہ دیا: لاضیر۔

حضرت شیخ قدس سرہٗ اہل اللہ کے بارے میں کہتے ہیں: ؎

دما دم شراب الم در کشند
وگر تلخ بینند دم در کشند
نہ تلخست صبرکہ بریاد اوست
کہ تلخی شکر باشد از دست دوست

ترجمہ: ہر دم دُکھ درد اٹھاتے ہیں تلخی دیکھنے کے باوجود قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ اس کی یاد میں صبر تلخ نہیں بلکہ ایسی تلخی شکر سے میٹھی ہے جو دوست کے ہاتھ سے حاصل ہو۔

حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

عاشقاں را گر در آتش می پسند لطف یار
تنگ چشم گر نظر چشمۂ کوثر کنم

ترجمہ: اگر لطف دوست عُشاق کو آگ میں چھلانگ لگانے کے لیے کہے مجھے اندھا کہنا اگر میں اس کے بعد چشمۂ کوثر کی طرف نگاہ کروں۔

اور فرمایا: ؎

اگر بلطف بخوانی مزید الطافست
وگر بقہر برانی دروں ما صافست

ترجمہ: اگر لُطف سے بلاؤ تو مزید لُطف و کرم ہے اور اگر قہر سے ہٹاؤ تو بھی کوئی فرق نہ پڑے گا اس لیے کہ میرا دل صاف ہے۔

اِنَّا نَطْمَعُ بے شک ہم پُر امید ہیں۔

حلِ لغات : المفردات میں ہے الطمع بمعنے خواہشِ نفسانی پر نفس کا کسی شے کی طرف مائل ہونا۔
اَنْ یَّغْفِرَلَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَآ یہ کہ ہمارے سابقہ جرائم مثلاً شرک وغیرہ بخش دے۔ اَنْ کُنَّا یہ کہ ہم ہیں اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ ٥ اتباعِ فرعون پر سب سے پہلے ایمان لانے والے۔ یا ہم سب سے پہلے اہلِ مشہد ہیں۔

ف : حضرت کاشفی مرحوم لکھتے ہیں، منقول ہے کہ فرعون نے حکم دیا کہ ان اہلِ ایمان کو گرفتار کر کے ان کے ہاتھ پاؤں بصورتِ مذکورہ کاٹ کر پھانسی پر لٹکایا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی گرفتاری سے خوب روئے اور پریشان ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیانی پردے اٹھا دئے یہاں تک کہ مقاماتِ انس و منازلِ قرب کا آنکھوں سے مشاہدہ کیا تو خوش ہو گئے ؎

۱ جادواں کاں دست و پا در باختند
در فضائے قرب مولیٰ تاختند

۲ گر برفت آں دست و پا برجائے آں
رست از حق بالہائے جاوداں

۳ تا بداں پر ہا بپرواز آمدند
در ہوائے عشق شہباز آمدند

ترجمہ :(۱) وہ جادوگر جنہوں نے ہاتھ پاؤں راہِ حق میں کٹوا دئے فضائے قربِ الٰہی میں خوب دوڑے۔
(۲) اگر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے تو کیا ہوا جبکہ انہیں اللہ تعالیٰ سے دائمی قوت و طاقت نصیب ہوئی۔
(۳) انہی پروں سے پرواز میں آ گئے۔ عشق کی قوت سے شہباز بن گئے۔

تفسیرِ صوفیانہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ظاہری زندگی میں جتنی تکلیف راہِ حق میں پہنچتی ہے اتنی ہی اسے روحانیت اور مشاہدۂ حق میں اضافہ نصیب ہوتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت کریمہ ہے کہ وُہ اپنے بندوں سے فانی چیزیں لے کر باقی چیزیں بخشتا ہے۔

حکایت سیدنا جعفر ابن عم النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعض غزوات میں لڑ رہے تھے اور اسلام کا جھنڈا سیدھے ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔ جب وُہ کٹ گیا تو آپ نے جھنڈا بائیں ہاتھ میں لے لیا۔ وُہ

بھی کٹ گیا تو دونوں بازوؤں میں تھام لیا حتی کہ شہید ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر تینتیس ۳۳ سال تھی اللہ تعالیٰ نے اس کے عوض انہیں بہشت میں دو پر عطا فرمائے جن کے ذریعے وہ اُڑتے ہیں جہاں جانا چاہتے ہیں جاتے ہیں اسی لیے ان کا نام جعفر طیار بھی ہے۔

ف : یہی کیفیت ہر اس خوش بخت کی ہے جو اپنے دعویٰ میں سچا ہو۔

سبق جس پر کوئی مصیبت آئے وہ اسے راحت سمجھے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو آزماتا ہے لیکن یہ دولت اسے نصیب ہوتی ہے جو ازلی خوش بخت ہوتا ہے۔ دیکھیے جادوگروں کو کس طرح مصیبت میں ڈالا گیا۔ لیکن چونکہ مشاہدۂ حق ان کی قسمت میں تھا اس لیے اسے وہ اپنے لیے راحت و رحمت سمجھ رہے تھے لیکن ایسے مرتبے والے بہت کم ہوتے ہیں کیونکہ یہ مرتبہ انجذابی ہے اور وہ سالکین کو بیک وقت نہیں بلکہ تدریجاً نصیب ہوتا ہے۔

ف : حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حال اسلام لاتے وقت جادوگروں کی طرح تھا۔

قاعدۂ تصوف : اسلام احسان یعنی مشاہدۂ حق کا وسیلہ ہے۔

سبق : جو شخص بھی اصلاح حال بذریعہ اعمال کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے وہی احوال عطا فرماتا ہے جو صاحبانِ حال کو نصیب ہوتا ہے۔

حدیث شریف : حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

من عمل بما علم ورثه الله علم ما لم يعلم۔

(جو اپنے پڑھے پر عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے وہ عمل عطا کرتا ہے جسے وہ پہلے نہیں جانتا تھا)

ف : حضرت شیخ اکبر قدس سرہ الاطہر فرماتے ہیں تم ایسے عبادت کرو جیسے حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے اظہار سے پہلے شریعتِ ابراہیمی پر کرتے تھے۔ یہ بھی آپ پر منجملہ عنایاتِ الٰہیہ سے تھا کہ اس عبادت کی ادائیگی کے بعد آپ کو رسالت و نبوت نصیب ہوئی (اگرچہ نبوت حقیقتہً آپ کو پہلے حاصل تھی لیکن ظاہر کرنے کا موقعہ اب ملا تاکہ امت کو تعلیم ہو کہ عبادت کی برکات یوں ہوتی ہیں)

ولایت کا حصول ایسے ہی ولی اللہ کا حال ہے کہ جب وہ شریعتِ مطہرہ پر مکمل طور پر عمل کرتا ہے تو اس کے قلب پر واردات الٰہیہ کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اسے قرآن مجید کے معانی الہام ہوتے ہیں یہاں تک کہ محدثین (بفتح الدال) کے زمرہ سے ہو جاتا ہے پھر اسے اللہ تعالیٰ ارشادِ خلق کے لیے مقرر فرماتا ہے جیسے رسل کرام علیہم السلام کے لیے رسالت دے کر مبعوث فرماتا رہا (چونکہ اب نبوت ختم ہے اس لیے وہ طریقہ جو پہلے عبادت کا تھا اگر اب کسی خوش نصیب کو حاصل ہو تو پھر اسے رسول بنا کر تو

(باقی صفحہ ۲۱۷ پر)

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ○ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ○ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ○ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ○ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ○ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ○ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ○ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ○ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ○ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ○ قَالَ كَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ○ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ○ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ○ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ○ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ○ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ○

ترجمہ : اور ہم نے موسٰی (علیہ السلام) کو وحی بھیجی کہ شبا شب میرے بندوں کو نکال کرلے جاؤ بیشک تمہارا تعاقب کیا جائے گا تو فرعون نے شہروں میں جمع کرنے والے دوڑائے ۔ بے شک یہ لوگوں کی مختصر سی جماعت ہے اور انہوں نے ہم سب کو غصہ میں ڈالا ہے اور بے شک ہم سب چوکس ہیں تو ہم نے ان کو باغوں اور چشموں اور خزانوں اور عمدہ مکانوں سے باہر نکالا ۔ ہم نے یوں کیا اور بنی اسرائیل کو ان کا وارث بنا دیا سو فرعونیوں نے سورج نکلتے وقت ان کا پیچھا کیا پھر جب ان دونوں جماعتوں کا آپس میں آمنا سامنا ہُوا تو موسٰی (علیہ السلام) کے ہمراہیوں نے عرض کی بیشک ہم ان کے قابو میں آ گئے موسٰی (علیہ السلام) نے فرمایا ایسا ہرگز نہ ہوگا بیشک میرا رب میرے ہمراہ ہے وہ مجھے سیدھی راہ بتائے گا ۔ پھر ہم نے موسٰی (علیہ السلام) کو وحی بھیجی کہ اپنا عصا دریا پر مار ۔ سو دریا پھٹ گیا تو اس کا ہر حصّہ بڑے پہاڑ جیسا ہو گیا ۔ اور ہم نے دُوسروں کو قریب کردیا اور ہم نے موسٰی (علیہ السلام) اور اس کے ہمراہیوں کو نجات بخشی ۔ پھر دوسروں کو غرق کردیا ۔ بے شک اس میں عبرت ہے اور ان کے اکثر بے ایمان تھے ۔ اور بے شک تمہارا رب وہی عزّت والا مہربان ہے ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۵) نہیں بھیجا جاتا البتہ ولایتِ کاملہ سے نوازا جاتا ہے) جب تمہیں راستہ معلوم ہُوا تو لازم ہے کہ اہل اللہ کا طریقہ اختیار کرو کیونکہ حقیقی بادشاہ یہی لوگ ہیں۔ اور یہ مرتبہ اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک انسان اپنی آل و اولاد اور اموال و اسبابِ دنیویہ سے مکمل طور پر انقطاع نہ کرے اور صرف اللہ تعالیٰ کا نہ ہو جائے۔ جیسے جادوگروں نے فرعون کو جواباً کہا انّا الیٰ ربنا منقلبون۔

سبق : یہ مسئلہ اس طرح سمجھ میں آئے گا کہ تم دیکھتے ہو کہ کوئی بندہ کسی سفر پر جائے تو سب چیزیں چھوڑ کر جاتا ہے تب سفر ہوتا ہے ورنہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ بندہ ضعیف ہے اور ضعیف زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

ہم اللہ تعالیٰ سے تیسیر و تسہیل کا سوال کرتے ہیں۔

(تفسیر آیاتِ صفحہ گزشتہ)

تفسیر عالمانہ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ

حلِ لغات : الایحاء بمعنے اعلام فی خفاء۔ چپکے سے کسی کو کچھ بتانا۔

سرٰی (بالکسر) و سرٰی (بالضم) و سرٰی (بالفتح) بمعنے رات کو جانا۔ ایسے ہی اسرٰی بمعنے رات کو جانا۔

اب آیت کا معنیٰ یہ ہُوا کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی فرمایا کہ اے موسیٰ (علیہ السلام) ! بنی اسرائیل کو رات کے وقت بحرِ قلزم تک لے جائیے وہاں پر میرا جو حکم پہنچے اس پر عمل کرنا۔ یہ حکم اس لیے ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کئی سال فرعون کے ہاں رہے اسے اور اس کی قوم کو بہت سمجھایا لیکن وُہ بجائے حق کو قبول کرنے کے سرکشی اور شر و فساد میں بڑھتے گئے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے مُوسیٰ (علیہ السلام) ! اپنی قوم کو رات کے وقت بحرِ قلزم کی طرف لے جائیے وہیں پر کافروں کو تباہ و برباد کروں گا۔

ف : حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحرِ قلزم تک چلے جانے کا حکم بذریعہ وحی ہُوا۔ وہ بظاہر یہ نہ جانتے تھے کہ رات کو جانا کہاں ہے اور ہماری منزلِ مقصود کیا ہے۔ پھر ان کو جبریل علیہ السلام کا وہ وعدہ بھی یاد تھا جو آخری الوداع پر انہوں نے کیا تھا کہ اب میں، آپ اور فرعون کا لشکر بحرِ قلزم کے کنارے پر ملیں گے۔

اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ○ بے شک تمہارے پیچھے فرعون چلا آئے گا اور اس کے ساتھ اس کا لشکر

بھی ہوگا۔ یہ رات کو چلے جانے کی علت ہے۔ وہ یہ کہ اے موسیٰ (علیہ السلام)! تم اپنی برادری کو لے کر چلو پھر فرعون بمعہ لشکر تمہارا تعاقب کرے گا لیکن وہ آپ تک پہنچ نہ سکے گا۔ یہاں تک کہ تم دریا کو عبور کر و گے اور وہ تمہارے تعاقب میں بمعہ لشکر اور قوم دریا میں ڈوب کر مر جائے گا۔ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ جب فرعون کو موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کی روانگی کا علم ہوا تو فرعون نے بھیج دیئے فِي الْمَدَآئِنِ ان شہروں میں جو اس کے دار الحکومت کے قرب وجوار میں تھے حٰشِرِيْنَ ○ جمع کرنے والے، تاکہ تمام لوگ اکٹھے ہو کر موسیٰ علیہ السلام کا پیچھا کریں۔

ف : کاشفی مرحوم نے لکھا کہ قبطیوں کو شام کے وقت علم ہوا کہ بنی اسرائیل رات کے وقت یہاں سے نکل گئے ہیں۔ صبح کو اس لیے علم نہ ہو سکا کہ ان کا خیال تھا کہ شاید بنی اسرائیل عید کی تیاری میں مصروف ہیں لیکن شام تک ان کے نہ ملنے پر انہیں یقین ہو گیا کہ وہ یہاں سے کوچ کر گئے ہیں۔ دوسرے روز ان کا پیچھا کرنا چاہا تو ہر قبطی گھرانے کا ایک ایک معزز فوت ہو گیا وہ ان کی تدفین وغیرہ میں لگے رہے۔ اس دن فرعون نے شہروں سے بہت بہادر و دلاور لوگ بلوائے۔

ف : کشف الاسرار میں ہے کہ جس رات موسیٰ علیہ السلام قوم کو لے کر چلے، صبح کو اتوار کا دن تھا۔ اسی دن قبطیوں کے اعزہ فوت ہوئے وہ ان کی تدفین میں مصروف ہو گئے تو فرعون نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی گرفتاری کا حکم جاری کیا۔ دوسرے دن یعنی سوموار کو لشکر جمع کر کے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے تعاقب کے لیے شوریٰ کا اجلاس ہوا۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ یعنی جب فرعون نے شہروں سے امراء اور بھاری لشکر بلوایا تو مجلس شوریٰ کے اراکین نے کہا لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ○ بنی اسرائیل گنتی کے چند افراد ہیں۔

سوال : مجلسِ شوریٰ کے اراکین نے بنی اسرائیل کو گنتی کے افراد (یعنی معمولی اور نہایت قلیل) بتایا حالانکہ وہ اس وقت چھ لاکھ ستر ہزار افراد تھے اور یہ کوئی معمولی تعداد نہیں۔

جواب : یہ بہ نسبت لشکر فرعون کے معمولی گنتی ہے اس لیے کہ فرعون کا لشکر شمار سے باہر تھا۔

ف : التکملہ میں ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا تو اس وقت اس کے ساتھ دس لاکھ گھوڑے تھے اور اس کا مقدمۃ الجیش ستر لاکھ افراد پر مشتمل تھا۔

حل لغات : الشرذمۃ مختصر سے گروہ کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد قلیلون لایا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ وہ بہت ہی تھوڑے تھے۔ وہ بایں طور کہ بنی اسرائیل کا ہر قبیلہ بہ نسبت دوسرے کے قلیل تھا۔

وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ○ اور بے شک وہ ہمیں بڑے غصے میں ڈالنے والے ہیں۔

حلِ لغات: الغیظ شدید ترین غصّہ کو کہا جاتا ہے اور غضب وغیظ ایک حرارت کا نام ہے جو قلب کے خون کھولنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ وہ ہمارے دین کی مخالفت کر کے ہمیں غیظ وغضب پر مجبور کر رہے ہیں) اور مزید برآں یہ کہ انہوں نے ہم سے عاریت کے طور کچھ زیورات واموال لیے۔ وہ بھی ساتھ لے گئے۔ اس وجہ سے اب ہمارا خون ان کے لیے کھول رہا ہے کہ وہ جہاں بھی مل جائیں ہم ان کو کھا جائیں۔

ف: زیورات اور اموال اس لیے کہ بنی اسرائیل مفلس تو تھے ہی، اور ان دنوں عید منانے کے لیے گھروں میں کچھ نہ تھا اس لیے قبطیوں سے کچھ نقدی ادھار لی اور بنی اسرائیل کی عورتوں نے قبطی عورتوں سے سنگار کے لیے زیورات لیے۔ جب وہ اسی شب یعنی عید گزارنے کے بعد چلے گئے تو بنی اسرائیل کی عورتیں زیورات بھی ساتھ لے گئیں۔ اور بنی اسرائیل چونکہ قبطیوں کے نوکر اور غلام تھے قبل ازیں باہر جاتے تھے تو قبطیوں سے اجازت لے کر جاتے تھے اس دفعہ ان سے اجازت لیے بغیر چلے گئے۔ قبطیوں کو ان کے مال اور زیورات ساتھ لے جانے کے علاوہ ان کے بلا اجازت چلے جانے پر بھی بہت غصہ آیا۔

وَاِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ ○

حلِ لغات: شے کے مجموعہ کو جمیع وجمع وجماعۃ کہا جاتا ہے۔ الحذر بمعنے الاحتراز عن مخیف۔ (ڈراؤنی شے سے بچنا)۔

(اب معنی یہ ہُوا کہ ہم ان کے لیے ایک ایسی خطرناک ترین جماعت ہیں کہ جس سے وہ ہر وقت گھبرائے رہتے تھے اس کی وجہ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل اقلیت میں تھے اور فرعون کے متبعین لا تعداد۔ اسی لیے قبطی ان کو بہ نظرِ حقارت دیکھتے اور ان کو کسی گنتی میں نہیں لاتے تھے۔ اور پھر ان کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ بنی اسرائیل کبھی اقتدار پر آسکیں گے۔ اور قبطیوں پر ان کا غلبہ ممکن ہی نہیں تھا۔ لیکن اب ایسا کام کر دکھلایا جس سے قبطیوں کے غصہ کی آگ اور بھڑکی۔ وہ کہتے ہم ایک عظیم قوم ہیں اور غیظ وغضب ہمارا شیوہ ہے اور جس بڑے سے بڑے کام کا ارادہ کرتے ہیں اسے کر گزرتے ہیں۔ کوئی ہمیں چھیڑتا ہے تو پھر ہم اسے ہرگز نہیں چھوڑتے۔ یہ تقریر فرعون کی ہے جسے اہلِ مدائن کے سامنے بیان کیا تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ بنی اسرائیل سے خوف زدہ ہے۔)

ف: بعض علماء نے فرمایا کہ حاذرون بمعنے ہتھیاروں والے اور جنگی سازوسامان اور امورِ جنگ کو بخوبی جاننے والے، بخلاف قومِ موسیٰ کے کہ وہ نہ تو ہتھیار رکھتی اور نہ جنگی امور سے واقف۔ اس معنی پر حاذر بمعنی جنگ کے لیے تیار رہنے والا۔ (کذا فی الصحاح)

فَاَخْرَجْنٰهُمْ پس ہم نے فرعون اور اس کی قوم کو نکالا بایں طور کہ ان کے دل میں خیال ڈالا کہ وہ بنی اسرائیل کو پکڑنے کے لیے یہاں سے نکلیں۔

سوال: فرعون اور اس کی قوم نکلی تو تھی اپنے اختیار سے لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب فرمادیا۔

جواب : یا تو اس لیے کہ ہر فعل کا خالق وہی ہے یا یہ اسناد مجازی ہے ۔

مِّنۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ○ باغات سے جو دریائے نیل کے دونوں کنارے پر پھیلے ہوئے تھے اور پانی کے چشموں سے ۔

حل لغات : المفردات میں ہے کہ پانی کے چشمے کو آنکھ سے تشبیہ دی گئی ہے اور وجہ تشبیہ جریان الماٴ ہے ۔

ف : کشف الاسرار میں ہے کہ یہاں عیون سے نہریں مراد ہیں ۔ کاشفی نے مطلقاً بہنے والا پانی مراد لیا ہے ۔

وَّ کُنُوۡزٍ اور خزانوں یعنی ظاہری مال، سونا چاندی وغیرہ ۔ اسے کنز اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے حقوقِ الٰہی ادا کئے جاتے ہیں اگرچہ وُہ زمین کے اوپر بھی پڑے ہوں ۔ جس سے اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا نہ کیے جائیں وہ کنز نہیں خواہ وہ ساتوں زمینوں کے نیچے ہو ۔ دراصل مالِ مجموع و محفوظ کو کنز کہا جاتا ہے ۔

کنوز و رکوز میں فرق رکاز وہ مال جو زمین میں ہو پیدائشی طور یا کسی نے خزانہ بنا رکھا ہو ۔ معدن وُہ مال جو زمین میں پیدائشی طور پر ہو ۔ کنز وہ مال جو کسی نے خزانے کے طور جمع کر رکھا ہو ۔

مصر کے خزانے خریدۃ العجائب میں ہے کہ مصر کی زمین میں بکثرت خزینے ہیں ۔ اسی لیے کہا جاتا ہے اس کی زمین کے اکثر حصوں میں سونا مدفون ہے ۔ یہاں تک کہ یہ بھی مشہور ہے کہ اس کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو دفینوں سے خالی ہو ۔

وَّ مَقَامٍ کَرِیۡمٍ○ اور حسین منزلیں اور بہترین مجلسیں ۔

ف : سہیلی نے کتاب التعریف والاعلام میں لکھا کہ اس سے ارضِ مصر کا فیوم مراد ہے ، جیسا کہ مفسرین نے فرمایا ہے ۔ الفیوم بمعنے الف یوم (ہزار دن) (کذا فی التکملہ) اور یہ ایک بہت بڑا شہر ہے جسے حضرت یوسف صدیق علیٰ نبینا وعلیہ السلام نے بنایا اور اس کی ایک ایسی نہر تھی جو عجائبِ دنیا میں سے ایک تھی وہ دریائے نیل سے متصل ہوتی تھی اور سردیوں میں منقطع ہو جاتی تھی ۔ اس شہر سے تین سو ساٹھ بستیاں ملحق تھیں جو سب کی سب سرسبز و شاداب تھیں ۔ اس نہر کا زیادہ تر پانی انہی بستیوں میں کھپ جاتا اور یوسف علیہ السلام نے اسے سال کے دنوں کے برابر تیار کرایا تھا ۔ جب قحط پڑتا تو ہر بستی مصر کی تمام آبادی کے اخراجات کی کفیل ہوتی ۔ ارض الفیوم میں بہت بڑے باغات اور درخت اور میوہ جات نہایت لذیذ تھے ۔ اس میں کماد بکثرت پیدا ہوتا تھا ۔

کَذٰلِکَ ؕ جیسے فرعون اور اس کی قوم کا مصر سے نکالنا عجیب و غریب تھا ایسے ہی یہ اخرجنا کا مصدر تشبیہی ہے ۔

ف : حضرت ابو اللیث نے اس کا ترجمہ یُوں کیا کہ : اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم یُونہی کرتے ہیں اس کے ساتھ جو ہماری نافرمانی کرے۔

وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۝ اور ہم نے ان باغات اور چشمہ جات اور خزائن اور مقام کریم کا مالک بنادیا بنی اسرائیل کو، جیسے وارث مورث کی جائداد کا کامل مکمل مالک ہوتا ہے ایسے ہی بنی اسرائیل فرعون اور اس کی قوم کے مالک بنے۔ گویا یہ اس وقت سے مالک بن گئے جب سے فرعون اور اس کی قوم گھروں سے نکلی اگرچہ اس پر قابض بعد میں ہوئے۔

(خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو فرعون اور اس کی قوم کے باغات، چشمہ جات اور خزائن اور مکانات کا وارث بنایا۔ مروی ہے کہ قبطیوں کی تباہی کے بعد بنی اسرائیل مصر میں آکر ان کی تمام جائداد پر قابض ہوگئے) لیکن صحیح تر یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ہی بنی اسرائیل کو مصر کا کامل طور پر قبضہ میسر آیا جیسا کہ کسی نے لکھا کہ وُہ اگرچہ قبطیوں کی جائداد کے مالک ہوئے لیکن مصر میں واپس نہ آئے بلکہ ملک شام میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔

فرعون کی دریائے نیل کی طرف روانگی جب فرعون نے لشکر کو آراستہ و پیراستہ کرلیا تو ساٹھ ہزار افراد مقدمۃ الجیش مقرر کیے ساٹھ ہزار میمنہ اور ساٹھ ہزار میسرہ اور ساٹھ ہزار ساقہ مقرر کرکے خود گھنے لشکر کے درمیان چلا گیا اور لشکر سرتا پا لوہے کے لباس سے ملبوس اور دریا کی موج کی طرح تیز رفتار۔ ان کا خیال تھا کہ وُہ بنی اسرائیل کے خون سے ہولی کھیلیں گے۔

فَاَتْبَعُوْهُمْ (پس فرعونیوں نے ان کا پیچھا کیا)

حلِ لغات : ہمزہ قطعی ہے، جیسے کہا جاتا ہے : اتبعہ اتباعا۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی کے ساتھ ملنے کی طلب میں ہو۔ و تبعہ تبعا یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی کے پاس سے گزرے۔

اب معنیٰ یہ ہُوا کہ ہم نے فرعون اور اس کے لشکر کے نکالنے اور ان کے ملک کو بنی اسرائیل کے قبضہ میں دینے کا ارادہ کیا تو وُہ قبطی گھروں سے نکل پڑے اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو جا ملے مُّشْرِقِیْنَ ۝

حلِ لغات : یہ اشرق واصبح و امسی و اظھر کے قبیل سے ہے بمعنے شروق وصبح و مساء و ظہیرہ میں داخل ہوا یعنی وہ صبح اشراق کے وقت داخل ہُوئے۔ یہ فاعل یا مفعول دونوں سے حال ہے کیونکہ دخول مذکور ہر ایک سے متعلق ہے۔

ف : وہ قبطی بنی اسرائیل کو صبح کے وقت جا ملے اس وقت بنی اسرائیل دریائے قلزم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے اور ارادہ کر رہے تھے کہ اب دریائے قلزم کو کیسے عبور کریں عین اس وقت ان کے پیچھے فرعون بھی

لشکر لے کر دریائے قلزم تک پہنچ گیا۔

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ پس جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے قریب ہوئے یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا لشکر دیکھ رہے تھے

حلِ لغات : ترٰی باب تفاعل یعنے ایک دوسرے کو دیکھنا اور ایک دوسرے کے برابر میں کرنا۔ (کذا فی التاج)

قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۝ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا کہ دشمن ہمارے پیچھے آچکا ہے، وہ ہمیں خوب ستائے گا، اس سے مقابلہ کی ہمیں طاقت بھی نہیں اور بھاگنے سے بھی رہے، کیونکہ آگے دریا ہے۔ قَالَ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا : كَلَّا ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ ایسی باتیں چھوڑو اور تسلّی رکھو کہ دشمن تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ میرے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ تمہیں نجات بخشے گا۔ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ بے شک میرا پروردگار مدد کرنے، حفاظت کرنے اور مہربانی کرنے میں میرے ساتھ ہے۔

فائدہ صوفیانہ : حضرت جنید رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کی عنایت پہلے ہوئی یا رعایت۔ فرمایا کہ عنایت اس وقت ہوئی تھی جب انسان کا گارہ بھی تیار نہ ہوا تھا (اور رعایت بعد کو)۔

سَیَهْدِیْنِ ۝ مجھے نجات کے راستہ کی رہبری عطا فرمائے گا۔

حبیب و کلیم میں فرق [1] محققین نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کلام میں معیّت کو پہلے بیان کیا کما قال، ان معی ربی (بے شک میرے ساتھ میرا پروردگار ہے) اور ہمارے حضور نبی پاک شہِ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کلام میں اللہ تعالیٰ کا نام پہلے اور اپنی معیت بعد کو بیان کی۔ چنانچہ فرمایا :

ان اللہ معنا۔ (بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے)

تاکہ عارفین کے قلوب روشن ہوں کہ کلیم اللہ علیہ السلام نے پہلے اپنے آپ کو پھر اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور یہ مرید کا مقام ہے اور حبیب علیہ السلام نے پہلے حق کو پھر اپنے آپ کو دیکھا اور یہ مقامِ مراد ہے۔ مُرید وُہ ہوتا ہے جس کے ہر حکم کی پابندی لازمی ہے اور مراد وُہ ہے کہ جو اس کے منہ سے نکلے اسے پُورا کیا جائے ؂

---

[1] جیسے اس کلام میں محققین کو فخر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اللہ کا نام لیا اسی لیے افضل المرسل ہیں ہمیں اعلحضرت امام اہلِ سنّت فاضل بریلوی کے ترجمۂ قرآن پر فخر ہے کہ بسم اللہ حبیبی اور ترکیب قرآنی میں پہلے اللہ کا نام لکھا بعد میں مفہوم بخلاف دوسرے تراجم کے کہ ان میں اللہ کا نام بعد میں ہے اور مفہوم پہلے۔ اویسی غفرلہٗ

ایں یکی را روے او در رُوے دوست
و آں دگر را روے او خود رُوے او ست

ترجمہ : ایک وُہ جس کا منہ دوست کی جانب ہے دوسرا وہ ہے نہ اس کے منہ کی جانب ہی دوست کی توجہ ہو۔

نکات (۱) کشف الاسرار میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو اکیلا پاکر کہا : معی ربی۔ ورنہ انہیں ان اللہ معنا کہنا چاہیے تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی خودی کو پیشِ نظر رکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ جانتے تھے (جیساکہ انبیاء علیہم السلام کے لیے ہمارا عقیدہ ہے، کہ انھیں لبعطائے الٰہی علمِ غیب حاصل ہوتا ہے) کہ لبعد کو ان کی قوم گوسالہ پرستی کرے گی اس لیے صرف اپنے آپ کو مقدم فرمایا اور ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے یارِ غار سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کو ساتھ ملایا چنانچہ فرمایا :

انّ اللّٰہ معنا۔ (بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے)

(۲) موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لیے اپنے رب کی معیّت کا دعویٰ کیا۔ کما قال :

انّ معی ربّی سیھدین۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کے لیے اپنی معیّت کا اظہار فرمایا۔ کما قال تعالیٰ :

ان اللہ مع الذین اتقوا۔

(۳) موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کہا اللہ تعالیٰ نے اسے پُورا فرمایا کہ انھیں نجات بخشی اور دشمن کے مکر و فریب سے بچایا لیکن ادھر امتِ مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خود وعدہ فرمایا اور پھر اسے پُورا کر دکھلایا اور انھیں گناہوں کے غم سے نجات بخشی اور انہیں اپنی رحمت و مغفرت تک پہنچایا۔

حکایت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر خفیہ ایمان لانے والا راستے میں موسیٰ علیہ السلام کے آگے آگے تھا ، پُوچھا : کہاں جا رہے ہو آگے دریا ہے پیچھے فرعون ، کیسے نجات پاؤ گے ؟ آپ نے فرمایا میں کیا کرسکتا ہُوں مجھے جیسے حکم ہوا ہے اسی طرح کر رہا ہُوں ، آگے اس کی مرضی جو چاہے کرے۔

دعائے موسیٰ علیہ السلام حضرت عبداللہ بن سلام سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام دریائے نیل کے کنارے پر پہنچے تو دُعا مانگی :

یا من کان قبل کل شیٔ والمکون لکل شیٔ والکائن بعد کل شیٔ اجعل لنا مخرجا۔

(اے وہ ذات جو سب سے پہلے تھی اور ہر شے کو پیدا کرنے والی اور ہر شے کے بعد بھی باقی رہے گی ،

ہمارے لیے راستہ کھول دے)

(۲) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا اعلمك الكلمات التی قالهن موسٰی حین انفلق البحر۔

(میں تمہیں وہ دعا نہ سکھاؤں جو موسٰی علیہ السلام نے دریا عبور کرتے وقت پڑھی تھی)

میں نے عرض کی: ہاں جی (ضرور سکھائیے)!

آپ نے یہ دُعا پڑھی:

اللهم لك الحمد واليك المشتكى وبك المستغاث وانت المستعان ولا حول ولا قوة الا بالله۔

(اے اللہ! تیرے لیے حمد اور تیری طرف شکوہ اور تجھی سے فریاد ہے اور تو ہی مددگار ہے اور نہ ہی تکلیف سے بچنے کی ہماری ہمت ہے اور نہ ہماری کوئی طاقت ہے سوائے تیرے)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے جب سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ دعا سیکھی ہے اسے کبھی ترک نہیں کیا۔

فَاَوۡحَيۡنَآ اِلٰى مُوۡسٰٓى اَنِ اضۡرِبۡ بِّعَصَاكَ الۡبَحۡرَ ؕ پس ہم نے موسٰی (علیہ السلام) کو وحی کی کہ اے موسٰی! مار دے دریا پر عصا۔ اس دریا سے دریائے قلزم مراد ہے۔ اور دریا کو بحر اس کی وسعت و فراخی کی وجہ سے کہا جاتا ہے اور بحر القلزم بحر فارس کا ایک حصہ ہے۔ القلزم بضم القاف وسکون اللام وضم الزاء مصر کی طرف ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ وہاں سے مصر تک تین روز کا سفر تھا۔ یہ شہر بعد میں ویران ہو گیا۔ اس جگہ کو آج کل (بزمانۂ صاحبِ روح البیان) سویس کے نام سے پکارتے ہیں جو کہ عجرود (شہر) کے بالمقابل واقع ہے مکہ مکرمہ کے لیے مصر سے جانے والے حجاج وہاں جا کر اترتے تھے۔ اسی کے قریب ہی فرعون اور اس کی قوم بحر قلزم میں غرق ہوئی تھی۔ بحر القلزم سیاہ اور نہایت ہی پُر وحشت دریا ہے اس میں ظاہراً و باطناً کوئی خیر و بھلائی نہیں رکھی گئی۔ اسی دریا کے کنارے شہر مدین آباد ہے۔ یہ بھی ویران ہو گیا ہے۔ اسی میں وہ کنواں ہے جس سے موسٰی علیہ السلام نے شعیب علیہ السلام کی بکریوں کو پانی پلایا تھا لیکن اب یہ بھی ویران ہے۔

ف: کاشفی مرحوم نے فرمایا موسٰی علیہ السلام نے دریا کے کنارے پر پہنچ کر عصا مارا اور دریا کو فرمایا: اے ابو خالد! ہمیں راستہ دے۔

فَانۡفَلَقَ فاء فصیحیہ ہے یعنی اس کے بعد موسٰی علیہ السلام نے عصا مارا۔ فانفلق تو دریا کا پانی پھٹ گیا

یعنی دریا چر گیا تو اس میں موسیٰ علیہ السلام کے بارہ گروہوں کی گنتی کے برابر بارہ راستے بن گئے۔ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ تو اس میں ٹکڑا متفرق ہوگیا۔

ف : المفردات میں ہے الفرق و الفلق کا تقریباً ایک ہی معنیٰ ہے لیکن الفلق شے کے چِر جانے پر اور الفرق شئے کے جُدا ہونے پر بولا جاتا ہے۔ اب الفرق کا معنیٰ ہُوا ایک ٹکڑا جُدا کیا ہُوا۔

قاعدۂ تجوید : کل فرق کو تفخیم و ترقیق دونوں طرح پڑھنا جائز ہے لیکن تفخیم اُولیٰ ہے۔

كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۝ اونچے پہاڑ کی طرح، یعنی وُہ پہاڑ جو آسمان کی جانب اونچا اور اپنے ٹھہرنے کے مقام پہ ثابت اور قائم ہو۔

حلِ لغات : امام راغب رحمہ اللہ تعالیٰ نے المفردات میں لکھا ہے الطود عظیم پہاڑ کو کہا جاتا ہے اسے العظیم سے موصوف کرنے میں اشارہ ہے کہ اس کا ہر حصہ باعظمت تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے بالمقابل کوئی پہاڑ تھا اسی لیے اسے العظیم سے موصوف کیا گیا۔ جب دریا میں راستے بنے تو ہر قبیلہ اپنے لیے ایک راستہ منتخب کر کے چل پڑا۔

ف : کاشفی مرحوم نے لکھا کہ دریا میں آندھی چلی جس سے دریا کے راستے نہایت خشک ہو گئے جس پر بنی اسرائیل آسانی سے گزرتے چلے گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا :

فاضرب لہم طریقاً فی البحر یبسا۔

(تو ان کے لیے دریا میں ایک خشک راستہ مقرر کیجئے)

وَاَزْلَفْنَا اور ہم نے بنی اسرائیل کے قریب کر دیا۔

حلِ لغات : تاج المصادر میں ہے کہ الازلاف بمعنے نزدیک اور جمع کرنا۔ ان دونوں کی تائید اسی آیت سے کی گئی ہے لیکن پہلا معنی احسن ہے۔

ثَمَّ وہاں پر، یعنی جہاں سے دریا پھٹ گیا۔ اس میں اشارہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم دُور چلی گئی تو پھر فرعون کی قوم دریا میں پہنچی **الْاٰخَرِيْنَ ۝** دوسروں کو یعنی فرعون اور اس کی قوم کہ بنی اسرائیل جہاں سے دریا میں داخل ہوئے وہ بھی دریا کو خشک دیکھ کر اس میں داخل ہو گئے **وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ۝** اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کے سب ساتھیوں سمیت نجات دے دی یعنی وہ سب کے سب دریا میں غرق ہونے سے بچ نکلے جیسے داخل ہوئے تھے ویسے ہی صحیح وسالم سب کے سب بلا کم وکاست باہر نکلے **ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝** پھر ہم نے دوسروں کو دریا جاری کر کے ڈبو دیا یعنی جب بنی اسرائیل صحیح سالم دریا سے باہر نکل آئے تو موسیٰ علیہ السلام نے چاہا کہ اب دریا اپنی حالت پہ

آ جائے کیونکہ انھیں خدشہ تھا کہ قبطی اور فرعون اگر دریا کے ان راستوں سے چلے آئے تو پھر ان کی خیر نہیں. اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم تھا اترك البحر رھوا (دریا کو اسی صاف حالت میں چھوڑ دے) کیونکہ فرعون اور اس کی قوم غرق ہونے والی ہے ۔ اسی لیے موسیٰ علیہ السلام نے دریا کو اسی حالت میں چھوڑ دیا ، یہاں تک کہ فرعون اور اس کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے غرق کردیا ، جیسا کہ متعدد مقامات پر یہ واقعہ بیان ہوا ہے ۔

دن دسواں اور رات گیارھویں مروی ہے کہ جس دن فرعون لشکر سمیت غرق ہوا اور موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو نجات کی راہ پر لے گئے پیر کا دن تھا اور محرم کی دس تاریخ تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس نعمت پر شکرانے کا روزہ رکھا ۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً بے شک ان تمام تفاصیل مذکورہ بالخصوص نجاتِ موسیٰؑ اور غرقِ فرعون میں البتہ بہت بڑی عبرت ہے عبرت گیروں کے لیے وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ اور نہ تھے ان کے اکثر یعنی اہلِ مصر۔ اس سے فرعون اور اس کی قوم مراد ہے مُّؤْمِنِیْنَ○ ایمان لانے والے ۔ منقول ہے کہ ان میں سوائے بی بی آسیہ کے ایک بھی اہلِ ایمان نہ تھا ہاں خربیل تو تھا ہی کیونکہ اس کا ذکر قرآن مجید میں مصرح ہے تیسری وہ بی بی مریم بنت ناموشا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے مزار کا پتا دیا تھا جب موسیٰ علیہ السلام مصر سے ہجرت کر رہے تھے وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ اور بیشک تیرا پروردگار البتہ وُہ غالب اپنے اعدا سے بدلہ لے سکتا ہے جیسے فرعون اور اس کی قوم سے بدلہ لیا الرَّحِیْمُ○ مہربان ہے اپنے دوستوں کے لیے ، جیسے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل پر مہربانی فرمائی ۔

قاعدہ عجیبہ فقیر (علامہ اسمٰعیل حقی قدس سرہٗ) کہتا ہے کہ انّ فی ذٰلك الخ اس سورہ میں آٹھ بار آیا ہے ؛

(۱) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کا ذکر ہے ۔

(سوال : تم نے کیسے سمجھا کہ اس میں حضور علیہ السلام کا ذکر ہے؟)

جواب : اگرچہ حضور علیہ السلام کا ذکر صراحۃً نہیں البتہ کنایۃً تو ضرور ہے ۔

(۲) موسیٰ علیہ السلام کا ذکر

(۳) ابراہیم علیہ السلام کا ذکر

(۴) نوح علیہ السلام کا ذکر

(۵) ہُود علیہ السلام کا ذکر

(۶) صالح علیہ السلام کا ذکر

(۷) لوط علیہ السلام کا ذکر
(۸) شعیب علیہ السلام کا ذکر

ف : ان اذکار میں جتنے واقعات گزرے ہیں ان میں لفظ اکثرہم سے کافر مراد ہیں۔

ف : ان مقامات کے علاوہ اور جگہوں پر بھی وما کان اکثرھم مؤمنین سے کفار مراد ہیں اور عبرت کا حکم ان لوگوں کو ہے جو واقعہ میں موجود تھے یا جو لوگ بعد کو (قیامت میں) آنے والے ہیں۔ اس سے قریش مراد ہیں کیوں کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون اور دیگر کفار اور حضرات انبیاء علیہم السلام کے قصے حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنے اسی لیے ان کے لیے عبرت کا حکم زیادہ موزوں ہے کیونکہ انھیں یقین تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے سُنے بغیر بیان فرمائے ہیں تو یہ ان کا معجزہ ہے فلہذا اس اعتبار سے یہ ان کے لیے ایمان لانے کا موجب قوی تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان کرنا یقیناً بذریعہ وحی صادق ہے اور یہ سوائے نبی (علیہ السلام) کے اور کوئی نہیں بیان کرسکتا۔

ف : انّ فی ذٰلك لاٰیۃ کے جملہ واقعات ان لوگوں کے لیے بھی عبرت ہیں جو غرق ہوئے پھر ان کے لیے جنہوں نے انہیں دیکھا اور ایسے ہی بعد کو آنے والوں کے لیے بھی عبرت ہے۔

ف : بعض مفسرین نے لکھا کہ وما کان اکثرھم کی ضمیر ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زمان کافروں کی طرف راجع ہے۔ اب معنیٰ یُوں ہُوا کہ اس قصہ سے پہلے کا بیان بھی ان کے لیے عبرت ہے لیکن ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں یعنی وُہ کافر جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ سُنا۔ ان سے اہلِ مکہ مراد ہیں کیونکہ انہوں نے نہ تدبیر سے کام لیا اور نہ ہی عبرت حاصل کی۔

سبق : اہلِ حق پر لازم ہے کہ وُہ فرعون اور دیگر اقوام کے حالات سے عبرت حاصل کریں تاکہ ان کی طرح عذاب میں مبتلا نہ ہوں۔

تفسیر صُوفیانہ

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ بے شک تمہارا رب ان لوگوں سے بدلہ لینے پر غالب ہے جنہوں نے اس کی تکذیب کی الرَّحِيْمُ بہت بڑا مہربان ہے اسی لیے انہیں مُہلت دیتا ہے اور ان کے عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا باوجودیکہ وُہ لوگ بڑی بڑی آیات کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن پھر بھی منکر ہو کر عذاب کے مستحق ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرتے ہُوئے ان کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔

ف : اس میں نبی علیہ السلام کے لیے تسلّی ہے کیونکہ کفار کی تکذیب پر آپ کا قلب مبارک محزون و مغموم ہو جاتا باوجودیکہ معجزات دیکھتے پھر بھی نہ مانتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو سابقہ امم کے مختلف قصے سنائے تاکہ آپ کو تسلی ہو اور آپ ان امور میں سابقہ انبیاء علیہم السلام کی اقتداء کریں یعنی صبر فرمائیں جب آپ کی قوم (باقی برصفحہ ۲۲۹)

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ۘ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا

فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ۝ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۝ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ۝

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝

اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الَّذِيْ

خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۝ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝

وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۝ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۝

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝

وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۝ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ وَلَا

تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ۝ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ

تَعْبُدُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ

وَالْغَاوٗنَ ۝ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ۝ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ۝ تَاللّٰهِ اِنْ

كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ۝

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ۝ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ۝ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝

ترجمہ: اور ان پر ابراہیم (علیہ السلام) کی خبر پڑھیے جبکہ انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے
فرمایا کہ تم کس کی عبادت کرتے ہو انہوں نے کہا کہ ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں پھر ہم ان کی عبادت
کے لیے جمع بیٹھے رہتے ہیں فرمایا کہ کیا وہ تمہاری سنتے ہیں جب تم پکارتے ہو یا یہ تمہیں کوئی نفع
یا نقصان پہنچاتے ہیں انہوں نے کہا بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسے ہی کرتے پایا فرمایا تو کیا تم
دیکھتے ہو کہ کس کی پرستش کر رہے ہو تم اور تمہارے پہلے آباؤ اجداد تو بے شک پروردگار عالم کے
سوا تمام میرے دشمن ہیں۔ وہ جس نے مجھے پیدا کیا وہی مجھے ہدایت دے گا اور وہی مجھے

کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا بخشتا ہے اور وہی مجھے موت دے گا پھر مجھے زندہ کرے گا اور وہی ہے جس سے میں پُر امید ہوں کہ وُہ قیامت میں میری لغزش سے درگزر فرمائے گا اے میرے پروردگار! مجھے حکم عطا فرما اور مجھے نیکو کار لوگوں سے ملا دے اور آنے والی نسلوں میں میری ناموری جاری رکھ اور مجھے نعمتوں کے باغات اور بہشت کے وارثوں میں بنا اور میرے باپ کو بخش دے بیشک وہ گمراہوں میں سے ہے اور مجھے رسوا نہ کرنا جس دن سب اٹھائے جائیں گے جس دن نہ مال نفع دے گا نہ بیٹے۔ مگر وُہ جو اللہ کے ہاں سلامت دل لائے گا اور پرہیز گاروں کے لیے بہشت قریب لائی جائے گی اور گمراہوں کے لیے دوزخ ظاہر کی جائے گی اور انہیں کہا جائے گا کہ کہاں ہیں وُہ جن کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے تھے کیا وہ تمہاری مدد کریں گے یا بدلہ لیں گے پھر وہ اور سب کے سب گمراہ اور ابلیس کا تمام لشکر جہنم میں اوندھے منہ گرایا جائیگا کہیں گے اور وہ اس میں آپس میں جھگڑیں گے بخدا ہم یقیناً کھلی گمراہی میں تھے جبکہ ہم تمہیں پروردگار عالم کے برابر خدا مانتے تھے اور ہمیں مجرموں نے بہکایا سو اب ہمارا کوئی سفارشی نہیں اور نہ ہی کوئی غمخوار دوست۔ تو کسی طرح ہمیں دنیا میں واپس لوٹنا ہوتا تو مسلمان ہو جاتے بے شک اس میں عبرت ہے اور ان کے اکثر مومن نہیں تھے اور بے شک تمہارا رب وُہی عزت والا مہربان ہے۔

(صفحہ ۲۲۷ سے آگے) ضد و عناد پر اڑ گئے پھر آپ کو کشادگی کا انتظار ہو یعنی دُکھ اور تکلیف دفع ہو اور آپ خوش اور راضی ہوں۔ جیسا کہ مشہور ہے :

اصبروا تظفروا کما ظفروا۔

(صبر کرو فتح پاؤ گے جیسے اگلے لوگوں نے فتح پائی)

حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ نے فرمایا : ؎

سروش عالم غیبم بشارتے خوش داد
کہ کس ہمیشہ بگیتی دژم نخواہد ماند

ترجمہ : عالم غیب کے فرشتے نے مجھے خوشخبری دی ہے کہ کوئی شخص اس دُنیا میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔

تفسیر عالمانہ ۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ تلاوت سے ہے بمعنے پے در پے پڑھنا اور لفظ قرأت عام ہے۔ یعنی لفظ قرأۃ سے پڑھنا مراد ہوتا ہے اس میں تتابع یعنی پے در پے کی قید نہیں یعنی آپ

پارہ ۱۹ سورۃ ۲۶

مشرکین کے سامنے پڑھیے اور اہلِ مکہ کو خبر دیجئے نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ○ ابراہیم علیہ السلام کی عظیم الشان خبر۔ کاشفی نے لکھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی خبر کی خصوصیت اس لیے ہے کہ اہلِ مکہ حضرت ابراہیم کی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کی بات کو خوشی سے سُنتے، بلکہ اپنی اس نسبت پر فخر کرنے کی بنا پر ان کی خبر سے متاثر ہوتے۔

اِذْ یہ نباء کا ظرف ہے قَالَ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا لِاَبِيْهِ اپنے اب یعنی چچا آذر کو۔ اس کا قصہ پہلے گزرا ہے۔ اس کا نام تارخ تھا وَقَوْمِهٖ اور اپنی قوم یعنی اہلِ بابل بروزن صاحب عراق میں ایک جگہ کا نام ہے اسی طرف سحر منسوب ہے قوم در اصل صرف مردوں کی جماعت کو کہا جاتا ہے جس میں عورتیں شامل نہیں ہوتیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الرجال قوامون علی النساء۔

اور قرآن مجید میں عام طور پر مرد و عورت دونوں مراد ہوتے ہیں۔ (کذا فی المفردات)

مَا تَعْبُدُوْنَ ○ وہ کیا شے ہے جس کی تم پرستش کرتے ہو۔

سوال: ابراہیم علیہ السلام کو تو علم تھا کہ یہ بتوں کے پجاری ہیں پھر سوال کیوں کیا؟

جواب: تاکہ انھیں تنبیہ ہو جائے کہ جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ عبادت کے مستحق نہیں ہیں۔

قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا انہوں نے کہا ہم بُتوں کی پرستش کرتے ہیں اور یہ ہیں پیتل، سونے، چاندی، تانبے، لکڑی اور لوہے کے۔ یہ بہتر بت تھے۔ (کشف الاسرار)

ف: صنم وہ ہے جو پتھر وغیرہ سے آدمی کی صورت میں تیار کیا جائے۔ (فتح الرحمٰن)

مفردات میں فرمایا کہ صنم وہ مجسمہ جو سونے یا پیتل سے بنا کر پُوجا جائے۔ اور وثن وہ ہے جو پتھر سے تیار کر کے پُوجا جائے۔

کاشفی مرحوم نے فرمایا کہ یہاں پہ مطلقاً بُت مراد ہیں انہوں نے مختلف ر ، پر مختلف اشیاء سے تیار کر کے ان کی پرستش پر مداومت اختیار کی۔

چنانچہ فرمایا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ○ پس ہم ان کے لیے بیٹھے رہیں گے۔

سوال: جواب کے لیے کفار کا اصناما کہنا کافی تھا اگلی عبارات بڑھانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ طویل عبارت سے فصاحت و بلاغت کو نقصان پہنچتا ہے۔

جواب: فعل کے اظہار سے اور فعل دوام کی تصریح سے اپنے عمل پر فخر و ناز سے کہہ رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ ہم اس عمل سے خوش و خرم ہیں۔

حلِ لغات: ظللت (بالکسر) اعمل کذا ظلولا۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی دن کو

عمل کرے۔ اس عمل میں رات کے وقت کو دخل نہیں ہوتا۔

سوال: یہ تو ان کی عبادت کے خلاف ہے کیونکہ ان کی پرستش صرف دن کو نہیں بلکہ ہر وقت (دن رات) جاری رہتی۔

جواب: یہاں پر ظلول سے دوام مراد ہے۔

اب معنیٰ یہ ہُوا کہ ہم اپنے بتوں کی پرستش پر مداومت و ملازمت رکھیں گے۔

حلِ لغات: العکوف بمعنے اللزوم۔ اسی سے المعتکف ہے۔ کیونکہ اعتکاف والا قربتِ الٰہی کی نیت سے مسجد میں بیٹھنے پر ملازمت و مداومت کرتا ہے۔

سوال: عکوف کا صلہ علیٰ ہوتا ہے لیکن لام کیوں لائی گئی ہے؟

جواب: اس میں ایک زاید معنیٰ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے گویا یُوں کہا گیا ہے کہ پس ہم ان بتوں کے لیے ان کی عبادت کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے گرد چکّر لگاتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام نے ماں سے پُوچھا

حضرت ابو اللیث رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو ماں نے غار میں جنا اور وہیں آپ کی تربیت ہوتی رہی۔ جب آپ جوان ہُوئے، غار سے نکل کر شہر میں آئے اور ماں سے پُوچھا: ان شہر والوں کا کیا مذہب ہے؟

ف: اسی لیے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ مسافر جس شہر میں جائے اس کو چاہیے کہ وہ اس شہر والوں کے مذہب کے متعلق سوال کرے اگر وہ بد مذہب ہوں تو ان کو صحیح اور حق مذہب کی تلقین کرے۔

ربط: جب ابراہیم علیہ السلام نے ان شہر والوں سے بُتوں کے متعلق سوال کیا اور انہوں نے ان کی پرستش کا دم بھرا تو آپ نے انہیں بتوں کے عیوب بتلائے۔

چنانچہ فرمایا: **قَالَ** یہ جملہ مستانفہ بیانیہ ہے **هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ** ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کیا وہ تمہاری دُعا کو سنتے ہیں۔ یہاں مضاف محذوف ہے۔

سوال: تم نے مضاف کا محذوف ہونا کہاں سے سمجھا؟

جواب: کُفر تو سننے کی شے نہیں اس لیے سُننے کے لائق دُعا ہوتی ہے اور وہی ہم نے کہا۔

سوال: یسمعون کا صیغہ ذوی العقول کے لیے مستعمل ہے اور بُت تو غیر ذوی العقول تھے۔

جواب: چونکہ بُت پرست انہیں ذوی العقول سمجھتے تھے اسی لیے ان کے گمان پر ان پر ذوی العقول کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

(اور یہ قاعدہ ہر جگہ استعمال ہوگا اس سے مخالفین یعنی وہابیہ و دیوبندیہ اور دیگر گمراہ کن فرقوں کا

رد ہے کہ وہ ایسے صیغے انبیاءِ عظام و اولیاءِ کرام کے لیے استعمال کرکے عوام کو یوں دھوکا دیتے ہیں کہ ایسی آیات میں بُت مراد نہیں کیونکہ وہ غیر ذوی العقول ہیں، اور صیغے ذوی العقول کے ہیں۔ تفصیل فقیر کی کتاب "احسن التقریر" و "احسن التحریر" و "تفسیر اویسی" میں دیکھئے)[1]

اِذْ تَدْعُوْنَ جب تم انہیں پکارتے ہو یعنی جب تم اپنی ضروریات ان سے مانگتے ہو تو کیا وُہ تمہیں ان کا جواب دیتے ہیں یا تمہاری ضروریات پُوری کرتے ہیں اَوْ یَنْفَعُوْنَكُمْ یا وُہ تمہاری عبادت پر تمہیں نفع پہنچاتے ہیں (اس سے معلوم ہوا کہ تدعون میں دعا بمعنے عبادت ہے جیسا کہ اہلسنت کا مسلک ہے بخلاف وہابیہ دیوبندیہ کے کہ وہ ایسی آیات میں دُعا بمعنی عبادت کے انکار سے تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں۔ تفصیل کتبِ مذکورہ میں دیکھئے)[2] اَوْ یَضُرُّوْنَ یا وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں جب تم ان کی پرستش چھوڑ دو کیونکہ عبادت کے لیے نفع کا حصول اور ضرر کا دفع ضروری ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے سوال کا جواب نہ دے سکے تو تقلیدِ آباد کا سہارا لیتے ہوئے جواب میں کہا قَالُوْا بت پرستوں نے کہا ہم نے بتوں سے اپنے سوالات کے جوابات تو نہیں سُنے اور نہ ہی ان سے کبھی نفع پایا نہ نقصان بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ بلکہ ہم نے آباؤ اجداد کو ایسے کرتے دیکھا ہے کذٰلك فعل یَفْعَلُوْنَ ۝ (کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ وجدنا کا مفعول ثانی ہے) یعنی چونکہ ہمارے آباؤ اجداد بتوں کی پُوجا کرتے تھے اسی لیے ان کی اقتداء میں ہم بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ یُوں انہوں نے اقرار کر لیا کہ وہ نہ تو بتوں سے کوئی بات سنتے ہیں نہ ان سے نفع پاتے ہیں نہ نقصان۔ بلکہ مجبوراً کہہ بیٹھے کہ ان کے پاس بُت پرستی پر کوئی دلیل نہیں سوائے تقلیدِ آباء کے ؎

خواہی بسوئے کعبہ تحقیق رہ بری
پے بر پے مقلد گم کردہ رہ مرو

ترجمہ: تم چاہتے ہو کہ کعبۂ تحقیق کی طرف راہ پا جاؤ تو مقلد گم کردہ کے پیچھے نہ چلو۔

قَالَ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا اَفَرَءَيْتُمْ تو کیا تم نے دیکھا اور غور بھی کیا، یا کیا تم نے تامل کرکے کچھ سوچا بھی مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝ کہ کس کی پُوجا کرتے ہو، تم اور تمہارے پہلے آباؤ اجداد یعنی تم نے صحیح طریقہ سے سوچا اور غور کیا کہ کبھی باطل بھی حق ہو سکتا ہے! اگرچہ باطل کے پجاری بہت بڑی تعداد میں ہی کیوں نہ ہوں اور عرصہ دراز سے ان کی عبادت کی جاری ہو۔

---

[1] اضافہ از اویسی غفرلہٗ [2] ایضاً

ف : ما موصولہ میں بُت مراد ہیں۔

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْ جب انہیں تنبیہ کی گئی کہ ان کو ان بُتوں کی پرستش کا کوئی علم نہیں۔ اب ان کا حال بتاتے ہو جن کی تم پرستش کرتے ہو۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ تو میرے دشمن ہیں۔ یعنی اگر تم بتوں کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اور نہ ہی تم اس پر غور کر سکتے ہو تو تم یقین کر لو کہ بُت نہ صرف میرے دشمن ہیں بلکہ اپنے پجاریوں کے بھی دشمن ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے ایسا نقصان پہنچے گا جیسا کسی اور وجہ سے نہیں پہنچ سکتا۔ یعنی ان کی وجہ سے انہیں جہنم میں جانا ہوگا اور یہی سب سے بڑا نقصان ہے۔

سوال : بُت تو پتھر محض تھے، دشمنی تو وہ کر سکتا ہے جس میں عقل و شعور ہو۔

جواب : استعارۃً کہا گیا ہے جس کی مختصر تقریر اوپر گزری ہے۔

سوال : بتوں کو صرف ان کا دشمن ہی کیوں بتایا حالانکہ وہ ان (ابراہیم علیہ السلام) کے بھی دشمن تھے؟

جواب : کنایۃً ان کا نام بھی اس مضمون میں شامل ہے۔ کیونکہ قاعدہ ہے جس مضمون کو تعریضاً و کنایۃً ذکر کیا جائے وہ نصیحت کے متعلق زیادہ نافع ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ انسان جب خبر میں اپنا نام پہلے پیش کرے تو اس کی نصیحت زیادہ قابلِ قبول ہوتی ہے۔

ف : فراء نے فرمایا کہ از قبیل مقلوب ہے اس لیے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ میں ان کا دشمن ہوں۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جس کا تو دشمن ہوگا لازماً وہ بھی تیرا دشمن ہوگا۔

سوال : بُت تو بہت تھے، هُمْ کی ضمیر بھی بتاتی ہے لیکن عدو کا صیغہ واحد کیوں؟

جواب : یہ مصدر ہے اور مصدر کا صیغہ واحد اور جمع دونوں طرح جائز ہے یا یہ صیغہ نسبتی ہے یعنی وہ بت ذی عداوت ہیں۔ یہ ایسے ہے جیسے تامر یعنی ذو تمر، اب اشکال نہ رہا۔

اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ یہ استثناء منقطع ہے الّا بمعنے لکن ہے۔ یعنی لیکن رب العالمین الینا نہیں ہے وہ میرا دشمن نہیں بلکہ دنیا و آخرت میں میرا مہربان ہے ان دونوں کے منافع سے ہر لحظہ مجھ پر فضل و کرم فرماتا رہتا ہے۔

ف : بعض بزرگوں نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام اس وقت اپنے آپ کو مقامِ خلّت میں دیکھ رہے تھے یہ ایسا مقام ہے کہ خلیل تمام مخلوق سے علیحدہ ہو کر اس کو اپنا دشمن اور اپنے پروردگار محبوب کو دیکھ رہے تھے۔

سبق : یہ ابراہیم علیہ السلام کی کمال محبت کی دلیل ہے کیونکہ انسان پر لازم ہے کہ سوائے حق کے کسی سے محبت نہ کرے۔

نسخۂ رُوحانی حضرتِ سمنون رحمہ اللہ فرماتے ہیں جسے عالم اکوان میں دیکھا نہیں جا سکتا اس سے محبت لائق نہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھے تاکہ اسے محبوب حقیقی کی محبت اور جملہ عالم سے انقطاع اور وصالِ محبوب حقیقی نصیب ہو۔ دیکھیے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کیا فرماتا ہے فانھم عدو لی الا رب العالمین سہ

ہجرت الکل فیک حتی صح لی الاتصال

بہجر ماسوی باید طلب کردن وصال او

کن من الخلق جانبا وارض اللہ صاحبا

قلب الخلق کیف شئت تجدہم عقاربا

ترجمہ: تیرے لیے میں نے سب کچھ چھوڑ دیا تاکہ مجھے تیرا وصال نصیب ہو۔ ماسوی کا ترک لازم ہے اس کے وصال کی طلب میں مخلوق سے علیحدگی اختیار کر، اللہ تعالیٰ کی مصاحبت سے راضی ہو جا۔ مخلوق کا تصور الٹ دے کیونکہ تو اسے ہر لحاظ سے بچھو پائے گا۔

صاحبِ رُوح البیان کی تقریر فقیر (صاحبِ رُوح البیان قدس سرہٗ) کہتا ہے کہ دشمن دشمن کو آنکھ چرا کر دیکھتا ہے بلکہ دیکھتا ہی نہیں کیونکہ دشمن کی طرف قلبی میلان کا فقدان ہے اس سے لازم ہے کہ ماسوی اللہ سالک کا دشمن ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ غیر کو بالکل نہ دیکھے اگر دیکھے تو عبرت کی نگاہ سے۔

لطیفہ انسان میں اللہ تعالیٰ نے دو آنکھیں بنائی ہیں۔ دائیں آنکھ میں ملکوت کی طرف اشارہ ہے اور بائیں میں ملک کی طرف۔ جب بائیں آنکھ ملک کی طرف کھلی رہے گی تو دائیں آنکھ ملکوت سے محجوب رہے گی اور جب ملکوت کی طرف آنکھ دیکھتی رہے گی تو سالک جبروت و لاہوت سے محجوب رہے گا۔ بنابریں سالک پر لازم ہے کہ وہ دونوں آنکھوں کو ملک و ملکوت کی طرف بند رکھے اس معنی کو ملحوظ رکھنے پر انسان کو جبروت و لاہوت تک پہنچنے کا موقع نصیب ہوگا کیونکہ انسان کا مقصودِ اعظم اور اصلی مطمحِ نظر یہی ہے۔

دعا: اللھم اشغلنا بك عمن سواك۔

(اے اللہ! ہمیں ماسوی اللہ سے دور کر کے اپنی ذات کا شغل نصیب فرما)

یہ دعا اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

سوال: اگر کوئی کہے کہ ماسوی اللہ میں تجلیات کے آثار بھی شامل ہیں پھر بقولِ شما آثارِ تجلیات بھی دشمن اور غیر ہوں حالانکہ یہ بالکل مقصد کے خلاف ہے۔

جواب: واقعی آثارِ تجلیات غیر ہیں لیکن ان میں مراتب کا اشارہ ہے اور سالک پر لازم ہے کہ وہ مراتب سے

بھی عبور کرے کیونکہ مراتب سالک کا مقصد نہیں بلکہ مقصد ذاتِ حق ہے۔ اور چونکہ یہ مراتب بھی ایک عارضی توجہ کا مرکز ہیں اور صنم بھی ایک توجہ کا مرکز ہے اسی لیے اس غیریت کی بنا پر سالک کی دشمن اور تعلق ما سوی اللہ ہے۔ اسی لیے ان کا ترک لازم ہے لیکن سالک تو ہر شے میں حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے اور غیر اللہ سے تعلق توڑتا ہے۔ اس معنی پر اس کا ہر دشمن بھی صدیق ہے ؎

جہان مرآت حسن شاہد ماست
فشاہد وجہہ فی کل ذرات

ترجمہ: یہ تمام جہان ہمارے محبوب کے حسن کا آئینہ ہے اس لیے ہر ذرہ میں محبوب کی ذات کا مشاہدہ کیجئے۔

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ وہ جس نے جملہ مخلوق کو پیدا کیا۔ یہ رب العالمین کی صفت ہے۔ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۝ مجھے صلاحِ دارین کی طرف اپنی ہدایت سے راستہ دکھاتا ہے یعنی اس کی وہ ہدایت جو مخلوق سے متصل ہے نفخ صور کے بعد استمراراً جاری ہے جیسا کہ فاء عاطفہ تعقیبیہ اور مضارع دلالت کرتا ہے اور انسان کی ہدایت کے مبدأ پیدائش سے پہلے پیٹ میں سے یوں جاری ہوئی کہ پیٹ میں ماہواری کا خون چوسنا شروع کر دیا اور اس کا انتہاء طریق جنت اور اس کی نعمتوں کو حاصل کرنے تک ہے۔

تفسیر صوفیانہ فہو یہدین میں اسی طرف اشارہ ہے کہ سالک پر لازم ہے کہ جملہ اسباب ظاہرہ کو منقطع کرے اور نبوت و ولایت وخلّت کے کمالات حاصل کرے۔ بلکہ اس میں ازلی برگزیدگی کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جملہ مقامات اختصاصہ عطائیہ غیر کسبیہ ہیں جو فیض اقدس اور اس کے ظہور سے محصول شرائط و اسباب عین ثابتہ کو حاصل ہوتے ہیں لیکن یہ اسباب محجوب ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ یہ مراتب کسبی ہیں جو شاید عمل کرنے سے نصیب ہوں۔ حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

قومے بجہد وجد نہادند وصل دوست
قومے دگر حوالہ بتقدیر مے کنند

ترجمہ: ایک گروہ توجد و جہد سے وصالِ دوست کو حاصل کرنے کا قائل ہے دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ (وصالِ دوست) تقدیر پر موقوف ہے۔

تفسیر عالمانہ وَالَّذِیْ الخ کا عطف صفت اولیٰ پر ہے اور تینوں مقام پر الذی (اسم موصول) کا تکرار دلالت کرتا ہے کہ ہر جملہ اقتضائے حکم میں مستقل ہے هُوَ يُطْعِمُنِيْ وہی مجھے طعام کھلاتا ہے یعنی ایسی غذا جو قوام بدن کے لیے نافع ہوتی ہے مجھے کھلاتا ہے وَيَسْقِيْنِ ۝ اور وہ جو

چاہے مجھے پلاتا ہے یعنی وُہ چیز مجھے پلاتا ہے جو پیاس بجھانے اور تربیتِ اعضا کا سبب ہے۔ یعنی وہی میرا رزاق ہے اسی لیے تو اسی کے پاس میرا طعام و شراب ہے۔

ف : طعام وسقی سے صرف خلق الطعام و السقی اور ان کی تملیک مراد نہیں بلکہ ان میں وہ جملہ امور داخل ہوں گے جن سے طعام وسقی کے لیے نفع اٹھایا جاتا ہے جیسے کھانے پینے کی خواہش ان کے نگلنے اور چبانے سے حاصل ہوتی ہے اور ہضم اور دفع وغیرہ۔

ف : حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی دُعا مشہور ہے :

اللھم اجعل لی ضرسا طحونا و معدۃ ھضوما و دبرا بشورا۔

(اے اللہ! ڈاڑھ چبانے والی اور معدہ ہضم کرنے والا اور دُبر فضلات کو باہر نکالنے والی عطا فرما)

تفسیر صُوفیانہ اس آیت میں توکل و رضا و تسلیم و تفویض و قطع اسباب اور صرف اسی طرف متوجہ رہنے اور ماسوا سے رُوگردانی کے مقام کی طرف اشارہ ہے۔

ف : صاحبِ بحر الحقائق نے فرمایا : طعام سے وہ ابدیت مراد ہے جس سے دل زندہ رہتا ہے اور شراب صفتِ ربوبیت کی وہ تجلی ہے جس سے ارواح کو تازگی نصیب ہوتی ہے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ طعام سے طعامِ معرفت اور شراب سے شرابِ محبت مراد ہے۔ پھر آپ نے یہ شعر پڑھا : ؎

شراب المحبۃ خیر الشراب
وکل شراب سواہ سراب

ترجمہ : محبۃ کا شراب سب سے بہتر شراب ہے۔ بلکہ اس کے ماسوا جتنے بھی شراب ہیں وہ تمام سراب ہیں۔

حدیث شریف : نیز حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پُر اسرار کلام :

ابیت عند ربی یطعمنی ویسقینی۔

(میں اپنے رب تعالیٰ کے ہاں شب باش ہوتا ہوں وہی مجھے کھلاتا پلاتا ہے)

میں اسی طرف اشارہ ہے۔

؎

ترا نوال دما دم ز خانہ یطعمنی
ترا پیالہ مدام از شراب یسقینی

مرا تو قبلۂ دینی ازاں سبب گفتم

بمرداں کہ "لکم دینکم ولی دینی"

ترجمہ: تجھے یطعمنی کے گھر سے ہر لحظہ لقمے پہنچتے ہیں تجھے یسقینی کے شراب سے پیالے بھربھر کر پلائے جاتے ہیں چونکہ تو میرے دین کا قبلہ ہے اس لیے میں لوگوں سے کہا کرتا ہوں تمہارا دین تمہارے لیے میرا دین میرے لیے۔

شرح الحدیث حدیث شریف میں یطعمنی ویسقینی کے طعام وشراب میں علماء کے دو قول ہیں:

(۱) اس سے ظاہری طعام اور پانی مراد ہیں جنہیں منہ کے ذریعے پیٹ کے اندر پہنچایا جاتا ہے کیونکہ طعام وشراب کا حقیقی معنی یہی ہے اور حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی لینا مناسب نہیں۔ پھر اس معنی پر کہ یہ طعام وغیرہ بہشتی تھا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا تھا۔

(۲) اس سے مراد وہ غذا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو اپنے معارف عطا فرمائے۔ مثلاً مناجات کے وقت کی لذت اور قرب سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور محبت کی نعمت اور دیگر وہ احوال جو قلوب کی غذا ہیں داخل ہیں۔ ایسے ہی رُوح کی نعمتیں اور آنکھ کی ٹھنڈک اور نفوس کی رونق سب اسی تقریر میں شامل ہیں۔

اہلسنّت کی تائید دربارہ مسئلہ نور وبشر (ہم اہلسنت کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری مثل نہیں بلکہ آپ سراسر نور ہیں آپ کی بشریت نمونۂ بشریت ہے نہ کہ ان کی حقیقت، اس کی دلیل حضرت اسماعیل حقی قدس سرہٗ اپنی تفسیر روح البیان ج ۶ ص ۲۸۴ میں اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں:)

قال الشیخ الشہیر بافتادہ آفندی قدس سرہٗ انما اکل نبینا علیہ السلام فی الظاھر لاجل امتہ الضعیفۃ والا فلا احتیاج لہ الی الاکل والشرب۔	حضرت شیخ شہیر بافتادہ قدس سرہٗ نے فرمایا کہ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہری طور پر امت کمزور کی خاطر کھایا ورنہ آپ کو نہ کھانے کی ضرورت تھی نہ پینے کی حاجت تھی۔

(**سوال کا جواب:** اگر محتاج نہ تھی تو پھر بھوک سے پیٹ پر پتھر کیوں باندھے، اس کا جواب بھی صاحب روح البیان قدس سرہٗ نے دیا:)

وما روی من انہ کان یشد الحجر علی بطنہ فھو لیس من الجوع بل من کمال لطافتہ لئلا یصعد الی الملکوت	اور وہ جو کہ مروی ہے کہ آپ پیٹ پر پتھر باندھتے تھے تو وہ بھی بھوک کی وجہ سے نہ تھا بلکہ آپ کی کمال لطافت کی وجہ سے تھا تاکہ

بل یبقٰی فی عالم الملك و یحصل لــہ الاستقرار فی عالم الارشاد۔ (روح البیان ج ۶ ص ۲۸۳)

آپ کا جسم اطہر ملکوت کی طرف نہ چلا جائے بلکہ آپ کا جسم اطہر عالم ملک میں باقی رہے۔ اور تاکہ آپ کو عالمِ ارشاد میں استقرار ہو۔

اعجوبہ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں بہت سے بزرگوں کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے سالہاسال تک نہ کھایا نہ پیا۔ جب انہوں کو یہ کمال حاصل ہے تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کمال حاصل ہونا بطریق اولیٰ ہے۔

دلیل: اور ہمارے دعوٰی کی یہی بہت بڑی دلیل قوی ہے کیونکہ ایسے لوگوں کے لیے بشریت کی جملہ آلائش مٹ کر رہ جاتی ہے پھر ان کو عالمِ قدس کی طرف کشش رہتی ہے۔ اسی لیے وہ عالمِ بشریت کے عوارض اور ضروریات سے فارغ ہوجاتے ہیں۔

حکایت حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ اقدس میں ایک سقا تھا جسے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں تین دن نصیب ہُوئے۔ اور وہ یہ آیت پڑھتا رہا:

وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا۔

اس کا اثر یہ ہُوا کہ اس نے اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ڈال دیا اور بیہوش ہوگیا۔ اسے خواب میں ایک پیالہ جنت کے شراباً طھوراً سے نصیب ہوا جسے اس نے پی لیا۔ اس کے بعد وہ بیس سال سے زیادہ زندہ رہا۔ لیکن اس دوران اس نے خواہش سے نہ کبھی کچھ کھایا نہ پیا۔ (کذا فی کشف الاسرار)

تفسیر عالمانہ وَاِذَا مَرِضْتُ اور جب میں بیمار ہوتا ہُوں فَھُوَ یَشْفِیْنِ ○ تو وہی مجھے بیماری سے شفا بخشتا ہے نہ کہ اطباء۔

نکتہ: یہ اس لیے فرمایا کہ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ بیماری اوقات کے اثرات سے ہوتی ہے یا پھر مختلف غذاؤں کے استعمال سے، اور شفا اطباء سے ملتی ہے یا پھر ادویہ سے۔ ابراہیم علیہ السلام نے انھیں سمجھایا کہ بیماری دینے والا بھی وہی ہے اور شفا دینے والا بھی وہی۔

سوال: ابراہیم علیہ السلام نے مرض کو اپنی طرف منسوب کیا ہے لیکن باقی افعال اللہ کی طرف۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: یہ ازراہِ ادب فرمایا۔ جیسے خضر علیہ السلام نے بھی یہی ادب ملحوظ رکھ کر کہا:

فاردت ان اعیبھا۔

اس میں عیب کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے لیکن کارِ خیر میں۔ فرمایا:

فاراد ان یبلغا اشدّ ھما ویستخرجا کنزھما۔

یہ فعل خیر ہے اسی لیے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ ایسے ہی جنّات نے بھی ادب کا لحاظ رکھا۔ چنانچہ،

وانا لا ندری اُشر ارید بمن فی الارض ان اراد بھم ربھم رشدا۔

آیت میں شر کی نسبت میں فعل مجہول ہے لیکن خیر میں اللہ تعالیٰ کے نام کی تصریح کی ہے۔

ف : واذا مرضت الخ کا عطف یطعمنی ویسقین پر ہے۔

سوال : مرض کو اطعام وسقاء کے ساتھ کیوں لایا گیا ہے ؟

جواب ؛ چونکہ بیماری عموماً زیادہ کھانے سے پیدا ہوتی ہے اسی لیے اس کے ساتھ لایا گیا ہے۔ قاعدہ مشہور ہے کہ بسیار خوری بیماری لاتی ہے اور بھوک راحت وسرور پیدا کرتی ہے۔

لطیفہ : حکما کہتے ہیں کہ اگر مُردوں سے بات چیت ہوتی تو ان میں سے اکثر یہی کہتے کہ ان کی موت کا سبب زیادہ کھانا ہے۔

ف : حکمت میں ہے کہ پیٹ بھر کر کھانے میں بھلائی نہیں اگرچہ بھوک کے بعد بھی کھایا جائے۔

ملفوظِ امام جعفر رضی اللہ عنہ حضرت ابو جعفر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب میں گناہ کی بیماری سے بیمار پڑتا ہوں تو مجھے توبہ سے شفاء نصیب ہوتی ہے۔

ف : حضرت سلمی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اغیار کو دیکھنے سے مرض بڑھتا ہے۔ واحد قہار کے مشاہدہ سے شفاء نصیب ہوتی ہے۔

ف : بحر الحقائق میں ہے کہ تعلقاتِ کونین بیماری ہے شفاء قطع تعلق سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ جذبہ عنایت الٰہی سے وابستہ ہے کہ جب کسی سالک کو نصیب ہوتا ہے تو وہ تمام کائنات سے منقطع ہو کر ایک ذات سے وابستہ ہو جاتا ہے یعنی شربتِ تجرید سے دُنیوی تعلق کے مرض سے نجات نصیب ہو سکتی ہے ؎

چہ گویمت کہ چہ خوش آمدی مسیح صفت
بیکنفس ہمہ دردِ مرا دوا گردد

ترجمہ : میں تجھے کیا کہوں کہ تو مسیح کی طرح کیسے تشریف لایا کہ یک لحظہ میرے تمام دردوں کا علاج ہوگیا۔

فائدہ صُوفیانہ بعض مشایخ نے فرمایا کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جب میں محبوب کی محبت اور اس کے وصال اور دیدار کے شوق میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے اپنے حسن وصال وکشف جمال سے شفا بخشتا ہے ؎

بمقدك المبارك زال دائی
وفی لقیاك عجل لی شفائی

ترجمہ: تیری مبارک تشریف آوری سے میری بیماری ٹل گئی اور تیرے دیدار سے مجھے جلدی شفا نصیب ہوگئی۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ رفع الرجوع الی الغیر اور دوا سے سکون اور کسی شے سے علاج کرانا بھی کمال تسلیم و رضا کی نشانی ہے۔

ف: کشف الاسرار میں لکھا ہے کہ یہ وُہ مرض نہیں جسے مرض کہا جائے بلکہ یہ ان مرضوں سے ہے کہ جن سے محبوب کا طبع پرسی کے لیے تشریف لانے کی طمع میں اپنے آپ کو بیمار بنا لینا ہے ؎

یود بان یمسی سقیما لعلہا
اذا سمعت عنہ سلیمی تراسلہ
ان کان یمنعک الوشاۃ زیارتی
فادخل الیّ بعلّۃ العوّاد

ترجمہ: وہ چاہتا ہے کہ وہ بیمار پڑ جائے کیونکہ جب محبوبہ سُنے گی تو کچھ تو پیغام بھیجے گی۔
اگر میرے ملنے کے لیے تمہیں چغلخوروں کا خطرہ ہے تو میری طبع پُرسی کے بہانے تشریف لایا کرو۔

لطیفہ حضرت خلیل کی شفاء مرض میں اس طرف اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس گاہے گاہے حاضر ہوکر عرض کرتے کہ آپ کو آپ کا مالک و مولا فرماتا ہے؛

کیف انت البارحۃ۔

(اے خلیل (علیہ السلام)! رات کیسے گزری)

حضرت ابراہیم علیہ السلام جواب میں گویا یُوں کہتے؛ ؎

خرسندم شدم بدانکہ گوئی یکبار
کاے خستۂ روزگار دوشت چوں بود

ترجمہ: میں اس سے خوش ہوں کہ اگر تُو ایک بار فرما دے کہ اے خستۂ روزگار! تیری رات کیسے گزری۔

حکایت کسی بزرگ کا واقعہ ہے کہ وُہ بیمار ہوکر کمزور ہوگئے اور ان کا رنگ پیلا ہوگیا۔ ان سے کہا گیا اجازت ہو تو آپ کے لیے طبیب بُلایا جائے تاکہ آپ کا علاج کرے۔ انہوں نے جواب دیا:

طبیب نے تو مجھے بیمار کیا ہے ؎

کیف اشکو الی طبیبی مابی
والذی بی اصابنی من طبیبی

ترجمہ : میں طبیب سے کیا شکوہ کروں کہ میں فلاں مرض میں مبتلا ہوں کیونکہ مجھے جو بیماری ملی ہے اسی طبیب سے ملی ہے۔

تفسیر عالمانہ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ اور وہ ذات مجھے دنیا کے اجل کے ختم ہونے پر موت دے گی ثُمَّ یُحْیِیْنِ ○ پھر آخرت میں مجھے اعمال کی جزا کے لیے زندہ فرمائے گی۔

ف : ان دونوں جملوں کے درمیان ثُمَّ کا لفظ لایا گیا ہے اس لیے کہ اماتت و احیا کے درمیان ایک عرصہ گزرے گا۔

نکتہ : اماتۃ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے سے اس کی نعمت کا اظہار اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ موت بھی ایک بڑی نعمت ہے کہ اس سے ہی اہلِ کمال کو وصالِ یار اور حیاتِ ابدیہ اور تکالیفِ دنیویہ و مصائبِ شاقہ سے نجات نصیب ہوتی ہے ؎

پس رجال از نقل عالم شادماں
وز بقااش شادمان ایں کودکاں

چونکہ آب خوش ندید آں مرغ کور
پیش او کوثر نماید آب شور

ترجمہ : مردانِ خدا دنیا سے کوچ کرنے سے خوش ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ بچے زندہ رہنے پر خوش ہوتے ہیں۔ اس اندھے پرندے کو کڑوا پانی میٹھا لگتا ہے جس نے آبِ کوثر کی چاشنی نہیں چکھی۔

تفسیر صوفیانہ امام ثعلبی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں کو موت دینا عدل اور زندہ رکھنا فضل ہے۔ بعض نے فرمایا کہ اماتت سے معصیت اور احیأ سے طاعت میں مصروف رکھنا مراد ہے۔ یا اماتت سے جہل اور احیأ سے عقل کی عطا مراد ہے یا اماتت سے طمع اور احیأ سے تقویٰ و پرہیزگاری کی زندگی بسر کرانا مراد ہے۔ اور اماتت میں فراق کی طرف اور احیاد میں وصال کی طرف اشارہ ہے۔ اور حقائق سلمی میں لکھا کہ روحانیت کی نشانیوں سے محروم رکھتا ہے اور صفاتِ ربانیت سے زندہ فرماتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اماتت کا معنیٰ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ مجھے میری انانیت سے مٹاتا اور اپنی ہدایت سے مجھے زندہ کرتا ہے۔ اسی معنیٰ پر

کہا گیا ہے ؎

نخواہم عمر فانی را توئی عمر عزیز من
نخواہم جان پرغم را توئی جانم بجان تو

ترجمہ : میں تجھ سے عمر فانی نہیں چاہتا کیونکہ تُو ہی تو میری جانِ عزیز ہے اور تجھ سے جانِ پُرغم نہیں چاہتا اس لیے کہ تیری جان میں ہی میری جان ہے۔

اور بعض بزرگوں نے یُوں کہا : ؎

غم کے خورد آنکہ شادمانیش توئی
با کے برد آنکہ زندگانیش توئی
در نسیئہ آں جہاں کجا دل بندد
آنکس کہ بنقد ایں جہانیش توئی

ترجمہ : اسے کاہے کا غم جس کی خوشی تم ہو۔ وہ کس کے ہاں جائے جس کی زندگی کا سرمایہ تم ہو ادھارے سودے پر اس جہان میں کون دل لگائے جس کا اس آخرت میں نقد سودا تم ہو۔

تفسیر عالمانہ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اور وُہ ذات جس سے میں طمع اور اُمید رکھتا ہُوں اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ○ یہ کہ قیامت میں وہ گناہ بخش دے۔

سوال : جیسے سابقہ مضامین عزم بالجزم سے کہتے چلے آئے اس مقام پہ طمع یعنی صرف امید کے ساتھ مضمون کو ظاہر فرمایا۔

جواب : ادب کو ملحوظ رکھا ہے یا یہ سبق سکھایا ہے کہ انسان پر لازم ہے کہ وہ از خود ایسے احکام صادر نہ کرے بلکہ انھیں اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے خوف و رجاء کے درمیان زندگی بسر کرے نیز اس طرف بھی اشارہ ہے کہ وُہ بڑا کریم ہے اس سے امید کی جائے تو کرم فرماتا ہے۔ اور خطاء کو اپنی طرف منسوب فرمایا یہ آپ کی کسرِ نفسی اور تواضع ہے اور امت کو تعلیم ہے تاکہ گناہوں سے اجتناب کرے اور ہر وقت خوفِ الٰہی میں رہے اور اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی مغفرت کی طلب گاری میں گزارے اور آئندہ ہر صغیرہ و کبیرہ گناہ سے بچنے کی توفیق مانگے اور نیز اپنے ان خلاف اولیٰ امور کی مغفرت چاہے جو اگر ہم جیسوں سے سرزد ہوں تو معمولی جرائم سمجھے جائیں لیکن وُہ اپنے لیے ہزاروں کبائر سے بھی بڑا جرم سمجھتے ہیں۔ جیسے مشہور ہے :

حسنات الابرار سیئات المقربین۔

اور یہ بھی مشہور ہے :

درجاتهم درکات المقربین۔

یعنی ان (ابرار) کے درجات مقربین کے گرے ہوئے مراتب کی مانند ہیں۔

نکتہ: آیۃ میں خطیئتی سے ابراہیم علیہ السلام کی اپنی خطا مراد نہیں بلکہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کی خطا مراد ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے حضور نبی پاک شہِ لولاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کی خطاؤں کی مغفرت کی دعا فرمائی۔ (کذا فی التلخیص)

سوال: گناہ کی بخشش تو ہر وقت ضروری ہے خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں۔ لیکن ابراہیم علیہ السلام نے یوم الدین (قیامت) کے ساتھ معلّق فرمایا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: چونکہ گناہوں کے اثرات اور ان کی جزا کا ترتّب آخرت میں ہوگا اسی لیے یومِ آخرت سے خطرہ اور ڈر رہتا ہے اور یہی مطلب ہے ان کے اس قول کا:

ربّ اغفرلی ولوالدی وللمؤمنین یوم یقوم الحساب۔

(اے میرے پروردگار! مجھے بخش دے اور میرے والدین کو اور مومنین کو حساب کے دن)

حدیث شریف بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ابن جدعان زندگی بھر جاہلیت میں صلۂ رحمی کرتا تھا اور غرباء و مساکین کو کھانا کھلاتا تھا کیا اسے یہ نیک عمل فائدہ دیں گے؟

آپ نے فرمایا:

لا انہ لم یقل یوما رب اغفرلی خطیئتی یوم الدین۔

(نہیں اس لیے کہ اس نے زندگی میں ایسا لفظ (منہ سے) نہیں نکالا جس سے بخشش کی طلب کا مفہوم نکلتا ہو (یعنی کہتا) اے اللہ! حساب کے دن میرے گناہ بخش دے)

یعنی وہ کافر تھا اسے یومِ آخرت پر ایمان نہ تھا کیونکہ جو بھی یومِ آخرت کا اقرار کرتا ہے وہ اپنے گناہوں کی مغفرت چاہتا ہے۔ اسی لیے اسے ایمان کے بغیر عملِ صالح کوئی فائدہ نہیں دے گا۔

ف: ابن جدعان حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا چچا زاد تھا ابتدائی زندگی میں غریب اور مسکین تھا پھر اسے کہیں سے خزانہ مل گیا جس کی وجہ سے وہ خوشحال ہوگیا اور غرباء و مساکین پر اسی خزانے سے خرچ کرتا تھا اور دوسرے امورِ خیر میں وافر حصّہ لیتا تھا۔

نکتہ: ان امور میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم پر حجت قائم کی اور واضح فرمایا کہ جو یہ امور نہیں بجا لاسکتا وہ الٰہیّہ کے لائق نہیں۔

ربط: آیاتِ مذکورہ میں ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے الطاف و انعامات کا ذکر فرمانے کے بعد

اب اپنے مالک کے آگے مناجات کرتے ہیں۔ چنانچہ کہا:

رَبِّ اے میرے پروردگار ہَبْ لِیْ حُکْمًا مجھے علم وعمل کا کمال عطا فرما تاکہ اس کی وجہ سے خلافت حق وریاست خلق کی استعداد حاصل کرسکوں اس لیے کہ اگر کوئی علم تو رکھتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا تو اسے حکیم نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اسے حکم حاصل ہے نہ حکمت وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۝ اور مجھے صالحین سے ملا دے اور ایسے علوم واعمال واخلاق کی دولت عطا فرما جس سے مجھے زمرۂ کاملین راسخین فی الصلاح میں داخل ہونا نصیب ہو اور کبائر وصغائر سے حاصل ہو یا یہ کہ مجھے اور انہیں بہشت میں جمع فرما۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمائی۔ چنانچہ خود فرمایا:

وانہ فی الآخرۃ من الصالحین۔

(اور بیشک وہ آخرت میں صالحین میں سے ہوں گے)

اور باقی ایسی بحث سورۂ کہف کے اواخر میں گزرگئی۔

وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ۝ اور آخر میں آنے والے لوگوں کے ہاں میری سچی شہرت بنا۔ یعنی ان کے ہاں دنیا میں میری اچھی شہرت اور قیامت میں چرچا ہو۔

قبولیتِ دُعا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعائیں قبول ہوئی کہ ہر نبی علیہ السلام کی ہر امت کا ہر فرد اس کا ثنا خواں اور محب رہا۔ دنیا میں تادمِ زلیست آپ ذی جاہ رہے اور بعد میں آپ کا ذکر حسنِ ثنا سے ہوتا رہا۔

خلاصہ یہ کہ آپ نے دعا مانگی کہ آنے والے لوگوں کی زبانوں پر میرا ذکرِ خیر سے ہو۔ یعنی ان کی زبانوں پر میری تعریف جاری فرما اور ان کی آپس کی گفتگو میں میری مدح وثنا جاری ہو۔

ف: فی الآخرین سے آپ کے بعد آنے والی امتیں مراد ہیں۔

سوال: حسنِ ثناء اور قبولِ عام کو زبان سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے؟

جواب: چونکہ حسنِ ثنا اور قبول کا اظہار وانتشار زبان سے ہوتا ہے اسی لیے زبان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ف: کسی کا مرنے کے بعد اچھا چرچا اور حسنِ قبول بھی ایک عظیم دولت ہے اور یہ بھی منجملہ رضائے الٰہی اور قبولیت عنداللہ کی دلیل ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جس بندے سے محبت کرتا ہے زمین وآسمان والوں کے دلوں میں اس کی محبت القاء فرماتا ہے اسی لیے اس بندۂ خدا کے ساتھ تمام مخلوق پیار کرتی ہے یہاں تک کہ مچھلیاں پانی میں اور پرندے ہوا میں اس سے پیار کرتے ہیں۔

(یہی ہمارے مسلک اہل سنت کی روشن دلیل ہے کہ ہم نے اہلِ مزارات کے ساتھ محبت میں خلقِ خدا کو

دیوانہ پایا، روکنے کے باوجود رکنے کو نہیں آتی۔ ہم نے مزارات پہ حاضری دینے والے نہ صرف انسانوں بلکہ حیوانوں کو سر جھکاتے دیکھا اور درندوں اور پرندوں کو وارفتہ پایا۔ ایسا بھی دیکھا کہ سیلاب کے پانی نے بڑی بڑی عمارات کو منہدم کر ڈالا لیکن مزارات جُوں کے توں کھڑے رہے[1]

اُمّتِ محمدیہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم حضرت ابن عطاء رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ اے پروردگار! میرا ذکر اور مدح و ثنا امتِ محمدیہ کی زبانوں پر جاری فرما اور امتِ محمدیہ کو میری نیک نامی کا گواہ بنا کیونکہ تُو نے اسے اپنا مقبول گواہ مقرر فرمایا ہے۔

ف : حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے کہا:

"اے اللہ! مجھے تمام اُمتوں اور تمام ملتوں کی نیک نامی کی ثنا کیا ہوا بنا۔" وہ اس لیے کہ بات فعلِ جمیل اور خلق حسن اور نرمی برتنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور یہی لسانِ صدق کے اسباب ہیں اور اسی کی ہی آنے والی نسلیں اتباع کریں گی پھر ان کے عمل پہ بوجہ اقتدار اسے بھی اجر و ثواب حاصل ہوگا۔

وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۝ اور مجھے جنتِ نعیم کے ورثا سے بنا۔

نکتہ : بہشت کو مالِ موروث سے تشبیہ دینے میں اشارہ ہے کہ جس طرح مورث کے مرنے کے بعد وارث کو مال ملتا ہے ایسے ہی عامل اپنے عمل کو مٹا لیتا ہے یعنی نہ ہونے کے برابر سمجھ کر محض فضلِ ربانی سے بہشت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اب یہ معنی ہوا کہ اے اللہ! مجھے بہشت کے مستحقین اور متمتعین سے بنا جیسے وارث مورث کے مال کا مالک بن کر مال سے نفع اٹھاتا ہے (الجنت النعیم بمعنے وُہ باغ جو ہر قسم کی نعمتوں سے بھرپور ہو)۔

مسئلہ : اس میں اشارہ ہے کہ جنت کی طلب طلبِ حق کے منافی نہیں بلکہ ترک طلب ربوبیت کے ساتھ بغاوت ہے۔

نکتہ : بعض اکابر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محبوب لنفسہٖ ہے اور اس کی عطا محبوب لغیرہٖ کہ ہم اس لیے اس سے محبت کرتے ہیں کہ وُہ محبوب کی عطا ہے۔ اس معنی پر ہمیں دو قسم کی محبت نصیب ہُوئی براہِ راست ذاتِ حق سے اور بالواسطہ اس کی عطا سے اور یہ دونوں بھی اسی کی ذات کی وجہ سے نہ کہ اس کے غیر کی وجہ سے۔ کیونکہ اس سے محبت ہے تو اس کی ذات کی وجہ اور عطاءُ سے بایں معنی کہ یہ اس کی ایک صفت اور یہ بھی حبِ ذاتی ہوئی۔ اس اعتبار سے یہ ایک محبت ہُوئی نہ کہ دو۔ ہاں اگر اسے متعدد کہا جائے تو یُوں کہا جائے گا کہ تعدد اس کے فروع سے ہے جیسا کہ جمع اور وحدت کا تقاضا اور فرق و کثرت کا موجب ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا ان سے محبت کرنا جمع الجمع کے

---

[1] اضافہ از اویسی غفرلہٗ

مقام میں ہوگا کیونکہ یہ مقامِ اعتدال ہے نہ کہ فقط مرتبۂ فرق وجمع میں۔ (یہی تقریر انبیاء علیہم السلام اور اولیاءِ کرام کی محبت کے متعلق ہوگی)

وَاغْفِرْ لِاَبِیْٓ اور میرے چچا کو بخش دے۔ مغفرت ایمان سے مشروط ہے۔ مشروط کی طلب شرط طلب کو متضمن ہے اس تقریر پر زندہ مشرکین کے لیے مغفرت سے ان کے لیے توفیق اور ہدایت ایمان کی طلب مراد ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ ۝ اس لیے کہ گمراہوں سے ہے یعنی طریقِ حق سے بھٹکا ہوا ہے۔

ازالۂ وہم: یہ دعا اس سے پہلے کی ہے جب ظاہر ہوگیا کہ یہ اللہ کا دشمن ہے (پھر ابراہیم علیہ السلام نے اس کے لیے دعا نہیں مانگی) جیسا کہ سورۃ توبہ میں گزرا۔

حدیث شریف حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص بھی گھر سے کامل وضو کر کے مسجد کو روانہ ہوا اور گھر سے نکلتے وقت کہا:

بسم الله الذی خلقنی فهو یهدین الا هداه الله لصواب الاعمال والذی هو یطعمنی ویسقین الا اطعمه الله من طعام الجنة وسقاه من شرابها واذا مرضت فهو یشفین الا شفاه الله تعالیٰ والذی یمیتنی ثم یحیین الا احیاه الله حیاة الشهداء واماته میتة الشهداء والذی اطمع ان یغفر لی خطیئتی یوم الدین الا غفر الله خطایاه ولو كانت اكثر من زبد البحر رب هب لی حكما والحقنی بالصالحین الا وهب له حكما والحقه بصالح من مضی وصالح من بقی واجعل لی لسان صدق فی الاٰخرین الا كتب عند الله صدیقا واجعلنی من ورثة جنة النعیم الا جعل الله له القصور والمنازل فی الجنة۔

(اس اللہ کے نام سے جس نے مجھے پیدا کیا اسے (مندرج) فوائد نصیب ہوں گے:

(۱) صواب اعمال کی ہدایت

(۲) جنت کا طعام و شراباً طہورا

(۳) بیماریوں سے شفاء

(۴) شہداء کی زندگی اور موت

(۵) گناہوں کی بخشش، خواہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔

(۶) حکمرانی نصیب ہوگی اور گزشتہ نیکوں اور صالحین کی رفاقت نصیب ہوگی۔

(۷) اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیق لکھا جائے گا۔

(۸) جنت میں اونچی منازل اور بہترین عمارت حاصل ہوگی۔)

حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان الفاظ پر ذیل کے الفاظ کا اضافہ کرتے :

واغفر لوالدی کما ربیانی صغیرا۔ (کذا فی کشف الاسرار)

(اور میرے ماں باپ کو بخش جیسے انہوں نے مجھے بچپن میں پالا)

وَلَا تُخْزِنِیْ (اور مجھے رسوا نہ کرنا)

حلِ لغات : الخزی بمعنے ذلت وخواری۔

یعنی اور مجھے رُسوا نہ کرنا اور نہ ہی میری پردہ دری کرنا اور نہ مجھے میری کوتاہی پر عتاب کرنا۔

سوال : ابراہیم علیہ السلام کو جب معلوم تھا کہ ان کی قیامت میں رُسوائی نہیں ہوگی تو پھر ایسی دعا کیوں مانگی ؟

جواب : انبیاء علیہم السلام کی عادت ہے کہ اپنی عبودیت کے اظہار کے لیے ایسی دُعائیں مانگتے ہیں اور دوسروں کو سکھاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں یُونہی عجز و انکساری کا اظہار کیا جاتا ہے جیسا کہ کاشفی مرحوم نے لکھا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اُمتوں کی تعلیم کے لیے ایسی دُعا مانگی تھی ورنہ انبیاء علیہم السلام کی رسوائی نہیں ہوگی۔

ف : اس سے شوم بختوں کو حیاء و شرم کرنی چاہیے جو انبیاء علیہم السلام کے ایسے مقامات کو دیکھ کر اپنے اوپر قیاس کر کے کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام سے بھی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہی کا اعتراف کر کے دُعائیں مانگتے ہیں وغیرہ۔

نکتہ : انبیاء علیہم السلام سوءِ خاتمہ سے محفوظ ہوتے ہیں اسی لیے ہم نے یہ تقریر لکھی ہے (لیکن لعض بدبختوں نے اپنی کتابوں براہین قاطعہ اور تقویۃ الایمان میں لکھ دیا کہ نبی علیہ السلام کو اپنے خاتمے کا علم نہ تھا۔ معاذ اللہ)[1]

ف : جبکہ خطاؤں کی مغفرت والذی اطمع میں ترک معاتبہ کو مستلزم نہیں اسی لیے دُعا میں ترک معاتبہ کا ذکر علیحدہ کیا۔

یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ۝ اس دن کہ قبور سے تمام لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔

سوال : تم نے تمام لوگوں کا معنیٰ کہاں سے نکال لیا ؟

جواب : اس کے عموم کا تقاضا یہی ہے کہ اس میں لفظ کافۃ مقدر ہو۔

سوال : قیامت میں رسوائی کے اظہار کی تخصیص کیوں ؟

جواب : چونکہ دنیا ستر پوشی کا مقام ہے اسی لیے صرف قیامت کے ساتھ اظہار خزی مخصوص ہوگیا۔

---

[1] اضافہ از اویسی غفرلہٗ

ربط : ابو اللیث رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہاں پر ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو کے اختتام کے بعد قیامت کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔

چنانچہ فرمایا یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوۡنَ ۝ اس دن نہ مال نفع دے گا نہ اولاد۔ یہ یوم یبعثون سے بدل اور فعل محذوف کا مفعول ہے) اصل عبارت یوں ہے : لا ینفع مال احدا الخ کسی کو مال نفع نہ دے گا اگرچہ اسے نیکی اور خیرات میں خرچ کیا ہوگا اور ایسے ہی اولاد سے بھی کچھ حاصل نہ ہوگا اگرچہ وہ سب کے سب نیک اور لائق شفاعت ہوں گے اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ۝ یہ مفعول محذوف سے بدل ہے۔ دراصل عبارت یوں ہے : الا مخلص سلیم القلب من مرض الکفر والنفاق ضرورة اشتراط نفع کل منهما بالایمان۔ (مگر وہ جس کا قلب کفر و نفاق کے مرض سے مخلص ہوگا، کیونکہ ہر نفع مشروط بالایمان ہے)

ف : کشف الاسرار میں لکھا ہے کہ یہاں پر قلب بمعنے نفس ہے یعنی وہ نفس جو کفر و معاصی سے صحیح و سالم ہے۔

سوال : گناہوں کا تعلق تو اعضاء سے ہوتا ہے لیکن یہاں پر ان کا تعلق قلب کے ساتھ بتایا گیا ہے۔

جواب : چونکہ تمام اعضاء قلب کے تابع ہیں یہی وجہ ہے کہ اگر قلب صحیح ہو تو اعضاء بھی برائی نہیں کرتے اور اگر قلب میں فساد ہو تو اعضاء برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مگر یہ جواب کے پاس سلامتی دلا لائے گا۔

حدیث شریف میں ہے : ان فی جسد ابن آدم لمضغة اذا اصلحت صلح لها سائر الجسد واذا فسدت فسد لها سائر الجسد الا وهی القلب۔

(ابنِ آدم کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ صحیح ہو تو تمام جسم صحیح ہوگا اگر وہ فاسد ہوگا تو تمام جسم میں فساد ہوگا، خبردار وہ ٹکڑا قلب ہے)

ازالہ وہم وہابیہ (اس آیت سے وہابیہ نے عدم شفاعت کا استدلال کیا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے صاحبِ روح البیان قدس سرہ فرماتے ہیں کہ)

یہ آیت کفار و مشرکین کے رد میں ہے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ چونکہ ان کا مال اور اولاد بکثرت ہے قیامت کے روز ان کے کام آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں فرمایا کہ نہ انھیں مال نفع دے گا نہ اولاد۔ اہل ایمان و اسلام کو قیامت میں ان کی نیکی اور خیرات فائدہ دے گی۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے ہی ان کی اولاد بھی انھیں نفع پہنچائے گی۔

استدلالِ اہلسنت قیامت میں مال و اولاد کا فائدہ پہنچنا ظاہر ہے کیونکہ خیرات و صدقات راہِ خدا میں مال لٹانے کا نام ہے اور اس کا اجر و ثواب ملے گا اور اس کے عوض بہشت

ملے گی۔ اس معنی پر بندے کو مال نے نفع دیا اور اولاد کا نفع دینا حدیث شریف کے مضمون ذیل سے واضح ہے۔ وہ یہ کہ جو اولاد اس کی موجودگی میں مرجاتی ہے وہ اس کے لیے اجر اور ذخیرۂ عقبیٰ بن جاتی ہے اور اگر وہ خود مرجائے اور اپنے پیچھے اولاد چھوڑ جائے تو اس کی اولاد اگر اسے نیک دُعاؤں سے یاد کرتی ہے تو اس سے بھی اس کی شفاعت متوقع ہوتی ہے۔

قلبِ سلیم کے معانی

○ حضرت ابوالقاسم حکیم رحمہ اللہ سے قلبِ سلیم کے متعلق سوال ہوا تو فرمایا قلبِ سلیم کی تین نشانیاں ہیں:

(۱) کسی کو ایذا نہ دے۔

(۲) کسی سے ایذا محسوس نہ کرے۔

(۳) جس کے ساتھ احسان کرے اس سے مکافاتِ عمل کی توقع نہ رکھے۔

اس لیے ایذا نہ دینا ورع اور پرہیزگاری کا موجب بنے گا اور کسی سے ایذا نہ پانا وفا لائے گا، احسان کرنے پر بدلہ کی امید نہ رکھنا اخلاص لاتا ہے۔

○ کاشفی مرحوم نے لکھا کہ اہلِ تصوّف نے فرمایا کہ سلامت قلب کا مطلب یہ ہے کہ مومن کلمۂ اسلام لا الٰہ الّا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دینے میں مخلص ہو۔

○ بعض نے کہا کہ قلبِ سلیم کا معنیٰ یہ ہے کہ دل حُبِ دنیا سے خالی ہو۔

○ بعض نے کہا کہ اسے حسد و خیانت سے دُور رکھا جائے۔

اہلِ بیت و ازواج و اصحاب رضی اللہ عنہم اجمعین

○ تیسیر (تفسیر) میں ہے کہ قلبِ سلیم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلبیت و ازواجِ مطہرات و اصحابِ کرام سے بغض سے دل کو پاک وصاف رکھا جائے۔

○ امام قشیری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ قلبِ سلیم یہ ہے کہ دل از غیرِ خدا یعنی طمعِ دنیا و رجائے عقبیٰ سے خالی ہو یا بدعت سے خالی اور سنّتِ رسول سے مطمئن ہو۔

○ حضرت سیّد الطائفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سلیم اس شخص کو کہتے ہیں کہ جسے ایسا سانپ ڈسے کہ جس کے ڈسنے سے ایسی بیقراری اور اضطراب پیدا ہو کہ اسے لمحہ بھر بھی قرار نہ ملے۔ ایسے ہی سلیم وہ قلب ہے جو دائمًا جزع و فزع اور تضرع وزاری میں ہو اور اس سے بیقرار ہو کہ شاید وصال کی گھڑی سے ہجر و فراق دُور ہو جائے۔

ز شوقِ وصل می نالم و گر دستم دہد روزے
ز بیم ہجر می گریم کہ ناگہ در کمیں باشد

ہمام از گریۂ خونیں و سوزِ دل مکن چندیں
نہ دانستی کہ حال عشقبازاں ایں چنیں باشد

ترجمہ: شوق وصال سے اس لیے روتا ہوں کہ شاید کبھی نصیب ہو تو پھر ہجر و فراق نہ آجائے خون کے آنسو اور سوزِ دل کا غم مت کھا اس لیے کہ عاشقوں کا یہی حال ہوتا ہے۔

حضرت مولانا جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

محنت قرب ز بعد افزونست
جگر از محنت مرہم خونست
ہست در قرب ہمہ بیم زوال
نیست در بعد جز امید وصال

ترجمہ: قُرب و بُعد کا درد بہت ہے جگر ہر قسم کے درد سے پُر ہے قرب میں زوال کا خوف ہے اور بُعد و فراق میں امیدِ وصال کے سوا کیا ہے۔

تفسیر صوفیانہ بحر (تفسیر) میں ہے کہ قبول فیض الٰہی کے لیے حضرت حق کے وصول کے لیے نہ مال نفع دیتا ہے نہ اولاد۔ مگر اس کو، جو مراقبہ کے وقت اللہ تعالیٰ کے ہاں قلب سلیم لائے۔ اور قلبِ سلیم وہ ہے جو مزاج اصلی کے انحراف سے سالم ہو۔ مزاج اصلی سے وہ فطرتِ انسانی مراد ہے جس پر انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا کیونکہ وہ کیفیت شیشے کی طرح ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسان میں تجلی صفات جمال و جلال کے قابل بنایا ہے۔ جیسے آدم علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ نے اول فطرت میں قبل از تعلق کونین سے پیدا فرمایا تھا۔ الا من اتی الخ تخلق باللہ و اتصاف بصفۃ الٰہیہ کی طرف اشارہ ہے۔ جب قلب سلیم بلا عیب نہ ہو تو نقصان ہے فائدہ اس وقت ہے جب وہ قلب متصف بطہارۃ قدس الحق ہو کہ اس کی نظر خلق پر بالکل نہ رہے۔

قلب سلیم کے مزید معانی ○ حضرت ابن عطا رحمہ اللہ نے فرمایا: قلبِ سلیم وہ ہے جسے آفات کی کوئی شے تشویش میں نہ ڈالے۔

○ کسی سے سلامت صدر کے متعلق سوال ہوا تو انہوں نے فرمایا: قلبِ سلیم یہ ہے کہ انسان حدِ یقین پر ہو اور اس کے دل سے تلوین و تمکین کے ارادے اور خیالات بالکل مٹ جائیں۔

○ حضرت ابو یزید رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں مفاوز یعنی جنگلات طے کر کے بوادی تک پہنچا پھر ان کو طے کرتا ہوا ملکوت تک پہنچا ملکوت کو طے کر کے ملک (بفتح المیم و کسر اللام) کے ہاں حاضر ہو کر عرض کی اس کا مجھے انعام عطا ہو۔ فرمایا جتنی منازل طے کر لی ہیں یہ سب میں نے تجھے انعام میں دیں۔ میں نے عرض کی: میں نے

ان کو دیکھا تک نہیں۔ فرمایا تو پھر کیا چاہتا ہے۔
کہا میں چاہتا ہوں کہ میرا کوئی ارادہ نہ ہو۔ یعنی فنا چاہتا ہوں۔ فرمایا، میں نے وہی تمہیں بخشا۔

تفسیر عالمانہ وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ○ اس کا عطف لا ینفعم پر ہے۔
سوال: ماضی کا مضارع پر عطف کیوں؟
جواب: تاکہ تحقق وقوع پر دال ہو جیسے مضارع میں استمرار نفع مال و اولاد کی دلالت ہے (یعنی جو لوگ کفر و معاصی سے دنیا میں محفوظ رہے بہشت ان کے اتنی قریب لائی جائے گی کہ وُہ اسے موقف (محشر کے میدان) میں دیکھیں گے اور ان کے اندر نعمتوں اور لذتوں سے خوش ہوں گے کہ ابھی ہم اس میں داخل ہونے والے ہیں۔)

تفسیر صوفیانہ البحر (تفسیر) میں ہے کہ بہشت ان کے قریب لائی جائے گی کیونکہ وُہ قبل ازیں اس سے دُور تھے۔ اس لیے کہ اس مقام پر انہیں قربِ الٰہی نصیب ہوگا۔

تفسیر عالمانہ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِلْغٰوِیْنَ ○ اور جہنم ان گمراہوں کے سامنے لائی جائے گی جو طریقِ حق سے بھٹک گئے اور طریقِ حق سے ایمان اور تقوٰی مراد ہے۔ یعنی دوزخ ان کی نظروں کے سامنے آئے گی اس کے اندر جو عذاب کے سامان ہیں وُہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور انہیں یقین ہوگا کہ ابھی وہ اس میں ڈالے جائیں گے اور بچنا مشکل ہے اس سے غم بڑھ جائیں گے۔

نکتہ: دو مختلف فعل لائے گئے تاکہ جانب وعد کو ترجیح ہو اس لیے کہ تبریز تقریب کو مستلزم نہیں۔
نکتہ: بہشت کی تقدیم میں سبقت رحمت بر غضب کی طرف اشارہ ہے۔

تفسیر صوفیانہ البحر میں ہے دوزخ اس لیے ظاہر کی گئی کہ دُنیا میں ان کی توجہ اس طرف تھی کیونکہ وُہ ہمیشہ شہوات کی طلب میں مبتلا رہے اور دوزخ کو شہوات نے گھیرا ہوا ہے۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

حفت الجنة بمکروھا تنا
حفت النیران من شھوا تنا

ترجمہ: بہشت کو تکالیف نے گھیرا ہُوا ہے تو دوزخ کو شہوات نے۔

یعنی بہشت کے ارد گرد وُہ امور ہیں جو ہمارے نزدیک مکروہ ہیں اور دوزخ وہ امور گھیرے ہوئے ہیں جو ہمیں مرغوب ہیں۔

تفسیر عالمانہ وَ قِیْلَ لَهُمْ اور قیامت میں گمراہوں کو زجر و توبیخ کے طور کہا جائے گا اور انھیں کہنے والے فرشتے ہوں گے جو انہیں اللہ تعالٰی کی جانب سے اس کے حکم سے کہیں گے اَیْنَمَا کُنْتُمْ دنیا میں تَعْبُدُوْنَ ○ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اللہ تعالٰی کے سوا تم کس کی عبادت کرتے تھے

یعنی اب وہ تمہارے معبود کہاں ہیں جن کی تم دنیا میں اس لیے پرستش کرتے تھے کہ وہ قیامت میں تمہاری سفارش کریں گے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہیں مقرب بنائیں گے۔ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ کیا تم سے عذابِ الٰہی دفع کر کے وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ۞ یا اپنے سے عذاب دفع کر سکیں گے۔

ف : افتعال کا باب یہاں پر فعل کے تابع ہے۔

حلِ لغات : کشف الاسرار میں ہے کہ غیر سے شر و سوء دفع کرنے پر مدد کا نام نصر ہے اور اپنے سے شر و سوء دفع کرنے کو انتصار کہا جاتا ہے۔

سوال : ینصرون کے بعد ینتصرون کیوں؟

جواب : انتصار کا رتبہ نصر کے بعد ہے اس لیے کہ جو دوسرے کی مدد کر سکتا ہے وہ بطریقِ اولیٰ اپنی بھی کر سکتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جو دوسروں کی مدد نہیں کرتا اس کی مدد کی جاتی ہے۔

ف : ابراہیم علیہ السلام کا سوال تقریع و تبکیت کا ہے اسی لیے اس سوال کے جواب کی ضرورت ہے۔ اسی لیے کہا گیا فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا۔ کیا وہ تمہاری مدد کریں گے

حلِ لغات : کبکبہ بمعنے عاجز کر کے اوندھا کرنا۔ کسی شے کا نیچے کی طرف گرنا۔ الکب کا تکرار ہے، بمعنے نیچے کو گرنا یا گرانا۔ تکرارِ لفظ تکرارِ معنیٰ پر دلالت کرتا ہے۔ یہ کبٌّ کا تکرار ہے اسے تفعیل کے باب میں لایا گیا۔ یعنی عین کو مکرر کیا گیا ہے۔ گویا کبکبوا دراصل کببوا تھا تین باآت کے اجتماع سے ثقالت پیدا ہو گئی تو دوسری باء کو کاف سے تبدیل کیا گیا جیسے زحزح دراصل زححح تھا۔ زحّہ یزحّہ سے ہے بمعنے کسی کو اپنی جگہ سے ہٹانا۔ پھر اسے باب تفعیل پر لایا گیا پھر دوسری حاء کو زاء سے تبدیل کیا گیا زحزحہ ہوا بمعنے باعدہ یعنی اس نے دور کیا۔

اب آیت کا معنیٰ یہ ہوا کہ وہ جہنم میں بار بار سر کے بل اوندھے گرائے جائیں گے یہاں تک کہ جہنم کے گہرے گڑھے میں جا پہنچیں گے هُمْ ان کے معبود وَالْغَاوٗنَ ۞ اور تمام گمراہ جو ان کی پرستش کرتے تھے، وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اور ابلیس کا لشکر اور اس کی ذریت جو انہیں گمراہ کرتی اور ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالتی اور انہیں بت پرستی پر ابھارتی اور ان سے کفر کے جملہ طریقوں اور جرائم و معاصی کا ارتکاب کراتی تو وہ سب کے سب جہنم میں اکٹھے جائیں گے جیسے وہ دنیا میں ان برائیوں میں اکٹھے تھے اَجْمَعُوْنَ ۞ (اَنْ کے ضمائر ان کے معطوف علیہ کی تاکید ہے) قَالُوْا یہ جملہ مستانفہ بیانیہ ہے یعنی جب بت کے پجاریوں کو سزا مذکور میں مبتلا کیا جائے گا تو وہ اپنے جرائم کا اعتراف کرتے ہوئے کہیں گے وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ۞ حالانکہ وہ جہنم میں جھگڑیں گے یعنی جہنم میں اپنے معبودوں سے گفتگو کریں گے بایں معنی کہ انہیں اللہ تعالیٰ گفتگو کی

طاقت پیدا فرمائے گا اور سمجھ بھی دے گا کہ انہیں کفار کیا کہہ رہے ہیں تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (اِن مخففہ ہے لام فرق بتانے والا ہے کہ ان ثقیلہ ہے نافیہ نہیں یعنی بخدا شان یہ ہے کہ ایسی روشن گمراہی میں تھے جس میں کسی قسم کا خفا نہ تھا اِذْ نُسَوِّیْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (ظرف ہے اس لیے کہ وہ روشن گمراہی میں تھے اور مضارع کا صیغہ اس لیے ہے تاکہ ماضی کا واقعہ سامنے آجائے) اب معنیٰ یہ ہوا کہ ہم نہایت فاحش گمراہی میں تھے جبکہ ہم تمہیں عبادت کے استحقاق میں رب العالمین کے برابر سمجھتے تھے حالانکہ تم اس کی ادنیٰ اور ذلیل اور عاجز ترین مخلوق تھے وَمَاۤ اَضَلَّنَاۤ اور ہمیں گمراہی کی دعوت نہیں دی اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ مگر مجرموں نے یعنی ہمارے بڑے سرداروں اور لیڈروں نے، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے ؛

ربنا انا اطعنا سادتنا وکبراءنا۔

(اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی)

حلِ لغات : جرم کا اصل معنیٰ ہے درخت سے پھل کاٹنا۔ اور الجرامۃ بمعنے ردی کھجور۔ اور اجرم بمعنے صار ذا جرم۔ جیسے اُتمر و اُلبن بمعنے صار ذا تمر و لبن یعنی صاحب تمر و لبن ہوگیا ایسے ہی اجرم بمعنے صاحبِ جرم ہوگیا۔ اب استعارۃً اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ناپسند کام کا مرتکب ہوا اسے اچھے کام کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا جائے گا۔

فَمَا لَنَا تو نہیں ہیں ہمارے لیے مِنْ شَافِعِیْنَ ۝ کوئی سفارش کرنے والے، جیسا کہ اہلِ ایمان سفارش کرنے والے ملائکہ وانبیاء علیہم السلام ہیں وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ ۝ اور نہ کوئی شفیق دوست ہے جیسے اہلِ ایمان ایک دوسرے کے سچے دوست ہیں۔

حلِ لغات : الصدیق وہ ہے جو کسی کے ساتھ سچائی رکھتا ہو۔ اور حمیم انسان کے خاص قریبی عزیز کو کہا جاتا ہے۔ اہلِ عرب کہتے ہیں : حامۃ الرجل بمعنے خاصتہ۔ (کذا فی فتح الرحمٰن)

امام راغب فرماتے ہیں : حمیم بمعنے القریب المشفق، اس لیے کہ جو اپنے عزیزوں کے لیے حمایت یقینی کا دم بھرے وہی درحقیقت دوستی کا حقدار ہے اسی لیے خواص لوگوں کو حامہ کہا جاتا ہے۔

بعض نے کہا کہ الحامہ بمعنے العامہ ہے۔ جیسا کہ ہم نے لکھا کہ اہلِ عرب کہتے ہیں : احتم فلان لفلان (فلاں نے فلاں کے لیے پختہ ارادہ کیا) یہی وجہ ہے کہ یہ اہتم سے بلیغ تر ہے، کیونکہ اہتمام احتمام میں پایا جاتا ہے۔

ف : جناب کاشفی مرحوم نے فرمایا کہ قوت القلوب میں ہے کہ حمیم دراصل ھمیم تھا۔ ہاء کو حاء کے ساتھ تبدیل کیا گیا ہے اسی لیے ان کو آپس میں مخرج کا قرب ہے اور ھمیم از اھتمام مشتق ہے۔ چونکہ

ھیم کافروں کے مقابلہ میں اہتمام کرتا ہے اسی لیے اسے ھیم کہا جاتا ہے اور اس میں دوستی کا حق ادا کیا جاتا ہے۔

ف : شافعین، شافع کی جمع ہے۔ صیغہ جمع اس لیے لایا گیا ہے کہ عموماً سفارش کے لیے زیادہ آدمی جمع ہوتے ہیں جیسا کہ بادشاہوں کے غیظ و غضب کے وقت سفارشیوں کو دیکھا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ سچے اور پکے دوست بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ بلکہ اگر کہا جائے کہ وہ نہ ہونے کے برابر ہیں تو بجا ہے۔ چنانچہ صائب نے فرمایا : ؎

دریں قحط ہوادری عجب دارم کہ خاکستر

کہ در ہنگام مردن چشم می پوشاند آتش را

ترجمہ : اس قحط سالی میں مجھے تعجب ہے کہ تو چاہتا ہے کہ آگ کی چنگاری ملے جبکہ راکھ پڑی ہے اور راکھ سے آگ خاک حاصل ہوگی!

کوئی کام نہ آئے گا سوائے ولی اللہ کے بعض اخبار میں ہے کہ قیامت میں ایک بندے کو حساب کے لیے لایا جائے گا حساب کے بعد اس کا عملنامہ نیکی و برائی میں برابر ہوگا اسے صرف ایک نیکی کی ضرورت ہوگی، اگر مل جائے گی تو اس کی نجات ہو سکے گی، اسے حکم ہوگا ایک نیکی لائیے تاکہ تمہیں بخشش نصیب ہو کیونکہ تیرے حقوق مانگنے والوں کو راضی کر لیا گیا ہے۔ ایک نیکی کی خاطر وہ شخص صفوں میں گھس کر اپنے ماں باپ سے ایک نیکی طلب کرے گا وہ جواب دے دیں گے۔ اس کے بعد دوستوں کے پاس جائے گا وہ بھی انکار کر دیں گے بلکہ کہیں گے کہ ہم خود ایک نیکی کے محتاج ہیں۔ واپس آئے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا : اے میرے بندے! نیکی لایا ہے؟ عرض کرے گا : یارب العالمین! سب نے جواب دے دیا ہے۔ اللہ فرمائے گا : اگر انہوں نے جواب دے دیا ہے تو یاد کر کوئی میرا دوست بھی تیرا دوست تھا۔ عرض کرے گا، ہاں رب العالمین! تیرے فلاں محبوب سے میرا تعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اس کے پاس جاؤ۔ وہ بندہ اس محبوبِ خدا کے پاس جاکر ایک نیکی کا سوال کرے گا تو وہ بندۂ خدا اسے نیکی عطا فرمائے گا۔ وہ بندہ اللہ تعالیٰ کے ہاں واپس آکر عرض کرے گا، یا اللہ! میں نیکی لایا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا : میں اس کے اعمال میں کمی نہیں کرتا۔ جاؤ میں نے تمہیں اور اس نیکی دینے والے محبوب کو بخش دیا۔

ف : اس روایت سے ثابت ہوا کہ اللہ والوں کی محبت اور دوستی سے بہت زیادہ فوائد نصیب ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی دوستی اور محبت کا بہت بڑا مرتبہ ہے۔

نیک کا پیار فائدہ دے گا حدیث شریف میں ہے : ان الرجل لیقول فی الجنۃ ما فعل بصدیقی فلاں وصدیقہ فی الجحیم فیقول اللہ اخرجوا لہ صدیقہ الی الجنۃ۔

(بہشت میں پہنچ کر نیک آدمی پوچھے گا میرا فلاں دوست کہاں ہے؟ وہ اس وقت دوزخ میں ہوگا۔ نیک آدمی کی وجہ سے اسے دوزخ سے نکالنے کا حکم ہوگا۔ چنانچہ اس نیک آدمی کے پیار کی وجہ سے اسے دوزخ سے نکال کر بہشت میں لایا جائے گا) (اللہ تعالیٰ بہشت میں بھیجتے وقت نیک آدمی کو فرمائے گا) میں نے اسے تجھے ہبہ کیا۔

اللہ والوں سے تعلق اور نسبت پیدا کرنے کا حکم حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اہل ایمان اور نیک لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دوست بناؤ کیونکہ قیامت میں انھیں شفاعت کی عام اجازت ہوگی۔

شفاعت کنندگان حدیث شریف میں ہے:

ان الناس یمرون یوم القیامة علی الصراط و الصراط دحض مزلة یتکفأ باھله والنار تاخذ منھم وان جھنم لتنطف علیھم۔

(لوگ پل صراط سے گزریں گے، پلصراط چونکہ ڈگمگانے کا مقام ہے اس لیے بعض لوگ جہنم کے اندر ہی گریں گے لیکن دوزخ بجائے جلانے کے ان پر برف برسائے گی)

یعنی اس وقت دوزخ آوازیں دے گی۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے پوچھے گا: تم کس کی عبادت کرتے تھے؟ عرض کریں گے: یا اللہ! تمہیں زیادہ معلوم ہے کہ ہم سوائے تیرے اور کسی کو نہیں پوجتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ایسی آواز دے گا کہ اس طرح کی آواز پہلے کسی نے نہیں سنی ہوگی کہ آج میں تمہیں کسی کے سپرد نہیں کروں گا، سن لو میں نے تمہیں بخش دیا اور تم سے راضی ہوں۔ اس وقت ملائکہ ان کی شفاعت کریں گے اور وہ وہاں سے نجات پاکر بہشت میں چلے جائیں گے ان کے دوسرے دوزخی ساتھی اسی جگہ کہیں گے فمالنا من شافعین الخ ہمارے سفارشی کوئی نہیں اور نہ ہی کوئی ہمارا سچا اور پکا دوست ہے۔

فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً۔ لو تمنا ئیہ ہے لیت کے قائم مقام ہے۔ کیونکہ یہ تقدیر کے معنی کے لیے آتا ہے گویا کہا گیا ہے کاش! ہمیں دنیا کی طرف لوٹنا ہوتا فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ○ تو ہم ہوتے اہل ایمان سے نکون منصوب ہے اس لیے کہ تمنا کا جواب ہے اور یہ کلام ان سے افسوس اور حیرت سے ظاہر ہوگا۔ اور انہیں بالفرض دنیا کی طرف بھیجا بھی جاتا تب بھی وہ وہی عمل کرتے جن سے انھیں روکا گیا اس لیے کہ جسے خود اللہ تعالیٰ گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ وہ اگرچہ دنیا میں بار بار لوٹائے جاتے تب بھی وہ وہی برائیاں کرتے جو وہ پہلے دنیا میں کرتے تھے۔ دیکھیے دنیا میں انہیں کئی بار دکھ اور بیماریوں میں مبتلا کیا جاتا ہے نجات پانے کے بعد پھر اسی طرح برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں جیسے پہلے کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں سے

بنائے جوسُن کر عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اُن سے نہ بنائے جوسن کر رُوگردانی کرتے اور غافل رہتے ہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ بے شک ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی قوم کے مذکورہ قصّہ میں لَاٰيَـةً عبرت ہے اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی پرستش کرتا ہے تاکہ معلوم کرکے غیراللہ سے بیزاری ہو اور آخرت کی طرف توجہ ہو۔ کیونکہ اسے غیراللہ کی پرستش نفع نہ دے گی، بالخصوص وُہ اہلِ مکّہ جو ملّتِ ابراہیمی کے مدعی ہوکر غیراللہ کی پرستش کرتے تھے وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ ابراہیم علیہ السلام کی اکثر قوم نہ تھی مُّؤْمِنِيْنَ ○ قریش کی طرح اہلِ ایمان۔

اعجوبہ: مروی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام پر ماسوائے لُوط علیہ السلام اور نمرود کی لڑکی کے اور کوئی ایمان نہ لایا۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ اور بے شک وہ اللہ تعالیٰ مشرکین پر ایسا غالب ہے کہ اس کا غلبہ رد نہیں ہوسکتا الرَّحِيْمُ ○ بخشنے والا ایسا کہ جو بندہ توبہ کرے اس کی توبہ رد نہیں فرماتا اور وُہ بلاوجہ کسی کو عذاب میں مبتلا نہیں فرماتا بلکہ مہلت دیتا ہے جیسے قریش کو بہت مہلت بخشی۔ کیونکہ اس کی رحمتِ واسعہ کا یہی تقاضا ہے صرف اس لیے کہ وُہ خود یا ان کی اولاد میں سے کوئی ایمان لائے۔ لیکن عمل کی جزا و سزا ضرور دے گا کیونکہ ہر عمل کی جزا و سزا ضروری ہے۔ اگر عمل نیک ہُوا تو نیک جزا نصیب ہوگی اگر عمل بُرا ہوا تو سزا پائے گا۔

ف: ممکن ہے کہ اکثرھم کی ضمیر نبی پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قوم کی طرف راجع ہو اس لیے کہ یہ آیات ان کے سامنے پڑھی جاتیں تاکہ وُہ عبرت پکڑ کر ایمان لائیں۔ اسے تفصیل کے ساتھ پہلے بیان کیا گیا ہے۔

تفسیرِ صُوفیانہ بحرالعلوم (تفسیر) میں ہے کہ نفس کی تخلیق صرف امّارۃ بالسّوء کے لیے ہُوئی ہے یعنی اس کی فطرت کفر ہے اگر وہ ایمان لائے تو امّارہ کے بجائے مامورہ ہوجائے گا جو کہ وہ اس کی عادت ہے ہماری اس تقریر پر و ان النفس لامارہ بالسوء الخ دلالت کرتا ہے یعنی ہے تو وُہ امّارہ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل وکرم سے مامورہ و مومنہ ہوجائے گا جو اس کی طبع کے خلاف ہے اسی لیے فرمایا و ماکان اکثرھم مؤمنین یعنی اکثر اصحاب نفوس مومن نہیں وان ربك لھو العزیز اور بے شک تیرا رب اکثر مخلوق کو ایمان کی ہدایت نہیں دیتا چہ جائیکہ وُہ اپنی درگاہ تک پہنچائے الرحیم وُہ اپنی رحمت سے ہی سبیل الرشاد کی راہ دکھاتا ہے ان لوگوں کو جو اس کے لیے جدوجہد کرتے ہیں بلکہ اپنی بارگاہِ جلال تک ان کو بھی پہنچاتا ہے جو طالبِ صادق ہیں۔ اس سے ثابت ہُوا کہ اگرچہ ہدایت اس کی عنایت سے ہوتی ہے لیکن اسباب کا دامن پکڑنا ضروری ہے تاکہ رحمت کے دروازے مفتوح ہوں اور نفس کی امرِالٰہی کی مخالفت پر ملامت کی جائے اور دُنیا میں ہی ایسے آداب بجا لانے چاہئیں جو کل آخرت میں فائدہ دیں۔ ورنہ آخرت میں تو کفار بھی اپنے آپ کو ملامت کریں گے کہ وہ ایمان نہ لائے (باقی برصفحہ ۲۵۷)

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحِ ٱلْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي
لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَمَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ
أَجْرِىَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ۝ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ قَالُوٓا۟ أَنُؤْمِنُ لَكَ وَٱتَّبَعَكَ
ٱلْأَرْذَلُونَ ۝ قَالَ وَمَا عِلْمِى بِمَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ۝ إِنْ حِسَابُهُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّى لَوْ تَشْعُرُونَ ۝
وَمَآ أَنَا۠ بِطَارِدِ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۝ إِنْ أَنَا۠ إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ قَالُوا۟ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَٰنُوحُ
لَتَكُونَنَّ مِنَ ٱلْمَرْجُومِينَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنَّ قَوْمِى كَذَّبُونِ ۝ فَٱفْتَحْ بَيْنِى وَبَيْنَهُمْ
فَتْحًا وَنَجِّنِى وَمَن مَّعِىَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۝ فَأَنجَيْنَٰهُ وَمَن مَّعَهُۥ فِى ٱلْفُلْكِ
ٱلْمَشْحُونِ ۝ ثُمَّ أَغْرَقْنَا بَعْدُ ٱلْبَاقِينَ ۝ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم
مُّؤْمِنِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلرَّحِيمُ ۝

ترجمہ : قوم نوح نے پیغمبروں کی تکذیب کی جبکہ انہیں ان کے ہم قوم نوح (علیہ السلام) نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں بیشک میں تمہارا امانتدار پیغمبر ہوں سو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اور اس پر میں تم سے اُجرت نہیں مانگتا میرا اجر تو نہیں مگر پروردگار عالم پر۔ سو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میرا کہا مانو، کہنے لگے کیا ہم تجھے مانیں حالانکہ رذیل لوگ تمہارے ساتھ ہوئے ہیں فرمایا مجھے کیا معلوم ان کا کیا پیشہ ہے ان کا حساب نہیں مگر میرے رب پر اگر تمہیں شعور ہو اور میں ایمانداروں کو نہیں ہٹاؤں گا میں تو نہیں مگر واضح طور ڈرانے والا۔ انہوں نے کہا اے نوح (علیہ السلام) اگر تو باز نہ آئے گا تو ضرور تو سنگسار کر دیا جائے گا۔ کہا اے میرے پروردگار! میری قوم نے میری تکذیب کر ڈالی تو تو میرے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما اور مجھے اور میرے ساتھی ایمانداروں کو نجات دے۔ سو ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو بھری ہوئی کشتی میں نجات دی، پھر اس کے بعد ہم نے باقیوں کو غرق کر دیا بیشک اس میں البتہ عبرت ہے اور ان کے اکثر ایماندار نہ تھے بیشک تمہارا رب وہی عزت والا رحم والا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۲۵۶) بلکہ اس وقت آرزو کریں گے کہ کاش انہیں پھر دنیا میں بھیج دیا جائے تاکہ ایمان لائیں اور

وہ اعمال کریں جو ان کے لیے مفید ہوں ؎

امروز قدر پند عزیزان شناختیم

یارب روان ناصح ما از تو شاد باد

ترجمہ: آج ہی ہمیں عزیزوں کی نصیحت کا پتا چلا ہے اے رب میرے ناصح کی روح شاد باد ہو۔

دُعا: اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے غلبہ وقہر سے محفوظ رکھے اور اپنی رحمت میں جگہ دے اور دنیا و آخرت میں ہمیں اہل قبور سے بنائے کیونکہ وہی خیر کے امورِ باطنہ و ظاہرہ کی توفیق بخشنے والا ہے۔

(تفسیر آیات صفحہ گزشتہ)

تفسیر عالمانہ كَذَّبَتْ ہمیشہ تکذیب کی یعنی عمر بھر، جب سے نوح علیہ السلام کی دعوت کا پیام سُنا قَوْمُ نُوحٍ قوم مردوں اور عورتوں کی ملی جماعت کو کہا جاتا ہے یا صرف مردوں کی جماعت کو قوم کہتے ہیں اور عورتیں اس میں تبعًا شامل ہوتی ہیں اور یہ صیغہ مونث ہے بدلیل تصغیر کے کہ وہ قویمۃ آتی ہے الْمُرْسَلِينَ ۝ صرف نوح علیہ السلام کی تکذیب کی۔ لیکن جمع کا صیغہ اس لیے ہے کہ ایک رسول کی تکذیب سے گویا سب کی تکذیب ہوتی کیونکہ اصول شرائع اور توحید پر سب کا اتفاق تھا، یا اس لیے کہ ایک رسول باقی تمام رسل علیہ السلام کی تصدیق کا حکم فرماتا ہے۔ إِذْ قَالَ لَهُمْ۔ اذ تکذیب کی ظرف ہے اس لیے کہ زمان طویل کے لیے مستعمل ہے أَخُوهُمْ اُن کے بھائی نے فرمایا اور نوح علیہ السلام ان کے نسبًا بھائی تھے۔ یہ اس لیے ظاہر کیا گیا تا کہ یقین ہو کہ ان کا معاملہ کوئی ڈھکا چھپا تو ہے نہیں اسی لیے ان کے معاملۂ صدق و دیانت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اور دوسرا یہ کہ وہ اس کی زبان کو بھی جانتے تھے اس طرح سے ان کو دعوت کو قبول کرنا قریب الفہم تھا نُوحٌ یہ اخوھم کا عطف بیان ہے أَلَا تَتَّقُونَ ۝ کیا تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے نہیں ہو کہ اس کی عبادت چھوڑ کر اس کے غیر کی پرستش میں لگے ہوئے ہو إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ بے شک میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ہوں أَمِينٌ ۝ امانت دار مشہور ہوں، تمہیں میری امانت کا پورا یقین ہے اور جو دنیوی امور میں دیانت و امانت میں کمی نہیں کرتا تو پھر وحی و رسالت میں کس طرح کمی کر سکتا ہے فَاتَّقُوا اللَّهَ تو اللہ تعالیٰ سے ڈرو وَأَطِيعُونِ ۝ اور میری اطاعت کرو اس بارہ میں کہ میں تمہیں توحید اور طاعتِ الٰہی کے متعلق حکم دیتا ہوں اس میں خیانت نہیں کرتا اور نہ ہی میرا کسی بُرائی کا ارادہ ہے فا ما بعد کو

امانت کے ساتھ ترتیب کے لیے ہے) وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اور میں تم سے پیغام رسانی پر سوال نہیں کرتا مِنْ اَجْرٍ کسی مزدوری اور انعام کا۔ وہ اس لیے کہ جب رسل کرام علیہم السلام کا پیغام رسانیِ حق پر مزدوری و اجر نہ مانگنا ان کی تصدیق کے لیے پُراثر ثابت ہوتا ہے تو دنیوی لالچ کی تہمت سے بھی ان کو بیزاری حاصل ہوتی ہے، اِنْ اَجْرِیَ میں جو عمل کرتا ہوں اس پر مجھے کوئی ثواب نہیں اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ مگر رب العلمین کے ہاں، کیونکہ جو بھی محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر عمل کرتا ہے وہ غیر اللہ سے اجر طلب نہیں کرتا۔ ؏

اہلِ علم کو سبق اس سے وُہ اہلِ علم سبق سیکھیں جو انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں وہ جو عمل اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لیے کریں اس پر اجر اور مزدوری انسانوں کی بجائے اللہ تعالیٰ سے طلب کریں، جیسے انبیاء علیہم السلام کا طریقہ تھا۔ انھیں ان کے طریقے اپنانے لازم ہیں۔ اشاعتِ علومِ اسلامیہ میں کسی سے کچھ نہ مانگیں وعظ و نصیحت کا فریضہ فی سبیل اللہ سرانجام دیں۔ جو عالمِ دین مسلمان سامعین سے علم کی اشاعت اور اپنی وعظ و نصیحت پر کسی قسم کا اجر اور انعام یا مفاد اٹھانا چاہتا ہے اس کے وعظ و نصیحت اور علم میں برکت نہیں ہوتی۔ ایسے عالم کو نہ کوئی اخروی فائدہ ہوگا نہ سامعین کو برکت نصیب ہوگی۔ بلکہ یوں سمجھو کہ یہ ایک قسم کی بیع و شرا ہے، تھوڑی سی قیمت پر بہت سے دینی سرمایہ کو ضائع کر دیا ؎

زیاں می کند مرد تفسیر دان
کہ علم و ادب می فروشد بنان

ترجمہ: وُہ تفسیر دان عالمِ دین بہت نقصان کر رہا ہے جو علم و ادب کو روٹی کے عوض بیچ رہا ہے۔

(فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ○ تو اللہ تعالیٰ سے ڈر کر میری اطاعت کرو) فا ماقبل کو ان کے تنزہ عن الطمع کی ترتیب کے لیے لایا گیا ہے اور تکرار تاکید اور تنبیہ کے لیے ہے کہ دونوں یعنی امانت و قطع طمع ایجاب تقویٰ و طاعت میں ایک الگ مستقل باب ہے۔ پھر جب دونوں کا اجتماع ہو جائے تو اور فوقیت حاصل ہو جاتی ہے قَالُوْٓا نوح علیہ السلام کی قوم نے کہا اَنُؤْمِنُ لَکَ یہ استفہام انکاری ہے یعنی کیا ہم ایمان لائیں وَاتَّبَعَکَ الْاَرْذَلُوْنَ ○ حالانکہ تیرے فرمانبردار تو وُہ ہیں جو نہایت ہی ادنیٰ مرتبہ رکھنے والے ہیں نہ ان کے ہاں مال و دولت ہے نہ عوام کی نظروں میں ان کی عزت۔ یہی تمھارا حال ہے جیسے تم کہتے ہو تو پھر ہم تمھاری کیا صحبت پاس کریں (ارذلون ارذل کی جمع ہے اور رذالہ خساست اور دناءت اور ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ناگوار ہو) کفار کی مراد یہ تھی کہ جب تک تیرے ہاں یہ رذیل لوگ ہوں گے ہم تیرے ہاں نہیں آسکتے۔ کیونکہ ان لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں اس لیے کہ نہ تو عقل کی طاقت رکھتے ہیں، نہ ہی فکر و سوچ کے لحاظ سے اچھے ہیں بلکہ یہ عامی نظر کے لوگ ہیں۔ یہ ان کافروں کی کم عقلی اور دنیاوی انہماک کا نتیجہ تھا اس لیے

کہ وہ برگزیدہ اسے سمجھتے تھے جو دنیاوی اسباب رکھتا تھا۔ جو دنیا و دولت نہ رکھتا وہ اسے رذیل خیال کرتے تھے حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ ان احمقوں کو یہ خبر نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کی قدر و قیمت مکھی کے پر کے برابر بھی نہیں۔ ایسے ہی قریش کہا کرتے تھے جب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں غریب و مسکین حاضر ہونے لگے۔ حالانکہ ان کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ لوگ آخرت کی نعمتوں سے مالا مال ہیں اگرچہ دنیوی اسباب سے خالی ہیں۔ اسی طرح ہر نبی علیہ السلام کے متبعین کا حال رہا کہ اکثر مسکین و فقیر اور غریب لوگ ان کی اتباع کرتے رہے۔

ف : اولیاءُ اللہ (اور علمائے حق) کے متبعین کا بھی یہی حال ہے کہ چونکہ انھیں انبیاء علیہم السلام کی وراثت نصیب ہے اسی لیے ان کے متبعین کی طرح ان کے تابعدار بھی اکثر غریب و مسکین لوگ ہوتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اربابِ جاہ و مال و اسباب بہت کم حقیقت شناس ہوتے ہیں ؏

دراں سرست بزرگی کہ نیست فکر بزرگی

ترجمہ : اسی سر کو بزرگی نصیب ہوگی جسے بزرگی کا تصور نہ ہو۔

قَالَ نوح علیہ السلام نے جواب میں فرمایا جب کافروں نے کہا کہ یہ لوگ نظر و بصیرت کے تحت ایمان نہیں لائے وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ اور وہ جو عمل کر رہے ہیں اس کا مجھے علم نہیں کہ وہ اخلاص سے عمل کر رہے ہیں یا منافقت سے۔ میرا کام تو یہ ہے کہ میں ان کے ظاہر کا اعتبار کروں اور ان کے باطن کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کروں مجھے ان کی تفتیش حال کا حکم نہیں اور ان کا دل چیرنا میرے ذمہ ہے۔

ف : ظاہر یہ ہے کہ ما استفہامیہ ہے بمعنے ایّ شیئٍ ہے محلاً مرفوع علی الابتداء ہے اور علمی اس کی خبر ہے اور یہ نافیہ بھی ہوسکتا ہے اور باء کا تعلق علمی ہے یہ تقدیر اول پر ہے اور تقدیر ثانی پر خبر محذوف ہوگی تاکہ کلام مکمل ہو (جناب کاشفی مرحوم نے اس کا معنی یہ کیا کہ میرا علم وہاں نہیں پہنچا جو یہ عمل کر رہے ہیں اِنْ حِسَابُهُمْ ان کے باطن کا محاسبہ نہیں اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں، کیونکہ دل کی بات وہی جانتا ہے۔

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

حدیث شریف فاذا شهدوا ان لا اله الا الله عصموا منی دماءهم واموالهم الا بحقها وحسابهم على الله ۔

(جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ (محمد رسول اللہ) کی گواہی دی انہوں نے اپنی جان اور مال کو محفوظ کر لیا اب ان کا حساب صرف اللہ تعالیٰ پر ہے) (وہ جیسے چاہے کرے)

ف : حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ہم نہ زندوں کا محاسبہ کرسکتے ہیں اور نہ مُردوں کا کوئی فیصلہ کرسکتے ہیں۔

لَوۡ تَشۡعُرُوۡنَ ○ اگر وہ اہلِ شعور و ادراک سے ہیں تو وہ خود سمجھ جائیں گے۔ لیکن اے کافرو! تم جاہل ہو کہ ایسی باتیں کر رہے ہو جن کا تمہیں کوئی علم نہیں (اور یہ باب اوّل سے ہے۔ اگر شعر بمعنے نظم ہو تو باب خامس سے ہے) اَنَا بِطَارِدِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○ میں اہلِ ایمان کو اپنے ہاں سے نہیں ہٹا سکتا (الطرد بمعنے انزعاج والابعاد علیٰ سبیل الاستخلاف) یعنی کلیں مومنوں کو ہٹانے والا نہیں ہوں۔ یہ انؤمن لك سے جو وہم پیدا ہوتا تھا اس کا جواب ہے یعنی کافرو! جو تم کہتے تھے کہ ہم اس وقت ایمان لائیں گے جب غریب لوگ تمہارے ہاں نہیں آئیں جائیں گے۔ نوح علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا: میں اہلِ ایمان کو اپنے سے دُور نہیں کر سکتا۔

ف: ابنِ عطاءؒ نے فرمایا کہ نوح علیہ السلام نے فرمایا: میں اس سے کیسے رُوگردانی کروں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف متوجہ ہے۔

اِنۡ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ○ میں نہیں ہُوں مگر ڈرسنانے والا یعنی میں نہیں مگر رسول یہ کہ لوگوں کو ڈرسناؤں اور انھیں کفر و معاصی سے روکوں خواہ وہ دنیا دار ہوں یا غرباء، زیادہ عزت والے ہوں یا کم عزّت والے۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دنیاداروں کی تابعداری کے خیال پر غریب تابعداروں کو اپنے سے ہٹادوں قَالُوۡا لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ یٰنُوۡحُ کافروں نے کہا کہ اے نوح (علیہ السلام) اگر تم اس سے باز نہیں آتے جس کی ہمیں دعوت دیتے ہو اور خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے ہو۔ (الانتہاء بمعنے پیچھے ہٹنا)

لَتَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمَرۡجُوۡمِیۡنَ ○ تو ہو جاؤ گے مار کھانے والوں میں سے۔

حلِ لغات: المفردات میں ہے الرجام بمعنے پتھر۔ الرمی بمعنے پتھر مارنا۔ اہلِ عرب کہتے ہیں:

رجم فھو مرجوم۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لتکونن من المرجومین۔ المرجومین یعنی المقتولین۔ یعنی وہ مقتول جسے نہایت قبیح کیفیت سے قتل کیا جائے، جسے ہمارے عرف میں سنگساری کہا جاتا ہے۔

ف: جب انہوں نے نُوح علیہ السلام کو یہ دھمکی دی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل و خوار کر کے تباہ و برباد کر ڈالا۔ چنانچہ نوح علیہ السلام نے بارگاہِ حق میں عرض کی:

قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوۡمِیۡ کَذَّبُوۡنِ ○ کہا اے میرے پروردگار! میری قوم نے مجھے جھٹلایا ہے۔ یعنی بہت عرصہ میں نے انہیں دعوتِ حق دی اس کے باوجود انہوں نے میری تکذیب کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مجھ سے دُور بھاگتے چلے جارہے ہیں۔ فَافۡتَحۡ بَیۡنِیۡ وَبَیۡنَهُمۡ فَتۡحًا میرے اور ان کے مابین وہی فیصلہ فرما جس کے میں اور وہ مستحق ہیں۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات میں لکھا ہے کہ ان کے اور میرے اُوپر اپنے فضل وکرم سے ایک ایسا دروازہ کھول دے جس سے ہر ایک مستحق کو اس کا حق ملے، اور عدل وانصاف سے ہمارا فیصلہ فرما۔

حل لغات : افتح، الفتاحۃ سے ہے بمعنے الحکومۃ۔ الفتاح بمعنے الحاکم۔ اللہ تعالیٰ کو الفتاح اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بڑی سے بڑی مشکل کو کھولتا ہے۔ جیسے الفصیل اسے کہا جاتا ہے جو ہر طرح کے فیصلے کرے۔

ف : ابن الشیخ نے کہا کہ الحکم سے ان پر عذاب نازل کرنا مراد ہے۔ جیسا کہ ان کے بعد کے قول سے معلوم ہوتا ہے۔

تفسیر عالمانہ چنانچہ کہا وَنَجِّنِیْ اور مجھے نجات بخش وَمَنْ مَّعِیَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ اور انہیں جو میرے ساتھی اہلِ ایمان ہیں یعنی ہم سب کو عذاب اور کفار کے ایذا سے نجات بخش دے فَاَنْجَیْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ تو پھر ہم نے انھیں اور ان کے ساتھیوں کو نجات دے دی، جیسا کہ اُنھوں نے دعا کی فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ بھری ہوئی کشتی میں۔ یعنی ان کے ساتھی اہلِ ایمان اور دیگر وہ حیوانات جو ان کے ساتھ تھے اور ضرورت کے سامان اور کھانے پینے کی اشیأ سے کشتی بھری ہوئی تھی۔

حلِ لغات : الشحناء بمعنے عداوت اسی سے ہے کہ وہ بھی غصہ والے انسان کے دل کو بھر دیتی ہے۔

ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ پھر ان کو نجات دینے کے بعد ہم نے غرق کر دیا الْبٰقِیْنَ ۝ نوح علیہ السلام کی وہ باقی قوم جو کشتی پر سوار نہ ہوسکی۔

ف : اس سے معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام تمام رُوئے زمین کے لوگوں کے لیے مبعوث ہوئے، اس لیے کہ ان کے لیے الباقین فرمایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے لیے فرمایا:

ثم اغرقنا الآخرین۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ بے شک اس میں آنے والی نسلوں کے لیے عبرت ہے یعنی نوح علیہ السلام کی قوم کی قبولِ حق سے رُوگردانی اور فقراء مسلمین کی تحقیر کرنے والے لوگ عبرت حاصل کریں گے وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ اور نوح علیہ السلام کی قوم سے اکثر لوگ ایمان نہ لائے۔ مروی ہے کہ صرف اسی مرد اور عورتیں ایمان سے بہرہ ور ہوئے۔

کاشفی مرحوم نے لکھا کہ وہ کل اناسی تھے۔

ف : یا یہ حضور علیہ السلام کی قوم کے لیے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے محبوب محمد صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم! آپ کی قوم قریش سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے۔ فلہٰذا آپ نوح علیہ السلام کی طرح اپنی قوم کی ایذا و تکلیف سے صبر کیجئے۔ وہ بھی فتح یاب ہوئے آپ بھی فتحیاب ہوں گے ؎

کار تو از صبر نکو تر شود
ہر کہ شکیباست مظفر شود

ترجمہ: صبر سے تمہارا کام بہتر ہوگا کیونکہ جو صبر کرتا ہے وہ فتحیاب ہوتا ہے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ اور بے شک تیرا پروردگار جن کافروں پر عذاب نازل کرنے کا ارادہ کرتا ہے وہ ایسا قادر غالب ہے کہ اپنے ارادہ کے مطابق کام کرگزرتا ہے الرَّحِيْمُ ۝ اور جو گناہوں سے توبہ کرے تو اس کے لیے رحیم ہے یا یہ کہ عذاب میں تاخیر کرنے میں رحیم ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ ہر قصہ میں ان فی ذٰلک لاٰیۃ ماکان اکثرھم مکرر لایا گیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ اللہ کے نزدیک عزت واکرام کا مستحق وہی ہے جو ایمان کی دولت رکھتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔

(بے شک تمہارے خدا کے نزدیک مکرم تو وہ ہے جو پرہیزگار ہے)

اور اس میں شک نہیں کہ کمینے لوگ کثیر تعداد میں ہیں اور اہلِ کرم نہایت قلیل۔ کسی شاعر نے فرمایا: ؎

تعیرنا انا قلیل عدادنا
فقلت لہا ان الکرام قلیل

ترجمہ: مجھے میری محبوبہ نے عار دلاتے ہوئے کہا کہ تم تو معدودے چند ہو۔ میں نے کہا اہلِ کرم ہمیشہ تھوڑے ہوتے ہیں۔

اسی لیے اس کے بعد فرمایا: ان ربك لعزیز یعنی اس کی طرف اربابِ نفوس کے ذلیل لوگ ہدایت نہیں پاسکتے بوجہ ان کی خساست کے، اور اللہ تعالیٰ کے عزیز ہونے کے بعد یعنی ان کے مابین تضاد ہے پھر ہدایت کیسی۔ الرحیم وہ اپنی رحمت سے اربابِ قلوب میں سے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے ان کی علوہمت اور اپنی رحمت کی وفرت کی وجہ سے۔ ع

آفرین بر جان درویشے کہ صاحب ہمت است

ترجمہ: آفرین اس درویش پر جو صاحبِ ہمت ہے۔

(باقی صفحہ ۲۶۵ پر)

كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ
رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ
إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ۝ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ
لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ۝ وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَ
اتَّقُوا الَّذِي أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُونَ ۝ أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَبَنِينَ ۝ وَجَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝
إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ قَالُوا سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَوَعَظْتَ أَمْ لَمْ تَكُنْ
مِنَ الْوَاعِظِينَ ۝ إِنْ هَٰذَا إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِينَ ۝ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ۝ فَكَذَّبُوهُ
فَأَهْلَكْنَاهُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ
الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝

ترجمہ : عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ ان کے ہم قوم ہُود (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم ڈرتے نہیں بے شک میں تمہارے لیے امانتدار رسول ہُوں۔ سو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور میں تم سے اس پر کوئی اُجرت نہیں مانگتا میرا اجر نہیں مگر پروردگارِ عالم پر کیا تم ہر اونچے مقام یادگار امانت بناتے ہو کر راہگزروں سے ہنسی مذاق کرو اور مضبوط کوٹھیاں بناتے ہو اس امید پر کہ اس میں ہمیشہ رہو گے اور جب تم کسی کی گرفت کرتے ہو تو بڑی بے رحمی سے کرتے ہو۔ سو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میرا کہا مانو اور اس سے ڈرو جس نے تمہاری مدد فرمائی ان چیزوں سے جن کا تمہیں علم ہے تمہاری مدد فرمائی جانوروں سے اور بیٹوں سے اور باغات سے اور چشموں سے بے شک میں تمہارے متعلق بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہُوں۔ انہوں نے کہا ہمارے نزدیک تو دونوں امر برابر ہیں ہمیں نصیحت کرو یا ناصحوں سے نہ ہو یہ تو نہیں مگر وہی اگلے لوگوں کا طریقہ اور ہمیں عذاب نہیں ہو گا سو انہوں نے اسے جھٹلایا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا بے شک اس میں البتہ عبرت ہے اور ان کے اکثر ایماندار نہ تھے اور بے شک تمہارا پروردگار ہی عزّت والا مہربان ہے۔

(بقیہ صفحہ ۲۶۳)

تفسیر صوفیانہ دیگر نوح میں قلب کی طرف اور قوم میں نفس اور اس کی صفات کی طرف اور مومنین میں جسد وجملہ اعضا کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ یہ موافق شرع نیک عمل کرتے ہیں اور اس میں نفس کے بعض صفات کی طرف بھی اشارہ ہے جبکہ انھیں غلط راستے سے صحیح راستے پر لگایا جائے۔ الفلك سے شریعت کی کشتی مراد ہے اس لیے کہ وہ اوامر و نواہی اور حکمتوں اور مواعظ و اسرار و حقائق و معانی سے پُر ہے جو اس پر سوار ہوا وہ نجات پاگیا، اور جو اس پر سوار نہ ہوسکا وہ نفس کے اخلاقِ ذمیمہ کے طوفان کے غلبہ اور مال وجاہ و زینت وشہوات، جو کہ دنیا کمینی کے آفات سے ہیں، کے ابتلاء میں غرق ہوگا۔ اور کشتی کے لیے ملاح ضروری ہے۔ اور شرع کا ملاح وہ استاذ اور پیر و مرشد ہے جو اعمالِ خیر پہ لگاتا ہے کہ ان کی صحبت سے نجات نصیب ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت حافظ نے فرمایا: ؎

یار مردان خدا باش کہ در کشتی نوح
ہست خاکی کہ بآبی نخرد طوفان را

ترجمہ: مردانِ خدا کا دوست ہوجا اس لیے کہ نوح کی کشتی میں کوئی ایسی بات نہیں کہ وہ طوفان کے پانی کو اپنے اندر آنے دے۔

اس میں اشارہ ہے کہ وہ کام جو مشکل ہو مرشد کے اشارے سے آسان ہوجاتا ہے اور وہ کام جو غافل سے ہونا ناممکن ہو وہ واصل سے بآسانی ہوجاتا ہے۔

(تفسیر آیاتِ صفحہ ۲۶۴)

تفسیر عالمانہ كَذَّبَتْ عَادٌ ۨالْمُرْسَلِيْنَ ۝ عاد نے رسل کرام علیہم السلام کی تکذیب کی۔

سوال: عاد تو مذکر تھا پھر صیغہ مؤنث کا کیوں؟

جواب: یہاں چونکہ قبیلہ مراد ہے اور لفظ قبیلہ مونث ہے اس لیے صیغہ مونث لایا گیا ہے اور وہ اس قبیلہ کا مورثِ اعلیٰ تھا۔

ف: مقاتل نے لکھا عاد و ثمود ایک دوسرے کے چچا زاد تھے۔ عاد ہود علیہ السلام کی قوم تھی۔ صالح علیہ السلام کی قوم کا نام ثمود تھا۔ عاد و ثمود کی ہلاکت کے درمیان پانچسو سال کا فاصلہ تھا۔ مورخین فرماتے ہیں کہ عاد و ثمود دونوں بھائی تھے۔ ارم بن سام ابنِ نوح علیہ السلام کے فرزندوں سے تھے کیونکہ سام بن نوح علیہ السلام کے پانچ بیٹے تھے:

۱۔ ارم　　　۲۔ ارفخشہ

۳۔ عالم　　　۴۔ الیفر

۵۔ الاسود

ارم ان پانچوں سے کمزور اور بالکل ناکارہ متصور ہوتا تھا اس کے سات بیٹے تھے :

۱۔ عاد　　　۲۔ ثمود

۳۔ صحار　　　۴۔ طلم

۵۔ جدیس　　　۶۔ جاسم

۷۔ وبار

عاد اور اس کی اولاد کا مسکن یمن تھا اور ثمود اور اس کے فرزندوں کا مسکن حجاز و شام کے درمیان میں ۔ اور طلم کا مسکن عمان و بحران اور جدیس کا مسکن تہامہ اور صحار کا مسکن مابین طائف سے جبال طی تک اور جاسم کا مسکن مابین الحرم سفوان تک اور وبار کا مسکن ارضِ وبار تھا جو اسی کے نام سے مشہور ہے ۔ ان سب کی بولی عربی تھی اور یہ سب کے سب نیست و نابود ہو گئے ان کی نسل میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہا ۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ یہ تکذیب کی ظرف ہے یعنی جب ان کے نسب کے بھائی نے فرمایا هُوْدٌ یعنی ہُود علیہ السّلام بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام نے فرمایا ۔

تعارفِ ہود علیہ السّلام بعض نے کہا ہُود علیہ السّلام کا نام عابر تھا لیکن چونکہ باوقار شخصیت تھے اسی لیے اس نام (ہود) سے مشہور ہوئے ۔ آپ نے ڈیڑھ سو سال عمر پائی ۔ چالیس سال کی عمر میں آپ کو عاد کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ۔ انھیں جا کر فرمایا :

اَلَا تَتَّقُوْنَ ○ کیا تم شرک سے کنارہ کش نہیں ہوتے اور خدا کا خوف نہیں کرتے اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ بے شک تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے رسول بن کر آیا ہوں اَمِیْنٌ ○ تمہارے ہاں میں امانتدار مشہور ہُوں فَاتَّقُوا اللّٰهَ سو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرو وَاَطِیْعُوْنِ ○ اور جن حق باتوں کا میں تمہیں حکم دُوں ان میں تم میری اطاعت کرو وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ اور پیغامِ حق پہنچانے پر میں تم سے نہیں مانگتا مِنْ اَجْرٍ کوئی مزدوری ، جیسے بعض قصّہ گو لوگ قصّے سنانے کے بعد تم سے اجر یا انعام مانگتے ہیں اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ میرا اجر نہیں مگر پروردگار عالم پر ، کیونکہ اسی نے مجھے بھیجا ہے تو میرا اجر یا انعام وہی عطا فرمائے گا ۔ اس میں ہُود علیہ السلام وضاحت فرما رہے ہیں کہ میرا پیغام پہنچانا دنیوی یا دینی کوئی غرض نہیں ۔ حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ نے فرمایا : ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن
کہ دوست خود روشِ بندہ پروری داند

ترجمہ : گداگروں کی طرح کسی اجروثواب کی شرط پر تم عبادت نہ کرو کیونکہ وُہ کریم خود ہی بندہ پروری کی روش جانتا ہے ۔

اَتَبْنُوْنَ ہمزہ استفہام انکاری ہے ۔ کیا تم بناتے ہو بِکُلِّ رِیْعٍ ہر اونچے مقام کو ۔

حلِ لغات : الریع بکسر الراء اور بالفتح بھی ۔ ریعۃ کی جمع ہے یعنی بلند مکان ۔ اسی سے ریع الارض (اونچی زمین) کا استعارہ ہے بوجہ زیادتی وارتفاع کے ۔

اٰیَۃً نشانی بلند یعنی ایسے اُونچے مکانات جو باقی تمام مکانوں سے ممتاز اور نمایاں ہیں تَعْبَثُوْنَ ○ اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم ان عمارات سے کھیل رہے ہو کیونکہ جو عمارت بلا ضرورت بنائی جائے وہ عبث (فضول) ہے ۔

حدیث شریف ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم گھر سے باہر نکلے اور ایک بہت بڑی عمارت کو دیکھ کر فرمایا : ماھٰذہ (یہ کیا ہے ؟) عرض کی گئی یہ فلاں انصاری کی بلڈنگ ہے ۔ اس سے آپ کبیدہ خاطر ہو کر واپس گھر تشریف لائے کچھ دیر کے بعد وہی انصاری حاضرِ درگاہ ہوا ۔ اس نے سلام عرض کیا تو آپ نے اس سے منہ پھیر لیا ۔ پھر اس نے متعدد بار سلام عرض کیا لیکن بارگاہِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جواب نہ پا کر سمجھا کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں مغموم ہو کر اپنے دوستوں سے عرض کی کہ آج مجھ سے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ناراض محسوس ہو رہے ہیں لیکن سمجھ نہیں آرہا کہ مجھ سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے ۔ دوستوں نے کہا آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے تو آپ کی اونچی بلڈنگ دیکھ کر کبیدہ خاطر ہوئے ۔ یہی وجہِ ناراضگی معلوم ہوتی ہے ۔ یہ سن کر وہ صحابی گھر لوٹے اور بلڈنگ مسمار کر دی ۔ دوسرے روز حضور علیہ السلام گھر سے باہر نکلے اور اس اونچی بلڈنگ کو نہ پا کر پوچھا تو عرض کی گئی کہ حضور ! آپ کی ناراضگی دیکھ کر صاحبِ مکان نے اسے گرا دیا ہے ۔ اس پر حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

ان کل بناء یبنی وبال علیٰ صاحبہ یوم القیٰمۃ الا مالابد منہ ۔	ہر تعمیر جو بلا ضرورت تعمیر کی جائے وہ صاحبِ تعمیر پر قیامت میں وبال ہوگی ۔

ف : یہ امام راغب اور صاحبِ کشف الاسرار وغیرہما کا خیال ہے ۔ اور جلالین میں فرمایا کہ آیۃ سے کبوتروں کے لیے عمارات اور بڑے بڑے بروج مراد ہیں ۔ اور یہاں بروج سے کبوتر خانے مراد ہیں ۔

ہُود علیہ السلام کی تقریر کا موضوع حضرت ہُود علیہ السلام نے ان کے بڑے بڑے کبوتر نما سے (جو فضول عمارتیں تھیں) دیکھ کر انہیں روکا اور فرمایا: بچوں کی طرح کبوتروں سے مت کھیلو۔

ف: نصاب الاحتساب میں ہے کہ جس کھیل پر قیامت میں حساب ہوگا وہ لہو ولعب اور کبوتر بازی ہے۔

ف: حضرت امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا: بیوقوف ہے وہ جو کبوتر بازی اور جُوا کھیلتا ہے۔

مسئلہ: شرح القہستانی میں ہے کہ پرندوں اور مرغیوں کو پنجروں وغیرہ میں بند رکھ کر انہیں دانہ ڈالنا اور پانی پلانا اور ان کے دیگر لوازمات پورے کرنا اور ان کی خوب خدمت کرنا ان کو عام بازاروں میں چھوڑنے سے افضل ہے۔

مسئلہ: کبوتروں کو مکانات میں بند رکھنا مکروہ ہے جبکہ لوگوں کو ان سے ضرر پہنچتا ہو۔ ابن مقاتل نے فرمایا: اگرچہ بلا وجہ انہیں قید میں رکھا جاتا ہے تاہم ان کو دانہ پانی ڈالنا نہایت ضروری ہے۔

○ تتارخانیہ میں ہے کہ بلبل، طوطی، قمری وغیرہا کو پنجروں میں لہو ولعب کی خاطر رکھنا جائز نہیں۔

○ کسی اور غرض سے بند رکھنا جائز ہے۔ مثلاً بطخ اور مرغابی وغیرہ کو اس لیے قید رکھا جائے کہ انہیں کھلا پلا کر موٹا بنایا جائے یا یہ ہمسائیگان کو ضرر نہ پہنچائیں تو کوئی حرج نہیں۔

○ درندے پرندوں کو شکار کے لیے قید کرنا جائز ہے۔

○ فتاویٰ قاریٔ الہدایہ میں ہے کہ کیا پرندوں (جو خوش الحانی سے آواز نکالتے ہیں) کو بند رکھنا جائز ہے؟ یا انہیں چھوڑ دینا؟ اس میں کون سے فعل میں ثواب ہے؟ اور کون سے عمل میں گناہ؟ ایسے ہی چمگادڑ کو مارنا جائز ہے یا نہیں جبکہ یہ مساجد کی چٹائیوں وغیرہ کو بلوث کر دیتا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ خوشنوا پرندوں کو ان کی خوش نوائی سے انس پانے کی نیت پر قید رکھنا جائز ہے جبکہ اس پرندے کو کھانے پلانے میں کمی نہ کی جائے۔

○ موذی جانوروں اور پرندوں وغیرہ کو قتل کرنا جائز ہے۔

حدیث شریف میں ہے: لا تحضر الملائکۃ شیئًا من الملاهی سوی النضال والرهان۔
(ملائکہ کرام کسی بھی لہو ولعب کی جگہ پر نہیں آتے سوائے تیراندازی اور گھڑ دوڑ کے) جو کہ جنگ و جہاد کے لیے کی جائے۔ ایسے اونٹوں اور پہلوانوں کی لڑائی جبکہ جنگ و جہاد کے لیے [illegible]

ف : بعض مفسرین نے فرمایا کہ تعبثون کا مطلب یہ ہے کہ کیا ان لوگوں سے ٹھٹھا مخول کرتے ہو جو تمہارے ہاں سے گزرتے ہیں کیونکہ وہ بہت اونچے مکان بناتے تھے پھر اوپر بیٹھ کر نیچے سے ہر راہ گیر سے ہنسی مذاق کرتے تھے۔

ف : بعض بہت بڑے مفسرین نے لکھا کہ اٰیۃ سے وُہ علامتی اونچے مکانات مراد ہیں جو دور سے دکھائی دیں اور انہیں دیکھ کر منزل مقصود پر پہنچا جا سکے۔ باوجودیکہ آگے ان کی نیت اچھی تھی۔ لیکن چونکہ یہ عمارتیں بلا ضرورت تھیں اس لیے انہیں عبث سے تعبیر کیا گیا ان کی اس لیے ضرورت نہ تھی کہ منزلِ مقصود تک لوگوں کا پہنچنا تو ستاروں کے ذریعے ہو سکتا تھا پھر اونچی منازل بنانے کا کیا فائدہ!

ف : مفتی سعدی مرحوم نے فرمایا کہ اس سے انہیں بے فائدہ کہنا نامناسب ہے اس لیے کہ رات کو تو ستاروں کے ذریعے منازل تک پہنچنے کی معلومات حاصل کر سکتے ہیں لیکن دن کو ستارے نہیں ہوتے یا پھر کبھی رات کو ستارے بادلوں میں چھپ جاتے ہیں۔

ف : فقیر (علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ) کہتا ہے کہ ایسے علامات یعنی تعمیرات کی بلندی (راستہ بتلانے کے لیے) کو عبث کہنا نامناسب ہے اگرچہ اس کے بالمقابل اس کا بدل موجود ہو۔ جیسے بغداد و مکہ کے راستوں پر میل نصب کیے گئے ہیں انہیں کوئی بھی عبث نہیں کہتا حالانکہ ان کے بالمقابل ستارے بھی موجود ہیں اور ان کو دوسرے طریقوں سے راستہ مل سکتا ہے اور مٹی کو سونگھ کر اور دیکھ کر بھی علاقوں میں منازل طے کیے جا سکتے ہیں۔ جیسے روح البیان کی جلد اول میں گزرا ہے۔

وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ اور بہترین جگہیں بناتے ہو۔ مفردات میں مصانع سے امکنہ شریفہ مراد لیے ہیں اور صحاح میں لکھا ہے کہ ان سے زمین کے نیچے کے پانی کے مآخذ مراد ہیں (کذا فی القاموس)

حلِ لغات : المصنع بفتح المیم وضم النون وفتحہا، حوض کی طرح بارش کے پانی کے جمع ہونے کی جگہ ہوتی ہے۔ اس کی جمع مصانع ہے یعنی بڑے حوض۔

لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝ تاکہ تم اس دنیا میں ایسے اعمال کر کے امید میں رہو کہ تمہیں اس میں مداومت نصیب ہو یعنی یہ تعمیرات اس نیت پر کرتے ہو کہ تمہیں اس دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔ یہ لعل تشبیہ کے لیے ہے یعنی گویا تم نے اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔

ف : پہلے ان کی مذمت کی ہے کہ بلا فائدہ مال ضائع کر دیا (۲) مضبوط بلڈنگیں بنا کر اس امید میں پڑ گئے کہ ہم تادیر زندہ رہیں گے۔

حضرت صائب نے فرمایا : ؎

در سرایں غافلاں طول امل دانی کہ چیست
آشیاں گردست ماری در کبوتر خانۂ

ترجمہ : غافلوں کے ذہن میں لمبی لمبی امیدیں جانتے ہو کیا ہیں یہ کبوتر خانہ اور گرد کے بڑے بڑے سانپ ہیں۔

وَإِذَا بَطَشْتُمْ اور جب تم ڈنڈے یا تلوار سے پکڑتے ہو۔

حلِ لغات : البطش بمعنے شے کو حملہ یا قہر و جبر اور غلبہ سے پکڑنا۔

بَطَشْتُمْ پکڑتے ہو اس وقت تمہارا حال ہوتا ہے جَبَّارِينَ ○ سرکش یعنی متسلط اور ظالم کا کہ اس میں نہ تمہارا قصد ہوتا ہے کہ کسی پر رحم کیا جائے یا ادب سکھایا جائے اور نہ ہی تمہاری انجام پر نظر ہوتی ہے۔ نہ ہی تم حق و عدل کو مدِ نظر رکھتے ہو۔ اس سے معلوم ہُوا کہ بطش کی ایک قسم جائز بھی ہوتی ہے اور جبّار وہ ہوتا ہے جو غضب میں کسی کو مار دے یا قتل کر دے فَاتَّقُوا اللّٰهَ یہ امور یعنی اونچے اونچے مکانات بنانا اور بہترین سے بہترین تعمیرات تیار کرنا اور بڑے بڑے حوضوں کی تیاری میں مال خرچ کرنا اور ناحق گرفت کرنا چھوڑ دو اللہ تعالٰے کے ڈر سے وَأَطِيعُونِ ○ اور میری اطاعت کرو جس کی میں تمہیں دعوت دیتا ہوں، یعنی توحید و عدل و انصاف و ترک الامل وغیرہ پر میرا کہا مانو اس میں تمہاری بھلائی ہے وَاتَّقُوا الَّذِي أَمَدَّكُمْ اور اس ذات سے ڈرو جس نے تمہاری مدد کی۔ الامداد بمعنے دُوسرے کا پہلے کے پیچھے لگنا انتظام میں یا کسی اور معاملہ میں۔ اس کا اکثر استعمال محبوب اشیاءٔ میں اور مدّ کا مکروہ اشیاءٔ میں ہوتا ہے۔

سوال : اللہ تعالٰی کے قول والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر میں تو تمہارا قانون نہیں چلتا۔

جواب : یہ مددت الدواۃ امدھا سے ماخوذ ہے اسے قاعدہ مذکور کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

بِمَا تَعْلَمُونَ ○ بسبب اس کے کہ جو تم جانتے ہو کہ اس کی تم پر بہت بڑی نعمتیں ہیں اور طرح طرح کے انعامات عطا فرمائے ہیں۔ پہلے اسے اجمالاً پھر تفصیلاً بیان فرماتا ہے کہ أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ اس نے تمہاری مدد کی جانوروں سے۔ جیسے اُونٹ، گائے اور بکریاں وغیرہ تاکہ تم ان سے نفع حاصل کرو وَّبَنِينَ ○ اور اولاد سے، کہ ہر حال میں وہ تمہارے مددگار رہیں۔ وَجَنَّاتٍ اور باغات سے۔ تاکہ تم ان کے میوہ جات سے مستفید ہو وَّعُيُونٍ ○ اور چشمے جاری کہ پیاس بجھانے اور سبزیاں اُگانے اور کھیتیاں پکانے کا کام ان کے بغیر مشکل ہے إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ اگر تم ان نعمتوں کا حق ادا نہ کرو گے تو مجھے خطرہ ہے عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ○ تم پر بڑے دن کے بڑے عذاب کے نزول کا یعنی دُنیا و آخرت میں مجھے تمہارے عذاب میں مبتلا ہو جانے کا خوف ہے کیونکہ کفرانِ نعمت اپنے پیچھے عذاب لاتا ہے جیسے شکرِ نعمت زیادتِ انعامات کا

موجب ہے اور یوم کو عظیم موصوف کرنے میں اشارہ ہے کہ وہ دن بہت بڑے خطروں کا مجموعہ ہے کہ اس دن سب سے بڑی آندھی چلے گی۔ قَالُوْا ہود علیہ السّلام کو عاد کی قوم نے جواب میں کہا سَوَآءٌ عَلَیْنَا ہمارے لیے یکساں ہے اَوَعَظْتَ نصیحت کرو اَمْ لَمْ تَکُنْ مِّنَ الْوٰعِظِیْنَ ۝ یا نصیحت نہ کرو کیونکہ ہم ان امور سے باز نہیں آئیں گے جن پر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ الوعظ وہ زجر و توبیخ جو خوف دلانے پر مشتمل ہو اور وُہ کلام جو دل کو نرم کرے وعد یا وعید سے۔

ف: خلیل نے کہا وُہ خبر جو دل کو نرم کرے۔ اور عظۃٌ و موعظۃ ایک شے ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ الموعظۃ ' عظۃ کا اسم ہے۔

اِنْ ھٰذَآ نہیں ہے یہ جو تم ہمارے ہاں لائے ہو اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ ۝ مگر پہلے لوگوں کی عادتیں کہ وہ بھی یہی کہتے کہ ہم پیغمبر ہیں اور (معاذ اللہ) جھُوٹ بولتے رہے۔ وہ بھی تمہاری طرح جھُوٹ گھڑتے اور اپنی لکھی ہُوئی تحریر سے ہم لوگوں کو ورغلاتے، اور جس حال میں ہم ہیں وُہ بھی پہلے لوگوں کا طریقہ ہے جیسے ہم دوسرے لوگوں پر غلبہ رکھتے ہیں وُہ بھی ایسے ہی تھے اور وہ بھی گزار گئے ہم بھی گزار رہے ہیں وہ بھی کھا پی کر مر گئے ہم نے بھی مرنا ہے اس کے بعد نہ اُٹھنا اور نہ کوئی حساب وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۝ اور نہ ھم عذاب دئے جائیں گے یعنی جن اعمال و عادات کو ہم اپنا رہے ہیں ان پر ہمیں کوئی عذاب بھی نہ ہوگا۔

فَکَذَّبُوْہُ پھر قومِ عاد نے تکذیب پر اصرار کیا فَاَھْلَکْنٰھُمْ تو ہم نے قومِ عاد کو تباہ کر ڈالا بسبب تکذیب کے سخت آندھی سے۔

خلاصہ یہ ہُوا کہ ہُود علیہ السّلام نے انہیں وعظ و نصیحت کی لیکن قومِ عاد نہ مانی جس پر وہ تباہ و برباد ہوئے اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً بے شک اس میں البتہ نشانی ہے جو دلالت کرتی ہے کہ عاد کی قوم تباہ و برباد ہوگی وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ اور عاد کی قوم میں اکثر ایسے تھے مُّؤْمِنِیْنَ ۝ جو ایمان لانے والے نہ تھے اس لیے کچھ لوگ ہُود علیہ السلام پر ایمان لائے وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ اور بے شک تیرا پروردگار وہ غالب ہے جو بدلہ لے سکتا ہے ان لوگوں سے جو تکبر کرتے ہیں اور وعظ و نصیحت کو نہیں مانتے الرَّحِیْمُ ۝ وُہ مہربان ہے کہ اہلِ ایمان کو سزا کی تباہی سے باہر لا کر نجات دیتا ہے۔ اس میں اس امت کو ڈرایا گیا ہے کہ وہ قومِ عاد کے طریقہ پر نہ چلے۔

ف: حکماء فرماتے ہیں انسان کو سب سے بہتر شے جو عطا ہُوئی ہے وُہ عقل ہے جو اسے برائیوں سے روک لیتی ہے، وہ نہ ہو تو حیاء، یہ نہ ہو تو خوف، یہ نہ ہو تو مال اس کے جملہ عیوب ڈھانپ لیتا ہے۔ یہ نہ ہو تو جلانے والی آگ آئے گی جو اسے جلا کر راکھ بنا دے گی جس سے بندگانِ خدا کو آرام ملے گا اور شہر کے لوگ خوش ہوں گے۔

یہ ایسے ہے جیسے زمین پر کانٹے بچھے ہوں تو انہیں زمین سے ہٹانا یا جلانا پڑتا ہے تاکہ زمین صاف ستھری ہوکر کام میں آسکے۔

سبق : دانا پر لازم ہے کہ وُہ عبرت حاصل کرے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرے اور عادات و شہوات کو ترک کردے مخالفات و منہیات پر اصرار نہ کرے ؎

مگر کہ عادت شوم از جنود ابلیس است

کہ سدِ راہ عبادت شدہ است عادت ما

ترجمہ : بُری عادت ابلیس کے لشکر سے ہے جبکہ ہماری عادت عبادت کرنے سے سدّراہ ہوگئی ہے۔

سبق : جو کچھ دُنیا میں ہو رہا ہے لُطف ہو یا قہر، یہ سب کچھ عقل والوں کے لیے نصیحت و عبرت ہے۔

؎

عاقلاں را گوش بر آواز طبل رحلتست

ہر طبیدن قاصدے باشد دل آگاہ را

ترجمہ : دانا ہر وقت نقارۂ موت کی آواز پر کان لگائے بیٹھے ہیں کیونکہ ہر سخت آواز انسان کے دل کو آگاہ کرنے کے لیے ہے۔

ف : باوجودیکہ قومِ عاد کو طاقت و قوت حاصل تھی لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اسے تباہ و برباد کردیا۔ اور وہ بھی نہایت کمزور شے سے یعنی ہوا سے۔ اور جب چاہتا ہے کہ ضعیف کو قوی بنا دے تو کر دکھلاتا ہے جیسے مچھر سے نمرود کو مروادیا۔ اس معنے پر ہوا اللہ والوں کے لیے ضعیف ہے لیکن دشمنانِ خدا کے لیے بڑی طاقت ور ہے اس لیے اللہ والوں کو اللہ تعالیٰ کی مختلف شانوں کی معرفت نصیب ہے۔ اسی لیے وہ ہر وقت مراقبہ میں رہ کر خوفِ خدا سے بھرپور رہتے ہیں جیسے جاہل لوگ خدا کے خوف سے غافل ہوکر امن میں رہتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں ان کی سرزنش کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حقائقِ اشیاءٔ سے تقویت بخشے اور ہر وقت ہمیں اہلِ مراقبہ سے بنائے۔ آمین

(اگلا صفحہ ملاحظہ کیجئے)

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ ۚۖ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ ۚ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ
اَمِيْنٌ ۝ ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ ۚ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ؕ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ۝ ۙ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ ۙ وَّزُرُوْعٍ وَّ
نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ۝ ۚ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ۝ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ
اَطِيْعُوْنِ ۝ ۚ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ ۙ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا
يُصْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ ۚ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚۖ فَاْتِ
بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ
مَّعْلُوْمٍ ۝ ۚ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا
نٰدِمِيْنَ ۝ ۙ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝
وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ ع

ترجمہ: ثمود کی قوم نے رسولوں کی تکذیب کی جبکہ ان کے ہم قوم صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم ڈرتے نہیں بیشک میں تمہارے لیے امانت دار پیغمبر ہوں سو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میرا کہا مانو اور اس پر میں تم سے اجرت نہیں مانگتا اور میرا اجر نہیں مگر پروردگار عالم پر۔ کیا تم یہاں کی نعمتوں میں بے فکر کرکے چھوڑے جاؤ گے اور کھیتوں میں اور چشموں میں اور کھجوروں میں جن کا شگوفہ نرم نازک ہے اور پہاڑوں میں گھر تراشتے ہو ہنرمندی سے سو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور حد سے بڑھنے والوں کا کہا مت مانو وہ جو زمین پر فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے انہوں نے کہا تو جادو کیا ہوا ہے اور تو نہیں مگر ہمارے جیسا بشر۔ سو کوئی نشان لائیے اگر تو سچا ہے فرمایا یہ اونٹنی ہے ایک دن اس کے پانی پینے کی باری ہے ایک مقرر دن تمہاری۔ اور اسے برائی کے ساتھ ہاتھ مت لگاؤ ورنہ تمہیں ایک بہت بڑے دن کا عذاب آ لے گا۔ سو انہوں نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو صبح کے وقت پشیمان ہوئے پھر انہیں عذاب نے آ لیا بے شک اس میں البتہ عبرت ہے اور ان کے بہت سے ایماندار نہ تھے اور بیشک تمہارا رب عزت والا مہربان ہے۔

تفسیر عالمانہ کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ قبیلہ کی تاویل پر صیغہ مؤنث لایا گیا ہے اور ثمود اس قبیلہ کا جدِ اعلیٰ تھا اس کا نسب نامہ یوں ہے :

ثمود بن عبید بن عوص بن عاد بن ارم بن سام بن نُوح علیہ السلام۔

اس کے علاوہ اور وجوہ بھی ہیں جن کا ذکر مجلسِ اوّل میں آگیا ہے الْمُرْسَلِیْنَ ۝ ثمود نے رسل کرام علیہم السلام کی تکذیب کی۔ اس سے حضرت صالح علیہ السلام اور آپ سے پہلے پیغمبرانِ عظام علیہم السلام یا صرف صالح علیہ السلام مراد ہیں کیونکہ ایک رسول علیہ السلام کی تکذیب کرنا گویا تمام رُسل علیہم السلام کو جھٹلانا ہے بوجہ توحید اور اصولِ شرائع پر متفق ہونے کے۔ اب بتایا کہ انہوں نے کس وقت اپنے رسول علیہ السلام کی تکذیب کی۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ جب ان کے نسبی بھائی نے فرمایا۔ یہاں دینی برادر مراد نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے گناہوں سے محفوظ اور نبوت کے بعد معصوم ہوتے ہیں۔ اس نسبت کے اظہار کا فائدہ یہ ہے کہ معلوم ہو کہ صالح علیہ السلام ان کی برادری کے اور ان کے ہم زبان تھے تاکہ وہ دینی باتوں کو سمجھیں اور انکار نہ کر سکیں کہ ہمیں پیغمبر سے شناسائی نہ تھی اور نہ ہی ہم ان کی بولی سمجھتے تھے صٰلِحٌ صالح ابن عبید بن آسف بن کاشح بن حاذر بن ثمود اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو فرمایا کہ کیا تم خدا کے عذاب سے نہیں ڈرتے کہ کہیں وہ تمہیں تباہ کر ڈالے جب کہ تم اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہو اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝ میں تمہارا رسول ہوں اور میری امانت داری تم میں مشہور و معروف ہے۔ اسی لیے میری بات پر تمہیں اعتماد ہے۔ فلہذا میں کہتا ہوں کہ تم خوفِ خدا کو دل میں جگہ دو اور میری اطاعت کرو ان جملہ امور میں کہ جن کی میں تمہیں دعوت دیتا ہوں وَمَاۤ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اس وعظ و نصیحت اور دعوت و تبلیغ پر میں تم سے نہیں مانگتا مِنْ اَجْرٍ مزدوری اور انعام کیونکہ اہلِ عفت اور پاکدامن لوگوں پر اس سے دھبہ لگتا ہے اِنْ اَجْرِیَ میری مزدوری اور انعام نہیں اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ مگر پروردگارِ عالم پر، کیونکہ مجھے اسی نے ہی تمہارے ہاں بھیجا ہے تو اس کی مزدوری بھی وہی دے گا بلکہ وہ اپنے مخلص بندوں کو بہتر مزدوری عطا فرماتا ہے۔

جیسا کہ حدیثِ قدسی میں اس کا اپنا فرمان ہے :

حدیثِ قدسی من قتلتہ فانا دیتہ۔

(جسے میں قتل کر ڈالوں اس کی دیت میں خود ہوں)

مثنوی شریف میں ہے : ؎

عاشقاں را شادمانی وغم اوست
دست مزد و اجرت خدمت ہم اوست

ترجمہ : عشّاق کی خوشی اور غم وہی ہے مزدوری اور اُجرت بھی وہ خود ہی ادا کرے گا ۔
(اَتُتْرَكُوْنَ ○ استفہام انکار وتوبیخ کا ہے یعنی کیا تمہارا گمان ہے کہ تم چھوڑ دئے جاؤ گے فِيْ مَا هٰهُنَا یہاں کی سرزمین پر ان نعمتوں میں جو یہاں پر دنیا میں موجود ہیں اور یہ دنیا دار الجزا نہیں اٰمِنِيْنَ ○)
(تترکون سے حال ہے یعنی درانحالیکہ تم آفات اور نعمتوں کے فوات سے امن وسکون میں ہو نعیم کی تفسیر فرمائی) فِيْ جَنّٰتٍ باغات میں وَّعُيُوْنٍ ○ اور چشموں اور نہروں میں ۔
ف : بعض مفسرین نے فرمایا کہ صالح علیہ السلام کی قوم کے ہاں کوئی نہریں نہیں تھیں ۔ اس معنیٰ پر یہاں عیون سے کنویں مراد ہیں ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ گرمیوں میں نہریں چلتی تھیں اور سردیوں میں کنووں سے کام لیتے تھے کیونکہ گرمیوں میں محلات میں اور باغات میں گزر اوقات کرتے اور ان ضروریات کو نہروں سے پورا کرتے ۔

وَّزُرُوْعٍ اور کھیتیاں وَّنَخْلٍ اور کھجوریں ۔
ف : کھجوریں اگرچہ باغات میں شامل تھیں لیکن چونکہ یہ تمام اشجار پر فضیلت رکھتی ہیں اس لیے ان کا علٰحدہ ذکر کیا گیا ہے اس لیے کہ یہ آدم علیہ السلام کی بقایا مٹی سے پیدا کی گئی ہے ۔
طَلْعُهَا (نخل کا طلع وہ ہوتا ہے جو تلوار کے نصل کی طرح ہوتا ہے ۔ فرق یہ ہے کہ کھجور کا طلع باہر نکلتا ہے اور تلوار کا نصل اس کے اندر ۔ گا بھا کہ جس پر کھجور کے دانے لپٹے ہوتے ہیں ۔ طلوع شمس سے شبیہ ہے ۔ شماریخ شمراخ کی جمع ہے بالکسر بمعنے عثکال یعنی عذق ۔ اور کھجور کی ہر شاخ شمراخ ہے) یعنی وہ کہ جس پر کھجور کے دانے تر یا کچے پکے لپٹے ہوئے ہوں) قنو ، عذق ، کباسہ بالکسر ثمر میں اسی طرح ہیں جیسے عنقود گچھے انگور میں) هَضِيْمٌ ○ یعنی اپنے جسم میں لطیف اور نرم جسم والا یعنی اس کھجور کا خوشہ اور شگوفہ نرم اور نازک ہوتا ہے کیونکہ اس کے اندر جو ثمر ہوتا ہے وہ نرم ہوتا ہے (اس وجہ سے اسے هضیم (نرم) کہا گیا ۔

حل لغات : الهضم (بفتحتین) بمعنے رقیق اور کمزور ہونا ۔ یعنی وہ گابھا نرم اور لطیف ہے ۔ اسی سے هضیم الکشح والحشی (نازک کمر اور نازک بھرتی والا) ہے ۔ اسی سے هضم الطعام ہے بمعنے طعام پیٹ میں نرم ہوکر جسم میں حلول کر گیا ہے (کذا فی کشف الاسرار) یا لطیف اس لیے کہ نخیل مؤنث ہے جیسا کہ اس کے لیے ضمیر کی تانیث دلالت کرتی ہے ۔ اور نرم گابھا مادہ کھجور کا اور نرم کھجور کا

گابھا گاڑھا اور سخت ہوتا ہے ۔

ف : ابن الشیخ نے فرمایا کہ برنی کھجور کا گابھا لون سے لطیف تر ہوتا ہے کیونکہ برنی عرب کی بہترین کھجور سمجھی جاتی ہے اور یہ معرب ہے اس لیے کہ یہ دراصل "بَرنیک" تھا یعنی اچھا پھل ۔ اور لون دقل ہوتی ہے اور تمام کھجوروں سے ردّی قسم ہے ۔

ف : اہل عرب برنی اور عجوہ کے سوا باقی تمام کھجوروں کو لون کہتے ہیں ، اور جب تک وہ غلاف میں ہیں انہیں ہضیم سے موصوف کرتے ہیں کیونکہ ان کے بعض حصّے بعض میں داخل اور ایک دوسرے سے چمٹے ہوتے ہیں اور جب غلاف سے باہر نکل آئیں گی ہضیم نہیں کہلائیں گی ۔

ف : الکفری بضم الکاف والفاء وتشدید الراء کھجور کا غلاف ۔ کیونکہ یہ کھجور کے ابتدائی گچھوں کو اپنے اندر چھپائے رکھتا ہے ۔

ف : امام راغب رحمہ اللہ نے فرمایا : الھضم کھجور کا وہ گابھا جو نرم نرم ہوتا ہے ، جیسے و نخل طلعہا ھضیم یعنی وہ گچھے جو ایک دوسرے میں داخل ہیں ، گویا وُہ چھپے ہُوئے ہیں یا ھضیم بمعنے لٹکنے والے اور ٹوٹنے والے ۔ گویا وہ بوجھ کی وجہ سے لٹکے ہوئے اور ٹوٹے ہوئے ہیں ۔ کیونکہ ھضم بمعنے الکسر یعنی ٹوٹنا ، اور تدلّی بمعنے لٹکنا اور اپنی جگہ سے نیچے کی طرف ہونا ۔

المختار میں ہے کہ الہاضوم ایک جوارش کا نام ہے جو طعام کو ہضم کرتا ہے ۔ یعنی توڑنا ۔ طعام اس کی وجہ سے بہت جلد ہضم ہو جاتا ہے ۔

وَتَنۡحِتُوۡنَ اور تم گھڑتے ہو گھر بنانے کے لیے مِنَ الۡجِبَالِ پہاڑوں سے بُیُوۡتًا مکانات ۔

ف : منقول ہے کہ پہاڑوں میں ان لوگوں نے پتھروں سے دو ہزار اور دو ہزار ستّر مکانات تیار کیے ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں کاریگری کی صنعت سے موصوف فرمایا ۔ کما قال :

فٰرِهِيۡنَ ۝ درانحالیکہ سنگ تراشی کے ماہر تھے جیسا کہ امام راغب نے اس کا معنی کیا ہے حاذقین بمعنے ماہرین ۔ یہ الفراھۃ سے مشتق ہے بمعنے نشاط ۔ چونکہ سنگ تراش اپنی مہارت پر خوش ہوتا ہے اسی لیے اس صفت سے موصوف کیا گیا اور جس نے اسے فرھین پڑھا ہے اس نے اس کا معنی مرحین لکھا ہے یعنی سرکش اور متکبر ۔ پہلا معنی از فرہ (بالضم) اور دوسرا از فرہ (بالکسر) ہے ۔

ف : آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قومِ ہُود خیالی لذات کی خوگر تھی یعنی استعلاء و بقا اور تفرد و تجبر کے طالب تھے اور قومِ صالح حسّی لذات میں منہمک تھی مثلاً کھانے پینے اور تعمیرات وغیرہ میں ۔ اور یہ تمام امور دنیوی ہیں ۔ جو غافلوں کا خاصہ ہے ۔ لیکن اس سے بڑھ کر اہلِ عقبیٰ کی لذّات ہیں وہ بیدار قلب لوگوں کا کام ہے اور یہ لذات

لذاتِ علوم و معارف اور اس کے لوازمات، جیسے تواضع، وقار، تجرد اور صبر وغیرہ۔

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ○ تو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو وَلَا تُطِیْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ ○ اور حد سے بڑھنے والوں کے امور کی اطاعت نہ کرو (عبارت کا مقتضیٰ یہ تھا کہ ولا تطیعوا المسرفین ہونا چاہیے درمیان میں لفظ امر زائد لانا نہیں چاہیے اس لیے کہ اطاعت آمر (بصیغہ اسم فاعل) کی ہوتی ہے اور امتثال یعنی فرمانبرداری امر (مصدر) کی ہوتی ہے لیکن یہاں پر امتثال کو امر سے تشبیہ دی اس لیے کہ طاعت و امر دونوں وجود اور مامور بہ کو چاہتی ہیں۔ اس تقریر پر مشبہ بہ یعنی طاعت بول کر امتثال مراد لیا گیا ہے۔ اب معنی یہ ہوا کہ ان کے امر کی فرمانبرداری نہ کرو الَّذِیْنَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وہ جو زمین پہ فساد برپا کرتے ہیں یعنی یہاں پر کفر و ظلم کرتے ہیں (یہ المسرفین کی صفت موضحہ ہے) وَلَا یُصْلِحُوْنَ ○ اور ایمان و عدل سے اصلاح نہیں کرتے۔ (اس کا عطف یفسدون پر ہے۔ اس سے ظاہر کرنا ہے کہ ان کا افساد اصلاح سے یکسر خالی تھا۔)

ف : لیکن معدودے چند لوگ تھے جنہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کی تفصیل سورۂ نمل میں آئے گی (ان شاء اللہ)

قَالُوْٓا صالح علیہ السلام کے جواب میں قوم ثمود نے کہا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ○ بیشک تم بار بار جادو کئے گئے ہیں یہاں تک کہ اب تمہارے عقل و خیال میں خلل پیدا ہو گیا ہے اور تمہارا اندازِ فکر بگڑ گیا ہے۔ تفعیل کا باب محض تکثیر کے لیے ہے مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا اور تم نہیں مگر بشر مثل ہمارے۔ تم ہماری طرح کھاتے پیتے ہو، تم فرشتے تو نہیں ہو۔

ف : کاشفی مرحوم نے لکھا کہ بوجہ شکل بشری حضرت صالح علیہ السلام کی حقیقت کفار کے سامنے پوشیدہ رہی انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ انسان اس ظاہری صورت کے علاوہ کچھ اور بھی تو ہوتا ہے ؎

چند صورت بینی اے صورت پرست
جان بے معنیست کز صورت ترست
درگزر از صورت و معنی نگر
زانکہ مقصود از صدف باشد گہر

ترجمہ : اے صورت پرست ایک تک صورت بینی میں پھنسے رہو گے وہ جان بے معنی ہے جو صرف صورت پر مبنی ہے صورت سے گزر کر معنی کو دیکھو کیونکہ صدف سے موتی مقصود ہوتا ہے (نہ کہ صرف صدف کی ظاہری شکل)

چونکہ قوم ثمود نے صالح علیہ السلام کی ظاہری شکل سے غلطی کھائی اور اپنے جیسا سمجھ کر کہہ دیا کہ اے صالح (علیہ السلام)! تم تو ہم جیسے بشر ہو پھر دعوئ رسالت کیسا! اور اگر اس دعوی کو ترک نہیں کرتے بلکہ اصرار کرتے ہو فَأْتِ بِآيَةٍ تو لائیے دلیل، یعنی اپنا کوئی کارنامہ دکھائیے جو خرقِ عادت پر مشتمل ہو إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ اگر تم اپنے دین میں سچے ہو۔ صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ اس سخت پتھر سے ایسی ایسی اونٹنی نکال دے۔ صالح علیہ السلام نے دعا مانگی تو ان کا مدعا پورا ہو گیا، جیسا کہ سورۂ اعراف و سورۂ ہود میں تفصیل گزری) قَالَ هَٰذِهِ نَاقَةٌ صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ لو یہ ہے وہی اونٹنی جس کی تم نے فرمائش کی لَهَا شِرْبٌ اس کے لیے پانی کی باری ہوگی وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَعْلُومٍ ۝ اور مقرر دن میں تمہارے لیے پانی کی باری ہوگی یعنی کنویں کا پانی ایک سالم دن اونٹنی کے لیے چھوڑ دو اور ایک سالم دن تم پانی لیا کرو، لیکن جب اونٹنی کی باری ہو تو اُسے نہ روکنا۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ لکم شرب معلوم میں مہایاۃ کی صورت پیدا ہوگئی اور یہ مفاعلہ کا باب از ھیئۃ ہے بمعنے وہ حالتِ ظاہرہ جو کسی شے کے لیے تیار کی گئی ہو۔ التہائی اسی سے ہے از باب تفاعل۔ ہر وہ کام جسے متفق ہو کر تیار کیا جائے۔ گویا وہ سب ایک ہیئت پر راضی ہو گئے اور شریعت میں ہر اس منافقت کو کہا جاتا ہے جسے لوگ باری باری عمل میں لائیں۔ مثلاً ایک مشترکہ دار میں دو شریک آپس میں طے کریں کہ تم دار کے فلاں حصے میں اور ہم فلاں حصے میں یا تم اُوپری حصے میں اور ہم نچلے حصے میں یا تم ایک ماہ یا سال اس دار میں ٹھہرو گے اور ہم ایک ماہ یا سال وغیرہ وغیرہ یا دو دار ہیں ایک میں تم ایک میں ہم۔ یا مشترک غلام ہو، اور آپس میں طے کرے کہ وہ ایک دن تمہاری خدمت کرے گا ایک دن ہماری۔ یا دو مشترک غلام ہیں ان کے متعلق طے کرلیں کہ یہ تمہاری خدمت کرے گا اور وہ ہماری، وغیرہ۔ یہ تمام صورتیں التہائی کی ہیں اور سب کی سب شرعاً جائز ہیں۔ اس میں کسی امام کا اختلاف نہیں بلکہ اجماع ہے کیونکہ ایسی صورتوں میں انسان کو عام ضرورت پڑتی ہے فلہذا استحساناً جائز ہیں۔ اس لیے کہ ظاہر ہے کہ بیک وقت تمام شرکا، تو مشترکہ اشیاء سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے اسی لیے ایسی تقسیم بوجہ مجبوری جائز قرار دی گئی ورنہ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ناجائز ہو کیونکہ مبادلۃ المنافع بجنسہا ہے اور ایسا مبادلہ شرعاً حرام ہے۔ لیکن کتاب و سنت کے حکم سے قیاس کو ترک کر دیا گیا کتاب کی دلیل تو آیت مذکورہ ہے اور روایت ذیل کا حکم بھی یہی ہے۔

روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں ایک اونٹ تین آدمیوں میں تقسیم فرمایا تو راستہ طے کرنے میں تینوں باری باری اُونٹ پر سوار ہوتے۔ ایسی صورت کے جواز میں امت کا اجماع ہے۔

ف : فتح الرحمٰن میں ہے کہ مہایاۃ کے جواز و عدمِ جواز میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ حضرت ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ باری سے رُکنے والے کو اپنی باری پر مجبور کیا جائے گا جب کہ مطالبہ کرنے والا ضد سے نہ کہہ رہا ہو۔ لیکن ائمہ ثلاثہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ جائز ہے جب سب راضی ہوں ان میں کسی کو مجبور نہ کیا جائے گا۔

وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ اور اسے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچانا۔ یعنی اسے نہ قتل کرو اور نہ مارو۔ اگر تم انکار کرو گے فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ تو تمہیں بڑے دن کا عذاب پکڑ لے گا اسے عظیم اس لیے کہا گیا تو اس میں عذابِ شدید کا نزول ہو گا۔ مثلاً جبریل علیہ السلام کی سخت آواز سے سب کو تباہ و برباد کر دینا فَعَقَرُوْهَا عقرت البعیر سے ہے بمعنے نحرتہ۔ یعنی انہوں نے اسے ذبح کیا۔ دراصل العقر بمعنے تلوار سے پنڈلی کاٹ دینا۔ (کذا فی کشف الاسرار)

یعنی کافروں نے اُونٹنی کا پیچھا کر کے اسے قتل کر دیا، وہ بدھ کا دن تھا۔ اونٹنی اس وقت مر گئی اور عقر کی نسبت تمام کافروں کی طرف ہے حالانکہ اُونٹنی کو صرف ایک نے مارا تھا کیونکہ وہ سب اُونٹنی کے مارنے پر راضی تھے۔ اسی لیے تمام کافر عذاب میں مبتلا کیے گئے۔

ف : حضرت ابُوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اُونٹنی کے رہنے کی جگہ دیکھی وہ ۶۰ × ۶۰ گز میں پھیلی ہُوئی تھی۔ اس کے مارنے کے بعد ان کافروں پر عذاب نازل ہو گیا۔

فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ○ پس وہ اونٹنی کو مارنے کے بعد نادم ہو گئے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ اب عذاب آئے گا اور توبہ بھی قبول نہ ہو گی یا ان کو ندامت اس وقت ہُوئی جب اُنہوں نے عذاب کو نازل ہوتے دیکھا۔ اسی لیے اس وقت انہیں ندامت نے فائدہ نہ دیا اگرچہ ان کی یہ ندامت توبہ کی مانند تھی جیسے فرعون نے پانی میں ڈوبتے وقت توبہ کی کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہ ہُوا۔

حلِ لغات : الندم والندامۃ التحسر یعنی اس رائے پر ندامت ہُوئی کہ جب انہوں نے صالح علیہ السلام کو چیلنج کے طور پر کہا فأت بہا۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ تو انہیں اس عذاب نے گھیر لیا جس کے آنے کی خبر انھیں پہلے سنائی گئی تھی وہ تھا جبریل علیہ السلام کا چنگھاڑنا اور وُہ ہفتہ کا دن تھا اس میں سب کے سب تباہ و برباد ہو گئے اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً اس عذاب نازل ہونے والے میں عبرت ہے جو دلالت کرتی ہے کہ ظہورِ آیات کے بعد کفر کرنا عذاب کے نزول کا موجب ہے۔

سبق : اس سے عقلمندوں بالخصوص قریش کو عبرت کرنی چاہیئے۔

وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ اور نہ تھے قومِ ثمود یا قریش کے اکثر ایمان لانے والے۔

ف : ثمود کی قوم میں سے صرف چار ہزار اشخاص ایمان لائے۔

ف : حضرت صالح علیہ السلام پر بعد بلوغ وحی کا نزول ہوا اور ہود علیہ السلام کے بعد آپ ایک لاکھ افراد کی طرف نبی مبعوث ہوئے اور ان میں ایک سو بیس سال گزارے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ اور بے شک تیرا پروردگار غالب ہے اس پر جو اس نے قوم ثمود سے انتقام لینے کا ارادہ فرمایا جبکہ انہوں نے صالح علیہ السلام کی تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی جڑ کاٹ دی۔

سبق : اللہ تعالیٰ کے احکامات کی مخالفت کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ وہ بھی ایسے ہی امم سابقہ کی طرح عذاب میں مبتلا ہو جائیں۔

الرَّحِيْمُ ○ وہ بڑا مہربان ہے کہ استحقاق کے بغیر کسی پر عذاب نازل نہیں فرماتا۔

ف : چونکہ اونٹنی صالح علیہ السلام کی نبوت کی دلیل تھی اس لیے انہوں نے اسے قتل کر دیا، پھر نادم ہوئے مگر اس وقت ندامت سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

سبق : قرآن مجید ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّت کی علامت ہے سو جو اسے چھوڑ دے گا یعنی نہ اس پر عمل کرے گا اور نہ اس کی عظمت کو مانے گا تو وہ بھی ایک دن نادم ہوگا اور اس پر عذاب نازل ہوگا۔ اس کی عظمت ماننے کا یہ معنیٰ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔

سبق : جتنا ہو سکے قرآن پاک پر عمل کیا جائے۔ یہی عقول و فہوم کا تقاضا ہے صرف زبانی جمع خرچ اچھا نہیں۔ کیونکہ عمل ہی حقیقتِ حال کا شاہد ہے۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ حفظ لفظ اندر گواہ قولی است
حفظ عہد اندر گواہ فعلی است

۲ گر گواہ قول کژ گوید رد ست
ور گواہ فعل کژ پوید بدست

۳ قول و فعل بے تناقض بایدت
تا قبول اندر زمان پیش آیدت

---

۴ چوں ترازوے تو کژ بود و دغا
راست چوں جوے ترازوے جزا

۵ چونکہ پاے چپ بدی در غدر و کاست
نامہ چوں آید ترا در دست راست

۶ چوں جزا سایہ است اے قد تو خم
سایۂ تو کژ فتد در پیش ہم

---

۷ کافراں را بیم کرد ایزد ز نار
کافراں گفتند نار اولےٰ زعار

---

۸ لاجرم افتند در نار ابد
الامان یا رب از کردار بد

ترجمہ :(۱) لفظوں کی نگرانی صرف قول کی گواہی ہے اس کے عہد کی حفاظت فعلی گواہی ہے۔
(۲) اگر کوئی لفظی گواہی ٹیڑھی دے تو وہ مردود ہے ایسے ہی اگر فعل کی گواہی غلط ہے تو تمام معاملہ خراب ہو گا۔
(۳) قول و فعل میں کوئی تناقض نہیں ہونا چاہیے اس سے عدمِ قبولیت پیش آئے گی۔
(۴) جب تمہارا ترازو ٹیڑھا ہو تو اس سے سچائی طلب کرنا کیسا!
(۵) جب تم دھوکے اور فریب کا کام کرتے ہو تو پھر تمہارے ہاں سچائی کہاں سے آئے گی!
(۶) اے ٹیڑھے قد والے! تیرا سایہ تیری جزا ہے، تو ٹیڑھا تو تیرا سایہ بھی ٹیڑھا ہو گا۔
(۷) اللہ تعالیٰ نے کافروں کو آگ سے ڈرایا تو انہوں نے کہا کہ ہم کو عار کی بجائے نار بہتر ہے۔
(۸) اسی لیے وہ ہمیشہ آگ میں رہے اے اللہ! ہم بُرے عمل سے امان و پناہ مانگتے ہیں۔

سبق: اے بھائی! اہلِ عار سے نہ ہو اہلِ نار سے ہو جاؤ گے جس کے کان سننے والے اور دل یاد رکھنے والا ہے وہی آیاتِ الٰہی کی طرف متوجہ ہو گا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرے گا اور ہر گھڑی یعنی رات دن اپنے اوقات کی نگہداشت کرے گا اور خلوت و جلوت میں ذکرِ الٰہی کی کثرت کرے گا۔

حکایت حضرت شیخ شبلی قدس سرہٗ نے سیاحت کے دوران ایک نوجوان کو کثرت سے ذکر کرتے دیکھا آپ نے اسے فرمایا صرف اللہ اللہ کی رٹ لگانے سے کام نہ بنے گا جب تک شرع مطہرہ کے حکم کی پابندی نہ کرو گے کیونکہ یہود و نصارٰی اس ذکر میں تیرے ساتھ ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ولئن سألتهم من خلقهم ليقولن الله -

(اور اگر ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو وہ کہیں گے اللہ نے)

(باقی برصفحہ ۲۸۲)

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ
رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ
إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝ أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِينَ ۝ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ
لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُونَ ۝ قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يٰلُوطُ
لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِينَ ۝ قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُمْ مِنَ الْقَالِينَ ۝ رَبِّ نَجِّنِي وَأَهْلِي مِمَّا
يَعْمَلُونَ ۝ فَنَجَّيْنٰهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغٰبِرِينَ ۝ ثُمَّ دَمَّرْنَا
الْآخَرِينَ ۝ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا فَسَاءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِينَ ۝ إِنَّ فِي ذٰلِكَ
لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝

ترجمہ : لُوط کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ انہیں ان کے ہم قوم لُوط علیہ السلام نے فرمایا کیا ڈرتے نہیں ہو بیشک میں تمہارے لیے امانت دار پیغمبر ہوں۔ سو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میرا کہا مانو اور میں تم سے اُجرت نہیں مانگتا اور میرا اجر نہیں مگر پروردگارِ عالم پر کیا تم جہان والوں میں مردوں سے برائی کرتے ہو اور چھوڑتے ہو وہ جو تمہارے لیے تمہارے رب تعالیٰ نے بیویاں بنائیں بلکہ تم لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہو، انہوں نے کہا اے لوط اگر تم باز نہ آئے تو ہو جاؤ گے نکالے ہوؤں سے فرمایا بے شک مَیں تمہارے فعل (بد) سے بیزار ہوں اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے گھر والوں کو ان کے عمل (بد) سے بچا سو ہم نے اسے اور اس کے تمام گھر والوں کو بچایا مگر ایک بڑھیا جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی پھر ہم نے اور سب کو ہلاک کر دیا اور ہم نے ان پر ایک بارش برسائی سو کیا ہی بُری تھی وُہ بارش جو ڈرائے ہوؤں پر برسی بیشک اس میں البتہ عبرت ہے اور ان کے اکثر ایماندار نہ تھے اور بیشک تمہارا رب عزّت والا مہربان ہے۔

(صفحہ ٢٨١ سے آگے) نوجوان یہ سُن کر دس بار اللہ اللہ کہہ کر بیہوش ہو گیا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ شیخ شبلی قدس سرہٗ تشریف لائے اور دیکھا کہ اس کا سینہ پھٹ چکا تھا اور اس کے سینے پر لکھا تھا "اللہ"۔ اس پر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا: اے شبلی! یہ اللہ تعالیٰ کے محبوبوں میں سے تھا اور وہ بہت تھوڑے ہیں

اللہ تعالیٰ نے عارفین کے قلوب کو پیدا کر کے انہیں اپنی معرفت سے سنوارا اور یقین سے مزین کیا انہیں طریق ذکر حقانی کے ذریعے روحانی نعمتوں میں داخل فرمایا جیسے غافلوں کو نسیان اور گناہوں پر اصرار کی وجہ سے جسمانی و روحانی عذاب میں مبتلا فرمانا ہے پہلا آثار رحمتِ الٰہی ہے اور دوسرا علاماتِ عزت سے۔ اس کی طرف وہی راہ پاتے ہیں جو اس کے قرب و وصال کے اہل ہیں۔ اس کی راہ سے وہی بھٹکتے ہیں جو اس کے قہر و عذاب کے مستعد ہیں۔ ہم اس کریم و رحیم سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں بڑے دن کے بڑے عذاب سے بچائے جس دن نہ اولاد نفع دے گی نہ مال سوائے اس کے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ہاں قلبِ سلیم لایا۔

(تفسیر آیاتِ صفحہ گزشتہ)

تفسیر عالمانہ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ قوم لوط نے جھٹلایا یعنی اہل سدوم اور اس کے ملحقات الْمُرْسَلِينَ ○ رسل کرام علیہم السلام کو یعنی لوط و ابراہیم علیٰ نبینا و علیہما السلام اور وہ رسل علیہم السلام جو ان سے پہلے گزرے إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ جب انہیں ان کے شفیق نبی لوط علیہ السلام نے فرمایا۔

ف: کاشفی مرحوم نے لکھا کہ یہاں اخوت سے لوط کی شفقت مراد ہے اس لیے کہ لوط علیہ السلام اس قوم کے نسب سے نہیں بلکہ اجنبی تھے کیونکہ انہوں نے جب اپنے چچا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ملک شام کی طرف ہجرت فرمائی تو ابراہیم علیہ السلام نے انہیں اُردن میں اتار کر سدوم والوں کی طرف رسول مقرر فرمایا۔

(تعارفِ لوط علیہ السلام حسب ذیل ہے:)

تعارفِ لوط علیہ السلام لوط بن ہاران اور ہاران تارخ ابی ابراہیم کا بھائی تھا۔

أَلَا تَتَّقُونَ ○ کیا تم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے نہیں ہو کہ شرک و معاصی کے مرتکب ہو رہے ہو إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ بے شک میں تمہارے لیے رسول ہوں یعنی تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، أَمِينٌ ○ امانت دار مشہور رہوں اور ہر ایک کو میرے اوپر پورا اعتماد ہے فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ○ تو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اس لیے معتمد کی ہر بات پر اعتماد ہونا چاہیے وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ اور میں تم سے تبلیغ و تعلیم کی مزدوری کا سوال نہیں کرتا مِنْ أَجْرٍ انعام اور بدلہ دنیوی کیونکہ احکامِ الٰہیہ کے مبلغ کو کسی سے اجر اور مزدوری اور انعام لینا برا عمل ہے إِنْ أَجْرِيَ میرا اجر و ثواب نہیں إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○ مگر پروردگارِ عالم پر بلکہ میری اس طلب کا تعلق بھی سوائے خدا کے اور کسی سے نہیں ہے

خلاف طریقت بود کا ولیا
تمنا کنند از خدا جز خدا

ترجمہ : یہ طریقت کے خلاف ہے کہ اولیاً کرام اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے سے کسی شے کی آرزو کریں ۔

اَتَأْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ○ استفہام انکاری ہے فاحش عمل پر اتیان کا اطلاق ایسے ہے جیسے حلال فعل پر اس کا اطلاق آیا ہے ۔ کما قال :

فأتوا حرثكم ۔ (آؤ اپنی کھیتیوں میں)

حلِ لغات : ذکران ۔ ذکور ذکر کی جمع اور اُنثیٰ کی نقیض ہے ۔ لیکن یہاں پر عضو مخصوص مراد ہے یعنی دُبر ۔ (کذا فی المفردات) من العالمین ۔ تأتون سے حال ہے ۔ اس سے حیوانات سے وطی کرنے والے مراد ہیں ۔

اب معنیٰ یہ ہُوا کہ کیا تم عالمین میں حیوانات کے ذکور پر آتے اور ان سے جماع کرتے ہو اور یہ ایسا عمل ہے کہ اس میں تمہارے ساتھ اور کوئی شریک نہیں یعنی یہ ایک ایسا برا عمل ہے جس کا تمہیں علم بھی ہے اور تمہارے پاس اس کے جواز کا کوئی معقول عذر نہیں ۔

ف : نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ الذکران سے حال ہو اور اس سے صرف انسان مراد ہوں ۔

اب معنیٰ یہ ہُوا کہ تم اولادِ آدم کے ذکور سے وطی کرتے ہو حالانکہ تمہارے ہاں عورتوں کی بہتات ہے گویا وہ عورتیں تم کو معدوم سمجھتی ہیں ۔

ف : مروی ہے کہ یہ بُرا عمل انہیں ابلیس نے سکھایا ۔

وَتَذَرُوْنَ اور تم چھوڑتے ہو ۔

حل لغات : تذرون ۔ فلان یذر الشئ سے ہے ۔ یعنی فلاں فلاں شے کو نا معتبر سمجھ کر چھوڑتا ہے ۔ اس کی ماضی مستعمل نہیں ۔

مَا خَلَقَ لَكُمْ اسے جو تمہارے نفع کے لیے پیدا فرمائی ہے مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ تمہاری عورتوں میں سے ۔ من بیانیہ ہے اگر ازواج سے عورتوں کی جنس مراد ہو ، اور اگر عضو مخصوص مراد ہو جس سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے یعنی رحم ، تو یہ من تبعیضیہ ہے اس میں تعریض ہے کہ وہ ایسے پاگل تھے کہ یہ لواطت اپنی عورتوں سے بھی کرتے تھے ۔ یہی پچھلا معنی دلیل بن رہا ہے کہ اپنی عورتوں اور لونڈیوں سے بھی لواطت حرام ہے ۔

حدیث شریف میں ہے :

مذمّتِ لواطت من أتی امرأۃ فی دبرھا فھو بریٔ مما انزل علی محمد و لا ینظر اللہ الیہ۔

(جو شخص اپنی عورت سے بیزار ہے تو وہ اس سے بیزار ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمایا ، (قیامت میں) اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظرِ عنایت نہیں فرمائے گا)

مسئلہ : بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تو اپنی عورت کے ساتھ لواطت کو کفر کہا ہے ۔

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ○ بلکہ تم ہو جمیع معاصی میں حد سے بڑھنے والے ، اور منجملہ ان کے یہ بھی ہے ۔

مسئلہ : لوطی کی سزا میں اختلاف ہے ۔

حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا : اس پر حد نہیں (سخت تعزیر ہے) .

صاحبین رضی اللہ عنہما اس کے برعکس حد کی سزا کا حکم فرماتے ہیں اس کی تفصیل سورۂ ھُود میں گزری ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ، فاعل و مفعول دونوں رجم کے حقدار ہیں وہ شادی شدہ ہوں یا نہ ۔ اور امام شافعی و امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی سزا زنا کے مطابق ہے ۔

قَالُوْا جنہیں لُوط علیہ السلام نے لواطت سے روکا انہوں نے کہا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ اے لوط (علیہ السلام) اگر تم ہماری قباحت بیان کرنے اور ہمیں لواطت سے روکنے سے باز نہ آؤ گے لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ○ تو تم شہر بدر ہونے والوں سے ہو گے اور نہایت ذلّت وخواری کے ساتھ ہم تمہیں اپنے شہر سے نکال دیں گے قَالَ اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ فرمایا بے شک مَیں تمہارے عمل یعنی لواطت سے مِّنَ الْقَالِيْنَ ○ بیزاروں سے ہُوں ۔ یعنی ان حضرات سے ہُوں جو ایسے فعل کے مرتکبین کے ساتھ سخت بغض و عداوت رکھتے ہیں گویا وہ اس سے غیظ وغضب کی وجہ سے اپنے دل اور جگر کو جلا لیتے ہیں ۔ بہر حال میں تمہاری دھمکیوں اور ہراساں کرنے سے مرعوب ہو کر ایسے بُرے فعل سے منع کرنے سے باز نہیں آؤں گا ۔

حلِ لغات : یہ قلی کا فاعل ہے بمعنے البغض الشدید محذوف سے متعلق ہے یہ دراصل لقال من القالین و مبغض من المبغضین ہے یعنی اس کا محذوف قال ہے اور وہ انّ کی خبر ہے اور من القالین اس کی صفت ہے اور لعملکم خبر محذوف کے متعلق ہے اور اگر ہم من القالین کو ان کی خبر اور قالین کو لعملکم کے متعلق بنائیں تو موصول کی صلہ پر تقدیم لازم آئے گی ۔

ف : غالباً اس سے لُوط علیہ السلام نے ان کے ساتھ سکونت رکھنے سے کراہت کا اظہار فرمایا اور واضح فرمایا کہ خدا کرے مجھے تم سے چھٹکارا مل جائے۔ اسی لیے اب ان سے گفتگو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے؛

رَبِّ اے میرے پروردگار! نَجِّنِیْ مجھے نجات دے وَ اَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ ○ اور میرے کنبہ کو اس سے جو وہ عمل کرتے ہیں یعنی ان کے خبیث عمل کی شامت اور عذاب سے فَنَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ○ تو ہم نے اسے اور اس کے سارے کنبے کو نجات بخشی یعنی ان کے رشتہ داروں کے علاوہ ان لوگوں کو بھی نجات دی جنہوں نے دُنیا میں لُوط علیہ السلام کی اتباع کی کہ پہلے انہیں اس بستی سے باہر نکالا پھر ان بستی والوں پر عذاب نازل کیا اِلَّا عَجُوْزًا مگر ایک بڑھیا جو لُوط علیہ السلام کی اہلیہ تھی اس کا نام والھہ تھا جسے اھلہ سے مستثنیٰ کیا گیا۔

ازالہ وہم نبی علیہ السّلام کی اہلیہ کا کافر ہونا حرج کی بات نہیں کیونکہ اس وقت کافرہ عورتوں سے نکاح جائز تھا اور وہ اس وقت لُوط علیہ السلام کے کنبہ میں شامل تھی اسی لیے اسے مستثنیٰ کیا گیا۔

حلِ لغات : امام راغب نے فرمایا کہ عجوز (عجز) کی وجہ سے اس نام سے موسوم ہوئی کہ وہ بہت سے امور میں عاجز ہوا کرتی ہے ۔

فِی الْغٰبِرِیْنَ ○ درانحالیکہ وہ ان لوگوں میں پیچھے رہنے والوں میں سے تھی جن پر عذاب نازل ہونا تھا کیونکہ وُہ ان غلط کار لوگوں کی طرف مائل بلکہ ان کے ایسے قبیح افعال پر خوش تھی اسے لوط علیہ السلام کے ساتھ جانا پڑا ۔ لیکن راستہ میں اس کے سر پر پتھر پڑا تو وہیں ڈھیر ہوگئی ۔

اعجوبہ مروی ہے کہ لُوط علیہ السّلام کی اسی اہلیہ مذکورہ نے جب عذاب کا دھماکہ سُنا اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ پتھر کی شکل میں مسخ ہوگئی۔ اب وہ پتھر ہر ماہ کے اول میں حیض کرتا ہے ۔ (کذا فی کتاب التعریف للامام السہیلی)

حلِ لغات : المفردات میں ہے کہ الغابر بمعنے الماکث یعنی وُہ شخص جو کسی کے ساتھ ہو اور وہ چل دے اور یہ پیچھے رہ جائے ۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

الّا عجوزًا فی الغابرین ۔

یعنی ان پیچھے رہنے والوں میں سے جن میں اس نے زندگی گزاری ۔ بعض نے کہا ان کے ساتھ جو لوط علیہ السلام کے جانے کے بعد پیچھے رہ گئے تھے بعض نے کہا وہ جو عذاب کے لیے بچ رہے اور لوط علیہ السلام کے ساتھ نہ گئے ۔

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ○ پھر ہم نے دوسروں کو شدت سے تباہ کر ڈالا کر ان کے شہروں کو اُلٹ دیا۔

حلِ لغات : التدمیر بمعنے کسی کو ہلاکت میں ڈالنا۔ الدمار بمعنے عجیب طریقے سے تباہ کرنا، جو نہایت ہی ہولناک ہو۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا اور ہم نے ایسی بارش برسادی جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھی یعنی پتھر برسادئے فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ○ تو بہت بُری تھی بارش ان کی جنہیں ڈرایا گیا تھا اور وہ ایمان کی دولت سے محروم رہے۔

ف : اس سے کوئی مخصوص قوم مراد نہیں کیونکہ افعال مدح و ذم کا قانون ہے کہ ان کا فاعل معرف بلام الجنس ہو یا معرف بلام الجنس کی طرف مضاف ہو یا مضمر ممیز بنکرہ ہو اور اس کا مخصوص با لذم محذوف ہے اور وہ مطرھم ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وہ جو قوم لوط (علیہ السلام) کے ساتھ کیا گیا البتہ عبرت ہے آنے والی نسلوں کے لیے۔ پس انہیں چاہیے کہ وہ ایسے قبیح فعل سے اجتناب کریں تاکہ کہیں ان پر بھی قوم لوط کی طرح عذاب نازل نہ ہو جائے وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ اور ان کے اکثر مومن نہ ہوئے۔

مروی ہے کہ لوط علیہ السلام پر صرف اس کی دو لڑکیاں اور دو داماد ایمان لائے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ اور بے شک تیرا پروردگار البتہ دشمنوں پر قہر کرنے پر غالب ہے الرَّحِيْمُ ○ اپنے اولیاء کو مدد دینے میں مہربان ہے یا یہ معنیٰ ہے کہ وہ تنبیہ و ارشاد سے پہلے کسی پر عذاب نہیں بھیجتا اور عذاب کے مستحق کو عذاب دینا بھی اس کی کمال رحمت ہے اور اہلِ ثواب کو ثواب دینا بھی۔ کیونکہ تم نے دیکھا ہوگا کہ کسی کو آکلہ کا مرض ہو تو بھلائی اسی میں ہے کہ وہ عضو کاٹ دیا جاتے ورنہ مریض کا تمام جسم تباہ ہو جاتے گا۔ اس معنی پر فسادی تمام جہان کے لیے اسی مرض آکلہ کی طرح ہے کہ جس طرح آکلہ کے مریض کا متاثرہ عضو کاٹنے میں بھلا ہے ایسے ہی اہلِ عذاب کو عذاب دینے سے تمام اہلِ ثواب کی بھلائی ہوگی کیونکہ اہلِ فساد کے دفع کرنے سے اہلِ صلاح کو راحت و فرحت نصیب ہوتی ہے۔ مثنوی شریف میں ہے : ؎

چونکہ دندان تو کرمش در فتاد
نیست دندان برکنش ای اوستاد

باقیٔ تن تا نگردد زار ازو
گرچہ بود آں تو شو بیزار ازو

(باقی بر صفحہ ۲۸۸)

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّىْ لَكُمْ
رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ
اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ۝
وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۝ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا
فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ وَاتَّقُوا الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ قَالُوْٓا
اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝
فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّىْٓ اَعْلَمُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ
عَظِيْمٍ ۝ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ
الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝

ترجمہ : بن والوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی جبکہ انھیں شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا کیا ڈرتے نہیں ہو بیشک میں تمہارے لیے امانت دار پیغمبر ہوں سو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میرا کہا مانو اور میں اس پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا میرا اجر نہیں مگر پروردگار عالم پر، پورا ناپا کرو اور گھٹانے والوں میں نہ ہو اور سیدھی ترازو سے تولا کرو اور لوگوں کی چیزیں کم کرکے نہ دو اور زمین پر فساد پھیلاتے ہوئے نہ پھرو اور اس سے ڈرو جس نے تمہیں اور اگلی مخلوق کو پیدا فرمایا انہوں نے کہا بے شک تم تو جادو کیے ہوئے ہو اور تم تو نہیں مگر ہم جیسے بشر اور بے شک ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں سو ہم پر آسمان کوئی پتھر کا ٹکڑا گرا دے اگر تو سچا ہے فرمایا میرا پروردگار تمہارے اعمال خوب جانتا ہے سو انہوں نے اس کی تکذیب کی تو انہیں سائبان والے دن کے عذاب نے آپکڑا بے شک وہ بڑے دن کا عذاب تھا بیشک اس میں البتہ عبرت ہے ان کے اکثر ایماندار نہ تھے بیشک تیرا رب ہی عزت والا مہربان ہے ۔

(صفحہ ۲۸۷ سے آگے)

ترجمہ : جب تیرے دانت میں کیڑا پڑ جائے تو دانت کو اکھیڑ دے ورنہ باقی جسم

درد سے کراہے گا۔ اگر ایسا نہیں کروگے تو سارے جسم کو پریشان رکھوگے اور اس سے بیزار رہو گے۔

نکتہ : اگر قہر وغلبہ بر اعداء کا کوئی فائدہ نہ ہوتا تو جرائم کی سزائیں ہرگز مقرر نہ کی جاتیں اسی لیے عرب کا مقولہ مشہور ہے :

اقامة الحدود خير من خصب الزمان۔

(حدود قایم کرنا خوشحالیٔ زمانہ سے بہتر ہے)

شہری زندگی کے فوائد حضرت ادریس علیہ السلام نے فرمایا جو ایسی جگہ سکونت پذیر ہو جہاں نہ سلطان قاہر ہے اور نہ قاضی عادل، نہ ہی طبیب عادل، نہ ہی بازار قائم، نہ ہی نہر جاری، تو اس نے اپنے آپ کو، اپنے اہل وعیال، مال اور آل واولاد کو ضائع کیا۔

سبق : عاقل پر لازم ہے کہ شہوات سے احتراز کرے اور غلط عادات کو چھوڑے اور اپنے نفس کے ساتھ سختی و نرمی سے ہر حالت میں جہاد کرے۔

(تفسیر آیات صفحہ گزشتہ)

تفسیر عالمانہ كَذَّبَ اَصۡحٰبُ لۡـَٔیۡكَةِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۝ بن والوں نے رسل کرام علیہم السلام کی تکذیب کی یعنی شعیب علیہ السلام اور ان سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی۔ الایکہ وہ بن جہاں نرم پتوں والے درخت پیدا ہوتے ہیں جیسے بیری اور پیلو وغیرہ۔ یہ بن مدین کے قریب واقع تھا جہاں ایک قوم قیام پذیر تھی ان کی طرف شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے جبکہ پہلے آپ کو مدین میں بھیجا گیا تھا چونکہ وہ مدین والوں کے رشتہ دار تھے اسی لیے فرمایا :

والیٰ مدین اخاهم شعیبا۔ (اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا گیا)

اور بن والے آپ کے رشتہ دار نہ تھے اسی لیے ان کے لیے فرمایا : اِذۡ قَالَ لَهُمۡ شُعَیۡبٌ جبکہ انھیں شعیب علیہ السلام نے فرمایا۔ یہاں اخوهم شعیب نہیں فرمایا۔

شعیب علیہ السلام کا نسب نامہ شعیب بن تویب بن مدین بن ابراہیم (علیہ السلام) یا ابن میکیک بن یشجر بن مدین ابن ابراہیم (علیہ السلام) اور شعیب علیہ السلام کی والدہ لوط علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں۔

اَلَا تَتَّقُوۡنَ ۝ کیا تم پروردگار کے عذاب سے ڈرتے نہیں کہ اس کے ساتھ شرک کرتے ہو۔

اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ○ بے شک میں تمہارے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، تمہارے معاملات میں بھی امین ہوں اور اللہ تعالیٰ کی پیغام رسانی میں بھی۔ میں صرف تمہاری اصلاح چاہتا ہوں فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ○ پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جس کا میں تمہیں حکم دیتا ہوں اس میں میری اطاعت کرو کیونکہ میرا حکم اللہ کا حکم ہے اور میری اطاعت درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے وَمَآ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْہِ اور میں تم سے اس کے متعلق نہیں مانگتا مِنْ اَجْرٍ کوئی مزدوری اور بدلہ یعنی اللہ تعالیٰ کی پیغام رسانی میں تم سے میرا عوض اور بدلے کا کوئی سوال نہیں اور نہ ہی تعلیم دین میں تم سے انعام چاہتا ہوں۔

سوال : تم نے تعلیم دین کہاں سے نکال لیا ؟

جواب : لفظِ رسول سے یہ معنی خود بخود ظاہر ہوا۔

اِنْ اَجْرِیَ میری مزدوری اور انعام نہیں اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ مگر پروردگارِ عالم کے ہاں، کیونکہ تربیت کے فیض اور تعلیم دین کا تمام ثواب اسی کے ہاں ہے خصوصاً وہ حضرات جو اس کی طرف سے اس کام پر مامور ہیں اَوْفُوا الْکَیْلَ پیمانہ کو مکمل کرو ، وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِیْنَ ○ اور لوگوں کے حقوق کو کم تول کر نقصان کرنے والے نہ بنو۔

حلِ لغات : یہ خسرتہ واخسرتہ سے ہے بمعنے نقصتہ یعنی میں نے اسے کم کیا۔

وَزِنُوْا اور موزنات کا صحیح وزن کرو۔

حلِ لغات : یہ وزن یزن وزنا وزنۃ کا امر ہے۔ الوزن بمعنے شے کی مقدار کی پہچان۔

بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ○ برابر اور صحیح ترازو کے ساتھ۔

حلِ لغات : القاموس میں ہے القسطاس بالضم و بالکسر (ترازو) یا بمعنے اقوم الموازین یعنے وہ میزان جو قسطاس کی طرح ہے یا معرب اور رومی لفظ ہے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ ۔ ان کے حقوق میں کمی نہ کرو۔

حلِ لغات : بخس حقہ سے ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی کا حق کم کر دے۔ یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے۔

ف : کشف الاسرار میں ہے کہ اعم الالفاظ سے اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ ان الفاظ سے قافلہ اور وزان اور نخاس اور محصی اور صیرفی کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ یعنی لوگوں کے حقوق میں کسی قسم کی کمی نہ کرو، مثلاً گنتی کی کمی، کھیتی کے معاملہ کا نقص، ایسے کھوٹا سکہ وغیرہ دینا، غصب، سرقہ، مالک کی اجازت کے بغیر تصرف وغیرہ۔

وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ○ قتل و غارت اور ڈاکہ زنی کر کے زمین میں فسادی ہو کر

نہ پھیلو۔

حلِ لغات: العثی سخت قسم کا فساد جو کسی طریق سے محسوس نہ ہونے دیا جائے۔ المفسدین حال مقیدہ ہے یعنی حد سے نہ بڑھو درانحالیکہ تم فساد کرنے والے ہو۔

سوال: عثی میں فساد کا مادہ تو موجود ہے پھر اسے فساد سے مقید کرنے کا کیا معنی؟

جواب: کبھی فساد تو ہوتا ہے لیکن اسے فساد نہیں کہا جاتا۔ جیسے وہ ظالم جو اپنے ظلم میں حد سے بڑھ رہا ہو۔ اس کا مقابلہ کرنا بظاہر تو فساد ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو فساد نہیں ایسے ہی کبھی اس فساد سے اصلاح مطلوب ہوتی ہے۔ جیسے خضر علیہ السّلام کا غلام کو قتل کرنا اور کشتی میں سوراخ کرنا۔

وَاتَّقُوا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالْجِبِلَّۃَ الْاَوَّلِیْنَ ○ جس نے تمہیں اور تم سے پہلی مخلوق کو پیدا فرمایا۔

حلِ لغات: الجبلۃ کا مادہ جبل ہے۔ اہلِ عرب کہتے ہیں: جبل یعنی خلق۔ لیکن یہ لفظ خلق سے متعلق نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے ساتھ مضاف نہ بلایا جائے۔ مثلاً کہا جائے گا:

خلق ذی الجبلۃ الاوّلین۔ یعنی وہ مخلوق جو ان سے پہلے گزری۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ○ انہوں نے کہا تم بار بار جادو کیے ہوئے ہیں یہاں تک کہ آپ حدِ عقل سے خارج ہیں وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا اور تو نہیں مگر بشر ہمارے جیسا۔ یعنی صفاتِ بشریہ میں تم ہم جیسے ہو پھر تمہیں ہم پر فوقیت کیسی اور تمہارا دعویٰ رسالت کیسا۔ دو جملوں میں واؤ عاطفہ دلالت کرتی ہے کہ دونوں یعنی تسحیر اور بشریت رسالت کے منافی ہیں اس طرح سے تکذیب میں مبالغہ ہوگا بخلاف قصّہ ثمود کے کہ اس میں واؤ نہیں کیونکہ وہاں صرف ایک فعل (تسحیر) کا اثبات مقصود ہے وَاِنْ نَّظُنُّکَ لَمِنَ الْکٰذِبِیْنَ ○ ہم تمہیں دعویٰ نبوت میں جھوٹا سمجھتے ہیں فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا تو گرا دے ہم پر۔ یعنی تم اپنے خدا کو کہو کہ وہ ہم پر گرا دے کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ آسمان کا ایک حصہ جس میں عذاب ہو۔

حلِ لغات: کسفا۔ کسفۃ بالکسر کی جمع ہے بمعنے قطعۃ (ٹکڑا) اور السمآء سے بادل یا سایہ دار شے مراد ہے۔ یہ لمّا کا جواب ہے۔ ڈرسنا کر اس سے تقویٰ کا درس دیا گیا ہے۔

اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ○ اگر تم سچے ہو اس دعویٰ میں کہ عذاب آئے گا۔ یہ انہوں نے استہزاء و تکذیب کے طور پر کہا ہے قَالَ شعیب علیہ السّلام نے فرمایا رَبِّیْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ میرا رب خوب جانتا ہے جو تم عمل کرتے ہو کفر و معاصی اور ایسے اعمال جن کے سبب سے تم عذاب کے مستحق ہوئے پھر وہ اپنے وقت مقدر پر ضرور نازل ہوگا ○

مہلت دہ روزۂ ظالم ببیں
فتنہ ببیں دم بدمش در کمیں
اول حالش ہمہ عیش است و ناز
آخر کارش ہمہ سوز و گداز

ترجمہ: ظالم کو دس روز کی مہلت دے کر دیکھو کہ اسے پیچھے سے عذاب کیسے پکڑتا ہے،
پہلے اس کا حال عیش و ناز ہے اس کا انجام سوز و گداز ہے۔

نزولِ عذاب بر قومِ شعیب علیہ السلام منقول ہے کہ جب قوم شعیب علیہ السلام انکار کر کے حد سے گزر گئی تو اللہ تعالیٰ نے سات دن رات سخت گرمی ان پر مسلط کر دی یہاں تک کہ ان کے چشموں اور کنوؤں کا پانی بھی گرم ہوگیا۔ گرمی سے ان کا دم گھٹنے لگا۔ گھروں سے باہر نکلے تو گرمی اور بڑھ گئی۔ جنگلوں میں جا کر درختوں سے چمٹ گئے۔ اچانک ہوا میں ابر سیاہ اڑتا ہوا ان کے سروں پر آ پہنچا اور بھینی بھینی ہوا آنے لگی۔ قوم شعیب خوش ہوئی اور ایک دوسرے کو بلایا کہ آؤ اس بادل کے نیچے قرار پکڑیں۔ جونہی سب کے سب اس بادل کے نیچے پہنچے تو اچانک بادل سے آگ کا شعلہ نکلا جس نے سب کو جلا کر بھسم کر ڈالا۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَكَذَّبُوهُ سو انہوں نے شعیب علیہ السلام کی تکذیب پر اصرار کیا باوجودیکہ ان کے سامنے حجت واضح ہوگئی اور تمام شبہات دور ہو گئے۔ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ط تو انہیں چھتری کے عذاب نے پکڑ لیا جیسا کہ انہوں نے طلب کیا تھا۔

ف: اگر آسمان سے سحاب مراد ہو تو ظاہر ہے اگر آسمان سے ظُلّۃ (چھتری) مراد ہے تو چونکہ عذاب اسی جہت سے ہوا اسی لیے اسے اس سے تعبیر کیا گیا اور بادل بھی چھتری کی طرح سایہ کرتا ہے اسی لیے اسے ظلّہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ف: کاشفی مرحوم نے لکھا کہ ظُلّہ لغت میں سائبان کو کہا جاتا ہے اور چونکہ وہ سیاہ بادل سائبان کی طرح تھا اسی لیے اسے ظلّہ کا عذاب کہا گیا ہے۔ اور عذاب کو یوم کی طرف اضافہ کرنے میں اشارہ ہے کہ ان کے عذاب کے ایام اس دن سے شروع ہوئے اور راتیں ان میں ضمناً مذکور ہوئیں اسی دن سے حرارت شدیدہ تھی جس سے انھیں یقین ہو گیا کہ اب وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

إِنَّهُ بے شک وہ سائبان کے عذاب کا دن كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ○ وہ تھا بڑے دن کا بڑا عذاب۔

ف : اس کی عظمت اسی لیے تھی کہ اس دن ان پر بہت بڑا عذاب آیا۔

ف : مروی ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام دو اُمتوں کی طرف مبعوث ہوئے، پہلے اصحابِ مدین کی طرف، پھر اصحابِ ایکہ کی طرف۔ اصحابِ مدین صیحہ و رجفہ میں مارے گئے، اور اصحابِ ایکہ ایک سائبان کے دن کے عذاب سے۔

ف : حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جو بیان کرے کہ عذاب یوم الظلہ کیا تھا تو وہ گویا اس کی تکذیب کرتا ہے۔ ان کی مراد یہ ہے کہ اس وقت وہ تمام تباہ و برباد ہوگئے پھر اس کی خبر کون دیتا ہے۔ (کذا فی کشف الاسرار) (یعنی انسانی خبر کا اعتبار نہیں جبکہ اس وقت کوئی انسان نہیں بچا تھا، ہاں منجانب اللہ جو خبر مل رہی ہے اس کی تصدیق کرنی چاہیے)

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ بے شک قومِ شعیب کے قصے میں جو مذکور ہوا اس میں لَاٰیَۃً البتہ عقلاً کے لیے عبرت ہے وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ اور نہ تھے اصحابِ ایکہ کے اکثر ایمان لانے والے، بلکہ سارے کے سارے ایمان نہ لائے کیونکہ اصحابِ ایکہ میں کسی ایک کا بھی ایمان لانا منقول نہیں بخلاف اصحابِ مدین کے کہ وہ سب کے سب ایمان لے آئے وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ اور بے شک تیرا پروردگار (ہر شے پر قادر و غالب ہے۔ اس کے غلبہ و قدرت کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ انبیاء و اولیاء کو ان کے دشمنوں پر غالب کرتا ہے الرَّحِیْمُ ۝ کفار کو مہلت دیتا ہے اس لیے کہ وہ مہربان ہے۔

ف : یہ ان سات قصوں کا آخری قصہ ہے۔ ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ کو قریش ستاتے ہیں تو یہی طریقہ سابقہ انبیاء علیہم السلام کی قوموں کا رہا کہ وہ انبیاء کو ستاتی تھیں۔ اس میں ان قریش کو تہدید ہے جو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو ستاتے تھے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ستاتا اور ان کی تکذیب کرتا ہے اس کا انجام یُوں ہی ہوگا کہ عذاب میں مبتلا ہوں گے جیسے ان قصوں میں پڑھا کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی تو ایسے عذابوں میں مبتلا ہوئے۔

سوال : اگر کوئی کہے کہ عاد و ثمود اور قومِ لوط وغیرہم پر کفر و عناد و تکذیب کی وجہ سے عذاب نازل نہیں ہوا بلکہ ان کے دور میں ستاروں کی گردش کچھ ایسے ہی تھی جب یہ احتمال بھی ہے تو قصص قطعی نہیں رہے نیز یہ بھی ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ عذاب اس لیے نازل فرماتا کہ مکلفین کی تکلیف و مشقت و محنت ان کے مراتب و کمالات کے اضافہ کا سبب بنے اور کبھی ان سے آزمائش بھی مطلوب ہوتی ہے جیسے اہلِ ایمان کو بارہا ایسے آزمایا گیا اس سے واضح نہ ہوا کہ مذکورہ بالا اقوام کا عذاب ان کے کفر و تکذیب کی وجہ سے تھا۔

ف : ہمیشہ دستور رہا کہ جس قوم نے کسی نبی علیہ السلام کی تکذیب کی تو وہ لازماً عذاب میں مبتلا ہوئے ایسے

ستاروں کی گردش پر محمول کرنا حماقت ہے کیونکہ ستاروں کی گردش انہی واقعات کی پابند نہ تھی اور نہ ہی آزمائش و ابتلاءٗ کا پروگرام ان واقعات کے ساتھ کوئی مناسبت رکھتا ہے۔

ف : عذابِ ماضی تو مذکور ہُوا لیکن اس میں عذابِ مستقبل کا اشارہ بھی ہے۔

تفسیر صُوفیانہ زمانہ حال کا عذاب یہ ہے کہ انسان دل کو غیر اللہ سے متعلق کر لے اور اس کی توجہ ہر وقت اسی کی طرف ہو جیسے ان کا دل کو خالی رکھنا اور عزم علی العصیان سے دُور کرنا ضروری ہے ایسے ہی اسے تصدیق وایمان کے زیور سے آراستہ کرنا ضروری ہے۔ ایسے ہی لازم ہے کہ دل کو علائق دنیویہ سے دُور رکھا جائے۔ اور شئون رب الخلائق کے مشاہدہ میں مستغرق کیا جائے کیونکہ یہی امور عذابِ فراق سے چھٹکارا بخشتے ہیں اور قہر خلائق سے نجات دیتے ہیں لیکن یہ عمل بر شریعت سے حاصل ہوتا ہے کہ اس کے احکام کی پابندی کی جائے اور اس کے ارشادات کو تہِ دل سے مانا جائے اور طریقت کو اپنانے سے بھی نجات مل جاتی ہے جبکہ اس کے جملہ آداب ملحوظ ہوں جو شخص اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد ان کے تبعین اور ائمہ مجتہدین کے ارشادات کا پابند بناتا ہے اور زہد وورع اور دائمی شب خیزی اور مامورات شرعیہ کی پابندی اور منہیات کا ترک کرتا ہے یہاں تک کہ مصائب اور تکالیف راحت بن جائیں اور تنگیِ معاش فرحت محسوس ہو اور دنیا کی پریشانیاں اور اس کی تکلیفیں اور شہوات تبدیل ہو کر اُخروی امور کے لیے سرور بن جائیں تو پھر یقین کر لو کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محب بھی ہے اور محبوب بھی۔ اور اب اس کے دل پر رحمت کے دھارے چلیں گے اور اس کی زندگی کا مشغلہ احکامِ الٰہی کی پابندی ہوگا ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کا مبغوض ہے جس پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا اور اسم عزیز کے قہر وغلبہ کے ماتحت ہمیشہ سزائیں پائے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اہلِ رحمت سے بنائے اور ہم سب کو اپنے عذاب سے بچائے اور ہم سے ہر بری علّت وذلّت دُور فرمائے۔ کسی نے کیا خوب فرمایا ؛ ؎

محیط از چہرۂ سیلاب گرد راہ می شود
چہ اندیشد کسے با عفو حق از گرد ذلتہا

ترجمہ : وہی چہرے سے گردِ راہ دھوئے گا عفو حق
جسے نصیب ہو وہ ذلتوں کی گرد سے کیا فکر کرے گا وہی
معاف کرنے والا بخشنے والا ہے اسی سے وافر اجر کا
فیض ہے۔

وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ
الْمُنْذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۝ وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ۝ أَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً
أَنْ يَّعْلَمَهُ عُلَمٰٓؤُا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ۝ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ ۝ فَقَرَأَهُ عَلَيْهِمْ
مَّا كَانُوا بِهِ مُؤْمِنِينَ ۝ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ۝ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ حَتّٰى يَرَوُا
الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۝ فَيَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ فَيَقُولُوا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُونَ ۝
أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ۝ أَفَرَءَيْتَ إِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِينَ ۝ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوا
يُوعَدُونَ ۝ مَآ أَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يُمَتَّعُونَ ۝ وَمَآ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا
مُنْذِرُونَ ۝ ذِكْرٰى وَمَا كُنَّا ظٰلِمِينَ ۝ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِينُ ۝ وَمَا يَنْبَغِي
لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيعُونَ ۝ إِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُولُونَ ۝ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا
اٰخَرَ فَتَكُونَ مِنَ الْمُعَذَّبِينَ ۝ وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ۝ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ
لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ۝ وَتَوَكَّلْ
عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝ الَّذِي يَرٰىكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِينَ ۝ إِنَّهُ هُوَ
السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِينُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ أَفَّاكٍ
أَثِيمٍ ۝ يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كٰذِبُونَ ۝ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ أَلَمْ تَرَ
أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَّهِيمُونَ ۝ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا وَّانْتَصَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوٓا أَيَّ
مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُونَ ۝

ترجمہ : اور بیشک یہ قرآن پروردگار عالم کا نازل کردہ ہے اسے رُوح الامین لے کر نازل ہوا تمہارے
دل پر تاکہ تم صاف عربی زبان میں تم ڈر سناؤ۔ بیشک اس کا شہرہ اگلی کتابوں میں ہے کیا یہ ان کے لیے
علامت نہ تھی کہ اس نبی کو بنی اسرائیل کے علماء جانتے ہیں اور اگر ہم اسے کسی عجمی آدمی پر نازل کرتے

پھر وُہ انھیں پڑھ کر سناتا تو بھی یہ ایمان نہ لاتے یونہی تکذیب کو ہم نے مجرموں کے دلوں میں ڈال رکھا ہے وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ وہ دردناک عذاب دیکھیں سو وُہ ان پر اچانک آ جائے گا اور انھیں اس کی خبر تک نہ ہو گی پھر کہیں گے کیا ہمیں کچھ مہلت ملے گی تو کیا تم ہمارے عذاب کی جلدی چاہتے ہو سو ذرا دیکھو کہ اگر ہم انہیں کئی برس عیش میں رہنے دیں پھر آئے ان پر وہ جو وعدہ دیے جاتے تو نہیں بچائے گا انھیں وُہ جو عیش میں بسر کرتے تھے ہم نے کوئی بستی تباہ نہیں کی مگر اس کی نصیحت کے لیے ڈرسنانے والے آئے اور ہم ظالم نہیں ہیں اور اس قرآن کو شیطان لے کر نہیں اُترے اور نہ وہ اس کے لائق ہیں اور نہ وُہ ایسا کر سکتے ہیں بے شک وُہ وحی سُننے سے روک دیئے گئے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو ورنہ تم پر عذاب نازل ہوگا اور اے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! اپنے زیادہ قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے اور اپنی رحمت کا بازو بچھائیے ان ایمان داروں کے لیے جو تمہارے پیروکار ہیں پھر اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں تو فرمائیے بیشک میں تمہارے اعمال سے لاتعلق نہیں اور اس پر توکل کیجئے جو عزت والا مہربان ہے۔ وُہ جو تمہاری نشست و برخاست کو جب تم نمازوں میں کھڑے ہوتے ہیں وہی سمیع علیم ہے کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اُترتے ہیں وہ بڑے بہتان تراش گنہگار پر اُترتے ہیں شیطان ان پر سُنی ہوئی بات ڈالتے ہیں اور ان کے اکثر جھُوٹے ہیں اور شاعروں کی پیروی وہ کرتے ہیں جو گمراہ ہیں کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سرگردان پھرتے ہیں اور بے شک جو زبان سے کہتے ہیں اس پر خود عمل نہیں کرتے مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور اللہ تعالیٰ کو بکثرت یاد کیا اور بدلہ لیا بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہُوا اور عنقریب ظالموں کو معلوم ہو گا کہ وہ کس کروٹ پلٹا کھائیں گے۔

تفسیر عالمانہ وَاِنَّهٗ یہ ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے اگرچہ اس سے پہلے اس کا ذکر نہیں لیکن چونکہ اس کا تصور اذہان میں سمایا ہوا ہے اسی لیے گویا مذکور ہے لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؁ تفعیل کا باب بتاتا ہے کہ یہ قرآن مجید آیاتِ مختلف ہو کر تئیس سال میں نازل ہُوا۔ تنزیل مصدر بمعنے مفعول ہے۔ مصدر کے ساتھ لانے میں مبالغہ مطلوب ہے اور رب العالمین کی صفت میں اشارہ ہے کہ قرآن مجید کے نزول سے اپنے بندوں کی تربیت اور ان سے شفقت و رافت مطلوب ہے۔ اب معنیٰ یہ ہے کہ قرآن مجید کے جتنے قصص (سبعہ) مذکور ہوئے تمام کے تمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں ورنہ تم اسے بیان نہ کر سکتے اور نہ ہی اس طرح سے تمہاری رسالت کی صداقت ظاہر ہوتی کیونکہ یہ تمام بطریقِ وحی تو معلوم ہو سکتے ہیں اپنی طرف سے ایسے کوئی نہیں

معلوم کرسکتا۔ نَزَلَ بِهِ با، تعدیہ کی ہے یعنی اس نے نازل کیا، یا ملابست کی ہے یعنی قرآن کے ساتھ آیا الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ○ جبریل علیہ السلام کیونکہ وحی کے امین اور رسل کرام علیہم السلام کے ہاں پہنچانے والے ہیں اور روح اس لیے ہیں کہ وہ قلوب مکلفین کی حیات کے سبب ہیں کہ نورِ معرفت و طاعت سے قلوب کو حیات نصیب ہوتی ہے تو وحی سے، اور وحی میں معرفت کی حیات اور جہالت کی موت ہے تو یہ سب کچھ جبریل علیہ السلام کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ یہ فرمایا:

یلقی الروح من امرہ علیٰ من یشاء من عبادہ۔

(اور روح وہی اللہ تعالیٰ کے حکم سے بندوں پر ڈالتا ہے جو وہی چاہتا ہے)

ف: کشف الاسرار میں ہے کہ جبریل علیہ السلام کو رُوح اس لیے کہا گیا کہ ان کا جسم رُوح کی طرح لطیف ہے ایسے ہی روحانی ملائکہ رُوح سے پیدا کیے گئے اور رُوح ایک ہوا ہے۔

ف: فقیر (صاحب روح البیان) کہتا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ ملائکہ اجسام لطیف ہیں اور ان کی اس لطافت کی وجہ سے ان پر روحانی احکام غالب ہوتے ہیں۔ اسی معنی پر ان کا نام ارواح ہے اور جبریل علیہ السلام کے ساتھ خصوصیت اس لیے ہے کہ وہ تمام ملائکہ پر ایسے ہیں جیسے کسی امت کا رسول ہو۔

ف: قرآن کلامِ الٰہی ہے اور اس کی صفت ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے اسے الفاظ عربیہ کا جامہ پہنا کر پہلے جبریل علیہ السلام پر نازل کیا اس کے بعد انہیں امین بنایا تاکہ وہ اس کے حقائق میں کسی قسم کا تصرف نہ کرسکیں پھر اسے اس کے ذریعہ حضور سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر پر نازل فرمایا۔ جیسا کہ فرمایا:

عَلٰی قَلْبِكَ جبریل علیہ السلام نے آپ کے ہاں حبیب علیہ السلام پڑھا یہاں تک کہ آپ نے اسے یاد کرلیا اور نزول کے لیے قلب کی تخصیص اس لیے کہ وحی کی حفاظت و تثبیت اور الہام کا محل و معدن قلب ہے اور انسان کے وجود میں سوائے قلب کے اور کوئی شے خطاب و فیض الٰہی کے قابل نہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی اس مرتبہ عالیہ اور کرامت قدسیہ کے اہل ہیں کیونکہ باقی انبیاء علیہم السلام کی کتابیں الواح و صحیفوں میں یکبارگی نازل ہوئیں اور وہ ان کی صورتوں اور ظاہری شکلوں کے آگے، نہ کہ قلوب پر۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

تفسیر صوفیانہ

کشف الاسرار میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی ہے تو سب سے پہلے آپ کے قلب پر، کیونکہ آپ کے دل کو وحی کی پیاس تھی اور آپ ہر وقت باری تعالیٰ کی ذات میں مستغرق رہتے۔ دل پر نزول کے بعد پھر فہم و سمع پر نازل ہوتا ہے اسے نزول من العلو الی السفل کہا جاتا ہے اور یہ خواص کا مرتبہ ہے اور عوام کا یہ حال ہے کہ وہ پہلے وحی کو سنتے ہیں اسی لیے وحی پہلے ان کی سمع پر پھر فہم پر پھر قلب پر نازل ہوتی ہے یہ اسفل سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہے یہی مریدین اور اہلِ سلوک کا مرتبہ ہے

(اس سے سمجھ لیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر خواص اور عوام کے درمیان کتنا فرق ہے)

ف : جبریل علیہ السلام وحی لاتے وقت کبھی بصورتِ ملک ہوتے اور کبھی بصورتِ بشر۔ اگر آیات احکامِ شرعیہ و ذکرِ حلال و حرام سے متعلق ہوتیں تو بشری شکل میں ہوتے۔ چنانچہ فرمایا :

وھوالذی انزل علیك الکتاب۔

اس میں قلب کے درمیان میں ذکر نہ ہوتا اور جب حدیثِ عشق و محبت ہوتی اور عارفانہ اسرار و رموز کا بیان ہوتا تو بصورتِ ملک حاضر ہوتے یعنی روحانی اور لطیف شکل میں حاضری دیتے تاکہ صرف آپ کے قلبِ اطہر پر ہی آیات کا نزول ہو ان سے اغیار مطلع نہ ہوں۔ جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے :

نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبك۔

جب جبریل علیہ السلام چلے جاتے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے : جبریل علیہ السلام مجھ سے جدا ہو گئے اور میں نے ان کا بیان کردہ مضمون یاد کر لیا۔

ف : الفتاویٰ الزینیۃ میں ہے کہ سید (مفتی زمان) سے پوچھا گیا کہ حضرت جبریل علیہ السلام حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر کتنی بار نازل ہوئے؟ انہوں نے فرمایا کہ چوبیس ہزار بار۔

مشکاۃ الانوار میں ستائیس ہزار بار لکھا ہے۔ اور دیگر جملہ انبیاء علیہم السلام پر صرف تین ہزار بار۔

تفسیر عالمانہ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ۝ تاکہ آپ ہوں ڈرانے والوں میں سے، یعنی انہیں امر و نہی کے ذریعہ عذابِ الٰہی سے ڈرائیں۔ اس میں نزل اور تنزیل کی حکمت و مصلحت کا بیان ہے یہ اس قبیل سے ہے کہ اس کی ایک طرف مذکور ہو تو دوسری طرف محذوف۔ کیونکہ مذکور محذوف پر دلالت کرتی ہے یہ اس لیے کہ نزولِ قرآن صرف انذار کے لیے نہیں بلکہ تبشیر کے لیے بھی ہے۔

نکتہ : فقیر (علامہ اسمٰعیل حقی علیہ الرحمۃ) کہتا ہے کہ اصل انذار ہے اور اس کی تقدیم بھی اسی لیے ہے کہ یہ بمنزلہ تخلیہ (شے کو صاف و ستھرا کرنا) کے ہے اسی لیے قرآن مجید کے اکثر مقامات پر صرف اسی پر اکتفا کیا گیا ہے۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۝ یہ بھی نزل کے متعلق ہے۔ اسے مؤخر اس لیے کیا گیا کہ انذار اس سے زیادہ مہتم بالشان ہے۔

حل لغات : اللسان بمعنے لغت یعنی بولی۔ کیونکہ زبان بولنے کا آلہ ہے فعل کو آلہ سے موسوم کرنا جائز ہے۔ یعنی قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے تاکہ اظہارِ معنیٰ میں خفا نہ ہو اور مقصد پر دلالت کرنے میں واضح ہو تاکہ کفار کو قیامت میں کسی قسم کا عذر نہ ہو، یہ نہ کہہ سکیں کہ نازل کردہ کلام کو ہم سمجھتے نہیں تھے۔

جاہل صوفیوں کا رد اس سے معلوم ہُوا کہ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہُوا اس میں باطنیہ (جاہل صوفیہ) کا رد ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن قلبِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی لغت و زبان پر وارد ہوا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی عربی بولی میں ظاہر فرمایا۔ یہ ان کا خیال فاسد ہے اور نص و اجماع کے مخالف و منافی ہے۔ اگر ان کی بات تسلیم کرلی جائے تو قرآن اور حدیثِ قدسی کا کوئی فرق نہیں رہے گا۔

لغتِ عربیہ کے فضائل آیت سے ثابت ہوا کہ عربی زبان باقی تمام زبانوں سے افضل ہے کیونکہ قرآن اسی زبان میں نازل ہوا۔ اگر کوئی اور زبان زیادہ فضیلت رکھتی تو قرآن اُسی میں نازل ہوتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے مبین سے تعبیر فرمایا ہے۔

جنّت کی بولی یہی وجہ ہے کہ جنّت میں عربی بولی جائے گی، اور دوزخیوں کی بولی عجمی ہوگی۔ حضرت سفیان نے فرمایا کہ ہمیں معلوم ہُوا ہے کہ بہشت میں داخلے سے پہلے سریانی بولی بولی جائے گی اس کے بعد عربی۔

سوال: یہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ قرآن عربی زبان میں ہے حالانکہ اس میں بہت سے الفاظ غیر عربی ہیں مثلاً سجّیل فارسی لفظ ہے بمعنے پتھر اور مٹی۔ صُرھُنّ رومی لفظ ہے بمعنے اقطعھن (انہیں ٹکڑے ٹکڑے کردے) اور فی جیدھا ارمینیہ بولی ہے۔ اور ولات حین مناص میں لات بمعنے لیس سریانی لفظ ہے۔ اور کفلین بمعنے ضعفین حبشی زبان ہے۔

جواب: چونکہ یہ الفاظ اہلِ عرب میں معروف تھے اور آپس میں استعمال کرتے تھے۔ اس لیے یہ الفاظ گویا عربی ہی ہیں۔

عربی پڑھنا سیکھنا ثواب ہے حضرت فقیہ ابواللیث رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چونکہ عربیت کو دوسری تمام زبانوں پر فضیلت حاصل ہے اس لیے اس کا پڑھنا اور پڑھانا اجر و ثواب ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو عربی زبان میں نازل فرمایا ہے۔

فاروق اعظم کا ارشاد سیّدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس نے صرف فارسی سیکھی وُہ خسارہ میں رہا اور خسارہ کی وجہ سے اس سے مروّت بھی جاتی رہے گی، یعنی جس نے صرف فارسی سیکھنے پر ہی اکتفا کیا اور عربی نہ سیکھی تو وہ عجمی ہی رہے گا اور عربوں کے ساتھ گفتگو نہ کرسکے گا تو ان کی نظروں سے گر جائے گا۔ یُوں اس سے مروت چلی جائے گی (صرف فارسی مراد نہیں بلکہ ہر زبان مثلاً انگریزی، اردو، سرائیکی، سندھی، پنجابی، بروہی، بلوچی وغیرہ بحیثیت دین کے امور ترک کرنے کے)

مسئلہ: جو غیر عربی سیکھے یا بولے جائز ہے اس پر کوئی گناہ نہیں۔

اعجوبہ : مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فارسی میں گفتگو فرمائی۔

ف : میں (صاحبِ روح البیان) کہتا ہوں کہ فارسی لسانِ عجم کا ایک شعبہ اور عربی زبان کے بالمقابل ہے لیکن اسے باقی تمام لغات پر فضیلت حاصل ہے (اس لیے اسلام میں عربی کے بعد فارسی زبان زیادہ رائج ہے لیکن آج کل کا مہذب مسلمان انگریزی کو ترجیح دیتا ہے اسے کیا کہا جائے!) [۱]

حدیث شریف میں ہے کہ:

لسان اھل الجنۃ العربیۃ والفارسیۃ الدریۃ۔

(اہلِ جنت کی زبان عربی اور بولی فارسی ہوگی)

ف : الدریۃ بتشدید الراء کذا فی الکرمانی وغیرہ۔

اور ایسے ہی صاحب الکافی والقہستانی وابن الکمال وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ نے ذکر فرما کر اس کی تصحیح فرمائی ہے۔

فضیلت لغتِ عربی

سوال : اگر کوئی کہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ:

احب العرب لثلاث لأنی عربی والقرآن عربی ولسان اھل الجنۃ فی الجنۃ عربی۔

(عربی سے محبت کرو تین وجوہ سے : میں عربی، قرآن عربی اور اہلِ جنت کی جنت میں زبان عربی)

اس میں تو بہشت کی بولی صرف عربی کو کہا گیا ہے۔

جواب : یہ تخصیص حصری نہیں کہ اس سے دوسری کوئی بولی مراد نہ ہو۔ یہ درست ہے کہ اہل جنت کی بولی عربی ہوگی اور فارسی بھی، جیسے دوزخیوں کی بولی فارسی بھی ہوگی۔ فارسی کو دُنیا میں بہت سے عارفین نے استعمال فرمایا ہے۔ مثنوی شریف میں ہے : ؎

فارسی گو گرچہ تازی خوشتر ست

عشق را خود صد زبان دیگر ست

ترجمہ : فارسی میں بول اگرچہ عربی زبان خوشتر ہے لیکن عشق کی سو زبانیں اور بھی ہیں۔

ف : اس میں عربی زبان کو سیکھنے کے بعد فارسی زبان کی تحصیل کی ترغیب ہے۔ یہاں پر مزید تفصیل ہے جسے ہم نے "تمام الفیض" کتاب میں لکھ دیا ہے۔

تفسیرِ عالمانہ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ○ زُبر، زبور کی جمع ہے بمعنی کتاب۔ جیسے رسل رسول کی جمع ہے اب معنی یہ ہوا کہ پہلے انبیاءؑ علیہم السلام کی کتابوں میں مذکور ہے۔ یعنی ہم نے ان کتابوں میں قرآن مجید کے نزول کا ذکر کیا تھا کہ یہ قرآن نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوگا اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ○

ترکیب : ہمزہ انکار نفی کے لیے ہے واؤ کا عطف فعل مقدر پر ہے لہم، آیۃ سے حال ہے اور لہم کی ضمیر مشرکینِ عرب کی طرف راجع ہے اور آیۃ فعل ناقص یعنی لم یکن کی خبر ہے اپنے اسم یعنی ان یعلمہ الخ پر مقدم ہے اس لیے کہ اس کی تقدیم کی اور اسم کی تاخیر کی ضرورت ہے۔

اب معنیٰ یہ ہُوا کہ یہ لوگ غافل ہیں کیا ان کے ہاں کوئی ایسی دلیل نہیں جو بتائے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہُوا ہے اور وہ پہلی کتب میں بھی مذکور ہے اسے بنی اسرائیل کے علماءؑ، جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ، بھی جانتے ہیں کہ ان کی کتب میں قرآن مجید کے اوصاف مذکور ہیں اور ان میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوگا اور یہ علماءِ کرام قرآن مجید کے نزول اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کو خوب جانتے ہیں اور اہلِ علم کی شہادت عوام کے لیے تسکین و اطمینانِ قلبی کا موجب ہے۔

ف : مروی ہے کہ اہلِ مکہ نے مدینہ کے یہود سے معلومات حاصل کیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت و رسالت حق ہے یا نہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم ان کی نعت اور صفات پڑھ چکے ہیں اب ان کے ظہور کا وقت ہے (فلہذا اگر تشریف لا چکے ہیں تو مان لو)

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ اور اگر اس کی نظم عجیب و معجز و غریب کے ساتھ ہم اسے نازل کرتے عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ○ بعض ان عجمیوں پر جو عربی میں گفتگو نہیں کر سکتے۔

ف : اعجمین، اعجمی کی جمع ہے (بالتخفیف)۔ یعنی اعجمی کی یاءُ مشدد نہیں اسی لیے اس کی جمع سالم لائی گئی ورنہ اگر اعجم کی جمع ہوتو اسے جمع سالم پر نہیں لائی جائے گی اس لیے کہ اعجم کی جمع عجماءُ آتی ہے اور ایسے افعل و فعلاءُ کی جمع سالم مذکر نہیں لائی جاتی۔

فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ تو وہ ان کے ہاں صحیح قراءت پڑھے خرقاً للعادۃ کے طور۔ یعنی وُہ سمجھتے ہوں کہ یہ عجمی ہوکر صحیح عربی پڑھ رہا ہے باوجودیکہ وُہ عربی نہ جانتا تھا لیکن صحیح پڑھتا ہے تو یہ اس کا معجزہ ہے۔ اور معجزہ نبی علیہ السلام کا ہوتا ہے فلہذا ماننا چاہیے لیکن ان کی اس وقت بھی یہ کیفیت ہوگی کہ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ○ وہ ایمان لانے والے نہیں باوجودیکہ وُہ یقین رکھتے ہیں کہ پڑھنے والا بھی معجزہ کے طور پڑھ رہا ہے اور جسے پڑھا جا رہا ہے وہ بھی ایک معجزہ ہے لیکن ان میں اتنا شدید عناد اور ضد اور ہٹ دھرمی ہے کہ وہ اسے ماننے کو تیار نہیں۔

ف : تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور اعلیٰ حکمت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ قدرتوں والا ہے کہ اگر یہ قرآن عربی ایسے عجمی پر نازل فرماتا جسے عربی زبان نہیں آتی تھی تو وہ بعد نزول قرآن بقدرت الٰہی قرآن کو اور اس کے احکام و حکم کو سمجھنے لگ جائے تو ہو سکتا ہے کیونکہ آدم علیہ السلام کو تمام اسماء اور عربی بولی سکھا دی، جیسے اس شخص پر فضلِ الٰہی ہوا جو کہہ رہا تھا:

امسیت کردیا و اصبحت عربیا۔

(شام کو کُردی تھا تو صبح کو عربی ہو گیا)

لیکن چونکہ منکرین ماننے والے نہ تھے باوجودیکہ ان کے سامنے قرآن معجزہ در معجزہ تھا کَذٰلِكَ ایسے طریق عجیب کی طرح اس کا اشارہ مصدر کی طرف ہے سَلَكْنٰهُ ہم نے داخل کیا قرآن کو فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ مجرمین یعنی مشرکین عرب کے قلوب میں۔ تو انہوں نے قرآن کے معانی اور اس کے اعجاز کو مکمل طور پر جان لیا۔ چنانچہ فرمایا: لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ایمان نہ لائے یہ جملہ مستانفہ ہے بوجہ عناد کے حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ یہاں تک کہ عذاب دردناک کو دیکھتے جو انہیں ایمان لانے پر مجبور کرتا لیکن اس وقت ان کا ماننا ان کے لیے مفید نہ ہوا، فَيَاْتِيَهُمْ سو ان کے ہاں عذاب آجائے گا بَغْتَةً اچانک۔ یعنی دنیا و آخرت کا عذاب اچانک آئے گا۔ اس کا عطف یروا پر ہے وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ اور وہ اس اچانک عذاب کے آنے کو جانتے سمجھتے نہ تھے یعنی انھیں اس کا اچانک آنا معلوم نہ تھا فَيَقُوْلُوْا تو حسرت سے کہیں گے کہ افسوس ہم ایمان نہ لا سکے، کاش! ہمیں مہلت مل جاتی تاکہ ہم سے جو بات چُوک گئی اس کی تلافی کر لیتے۔ اس کا عطف یاتیھم پر ہے هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ۝

حلِ لغات : الانظار بمعنے تاخیر و امہال۔ یعنی کیا ہمیں مہلت مل جائے گی تاکہ ایمان لائیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں عذابِ الٰہی سے ڈرایا تو کہنے لگے کہ ہمیں کب تک اس عذاب سے ڈراتے رہو گے اور وہ عذاب آئے گا کب۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ کیا وہ ہمارے عذاب کو بعجلت مانگ رہے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ ہمارے اوپر آسمان سے پتھر برسا دو، کبھی کہتے کہ جس عذاب سے ڈراتے ہو اسے لاؤ اور یہ عذاب کب آئے گا۔ لیکن جب عذاب آگیا تو ان کا حال یہ ہے کہ وہ مہلت مانگتے ہیں۔ فا کا فعل مقدر پر عطف ہے۔ یعنی ان کا یہ حال ہے کہ ادھر تو عذاب مانگتے ہیں۔ جب آگیا تو مہلت چاہتے ہیں۔ ان کے دونوں طریقوں میں منافات ہے جیسا کہ مخفی نہیں۔

تفسیر صوفیانہ تاویلاتِ نجمیہ میں ہے کہ ان کا عذاب بعجلت مانگنا عذاب بھیجنے کا سبب ہے اگر وہ عذاب کے مستحق نہ ہوتے تو وہ بعجلت عذاب کا مطالبہ نہ کرتے۔

تفسیر عالمانہ اَفَرَءَیۡتَ ھل نحن منظرون سے متعلق ہے ان کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ اس میں انہیں زجر و توبیخ کی گئی ہے جیسے کہ وہ اس کے مستحق تھے اسی استحقاق پر انھیں ڈانٹ پلائی گئی۔

ف : چونکہ رویت اخبار بالشئ کے متعلق اقویٰ و اظہر اسباب سے ہے۔ اسی لیے اس کا عام استعمال اخبار کے معنی میں آتا ہے۔

اب معنیٰ یہ ہے کہ مجھے خبر دے اے وہ مخاطب جو اس خطاب کی اہلیت رکھتا ہے اِنۡ مَّتَّعۡنٰھُمۡ اگر ہم مشرکین کو تمتع و نفع اٹھانے والا بنا دیں سِنِیۡنَ ۝ کئی سال یعنی دنیا میں ایک عرصہ تک انھیں اچھے عیش دیں اور مہلت دے کر انھیں عذاب میں مبتلا نہ کریں۔

ف : کلبی نے کہا اس سے ان کی تمام عمر مراد ہے۔ عطاؒ نے کہا اس سے دنیا کی ابتدا تا انتہا مراد ہے۔

ثُمَّ جَآءَھُمۡ مَّا کَانُوۡا یُوۡعَدُوۡنَ ۝ پھر ان کے ہاں وہ آئے جس سے وہ ڈرائے جاتے تھے یعنی عذاب۔ الایعاد بمعنے تخویف یعنی ڈرانا۔ مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡھُمۡ مَّا کَانُوۡا یُمَتَّعُوۡنَ ۝ تو انہیں اس عذاب سے نہ بچائے گا وہ جو نفع پاتے تھے۔ یعنی ان کی طویل عمر تک دنیوی عیش و عشرت انھیں عذابِ الٰہی سے نہ بچا سکے گا نہ ہی اس میں تخفیف ہو سکے گی۔

ف : اغنیٰ کا مفعول محذوف ہے اس کا فاعل ما کانوا یمتعون ہے۔ یا دراصل ای شئ اغنیٰ عنھم کونہم ممتعین ذٰلك التمتیع علی المؤبد تھا۔ یعنی کون سی شے ہے جو انہیں طویل مدت عیش و عشرت میں زندگی بسر کرنے کے باوجود عذابِ الٰہی سے بچائے۔

ف : ما کانوا یمتعون ہیں ما مصدریہ یا متاع سے دنیوی عیش و عشرت مراد ہو اس وقت ما موصولہ ہوگا اس کا عائد محذوف ہے اور اغنیٰ کا مفعول مقدم ہے اور استفہام نفی کا ہے اور ما کانوا اس کا فاعل ہے۔ یہی پہلے معنیٰ سے اولیٰ ہے کیونکہ استخبار (طلب خبر) کے موافق ہے۔ اور بلیغ ترین وجہ سے انتفاء اغناء پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس طرح سے ہر مخاطب خبر دے سکتا ہے کہ ان کو طویل مدت تک دنیوی منافع حاصل کرنا عذابِ الٰہی سے نہ بچا سکا اور کوئی شے بھی فائدہ مند نہ ہوئی ان کے سوا کوئی اس طرح کی خبر دینے پر قدرت نہیں رکھتا۔

حکایت میمون بن مہران حضرت حسن بصری (رحمہ اللہ تعالیٰ) کو طواف کرتے وقت ملے عرض کی مجھے نصیحت فرمایئے آپ نے یہی آیت پڑھی۔ اس نے کہا آپ نے خوب فرمایا بہترین نصیحت ہے۔

حکایت حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تخت پر بیٹھتے وقت روزانہ یہی آیت پڑھتے تھے ؎

۱ جہاں بے وفائیست مردم فریب
کہ از دل رباید قد او شکیب

۲ نکرتا بجاہش نگردی اسیر
نگردی پے مالش اندر زحیر

۳ کہ آندم کہ مردک اندر آید ز راہ
نہ مالت کند دستگیری نہ جاہ

ترجمہ :(۱) جہان بے وفا اور فریب دینے والا ہے دل سے صبر وغیرہ چھین لیتا ہے۔
(۲) خبردار اس کے ظاہری مرتبہ سے قیدی نہ ہوجانا اس کے مال کی وجہ سے دل کو خیر و بھلائی سے نہ پھیرلینا۔
(۳) جب تیرے سرپر موت آئے گی نہ تیرا مال تیری مدد کرے گا نہ مرتبہ۔

سبق حضرت یحیٰی بن معاذ رحمہ اللہ نے فرمایا : وہ بدترین غفلت میں مبتلا ہے جو اپنی حیاتِ فانی کے دھوکا میں ہے اور زندگی کے عیش وعشرت کی لذت میں پھنسا ہے۔

حکایت ہارون الرشید نے کسی کو قید کردیا ایک دن قیدی نے پیغام بھجوایا تیرے لذت کے ایام اور میرے دکھ کے دن گزرتے جارہے ہیں ابھی قیامت آئے گی اور پل صراط سے گزرنا ہے وہاں حاکم صرف اللہ تعالیٰ ہے ۔ یہ سن کر ہارون الرشید بے ہوش ہوکر گر پڑا، جب ہوش آیا تو فرمایا : اس قیدی کو چھوڑدو۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اور ہم تباہ شدہ شہروں میں سے کوئی شہر تباہ نہیں کیا اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ۝ مگر اس کے لیے ڈرانے والے بھیجے جنھوں نے انھیں خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا۔
ف : منذرون جمع کے صیغے سے اس علاقہ کے نبی علیہ السلام اور ان کے معاونین مراد ہیں (کما فی کشف الاسرار)
ذِكْرٰى نصیحت و پند اور اتمام حجت کے لیے یہ محلاً منصوب علی العلۃ ہے وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ اور ہم ظالم نہیں کہ ہم غیر ظالمین کو تباہ کرڈالیں۔
ف : قبل از انذار تباہ نہ کرنے سے ظلم کی نفی کی گئی ہے حالانکہ یہ ظلم نہیں، جیسا کہ اہلسنت کا مذہب ہے صرف تنزیہ و تقدیس پر کہ اس ذات سے ظلم کا تصور بھی محال ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ وما اھلکنا من قریۃ میں قریہ سے اہلِ قریہ مراد ہیں اس سے جسدِ انسانی اور اس کے اہل سے نفس وقلب وروح۔ اور اھلاك ان کا مامورات کے ترک و اتیان المنہیات سے استعداد فطری کو ضائع کرنا مراد ہے۔ الا لہا منذ رون ہم کسی بستی کو تباہ نہیں کرتے مگر ان کے الہاماتِ ربانیہ کے ساتھ ڈرانے والے ذکریٰ اپنے پروردگار کو یاد کرنے کے لیے۔ کما قال تعالیٰ:

ونفس وما سواھا فالھمھا فجورھا وتقواھا۔

(قسم ہے نفس اور اس ذات کی جس نے انہیں برابر بنایا اور اسے فجور و تقویٰ الہام کیا)

وما کنا ظلمین اور ہم ظلم کرنے والے نہیں کہ عذاب کو غیر محل میں نہیں رکھتے یا رحمت کو غیر محل میں نازل فرمائیں۔

تفسیر عالمانہ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ○ تنزل بمعنے شے کا جستہ جستہ نازل ہونا، اور باء تعدیہ کی ہے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ قرآن مجید کو شیاطین نازل نہیں کرتے یا باء ملابست کی ہے اب معنیٰ یہ ہُوا کہ قرآن کو شیاطین لے کر نہیں آتے۔

شانِ نزول مقاتل نے کہا کہ مشرکینِ قریش نے کہا کہ رسول خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کاہن ہیں اور ان کے ہاں جن آتا ہے اور جس قرآن کے متعلق وہ مدعی ہیں کہ وُہ کلام خدا ہے یہ اسی جن کا بتایا ہُوا کلام ہے جو انہیں آکر سناتا ہے جیسے کاہن کو جن آکر بتاتے تھے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہر کاہن کے ساتھ ایک جن ہوتا تھا جسے وُہ آسمان کی خبریں اور دوزخ کی باتیں بتاتا سکھاتا تھا مشرکین نے سمجھا کہ شاید قرآن مجید بھی اسی قسم سے ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس غلط اور جھوٹے تصوّر کا ردّ فرمایا کہ وما تنزلت بہ الشیاطین اور اسے شیاطین نہیں بلکہ رُوح الامین لے کر آیا ہے۔

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ اور ان کے لیے کوئی جواز نہیں کہ وہ آسمان سے قرآن لائیں وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ○ اور نہ وہ اس قسم کی کوئی طاقت و قدرت رکھتے ہیں اِنَّهُمْ بیشک رسولِ اکرم حبیبِ محتشم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پاک کے بعد عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ○ وہ ملائکہ کے کلام کو سننے سے رد کیے گئے ہیں جبکہ اس سے قبل انہیں کچھ نہ کچھ ممکن تھا کیونکہ اب انہیں چنگاریوں سے رجم کیا جاتا ہے اور انہیں آسمان پر چڑھنے نہیں دیا جاتا۔

ف: بعض اہلِ تفاسیر نے فرمایا کہ انہیں ملائکہ کا کلام سننے سے اس لیے روکا گیا کہ ان میں صفات ذات کی مشارکت بہ ملائکہ نہیں ہے یعنی یہ ملائکہ کی طرح انوارِ حق کے فیضان قبول کرنے اور صور علوم ربانیہ و معارف نورانیہ کو دلوں پر منقش کرنے کی استعداد نہیں رکھتے اور یہ صفات ہوں بھی کیوں جبکہ ان کے نفوس خبیثہ ظلمانیہ شریرہ بالذات ہیں انہیں فیضانِ حق کے قبول کرنے کا کیا معنی، بلکہ ان میں تو ان امور کو قبول کرنے کی استعداد رکھی گئی ہے جن میں خیر و بھلائی کا نشان تک نہ ہو بلکہ وہ سراسر شر ہی شر ہیں والقران مشتمل علیٰ حقایق و مغیبات (اور قرآن حقائق و

مغیبات پر مشتمل ہے) اور یہ امور ملائکہ کرام سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔

تفسیر صُوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ شیاطین کو قرآن پاک نازل کرنے کی استعداد نہیں اور نہ اسے اٹھانے کی قوت ہے اور نہ سمجھنے کی، اس لیے کہ وُہ آگ سے پیدا کئے گئے اور قرآن نور قدیم ہے اس معنیٰ پر آگ کو نور قدیم کو اٹھانے کا کیا معنیٰ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ دوزخ اہلِ ایمان کے ورود پر فریادی ہوگی۔

جزیامومن فقد اطفأ نورک لھبی۔

(اسے مومن! جلدی سے گزر جا اس لیے کہ تیرا نور میری آگ بجھا رہا ہے)

جب ان کو قرآن کو اٹھانے اور سننے کی استعداد نہیں تو پھر وُہ اسے نازل کیسے کر سکتے ہیں اگرچہ وہ اسے سُن بھی لیں لیکن ان میں ایسا ادراک فہم نہیں جو وہ دعوتِ اسلام کو قبول کرلیں اسی لیے وہ عذاب کے مستحق ٹھہرے

ف: بعض اکابر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے محروم لوگوں کے متعلق فرمایا ہے کہ ان کے کانوں اور آنکھوں اور قلوب پر غفلت کا پردہ ہے کہ وُہ قرآن کو نہیں سُن سکتے ورنہ حقیقۃً سمع قلبی عقلی غیبی رُوحی جسے نصیب ہے وہ اکوان میں ہر صوت و ہر حرکت سے ہر لمحہ خطاب حق سبحانہٗ و تعالیٰ سُنتا ہے پھر اس کا دل و دماغ اور روح اس کی طرف مشتاق رہتا ہے۔ خوش بخت ہیں وُہ لوگ جو قرآن فہمی اللہ تعالیٰ سے پاتے ہیں اور شریعۃً و حقیقۃً عمل امانت حق تعالیٰ کی استعداد رکھتے ہیں وہی توفیق بخشتا ہے اور وہی توفیق سے محروم رکھنے والا ہے۔ اے سننے والو! سمجھو۔ اے ادراک رکھنے والو! اس پہ مضبوط رہو۔ اس لیے کہ علم صدور و قلوب میں ہے نہ کہ حواس کے انداز اور تخمین و قیاس سے۔

تفسیر عالمانہ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ جب تم نے اے حبیب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم! کفار کا حال معلوم کر لیا تو تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کی عبادت نہ کیجئے، فَتَكُوْنَ اگر تم (بفرضِ محال) غیر اللہ کی پرستش کرو گے تو ہو جاؤ گے مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ۝ معذب قوم سے۔

سوال: حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم ہیں تو پھر ان کو غیر اللہ کی پرستش سے منع کرنے کا کیا معنیٰ؟

جواب(۱): آپ کی عزیمت پر مزید پختگی اور اخلاص میں مزید استحکام۔

(۲) مکلفین پر لطف و کرم کرتے ہوئے نصیحت فرمائی کہ جب ایسی ذات کو غیر اللہ کی پرستش سے روکا جا رہا ہے کہ ان سے ایسے قبیح فعل کا صدور محال ہے تو پھر تم کون لگتے ہو کہ تم کو نہ روکا جائے اور پھر اگر ایسی ذات بفرضِ محال ایسا فعل سرزد ہو تو بھی ہم عذاب دینے سے نہیں ٹلتے تو پھر تم خود سوچو کہ تمہارا کیا حال ہوگا۔

وحیِ نبی علیہ السلام کا حال مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے کسی نبی یعنی ارمیا علیہ السلام کے ہاں وحی بھیجی کہ وہ اپنی قوم کو کہہ دیں کہ وہ گناہوں سے باز آجائیں ورنہ میں انہیں عذاب میں مبتلا کر دوں گا - نبی علیہ السلام نے عرض کی : یا اللہ ! وہ تو تیرے پیغمبروں ابراہیم ، اسحٰق ، یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں کیا ان پر بھی عذاب بھیجے گا - اللہ تعالیٰ نے فرمایا : میں نے انبیاء علیہم السلام کو اسی لیے مکرم بنایا کہ انہوں نے میری اطاعت کی - اگر وہ بھی میری نافرمانی کرتے تو میں انہیں بھی عذاب میں مبتلا کر دیتا خواہ میرے خلیل بھی ہوں -

تفسیرِ صُوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ دنیا و آخرت میں غیر اللہ کی پرستش اور توجہ قلب سے غیر اللہ کی طلب عذاب الٰہی کو دعوت دینا ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے بعید ہونے کا سبب ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے غیر کا طالب ہے اسے سخت ترین عذاب میں مبتلا کیا جائے گا - اس لیے کہ جو کسی کا طالب ہوتا ہے وہ اپنے مطلوب کے قریب اور ما سوا سے بعید کیا جاتا ہے - یہی وجہ ہے کہ طالبِ دنیا دنیا کے قریب اور آخرت سے دُور ہوتا ہے اور آخرت کا طالب آخرت کے قریب اور اللہ تعالیٰ سے بعید ہوتا ہے - اسی لیے حضرت ابو سعید الخراز نے فرمایا :

حسنات الابرار سیآت المقربین فالابرار اھل الجنۃ وحسناتھم طلب الجنۃ والمقربون اھل اللہ وحسناتھم طلب اللہ وحدہٗ لاشریک لہ -

(ابرار کی حسنات مقربین کی سیئات ہیں اس معنی پر ابرار اہلِ جنۃ اور ان کی حسنات طلب الجنۃ ہیں اور مقربین اہل اللہ ہیں اور ان کی حسنات طلب اللہ وحدہٗ لاشریک ہیں)

تفسیرِ عالمانہ وَاَنْذِرْ اور اس عذاب سے ڈرائیے جو شرک و کفر کی وجہ سے ہو گا عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ اپنے زیادہ قریبی رشتہ داروں کو -

حلِ لغات عشیرۃ انسان کے وہ رشتہ دار جن سے وہ کسی شمار میں آسکے یعنی ان کی وجہ سے وہ بمنزلہ کامل عدد کے ہو جائے وہ اس لیے کہ عشرہ کامل عدد ہے لیکن مشہور یہ ہے کہ عشیرہ سے انسان کا وہ قبیلہ مراد ہے جو انسان کے قریبی رشتہ دار ہوں اور وہ ان کی وجہ سے کثیر التعداد سمجھا جائے - اور العشیر وہ لوگ جو کسی معاشرہ کے شریک ہوں وہ قریبی رشتہ دار ہوں یا بعیدی - (کذا فی المفردات) یہاں پر بنو ہاشم و بنو عبد المطلب مراد ہیں -

ف : ان کے ڈرانے کا حکم اس لیے ہے کہ معاشرہ میں انسان کے لیے یہی لوگ مہتم بالشان متصور ہوتے ہیں - تو پھر انذار میں بھی ان سے ابتداء بہتر ہے - جیسے احسان و مروّت اور صلہ رحمی میں یہی سب سے اولیٰ و اوّل

ہوتے ہیں۔

ف : اس آیت کی نظیر آیت یا ایہا الذین اٰمنوا قاتلوا الذین یلونکم ہے۔ یعنی اے ایمان والو! ان سے جنگ کرو جو تمہارے قریب ہیں حالانکہ اہلِ اسلام کو جنگ کرنے کا حکم تو تمام کافروں کے لیے تھا لیکن ان میں سب سے پہلے ان کے قریبی رشتہ داروں کو اولیت دی گئی۔ ایسے ہی انذار کو سمجھیے (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انذار کا حکم تو سب کے لیے ہے۔ لیکن سب سے پہلے رشتہ داروں کو انذار فرمائیں۔ تبلیغی جماعت دیوبندی کے سربراہوں کو آنکھ کھولنی چاہیے کہ وہ جن کو پھانس کر چلّے کرا رہے ہیں اور تبلیغ کے پھیرے لگوا رہے ہیں ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ میاں تبلیغ پر ہیں تو بیوی سینما کی زینت۔ بیٹا تبلیغ پر ہے تو بوڑھے ماں باپ گھر میں پیاس کے مارے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ بہرحال تبلیغِ دین کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اُن کی تبلیغ دینی تو ہے نہیں بلکہ اندرونِ خانہ عزائم کچھ اور ہیں۔ پھر وہ اصولِ تبلیغ کو کیا جانیں۔ افسوس تو عوام الناس پر ہے جو ان کی چکنی چپڑی باتوں کے جال میں پھنستے چلے جا رہے ہیں۔ عوام سے التجا ہے کہ وہ تبلیغی جماعت (دیوبندی) کے چکر میں نہ آئیں)[1]

نکتہ : جب قریبی لوگوں کو انذار ضروری ہے تو پھر بعیدی اور رشتہ داروں کے علاوہ اور لوگ بطریقِ اولیٰ انذار کے مستحق ہیں۔

روایت مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا پہاڑی پر چڑھ کر اپنی قوم کے ہر قبیلہ کا علیٰحدہ علیٰحدہ نام پکارا تمام لوگ اکٹھے ہو گئے آپ نے انہیں فرمایا کہ اگر میں تمہیں کہوں کہ اس پہاڑ کی اوٹ میں بہت بڑی جماعت ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ سب نے کہا، ہاں۔ آپ نے فرمایا: میں تمہیں آنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں۔

روایت حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا: اے بنی ہاشم، اے بنی عبد مناف!! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ میں تمہارے کام نہ آؤں گا۔

پھر فرمایا: اے عائشہ بنت ابی بکر، اے حفصہ بنت عمر، اے فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اے صفیہ عمۃ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ میں تمہارے کسی کام نہیں آؤں گا۔

خبر میں ہے کہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رو کر عرض کیا کہ "آپ

---

[1] اضافہ از اویسی غفرلہٗ

قیامت میں ہمارے کام نہیں آئیں گے ؟ آپ نے فرمایا : ہاں ۔

اس کے بعد فرمایا :

" اے عائشہ ! تین مقامات ایسے ہیں جہاں میں تمہارے کام نہیں آؤں گا ۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا :

(۱) ونضع الموازین القسط لیوم القیامة ۔

(ہم قیامت میں انصاف کا ترازو رکھیں گے)

(۲) جب اللہ تعالیٰ نور روشن فرمائے گا جسے چاہے گا اس وقت نور عطا فرمائے گا جسے چاہے گا ظلمات میں اوندھا کر دے گا ۔

(۳) پلصراط ، جسے چاہے گا صحیح وسالم اس پل سے گزار دے گا جسے چاہے گا اوندھا لٹکا دے گا ۔

سبق اس سے اہلِ ایمان کو نصیحت ہے کہ شرافتِ انساب سے کوئی دھوکا نہ کھائے کیونکہ ایمان کے بغیر نسب کوئی فائدہ نہ دے گا ۔ کنعان بن نوح علیہ السلام کو دیکھئے یا آزر ابراہیم علیہ السلام کے اب یعنی چچا کو دیکھیے ۔ عبرت کے لیے یہ دو مثالیں کافی ہیں ۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا :

چوں کنعان را طبیعت بے ہنر بود
پیمبر زادگی قدرش نیفزود

ہنر بنماے اگر داری نہ گوہر
گل از خارست و ابراہیم از آزر

ترجمہ : جیسے کنعان کہ اس کی طبیعت بے ہنر تھی پیغمبر کی اولاد ہونا اس کی قدر بڑھا نہ سکا ۔ ہنر دکھا اگر تیرے پاس ہے گوہر کی ضرورت نہیں ورنہ گل کانٹوں سے اور ابراہیم آزر سے ۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ یہ فلا انساب بینھم یومئذ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا :

کل حسب ونسب ینقطع الا حسبی ونسبی ۔

(ہر حسب ونسب منقطع ہو جائے گا سوائے میرے حسب ونسب کے)

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو ایمان وتقویٰ لازم ہے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

آلی کل مومن تقی ۔

(ہر متقی مومن میری آل ہے)

نیز اس میں اشارہ ہے کہ اگر کسی کے دل کا دیا ایمان سے روشن ہے تو ضروری نہیں کہ اس کے قریبی رشتہ دار کے دل کا دیا بھی روشن ہو جب تک کہ وہ روشن دل والے دئیے سے نور حاصل نہ کرے۔ اس لیے نبی علیہ السلام کی اتباع اور ولی کی اقتدا ضروری ہے۔ اور حضور علیہ السلام نے بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا:

اے فاطمہ بنتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! اپنے آپ کو آگ سے بچائیں تجھے کوئی فائدہ نہ دوں گا۔
وہ بھی اسی معنیٰ کی طرف اشارہ کرتا ہے یہ ایسے ہے جیسے کوئی پیٹ میں نہ جائے گا جب تک وہ خود نہ کھائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرابت اور رشتہ داری مفید نہیں اور نہ ہی ان کی ان کے متعلق شفاعت ہوگی (اگر وہ کافر ومشرک ہوں) کیونکہ اصل میں ایمان ضروری ہے اور اعمال بمنزلہ شاخوں کے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے وانذر عشیرتك الاقربین کے بعد فرمایا:

تفسیر عالمانہ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۝ ان کے لیے نرمی کیجئے اور انہیں اپنی صحبت میں لائیے اور ان کی غلطیوں سے درگزر فرمائیے ان کے بُرے احوال سے چشم پوشی فرما کر ان کے ساتھ اچھے اخلاق کا برتاؤ کیجئے۔ اگر وہ محروم رکھیں تو انہیں عطیات سے نوازیں اگر وہ تم پر ظلم کریں تجاوز کریں اگر وہ تمہارے حقوق میں کوتاہی کریں تو انھیں معاف کر دیجئے بلکہ ان کے لیے بخشش مانگئے۔ اور رشتہ داروں کے ساتھ عاجزی و تواضع اور انکساری سے پیش آئیے یعنی مہربان بن جائیے اور زیادہ سے زیادہ ان کی عزت وتکریم کیجئے۔

حلِ لغات: الخفض رفع کی نقیض اور اونٹ کی نرم سیر کو بھی کہتے ہیں اس میں نرمیٔ قلب اور انقیاد کی ترغیب ہے۔ (المفردات) وجناح العسکر بمعنے لشکر کی دو جانبیں۔ یہ خفض الطائر جناحه سے مستعار ہے یعنی پرندے نے پر نرم کیے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب اوپر سے نیچے کا ارادہ کیا جائے۔ اقارب واجانب (اپنے پرائے) کے ملتے وقت نرمی اور تواضع وانکساری کو پروں کے نرم کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

ف: منافق وفاسق کے ساتھ نرمی اور تواضع کی ضرورت نہیں ہاں بعض اوقات واحوال میں جائز ہے کیونکہ نرم وسختی کا بھی وقت ہوتا ہے جیسا کہ قرآن دلالت کرتا ہے اسی لیے لازم ہے کہ دونوں کے اوقات کی رعایت کی جائے مِن تبیینہ ہے کیونکہ مطلق اتباع اور ہے دین اور اسلام کی اتباع اور یا من تبعیضیہ ہے۔ اس وقت مؤمن سے وہ لوگ مراد ہیں جو ایمان کی طرف متوجہ ہوں اور صرف زبان سے تصدیق کرتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ واخفض جناحك لمن اتبعك الخ میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ ہر تابعدار مومن ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر مومن تابعدار ہو تاکہ مومن ایمان لا کر دھوکا نہ کھائے اس لئے مومن حقیقت سے ناآشنا رہتا ہے جب تک اتباع نہ کرے۔

سبق عاقل پر لازم ہے کہ وُہ بزرگوں کی صحبت اختیار کرے اور ان کے اعمال وکردار کی اتباع کرے ان کے اخلاق واحوال کی تحصیل میں سعی کرے کیا دیکھتے نہیں ہو کہ نیک لوگوں کی صحبت میں حیوانات تک بہشت کے مستحق بن گئے۔ اصحابِ کہف کے کُتے کا حال دیکھئے۔ شاعر کا بھلا ہو کیا خُوب فرمایا : ؎

سگِ اصحابِ کہف روزے چند
پے نیکاں گرفت مردم شد

ترجمہ : اصحابِ کہف کے کتے کو دیکھئے کہ چند روز نیک لوگوں کے قدموں پر گرا تو آدمی ہوگیا۔

ف : اصحابِ کہف کا کُتا مینڈھے کی شکل میں بہشت میں جائے گا۔[1]

تفسیرِ عالمانہ فَاِنْ عَصَوْكَ۔ **شانِ نزول** : کشف الاسرار میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں نے جب آپ سے عداوت ومخالفت اور زبان درازی کی تو نازل ہُوئی فان عصوك پس اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں یعنی تمہاری برادری کے لوگ اگر تمہاری طاعت سے نکل جائیں اور مخالفت کرکے تمہاری اتباع نہ کریں فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ○ تو فرمائیے میں بیزار ہُوں اس سے جو عمل تم کرتے ہو یعنی تمہاری بُت پرستی جیسے بدعمل سے میں بیزار ہُوں۔ تاہم ان سے علیحدگی اختیار نہ کیجئے بلکہ آپ انھیں وعظ ونصیحت کے طور اچھی اچھی باتیں سُنائیں پھر امید کریں کہ شاید وہ تمہاری طاعت کی طرف آجائیں اور تمہاری دعوت قبول کرلیں۔

ف : فقیر (صاحبِ رُوح البیان) کہتا ہے کہ میں نے اپنے شیخ ومرشد قدس سرہٗ کو یہ فرماتے ہُوئے سُنا کہ میرا اور میرے خلفاء کا ہر طرح کا تعلق ختم ہے سوائے وصیت کے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔

وصیت بالحق تو ہو چکی اب مجھے صبر سے کام لینا ہے کہ ان سب کے حق میں صبر کروں۔

وَتَوَكَّلْ اور تم اپنے جملہ حالات میں بھروسا کرو عَلَى الْعَزِیْزِ اس غالب ذات پر جو کسی کے ذلیل کرنے سے کمزور ہوتی ہے اور نہ کسی کی دشمنی سے اسے کمی ہوتی ہے بلکہ وہ اپنے دشمنوں پر قہر وجبر پر قدرت رکھتا ہے الرَّحِیْمِ○ رحیم ہے ان لوگوں پر جو اس پر بھروسا کرتے ہیں اور جو اپنے جملہ امور اسی کے سپرد کرتے ہیں ان کی فتح ونصرت فرماتا ہے کیونکہ اپنے اولیاء کی ہمیشہ مدد فرماتا رہتا ہے۔ وہ خود کسی پر بھروسا نہیں کرتا صرف وہی دشمنوں کے سر کچلنے والا ہے اور کسی کو اس جیسی قدرت نہیں اسی لیے جملہ امور میں صرف اسی پر

---

[1] روح البیان ج ۶ ص ۳۱۲

بھروسا کیجئے اور غیروں کا سہارا ترک کیجئے اور جملہ عالم سے رُوگردانی فرمائیے سوائے اس کے خاص محبوبوں کے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو انھیں کے ساتھیوں سے بنائے (آمین)۔

الَّذِیْ یَرٰىكَ وُہ ذات جو تجھے دیکھتی ہے کیونکہ اس کا دیکھنا اس کی رحمت کے لیے بمنزلہ سبب کے ہے یعنی اس پر توکل کیجئے جو تمہیں دیکھتا ہے حِیْنَ تَقُوْمُ ○ جب تم آدھی رات کے وقت تہجدؔ کے لیے اُٹھتے ہو

سوال: تم نے تقوم کے عموم سے خاص نمازِ تہجد کا معنیٰ کہاں سے نکال لیا؟

جواب: قاعدہ ہے عرف شرع میں قیام کا اطلاق اس نماز پر ہوتا ہے جو رات کو اٹھ کر ادا کی جائے اور وہ تہجدّ ہے۔

فضائلِ تہجّد تہجد کے فضائل مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) حدیث شریف میں ہے:

افضل الصلاۃ بعد الفریضۃ صلاۃ اللیل۔

(فرائض کے بعد افضل نماز تہجد ہے)

(۲) بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی تہجد قضا نہیں فرماتے تھے، بیمار:

لہ تہجد بہترین عبادت ہے۔ کسی شاعر نے اشعار میں اس کے فضائل بیان کئے ہیں: ؎

پائے ساقی پہ گرا دیتی ہے — رُوح کو نشہ پلا دیتی ہے
تن کے آنگن میں تڑپنے والی — جان کو جامِ شفا دیتی ہے
خاک پر جھکتے ہوئے ماتھے کو — طلعتِ عرشِ عُلا دیتی ہے
شکر مستوں کو بہ ہنگامِ سجود — جُھوم کر حُسنِ رضا دیتی ہے
سانولی رات کے آواروں کو — کُوئے جاناں کا پتا دیتی ہے
چند اُکھڑی ہُوئی سانسوں کے عوض — عمرِ یاراں کو بقا دیتی ہے
دل کی دُنیا کو حسیں رحمت کی — پاک مہندی میں رچا دیتی ہے
دے کے البیلی دُعاؤں کا نور — ہاتھ کو چاند بنا دیتی ہے
گدگداتی ہے مشیّت کو بھی — شاہِ خُوباں کو ہنسا دیتی ہے

ریشمیں نیند کے متوالوں کی
آنکھ یزداں سے لڑا دیتی ہے

اویسی غفرلہٗ

اور دیگر عارضہ کے وقت بیٹھ کر ادا فرماتے تھے۔

(۳) حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بیماری کی تکلیف وغیرہ سے اگر رات کو تہجد نہ پڑھ سکتے تو دن کو بارہ رکعت قضا کے طور پڑھا کرتے (تاکہ امت کو قضائے تہجد کا طریقہ معلوم ہو جائے) رواہ مسلم۔

ف : فقیر (صاحبِ روح البیان رحمہ اللہ) کہتا ہے کہ تہجد کا دن کو قضا کرنا اس کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ دیگر تمام نوافل سے افضل ہے کیونکہ نوافل کی قضا نہیں۔

● وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ اور تمہارا سجدہ گزار لوگوں میں چلنا پھرنا یعنی تمہارا پروردگار تمہیں اس وقت دیکھتا ہے جب تم تہجد گزار لوگوں کے تفحصِ احوال کے لیے چلتے پھرتے ہو تاکہ معلوم کر سکو کہ کون تہجد پڑھتا ہے اور کون نہیں۔

تہجّد کا حکم منسوخ یہ اس وقت ہے جب آپ پر تہجّد فرض تھی ایسے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر، پھر بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ یہی اصح ہے (لیکن اس کا استحباب باقی ہے)

تہجّد کی فرضیّت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام پر تہجد فرض ہے اسی لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) رات کے وقت اٹھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گھروں میں پہنچ جاتے تاکہ معلوم کر سکیں کہ کس نے تہجد پڑھی اور کس نے نہیں۔ پھر یہ حکم شبِ معراج پانچ نمازوں سے منسوخ ہوا۔

نکتہ : آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تشریف لے جا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات سے آگاہی حاصل کرنا دلالت کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کے لیے عبادت کے متعلق کتنا ذوق رکھتے تھے۔

لطیفہ مروی ہے کہ تہجّد کی ادائیگی میں صحابہ کرام کے ذکرِ الٰہی اور تلاوتِ کلامِ الٰہی کی آواز سے ایسے معلوم ہوتا کہ گویا ان کے گھروں میں بھڑ شور کر رہے ہیں۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری گفتگو اور اپنے تمام بندوں کی دُعاؤں کو اور مناجاۃ الاسرار کو سُنتا ہے الْعَلِيْمُ○ اور تمہاری نیّات اور مصالح ضمائر کے اسرار کو جانتا ہے۔

● بعض مفسرین نے کہا اس سے وُہ پھرنا مراد ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نمازیوں میں امامت کے وقت بحالتِ سجود و رکوع و قعود متحرک ہوتے تھے۔ اس تقریر پر السّاجدین بمعنے المصلین مع الجماعۃ ہے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ وُہ ذات تمہیں دیکھتی ہے جب اکیلے نماز پڑھ رہے ہوتے اور اس وقت جب تم نمازیوں کی امامت کرا رہے ہوتے ہو۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ الذی یرٰلک حین تقوم وہ ذات تمہارے اس قصد اور نیت اور عزیمت کو دیکھتی ہے جب تم اپنے جملہ امور کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہو شہود الحق کا مسئلہ اس آیت سے ثابت کیا گیا ہے کہ جب انسان تصور کرے گا کہ وہ کریم مجھے ہر وقت دیکھتا ہے تو پھر میں گناہ کیوں کروں اور وہ خیال کرے گا کہ میں ہر معاملہ میں اس ذات کے سامنے ہوں تو پھر عبادت بھی آسان ہو جائے گی کیونکہ محبوب کے سامنے بہت بڑے مشقت بھرے امور بھی آسان ہو جاتے ہیں بلکہ اس وقت پہاڑ سر پر رکھ دیئے جائیں تب بھی محسوس نہ ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نگاہِ حق میں اور کب سے بعض مفسرین نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

کنت بمرأی منا حین تقلبك فی عالم الارواح فی الساجدین بان خلقنا روح کل ساجد من روحك انه هو السمیع فی الازل مقالتك انا سید ولد آدم ولا فخرلان ارواحهم خلقت من روحك العلیم باستحقاقك لهذه الکرامة انتهی۔
(روح البیان ج ۶ ص ۳۱۳)

(عالمِ ارواح میں تم ساجدین میرے سامنے ہو کیونکہ ہم نے ہر روح کو تمہاری روح سے پیدا کیا وہ اللہ تیری بات ازل میں سن رہا تھا جب تم کہو گے کہ جملہ اولادِ آدم کا سردار ہوں اور اس پر میں فخر نہیں کرتا، وہ اس لیے کہ جملہ ارواح تیری رُوح سے پیدا کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم ہی اس بزرگی و شرافت کے مستحق ہو)

انبیاءُ زادہ علیٰ نبیّنا وعلیہم الصّلوٰۃ والسلام حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ میں تمہیں دیکھ رہا تھا کہ تم ایک نبی علیہ السلام سے منتقل ہو کر دوسرے نبی علیہ السلام کی پشت میں تشریف لے جاتے۔ یعنی ساجدین سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں کہ آدم علیہ السلام سے لے کر ابراہیم علیہ السلام پھر ان سے منتقل ہوئے یہاں تک کہ انہیں اُمّی نے جنا۔
سوال: حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نسب میں تمام حضرات تو نبی نہ تھے پھر یہ تفسیر کیسے صحیح ہوگی؟
جواب: علی الاطلاق انبیاء کا ہونا مراد ہے نہ یہ کہ جملہ نسب کے لوگ۔

رافضیوں کا استدلال اس آیت سے رافضہ نے استدلال کیا ہے کہ نبی علیہ السلام کے جملہ آباء مومن تھے اس لیے کہ ساجد ہوتا ہی مومن ہے گویا ساجدین بول کر مؤمنین مراد لیا گیا ہے۔ **ف**: یہ استدلال سرسری ہے یعنی تحقیقی نہیں۔

حدیث شریف سے استدلال حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لم ازل انقل من اصلاب الطاھرین الیٰ ارحام الطاھرات۔

(میں اصلابِ طاہرین سے منتقل ہوکر ارحام طاہرات سے تشریف لایا ہوں)

ف: اس حدیث سے بھی استدلال درست نہیں کیونکہ طہارت ایمان پر دلالت نہیں کرتی بلکہ اس سے تو یہ ثابت ہورہا ہے کہ میں نکاح صحیح کے ذریعے دُنیا میں آیا ہُوں اگرچہ وہ نکاح جاہلیت کے تھے۔ (یعنی زنا سے نہیں بلکہ نکاح سے، حلال اولاد کی حیثیت سے)[1]

ف: (اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وسعتِ علمی کے کمال کا اظہار ہے کہ تا آدم اپنے نسب کی صفائی بیان فرمادی اور تم اپنی بھی صفائی نہیں دے سکتے کہ حلالی ہو یا حرامی پھر بھی مقابلے پہ ہو کہ نبوت ہے کیا، بس وہ بڑے بھائی ہیں)[2]

مزید تائید (روافض کے جواب میں ہمارے قول کی تائید اس حدیث شریف سے ہوتی ہے) حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حتی اخرجنی من بین ابوی لم یلتقیا علی سفاح قط۔

(یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر زمانے میں ان والدین سے ظاہر فرمایا جن سے زنا کا ارتکاب ہوا)

ف: اس کے متعلق مختصراً ہم نے پہلے بھی گفتگو کی ہے۔ سورۂ ابراہیم کے آخر میں یہ بحث پڑھ لیں۔

انتباہ: مسلمان پر فرض ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب شریف کے متعلق معمولی سی تنقیص بھی نہ کرے۔ بلکہ جس بات سے عوام کے بہکنے کا خیال ہو اس سے بھی احتراز کرے۔

سوال: تو پھر حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء کے متعلق کیسا عقیدہ ہو۔

جواب: یہ مسئلہ اعتقادیات[3] سے نہیں (بلکہ حسنِ عقیدت سے متعلق ہے۔ عقیدہ اور عقیدت میں فرق ہے)

---

[1] و [2] اضافہ از اویسی غفرلہٗ

[3] اس سے وہابیہ کا اہلسنت پر اعتراض اُٹھ گیا کہ سُنّی لوگ حضور علیہ السلام کے آباء کے بارے میں وہی عقیدہ رکھتے ہیں جو روافض کا ہے۔ وہابیہ کہتے ہیں کہ سُنّی رافضی بھائی بھائی۔ لیکن وہابی کو اگر عقل ہے تو سمجھ گیا ہوگا کہ یہ عقیدہ رافضیوں کا ہے سُنّیوں کا نہیں۔

عقیدہ و عقیدت میں فرق عقیدہ نصِ قطعی سے ثابت ہوتا ہے اس کا منکر کافر ہوتا ہے۔ اور عقیدت روایاتِ ضعیفہ بلکہ آیاتِ قرآنیہ و احادیثِ نبویہ کے (باقی برصفحہ آئندہ)

اس سے قلب یعنی عقیدہ کا کوئی تعلق ہے البتہ زبان سے عقیدت کا اظہار احسن طریقے سے ہو۔ جیسے ہم پہلے بیان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۰) معمولی اشارات سے بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ اس فرق کو نہ سمجھتے ہوئے جاہل وہابی، دیوبندی بلکہ ان کے پڑھے لکھے عالم دین کہلوانے والے اہلسنت کے ہر چھوٹے بڑے مسئلے پر کہہ اٹھتے ہیں کس آیت میں ہے یا کس حدیث میں ہے۔ تجربہ کر لو یہ ان میں عام مرض ہے۔ تو یہ مسئلہ ایمان آباء نبی علیہ السلام بھی منجملہ انہی عقاید یعنی عقیدتوں سے ہے۔ فلہذا اب ہمارا اور روافض کا اتحاد صرف نفس مسئلہ میں ہے اور نفس مسئلہ کے اتحاد سے بھائی بھائی نہیں بن جاتا۔ اس موضوع پر فقیر نے علیحدہ کتاب لکھی ہے اور اسی تفسیر میں پہلے بھی لکھا ہے اور اب بھی لکھنا ہے۔

مسئلہ: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء و اُمّہات حضرت عبداللہ تا حضرت آدم علیہ السلام اور از حضرت حوّا تا حضرت آمنہ رضی اللہ عنہن سب ہی موحد مومن تھے۔ آپ کے سلسلۂ نسب میں کوئی مشرک یا کافر نہیں۔

دلائل از قرآن و حدیث (۱) ولعبدٌ مومن خیر من مشرك۔ (القرآن)
(بیشک مومن غلام بہتر ہے مشرک سے)

یہ مسئلہ قطعی ہے کہ مسلمان چاہے حسب و نسب میں کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو وہ مشرک اعلیٰ قوم و اولیٰ نسب سے بدرجہا بہتر ہے۔

حدیث شریف: حضور نبی کریم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

بعثت من خیر قرون بنی آدم قرناً فقرناً حتی کنت من القرن الذی کنت منه۔

(رواہ البخاری عن ابو ہریرۃ)

(ہر قرن و طبقہ میں تمام قرون کے آدم سے بہتر بھیجا گیا ہوں یہاں تک کہ اس قرن میں ہوا جس سے پیدا ہوا)

اب اس حدیث کو آیۃ مذکورہ سے ملا دیا جائے تو دعویٰ بالکل واضح ہو جائے گا کیونکہ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ "مشرک سے مومن غلام بہتر ہے"۔ اور حضور علیہ السلام کے ارشاد سے پتا چلا ہے کہ "میں خیر قرون سے ہوں"۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ میں (حضور علیہ السلام) ایمان والوں کی پشت سے ہوں۔

حدیث شریف: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لم یزل علیٰ وجه الدهر (الارض) سبعة مسلمین فصاعداً فلولا ذٰلك هلكت الارض و من علیها۔ (اخرجہ عبدالرزاق و ابن منذر بسند صحیح علیٰ شرط الشیخین)

(باقی بر صفحہ آئندہ)

کر چکے ہیں (حاشیہ بھی ملاحظہ ہو)۔ حضرت حافظ سیوطی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۶)

(رُوئے زمین پر ہر زمانے میں کم سے کم سات مسلمان رہے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو زمین و اہلِ زمین سب ہلاک ہو جاتے)

اب ان دونوں حدیثوں کو صغریٰ کبریٰ کے طریق پر ملایا جائے تو نتیجہ (مطلوب) برآمد ہوگا اس لیے کہ اول حدیث میں صاف طور پر فرمایا گیا کہ " میں خیر قرون سے ہوں "۔

دُوسری حدیث نے بتایا کہ رُوئے زمین پر ہمیشہ کم از کم سات مسلمان رہے ہیں۔ اور بمقتضا سے آیہ مذکورہ مومن خیر من مشرک سے یہ نتیجہ نکلا کہ حضور علیہ السلام کا نور ہمیشہ خیر سے خیر کی طرف منتقل ہوتا رہا اور چونکہ خیر مومن ہے مشرک و کافر نہیں اس لیے حضور علیہ السلام کا سلسلۂ نسب مومنین سے ہے مشرکین سے نہیں۔

کبریٰ واضح ہے صغریٰ پر دلیل، جس کی طرف امام جلیل جلال الدین سیوطی نے اشارہ فرمایا کہ والمعنیٰ ان الکافر لا یستاھل شرعاً ان یطلق انہ من خیر القرون۔ یعنی شرعاً کافر ہرگز اس کا اہل نہیں ہو سکتا کہ وہ خیر قرون سے ہو۔ خیر قرون مومن ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصول سب مومن ہی قرار پائے۔

(۲) انما المشرکون نجسٌ۔ (القرآن)

(کافر تو ناپاک ہی ہیں)

حدیث شریف: حضور نبی کریم علیہ السلام کا ارشاد ہے:

لم ازل انقل من اصلاب الطاھرین الیٰ ارحام الطاھرات۔ (رواہ ابونعیم فی دلائل النبوۃ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما)

(میں ہمیشہ پاک مردوں کی پشتوں سے پاک بیبیوں کے پیٹوں کی طرف منتقل ہوتا رہا)

اب مندرجہ بالا آیت و حدیث کو آپس میں ملایا جائے تو مطلب بالکل واضح ہو جائے گا کیونکہ قرآن عظیم الشان نے بلا شبہ مشرکین کے نجس ہونے کا فیصلہ فرمایا اور حدیث پاک میں حضور علیہ السلام نے اپنے آباء و امہات کو طیب و طاہر فرمایا۔ مشرکین نجس ہیں کبھی طاہر نہیں ہو سکتے اور حضور کے اصول طاہر ہیں کبھی نجس نہیں ہو سکتے تو لازمی نتیجہ نکلا کہ

(باقی بر صفحہ ۳۱۸)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۷)
حضور علیہ السلام کے آباؤ اجداد، امہات وجدات مومن موحد تھے۔ کبھی مشرک وکافر نہیں ہو سکتے۔
(۳) وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنافقین لا یعلمون۔ (القرآن)
(عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنین ہی کے لیے ہے مگر منافقین کو علم نہیں)
اس آیت کریمہ میں عزت و اکرام کا حصر اللہ جل وعلا نے مومنین میں فرمایا۔ اور کافر چاہے کیسا ہی اونچی قوم کا کیوں نہ ہو ذلیل ولئیم ٹھہرا۔ نبی کا کسی ذلیل ولئیم کی پشت اور نسب سے ہونا کوئی مدح نہیں۔ حالانکہ اس آیت کریمہ کو اللہ تعالیٰ نے حضور کے مقام مدح میں نازل فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کے آباؤ اجداد اشراف تھے اور اشرف کافر ومشرک نہیں ہوسکتا بلکہ مومن وموحد ہی اشرف واکرم ہوسکتا ہے۔
عقلی دلیل: کسی ذلیل ورذیل شخص پر نسب میں فخر کرنا عقلاً وعرفاً باطل ہے۔
تائید: لیکن نبی کریم علیہ السلام نے اپنے فضائل کریمہ کے بیان میں رجز اور مدح کے متعدد دفعہ اپنے آباء کرام و امہات طیبات کا ذکر فرمایا۔ جنگ حنین میں جب کچھ دیر کے لیے کفار نے غلبہ پا لیا اور چند لوگ پناہ رسالت میں باقی رہے اللہ کے پیارے رسول پر جلالیت طاری ہوگئی۔ فرمایا:
انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب۔ (رواہ احمد والبخاری۔ مسلم ونسائی عن براء ابن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ)
(میں نبی ہوں کچھ جھوٹ نہیں، میں بیٹا ہوں عبد المطلب کا)
حضور علیہ السلام نے یہ رجز پڑھتے ہوئے سواری سے نزول فرمایا۔ ایک مٹھی خاک دست مبارک میں لے کر کافروں کی طرف پھینکی اور فرمایا:
شاھت الوجوہ۔ (بگڑ گئے چہرے)
وہ خاک سب کفار کی آنکھوں میں پہنچی اور سب کے منہ پھر گئے۔
بعض روایات میں رجز کا آخر ہے:
انا ابن العواتک من بنی سلیم۔
یعنی میں بنی سلیم سے ان چند خواتین کا بیٹا ہوں جن کا نام عاتکہ تھا۔
بعض علماء کے نزدیک حضور علیہ السلام کے جدات میں نو بیبیوں کا نام عاتکہ تھا، بعض کے نزدیک (باقی بر صفحہ ۳۱۹)

ملتی ہے اور اقوالِ سلف صالحین رحمہ اللہ تعالیٰ میں بھی صراحت ہے صرف چار پشتیں از مرہ تا عبدالمطلب رضی اللہ عنہما

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۸)

بارہ کا۔

بعض روایات میں حضور علیہ السلام نے اپنا نسب نامہ اپنے فضائل کریمہ میں اکیس پشتوں تک بیان فرمایا کہ میں سب سے نسب میں افضل باپ میں افضل ہوں اور کسی مشرک یا کافر باپ دادا پر فخر کرنا نہ تو عقلاً جائز ہے اور نہ ہی عرفاً۔

تو یہ حضور علیہ السلام کے لیے کیونکر ممکن ہے کہ معاذاللہ آپ مشرک یا کافر باپ دادا کے نسب پر فخر فرمائیں تو بحکم نصوص ثابت ہوا کہ حضور کے آباؤ امہات مسلمین و مسلمات تھے۔ (و ہو المطلوب)

(۴) انہ لیس من اھلک انہ عملٌ غیر صالح۔ (القرآن)

(اے نوح! یہ کنعان تیرے اہل سے نہیں یہ تو عمل غیر صالح ہے (یہ) نافرمان ہے))

آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مومن و کافر کا نسب قطع فرمایا۔ اور حدیث میں ہے:

نحن بنو نضر بن کنانہ لا منتفی من ابینا۔ (رواہ احمد و ابن ماجہ والطبرانی)

(ہم نضر بن کنانہ کے بیٹے ہیں ہم اپنے باپ سے اپنا نسب جُدا نہیں کرتے)

اگر معاذاللہ حضور علیہ السلام کے سلسلۂ نسب میں کوئی کافر تھا یا مشرک تو باقی رکھنے یا ان پر فخر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آباؤ امہات سب موحد مومن تھے لھذا ان پر فخر کرنا ان کا نسب باقی رکھنا اپنی جگہ بالکل درست اور بجا ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

(۵) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ بنا کر دعا کی تھی:

ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک۔ (القرآن)

(اے اللہ! ہماری اولاد میں ایک مسلمان جماعت رکھنا)

پھر فرمایا:

وابعث فیھم رسولا منھم۔

(اور اسی مسلمان جماعت میں آخری نبی بھیجنا)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا حضور علیہ السلام سے پُوری ہوئی۔

(باقی بر صفحہ ۳۲۰)

جن کے متعلق مجھے تصریح نہیں ملتی ۔ ہاں حضرت عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے لیے بھی قوی گمان یہ ہے کہ وہ بھی مومن تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۹)

اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ نبی علیہ السلام مسلم جماعت سے پیدا ہوئے اور یہی ہمارا مقصود ہے۔

(۶) لقد جاءکم رسولٌ من انفسکم۔ (القرآن)

(بے شک آئے تمہارے پاس عظیم رسول جو تم میں سے ہیں)

ایک قرأت میں ف کی فتحہ کے ساتھ ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ تمہارے پاس یہ عظمت والے رسول نفیس ترین جماعت میں سے تشریف لائے ۔ اور کافر چونکہ نفیس نہیں بلکہ خسیس ہے ۔ معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کے اجداد ماجدین و جدات طاہرات اعلیٰ قسم کے مومن موحد تھے ۔ وہ کفر و شرک کے تمام انواع سے پاک و مبرآ تھے ۔

(۷) وتوکل علی العزیز الرحیم الذی یراك حین تقوم وتقلبك فی الساجدین ۔ (القرآن)

(بھروسا کر غالب مہربان پر جو تجھے دیکھتا ہے جب تو کھڑا ہو اور تیرا کروٹیں بدلنا سجدہ کرنے والوں میں)

امام رازی فرماتے ہیں آیت شریف کا معنی یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کا نُور پاک ساجدوں سے ساجدین کی طرف منتقل ہوتا رہا، تو یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ سب آباء کرام مسلمین تھے ۔ امام سیوطی و ابن حجر و علامہ زرقانی نے اس تقریر کی تائید و توثیق فرمائی ۔

(۸) ولسوف یعطیك فترضٰی ۔ (القرآن)

(البتہ عنقریب تجھے تیرا رب اتنا دے گا کہ تُو راضی ہو جائے گا)

نبی کریم علیہ السلام کی وجاہت اجابت کا تو یہ عالم ہے کہ ان کے حق میں رب فرماتا ہے :

سنرضیك فی امتك ولا نسوءك به ۔ (رواہ مسلم)

(قریب ہے کہ ہم تجھے تیری اُمت کے بارے میں راضی کر دیں گے اور تیرا دل بُرا نہ کریں گے)

امت کے معاملے میں تو حضور علیہ السلام کی شفاعت رد نہ فرمائے تو کیا والدین کے بارے میں حضور علیہ السلام کو یہ گوارہ ہوگا کہ وہ معاذ اللہ جہنم میں رہیں ۔

حدیث شریف : صحیح حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کے بارے میں فرمایا :

وجدته فی غمرات من النار فاخرجتُہٗ الیٰ ضحضاح ۔ (رواہ البخاری ومسلم عن العباس ابن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہما)

(میں نے ابُوطالب کو سراپا آگ میں ڈوبا پایا تو کھینچ کر ٹخنوں تک آگ سے نکال دیا)

(باقی بر صفحہ ۳۲۱)

اگرچہ ان کو دعوتِ اسلام نہیں پہنچی کیونکہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کی عمر مبارک آٹھ سال تھی جب حضرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۰)

حدیث شریف : دوسری روایت ہے کہ صحابہ نے پوچھا ؛

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! ابوطالب نے آپ کی بہت خدمت کی، کیا آپ سے ان کو کوئی فائدہ ہوا ؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ، ہاں ۔

ولولا انا لکان فی الدرک الاسفل من النار۔

(اگر میں نہ ہوتا تو ابوطالب جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں ہوتا)

دوسری حدیث میں ہے ؛

اھون اھل النار عذاباً ابوطالب ۔

(دوزخیوں میں سب سے ہلکا عذاب ابوطالب پر ہے)

ظاہر ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جو قرب والدین کریمین کو حاصل ہے ابوطالب کو اس سے کوئی نسبت نہیں پھر والدین کریمین کا عذر بھی معقول کہ نہ تو انہیں دعوتِ اسلام پہنچی اور نہ ہی انھوں نے زمانۂ نبوت پایا وہ دینِ فطرت پر تھے ان کے لیے عقیدۂ توحید ہی کافی ہے ۔ کسی ضعیف حدیث یا تاریخ سے ان کی طرف شرک کی نسبت ثابت نہیں ۔ اور اللہ عزّ وجل فرماتا ہے :

ماکنا معذبین حتی نبعث رسولا۔

(ہم کسی قوم کو بغیر ان میں رسول بھیجے ہُوئے عذاب نہیں دیتے)

معلوم ہُوا کہ جب والدین کریمین کو دعوت ہی نہیں پہنچی تو عذاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ وہ حضرات دین ابراہیمی پر تھے ۔ حضور علیہ السلام کی والدہ ماجدہ نے جو اشعار بوقتِ رحلت ارشاد فرمائے ان سے ان کے ایمان کی دلیل ملتی ہے جب والدہ ماجدہ نے اپنے فرزند جلیل سیّد المرسلین کے چہرۂ انور پر حسرت بھری نظر کی اور ان کی یتیمی کا خیال آیا تو فرمایا : ؎

بارک اللہ فیک من غلام — یا ابن الذی من حومة الحمام

کالعون الملک المنام — فودی غداة الضرب بالسھام

بمائة من الابل السوام — وان صح ما ابصرت فی المنام

فانت مبعوث الی الانام — تبعث فی الحل والحرام

(باقی بر صفحہ ۳۲۲)

عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا وصال ہُوا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۲۱) تبعث فی التحقیق والاسلام دین ابیك البر ابراهام

فالله انهاك عن الاصنام ان لا تواليها مع الاقوام

(اے ستھرے لڑکے! اللہ تجھ میں برکت رکھے۔ اے بیٹے ان کے جنہوں نے موت کے گھر سے نجات پائی۔ بڑے انعام والے بادشاہ۔ اللہ عزوجل کی مدد سے جس صبح کو قرعہ ڈالا گیا سو بلند اونٹ ان کے فدیہ میں قربان کیے گئے۔ اگر وہ ٹھیک ٹھہرا جو میں نے خواب میں دیکھا ہے تو تو سارے جہان کی طرف پیغمبر بنایا جائے گا جو تیرے نکوکار باپ ابراہیم کا دین ہے میں اللہ کی قسم دے کر تجھے بتوں سے منع کرتی ہوں کہ قوموں کے ساتھ ان کی دوستی نہ کرنا)

حضرت آمنہ خاتون کی اس مبارک وصیت میں جو فراقِ دنیا کے وقت اپنے ابن کریم علیہ السلام کو کی، توحید و ردِ شرک آفتاب سے زیادہ روشن ہے، اور اس کے ساتھ ملتِ ابراہیمی کا بھی پورا اقرار و ایمان ہے اور وہ بھی بیانِ بعثتِ عامہ کے ساتھ۔ (الحمد للہ علیٰ ذالک)

(۹) الله اعلم حيث يجعل رسالته - (القرآن)

(خدا خوب جانتا ہے جہاں رکھے اپنی پیغمبری کو)

رب العزت سب سے زیادہ معزز و محترم جگہ وضع رسالت کے لیے انتخاب فرماتا ہے۔ لہٰذا کبھی کم قوموں رذیلوں میں رسالت نہیں رکھی پھر کفر و شرک سے زیادہ رذیل کون سی چیز ہو سکتی ہے وہ کیونکر اس قابل ہو کہ اللہ عزّ وجل نورِ رسالت اس میں ودیعت رکھے کفار محلِ غضب و لعنت ہیں اور نورِ رسالت کے وضع کو محلِ رضا رحمت درکار ہے تو معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کا نور اصلابِ طیبہ سے ارحامِ طاہرہ کی طرف گردش کرتا ہوا حضرت عبداللہ اور آمنہ خاتون کے درمیان ظاہر ہوا۔ وہ سب کے سب کفر و شرک اور الحاد و بے دینی کی آلودگیوں سے پاک و منزّہ تھے۔

(۱۰) ان الذين كفروا من اهل الكتاب والمشركين فى نار جهنم خالدين فيها اولئك هم شرّ البرية ان الذين آمنوا وعملوا الصالحات اولئك هم خير البرية۔

(بے شک سب کافر کتابی اور مشرک جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے وہ سارے جہان سے بدتر ہیں، بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ سارے جہان سے بہتر ہیں)

حدیث شریف: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

(باقی بر صفحہ ۳۲۳)

عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا ایمان مشہور تر یہ ہے کہ حضرت عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ملّتِ ابراہیمی پر تھے، انہوں نے بُت پرستی نہیں کی جیسا کہ سورۂ براۃ میں گزرا ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۲۲)

انا محمد بن عبد الله بن عبد المطلب بن هاشم بن عبد مناف بن قصى بن كلاب بن مره بن كعب بن لوى بن غالب بن فهر بن مالك بن نضر بن كنانه بن خزيمه بن مدركة بن الياس بن نزار بن معد بن عدنان ما فترت الناس فرقتين الا جعلني الله فى خيرهما فاخرجت من بين ابوى فلم يصبني شئ من عهد الجاهلية وخرجت من نكاح ولم اخرج من سفاح من لدن آدم حتى انتهيت الى ابى و امى فانا خيركم نسبًا وخيركم ابًا۔

(میں ہوں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن نزار بن معد بن عدنان۔ لوگ دو گروہ نہ ہُوتے مگر یہ کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بہتر گروہ میں کیا تو میں اپنے ماں باپ سے اس طرح پیدا ہُوا کہ زمانہ جاہلیت کی کوئی بات مجھ تک نہ پہنچی اور میں خالص نکاح سے پیدا ہُوا آدم سے لے کر اپنے ابوین تک تو میرا نفس کریم سب سے افضل اور میرے باپ تم سب کے آباء سے بہتر)

آیتِ مندرجہ بالا میں رب العزّت نے کفار اور مشرکین کو شر البریہ فرمایا اور حضور نے فرمایا:

انا خیرکم اباً و نفساً۔

(میں تم میں سے ذات اور باپ کے اعتبار سے اچھا ہوں)

جس سے آفتاب نیم روز سے مطلوب زیادہ روشن ہوا کہ سلسلۂ نبوی میں کوئی کافر مشرک داخل نہیں ورنہ حضور علیہ السلام کا خیر آب ہونا کس طرح ثابت ہو سکتا ہے!

اقوال علماء

(۱) حضرت علامہ جلال الدین سیوطی و دیگر محدثین فرماتے ہیں:

(باقی بر صفحہ ۳۲۴)

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ یہ خطاب مکّہ کے کفار کو ہے ۔
شانِ نزول : کفار کہتے تھے کہ (معاذ اللہ) رسول اللہ صلّی اللہ کے ہاں شیطان حاضر ہو کر باتیں بناتے ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۳)

ان آباء النبی صلی اللہ علیہ وسلم غیر الانبیاء وامہاتہ الیٰ آدم وحوا لیس فیھم کافر لانہ یقال فی حقہ انہ مختار ولا کریم ولا طاھر بل نجس وقد صرحت الاحادیث بانھم مختارون وان الآباء کرام والامھات طاھرات وایضاً قال تعالیٰ وتقلبك فی الساجدین علیٰ احد التفاسیر فیہ ان المراد تنقل نورہ من ساجد الیٰ ساجد الخ

یعنی نبی کریم کے سلسلۂ نسب میں جتنے انبیاء ہیں وہ تو انبیاء ہی ہیں ۔ ان کے سوا حضور علیہ السلام کے جس قدر آباء و امّہات آدم و حوا تک ہیں ان میں کوئی کافر نہ تھا کہ کافر کو پسندیدہ یا کریم یا پاک نہیں کہا جا سکتا اور حضور علیہ السلام کے آباء و امہات کی نسبت حدیثوں میں تصریح کی گئی ہے کہ وہ سب پسندیدہ بارگاہِ الٰہی ہیں آبا سب کرام ہیں مائیں سب پاکیزہ ہیں اور آیۂ کریمہ وتقلبك فی الساجدین کی بھی ایک تفسیر یہی ہے کہ نبی علیہ السلام کا نور ایک ساجد سے دوسرے ساجد کی طرف منتقل ہوتا آیا ۔

اب اس سے صاف ثابت ہو رہا ہے کہ حضور علیہ السلام کے والدین ماجدین اہلِ جنّت ہیں کیونکہ ساجد مشرک و کافر نہیں ہوتے مومن و موحد ہی ہوتے ہیں ۔

سوال : قرآنِ کریم نے آزر کو ابراہیم علیہ السلام کا باپ بتایا حالانکہ وہ بت تراش تھے اور مشرک بھی ۔ تو حضور علیہ السلام کے سلسلۂ نسب میں مشرک آ گیا ۔

جواب : مفسرین و اہلِ تاریخ کا اس پر اتفاق ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا باپ نہیں تھا ۔ ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے حدیث موجود ہے کہ :

عم الرجل صنو ابیہ ۔

(آدمی کا چچا اس کے باپ کی بجائے ہوتا ہے)

نیز قرآن کریم میں صریح آیت موجود ہے جس میں چچا کو باپ کہا گیا ہے ۔

سوال : روایات سے ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام کے والدین کو زندہ کیا گیا اور وہ حضور علیہ السلام پر ایمان لائے ۔ اس سے ثابت ہوا کہ آپ کے والدین کفر کی حالت میں مرے ۔ (باقی بر صفحہ ۳۲۵)

اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۴)

جواب: اوّلاً تو اس حدیث سے حضور علیہ السلام کے والدین کا ایمان ثابت ہے۔ جو لوگ اب بھی ایمان کے قائل نہیں جواب تو ان کو دینا ہے۔ یہ حدیث ہمارے مقصد کے خلاف نہیں۔ نیز حضور علیہ السلام کے والدین کا دوبارہ زندہ کیا جانا اور ایمان لانا معاذ اللہ اس لیے نہیں تھا کہ وُہ کافر تھے۔ اُن کا کفر تو کسی ضعیف روایت سے بھی ثابت نہیں۔ بلکہ ان کو اس لیے زندہ کیا گیا کہ وہ حضور علیہ السلام پر ایمان لا کر حضور اکرم کے شرفِ صحابیت سے مشرف ہو کر خیر الامتہ میں داخل ہو جائیں۔ ان کا زندہ کرنا اور حضور علیہ السلام پر ایمان لانا مزید انعام و اکرام کے لیے تھا ورنہ وُہ تو پہلے ہی ملتِ ابراہیمی پر تھے جس طرح گزشتہ قصیدہ میں ثابت ہو چکا ہے۔

ثانیاً ایمان سے تجدید مراد ہے اس لیے کہ ان کا اہلِ توحید سے ہونا ہی ان کی نجات کے لیے کافی ہے۔ اس لیے کہ وُہ تو احکام کے مکلف ہی نہیں تھے۔ جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔

سوال: حضور علیہ السلام نے ایک صحابی سے فرمایا:

ابی و اباک هما فی النار۔

(میرا باپ اور تمہارا باپ دوزخ میں ہیں)

جواب: (۱) باپ سے مراد ابو طالب آپ کا چچا ہی ہے۔ ورنہ اس حدیث کے مقابلے میں جو آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبوی ہیں ان کا کیا جواب ہوگا۔

(۲) حضور علیہ السلام کو استغفار سے بھی رب العزّت نے اسی لیے منع فرمایا کہ آپ کے والدین گنہ گار تھے ہی نہیں۔ استغفار تو گنہ گاروں کے لیے ہوتا ہے، اور گنہ گار وُہ مجرم ہے جس کو نبی یا رسول دعوتِ توحیدو احکام دے اور وہ شخص اعراض کر دے۔ حضور علیہ السلام کے والدین کے لیے یہ دونوں امر ثابت نہیں۔

سوال: فقہ اکبر میں ہے کہ ماتا علی الکفر۔ یعنی ان کی موت کفر پر ہوئی۔ (معاذ اللہ)

جواب: اوّل تو یہ مسئلہ اجتہادی نہیں کہ ہم اس میں کسی امام کی پیروی یا تقلید کریں۔

دوم فقہ اکبر کی عبارت ماوّل ہے۔ یعنی ماتا علیٰ عہد الکفر۔ (حضور علیہ السلام کے والدین کا انتقال عہدِ کفر میں ہوا) اور یہ مسلّم ہے اس سے انکار نہیں۔

سوم یہ عبارت ماماتا علی الکفر تھی جیسا کہ اصل کتاب میں ہے۔

چہارم یہ عبارت بعض نسخوں میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ تو ہمیں اس عبارت کا جواب دینے کی ضرورت

(باقی بر صفحہ ۳۲۶)

ربط : پہلے یہ بتایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں شیاطین کا قرآن لانا ممتنع ہے، اب بتایا کہ ان کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ہی نہیں۔

انتباہ : یہ مسئلہ اس قدر نازک ہے کہ اگر احتیاط ہاتھ سے نکل جائے تو ایمان سے محروم ہونے کا خطرہ ہے۔ کیا حضور علیہ السلام کے والدین ماجدین کے کفر کے متعلق بات کرنا کوئی آسان کام ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :

والذین یؤذون رسول اللہ لہم عذابٌ الیم۔

(جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچاتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے)

آخری گزارش

عقلمند کو چاہیے کہ ایسی پُرخطر جگہ احتیاط سے کام لے۔

○ حجۃ الاسلام امام غزالی نور اللہ مرقدہ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں "کسی مسلمان کی طرف گناہِ کبیرہ کی نسبت جائز نہیں جب تک یہ یقین سے ثابت نہ ہو"۔ کفر کی نسبت کا معاملہ تو بہت ہی دشوار ہے۔

○ امامِ اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول سے سبق لیا جائے۔ فرماتے ہیں : " اگر کسی میں ننانوے احتمالات کفر کے ہوں اور ایک ایمان کا، تو اس کے لیے بھی کفر کی نسبت کرنا جائز نہیں "۔

خودساختہ مقلدین کے پاس امام کے اس ارشاد کا کیا جواب ہے :

ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

(اگر تمہارے پاس کوئی برہان ہے اور تم سچے ہو تو وہ برہان لاؤ)

کیا تمہارا ایمان گوارہ کرتا ہے کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادنیٰ غلاموں کے ساتھ سگانِ درگاہ جنّاتِ نعیم میں داخل ہوں اور جن کے نعلین کے تصدق جنّت بنی ان کے ماں باپ دوسری جگہ معاذ اللہ غضب و عذاب میں مبتلا ہوں، کیا آمنہ خاتون حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے بھی کم ہیں۔ کیا یہ آپ کو پسند ہوگا کہ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام اپنی والداؤں کو جنّت میں دیکھیں اور محبوب کی والدہ وہاں نظر نہ آئیں۔

زندہ معجزہ اور اہلسنت کی تائید

مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی توسیع کے سلسلے میں کی جانے والی کھدائی کے دوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

(باقی برصفحہ ۳۲۷)

حاضر ہوکر کچھ بتانہیں سکھانا بھی محال ہے۔

اب معنیٰ یہ ہُوا کہ اے مشرکو! کیا میں تمہیں خبر دوں عَلٰی مَنْ تَنَزَّلُ الشَّیٰطِیْنُ ○ شیاطین کس پر نازل ہوتے ہیں۔

ف : تنزل دراصل تتنزل تھا۔ ایک تا حذف کر دی گئی ہے من استفہام کو متضمن ہے۔

سوال : اگر من استفہام کو متضمن ہے تو استفہام کا قاعدہ ہے کہ وہ ابتدائے کلام میں آتا ہے مثلاً، اعلی زید مررت ہوگا علیٰ ازید مررت نہیں ہوگا، اور یہاں مَن ابتدائے کلام میں نہیں۔

جواب : اس کا مطلب یہ نہیں کہ من اسم ہے اور اس میں حرف کا معنی ہے بلکہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ یہ دراصل اَمَنْ تھا حرف استفہام یعنی ہمزہ حذف کر کے مَن اسم کو اس کے قائم مقام کیا گیا ہے جیسے ھَل دراصل اَھَل تھا بمعنے اَقَدْ اسی قاعدہ پر جب حرفِ جر مَنْ پر داخل ہوگا تو حرفِ جر سے پہلے ہمزہ استفہام مقدر ماننا ہوگا گویا اصل میں یہ عبارت اعلیٰ من تنزل الخ تھی۔

تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاكٍ افاک کثیرالافك والکذب بہت بڑا بہتانی اور جھوٹا۔

حلِ لغات : امام راغب رحمہ اللہ نے فرمایا افک ہر وہ بات جس کو اپنے مقام سے پھیر کر دوسری طرف لایا جائے۔ جس کے لیے حق یہ تھا کہ اس طرف سے نہ لائی جاتی۔

اَثِیْمٍ ○ کثیرالاثم ہر وہ اسم جو ثواب کی راہ سے ہٹا ہوا ہو یعنی شیاطین ان لوگوں پر اترتے ہیں جو پرلے درجے کے بہتانی اور جھوٹے اور گناہوں میں بکثرت مبتلا ہونے والے ہیں جیسے کاہن اور جھوٹے نبی جیسے مسیلمۃ الکذاب و طلیحۃ۔ کیونکہ یہ لوگ شیاطین کے عملی ہم جنس ہیں اور کذب و افتراء میں ان کو آپس میں مناسبت بھی ہے اور اضلال میں برابر کی شرکت بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے قبائح سے بالکل منزّہ و

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۶)

کے والد حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کا جسدِ مبارک جس کو دفن کیے چودہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے بالکل صحیح و سالم حالت میں برآمد ہوا، علاوہ ازیں صحابیِ رسول حضرت مالک بن سنانؓ کے علاوہ دیگر چھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجساد مبارک بھی اصل حالت میں پائے گئے جنہیں جنت البقیع میں نہایت عزّت و احترام کے ساتھ دفنا دیا گیا جن لوگوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ان کا کہنا ہے کہ مذکورہ صحابہ کے جسم نہایت تر و تازہ اور اصلی حالت میں تھے۔ (روزنامہ ۲۰ر جنوری)

نوٹ : فقیر نے اس خبر کو تفصیل کے ساتھ صدائے نوی شرح مثنوی میں لکھ دیا ہے۔ اویسی غفرلہٗ

مقدّس ہیں - اسی لیے شیاطین کا ان کے ہاں حاضر ہونا محال ہی نہیں بلکہ ممتنع ہے یُلْقُوْنَ السَّمْعَ جملہ محلاً مجرور ہے اور کل افاك اثیم کی صفت ہے اس لیے کہ کل افاك اثیم جمع کے معنی میں ہے یعنی افاک و اثیم شیاطین کی طرف کان لگاتے ہیں تو ان سے اوہام اور علامات پاتے ہیں کیونکہ ان کی علمی کمی ہے اسی لیے اپنی طرف سے چند باتیں گھڑ کر سناتے ہیں جن کے اکثر کو واقع کے سامنے مطابقت نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ کہ یہ لوگ شیاطین کی طرف کان لگا کر سنتے ہیں پھر کچھ باتیں اپنی طرف سے گھڑ لیتے ہیں۔

وَاَکْثَرُهُمْ اور ان بہتانیوں کے اکثر کٰذِبُوْنَ ○ ان باتوں میں جھوٹے ہیں جو اپنی طرف سے گھڑتے ہیں - میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم ایسے نہیں کیونکہ وہ صادق فی جمیع ما اخبر من المغیبات[1] ہیں یعنی غیب کی باتوں کی خبر دینے میں سچے ہیں۔

ف : (اس سے وہابیہ کا بھی رد ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیب کیا جانیں، اور ان کے علمِ غیب کو ماننا شرک ہے۔ ان بھلے مانسوں کو کون سمجھائے کہ جو غیب کی باتیں جانتا نہیں وہ غیب کی خبر کیسے دے سکتا ہے)[2]

سوال : اکثر کے اطلاق سے معلوم ہوا کہ ان کے بعض کاہن وغیرہ جھوٹے نہ تھے۔

جواب : (۱) کبھی اکثر بمعنے کُل آتا ہے یعنی ان کے سارے کے سارے جھوٹے ہیں - بلکہ بعض کا لفظ بھی کبھی کل کے معنی میں آتا ہے - جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

ولاحل لکم بعض الذی حرم علیکم۔

(اور تاکہ تمہارے لیے وہ بعض یعنی کل اشیاء حرام کی گئی تھیں)

اب حلال کی گئیں - بلکہ بکثرت قلت کا اطلاق عدم پر بکثرت آیا ہے۔

(۲) بعض مشایخ نے فرمایا کہ یہ اکثریت باعتبار اقوال کے ہے نہ کہ بہ اعتبار ذوات - یعنی ان کی اکثر باتیں جھوٹی تھیں وغیرہ - اس سے لازم نہیں آتا کہ ان کے بعض سچے تھے بلکہ یہ لازم آتا ہے کہ ان کی بعض باتیں سچی تھیں جیسا کہ معلوم ہوا - اور افاک کا معنیٰ بھی یہی ہے کہ اس سے اکثر باتیں من گھڑت صادر ہوتی ہیں - اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ وہ ہر وقت من گھڑت باتیں کرتا رہتا ہے - یہاں تک کہ اس سے سچ کا صدور ناممکن ہو گیا ہے بلکہ وہ اکثر تو جھوٹ بولتا ہے اور کبھی کبھار سچ بھی بول لیتا ہے۔

(جیسے عربی مقولہ ہے :

الکذوب قد یصدق یعنی کاذب کبھی سچ بول لیتا ہے)[3]

---

[1] روح البیان ج ۶ ص ۳۱۴

[2] اضافہ از مترجم غفرلہٗ

[3] اضافہ از مترجم غفرلہٗ

کشف الاسرار میں ہے کہ اکثر ھم میں سطیح وشق وسواد بن قارب کو مستثنیٰ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کیا گیا ہے کہ وہ اپنے دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ پاک

کی رسالت کی گواہی وتصدیق کے صدقے سے سرشار رہتے، آپ کی تصدیق کرتے اور آپ کی نبوت کی گواہی دیتے اور لوگوں کو آپ کے دین کی دعوت دیتے رہتے تھے۔[1]

حیوٰۃ الحیوان میں ہے کہ :

دو اعجوبے (۱) شق کو شق اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس کے جسم کا ایک ایک حصہ کم تھا، مثلاً ہاتھ ایک، پاؤں ایک، آنکھ ایک۔

(۲) سطیح کے ڈھانچے میں نہ ہڈیاں تھیں نہ رگیں اور نہ پٹھے (صرف گوشت پوست تھا) وہ چٹائی کی طرح لپیٹ لیا جاتا۔

یہ دونوں (شق وسطیح) کاہن تھے، زمانۂ بعثت کو نہیں پایا بلکہ یہ کسریٰ یعنی ساسان کے زمانے میں تھے۔[2]

وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُھُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اور شعراء کی اتباع گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ یعنی نہ قرآن شعر ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاعر ہیں کیونکہ شاعر تو وہ ہے جن کی اتباع گمراہ اور بیوقوف ہی کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابعدار ایسے نہیں بلکہ وہ دانائے روزگار ہیں، ان کی باتیں عوام کے نزدیک وقیع اور ان کی دانائی خلقِ خدا میں مسلّم ہے۔

شرارتی شعراء کفار کے چند شعراء تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی ہجو اور اسلام کی بدگوئی کرتے۔ ان کی اتباع میں بیوقوف اور پاگل قسم کے لوگ ہوتے، تاکہ وہی ہجو یاد کریں۔ پھر وہ اپنے علاقوں میں جا کر مجالس قائم کر کے ہجو کر کے ہنستے ہنساتے۔ (جیسے آج کل وہابیہ اور روافض کے شعراء کا حال ہے کہ وہابیہ نبی علیہ السلام کے علم غیب واختیار ونور وغیرہ کی نفی میں اشعار پڑھتے ہیں اور اولیاء و مزارات کی تنقیص وتحقیر میں ابیات سناتے ہیں۔ اور روافض صحابہ کرام کی ہجو بکتے اور مجالس قائم کر کے اشعار میں گالیاں دیتے ہیں)[3]

حکایت واضحوکہ خلیفۂ وقت کے ہاں شعراء کی جماعت حاضر ہوئی ان کے پیچھے ایک طفیلی (جسے آج ہم مفت خورہ کہتے ہیں) چلا گیا۔ شعراء نے خلیفہ کو قصائد سنا کر انعامات حاصل کئے

---

[1] و [2] ایسے واقعات فقیر کی کتاب "آدم تا ایندم" میں دیکھئے۔ اویسی غفرلہٗ

[3] اضافہ از اویسی غفرلہٗ

اور طفیلی اداس بیٹھا تھا۔ بادشاہ نے کہا: تم بھی کچھ کہو تاکہ تمہیں بھی انعام ملے۔ طفیلی نے کہا: میں شاعر نہیں بلکہ ایک گمراہ آدمی ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

والشعراء یتبعھم الغاوٗن۔

اس پر بادشاہ بہت ہنسا اور طفیلی کو بھی انعام سے نوازا۔ (کذا فی الروضہ لابن الخطیب)

ف: بعض مفسرین نے فرمایا کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ کافروں کے شعراء وہ ہیں جو ان کے طریقے پر چلتے ہیں وہ گمراہ ہیں اور راہِ حق سے کوسوں دور ہیں۔ اس سے اہلِ حق شعراء مراد نہیں۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے اس میں اشارہ ہے کہ شعراء جب اپنے حسب مقامات وبموافق مطامح نظر و منشاءئے قصد ونیات کے مطابق اقدام تفکر و مفاوز تذکر پر طلب معانی ونظم و ترتیب عروض وقوافی وتدبیر تجنیس واسالیب میں چلتے ہیں تو شیاطین اغواء واضلال کے لیے ان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور انہیں اباطیل واکاذیب میں واقع کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

شعر کی لغوی تحقیق المفردات میں ہے: شعرت بمعنی اصبت الشعر۔ اسی سے استعارہ کیا گیا ہے شعرت کذا۔ یعنی میں نے اسے دقت میں بالوں کی طرح پایا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شاعر کو بھی اسی لیے شاعر کہا جاتا ہے کہ وہ اچھی ذہانت اور دقیق معرفت کا حامل ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دراصل شعر بمعنے علم الدقیق کو کہا جاتا ہے۔ اسی سے لیت شعری کا مقولہ مشہور ہے۔

عرف میں شعر کی تعریف عرف میں شعر ہر مقفّٰی اور مسجّع اور موزون کلام کو کہتے ہیں۔ اور شاعر اس کو کہا جاتا ہے جو فنِ شعر کا ماہر ہو۔ کما قال تعالیٰ:

بل افتراہ بل ھو شاعر۔ ترجمہ: بلکہ اسے گھڑا ہے بلکہ وہ شاعر (جھوٹا) ہے۔ معاذاللہ۔

بل افتراہ بل ھو شاعر کی تفسیر اس آیت میں بھی کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر اسی معنیٰ پر کہا کہ آپ کا قرآن شعر ہے کہ اس میں مقفّٰی و مسجّع و موزون کلام ہے۔ مثلاً:

وجفان کالجواب وقدور راسیات۔ ترجمہ: اور بڑے حوضوں کے برابر لگن اور لنگردار دیگیں۔

یہ مطلب[1] صحیح نہیں کیونکہ کفارِ عرب کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر بمعنے معروف اور شعر معروف کی تہمت

---

[1] یہی مطلب وہابیہ دیوبندیہ لیتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علمِ کلی حاصل نہیں۔ (باقی برصفحہ ۳۳۱)

نہیں لگائی اس لیے کہ عجمی جاہل بھی سمجھتے ہیں کہ قرآنی آیات اور جملے شعر معروف کی صنعت پر نہیں چہ جائیکہ اہل عرب، اور وہ بھی فصحاٗ و بلغاٗ اس سے یہی مراد لیں۔ بلکہ اس سے ان کی مراد شعر سے کذب ہے۔ (یہی معنیٰ ہم اہلسنت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وما علمناہ الشعر میں شعر سے مراد کذب ہے۔ اب معنیٰ و مطلب واضح ہے۔ دلائل فقیر اویسی کی کتاب احسن التقریر میں ہیں)[1] آیت مذکور میں شاعر بمعنے کاذب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک قوم (منطقی) ادلہ کاذبہ کو شعر سے تعبیر کرتی ہے۔ (چنانچہ منطقیوں نے شعر کی یوں تعریف کی ہے:

الشعر ھو قیاس مؤلف من مقدمات تنبسط منها النفس او تنقبض۔ یعنی شعر وہ قیاس ہے جو ایسے مقدمات سے مرکب ہو جس سے جی خوش ہو جائے یا مغموم و منقبض ہو جائے خواہ اس سے غلط اور جھوٹے جملے ملانے پڑیں۔ اس کی مثال الخمر یاقوتیة سیالة اور العسل مرة مهوعة ہے)[2]

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے شعراٗ کے وصف میں فرمایا:

والشعراء یتبعهم الغاؤن۔ ترجمہ: شاعر وہ ہیں جن کی گمراہ لوگ اتباع کرتے ہیں۔

ف: امام مرزوقی شارح حماسہ نے فرمایا کہ درجۂ اوّل پر بلغاٗ ہیں دوسرے نمبر پر شعراٗ۔ وہ اس لیے کہ عرب میں منظوم کی بجائے نثری کلام کو ترجیح ہے اس لیے ملوک عرب اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد خطابت پر نازاں تھے اور اپنی بادشاہی کی مضبوطی کے لیے اسے قوی ترین اسباب سے شمار کرتے لیکن شعر گوئی کو ردی اور بیکار سمجھتے کیونکہ شعر گوئی میں کسب کو دخل ہوتا ہے اور یہ ایک تجارتی عمل متصور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طمع کے وقت لئیم اپنے دانا کو کریم سے یاد کرتا ہے اور کریم اگر صلہ و انعام کی داد و دہش سے پیچھے ہٹے تو اسے لئیم کہا جاتا۔ دوسری دلیل برائے ترجیح نثر بر نظم اعجاز بھی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانۂ اقدس میں فصاحت کا زور تھا۔ (اسی لیے فأتوا بسورة من مثله کا چیلنج کیا گیا)

تفسیر عالمانہ اَلَمْ تَرَ اے وہ شخص جس کی شان رؤیت ہے کیا تو نے نہیں دیکھا یعنی بیشک تو نے دیکھا اور معلوم کیا ہے اَنَّهُمْ بے شک وہ شعراٗ فِیْ كُلِّ وَادٍ ہر وادی میں۔ یعنی مدح و ذم اور ہجو و کذب اور فحش و شتم اور لعن و افتراٗ اور دعاوی و تکبر اور مفاخر و تحاسد اور ریاکاری اور عجب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دلیل میں وما علمناہ الشعر الخ پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضور شعر (معروف) نہیں جانتے تھے اور اس شعر (معروف) کی اللہ تعالیٰ نے آپ سے نفی کی ہے حالانکہ یہاں بلکہ جملہ قرآن میں شعر سے شعر معروف مراد نہیں بلکہ شعر سے کذب مراد ہے جیسا کہ روح البیان میں لکھا گیا ہے۔

[1] و [2] اضافہ از اویسی غفرلہٗ

اور اظہار فضل و دنائت و خست اور طمع ولالچ اور ذلت وخواری و دیگر قسم قسم کے اخلاقِ رذیلہ وطعن علی الانساب و الاعراض (عزتوں اور نسبوں پر حملہ کرنا) و دیگر ایسی آفات وبلیات کے چکر میں ہیں، جیسا کہ فنِ شعرگوئی میں عموماً ہوتا ہے یَہِیْمُوْنَ ○

حلِ لغات : ھام یھیم علیٰ وجھہ ھیمانا (بفتحتین) از باب باع یبیع بمعنی ذھب فی العشق وغیرہ یعنی وہ عشق وغیرہ میں ڈوب گیا (کذا فی المختار) یعنی وہ اپنے چہروں پر گرتے پھرتے ہیں اور کوئی صحیح راہ نہیں پاتے بلکہ وہ فضول باتوں کی وادی میں بھٹکتے اور وہم وخیال اور گمراہی میں گم رہتے ہیں۔

امام راغب نے فرمایا کہ وادی دراصل اس جگہ کو کہا جاتا ہے جس میں پانی بہتا ہو اور دو پہاڑوں کے درمیان کے کھلے راستہ کو بھی وادی سے تعبیر کرتے ہیں۔ استعارۃً طریقہ مثلاً مذہب و اسلوب پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے :

فلان فی واد غیر وادیك ۔

(فلاں تیرے طریقے (مذہب) کے غیر پر ہے)

اور اب الم تر انھم فی کل واد یھیمون کا معنی یہ ہوا کہ وہ کلام کے اسالیب، مدح، ہجو، غزل، جدل میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ کلام کے ہر طریقے میں غلو کرتے ہیں۔

ف : وسیط میں ہے کہ وادی فنونِ کلام کی کہاوت اور اس میں سرگردان پھرنے کی کہاوت ہے کیونکہ وہ اپنی باتوں میں ہر قسم کی لغویات اور باطل گفتگو اور مدح وذم میں غلو کرتے ہیں۔

وَاَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ اور وہ اپنے اشعار میں ڈینگیں مارتے اور غلط دعاوی کرتے اور ایسی باتیں کہتے ہیں مَا لَا یَفْعَلُوْنَ ○ وہ جو نہیں کرتے یعنی ناکردہ فسق کا اقرار کر لیتے ہیں اور بلا وجہ ایسے پیغامات دیتے ہیں جن سے انہیں کسی قسم کا تعلق نہیں ہوتا۔ سخاوت کی ڈینگیں مارتے ہیں لیکن اس سے کوسوں دور ہوتے ہیں اور بخل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن ہوتے ہیں پرلے درجے کے بخیل، اور کسی سے انہیں معمولی پرخاش ہو تو اس پر مذمت کا انبار لگا دیتے ہیں اور سوائے فواحش ومعاصی کے ان کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ اور یہ تمام کی تمام غوایۃ وضلالۃ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان جملہ امور سے منزہ اور پاک ہیں۔ اور آپ تو بفضلہ تعالیٰ جملہ محاسن جمیلہ و اوصافِ حمیدہ ومکارمِ اخلاق سے موصوف بلکہ سرچشمہ ہیں اور منہاج قویم بہتر راستہ پر قایم اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ شعراء صالحین مؤمنین کا استثنا ہے۔ یعنی مگر وہ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے وَذَکَرُوا اللّٰہَ اور اللہ تعالیٰ کی یاد کی کَثِیْرًا بکثرت، اس لیے کہ ان کے اشعار مبنی بر توحید و ثناء علی اللہ ہیں اور طاعت کی ترغیب پر مشتمل ہیں

اوران میں حکمت وموعظت اور زہد فی الدنیا وترغیب فی الآخرت کا ذکر ہے ۔ یا یہ معنیٰ ہے کہ شعر گوئی انہیں ذکرِ الٰہی سے باز نہیں رکھتی اور نہ ہی انہوں نے شعر گوئی اپنی عادت ومشغلہ بنا رکھا ہے ۔

نسخہ روحانی ذکر کی کثرت سے گنتی مراد نہیں بلکہ وُہ ذکر جس میں حضورِ قلبی ہو وہ ذکرِ کثیر ہے (جیساکہ ابو یزید قدس سرہٗ نے فرمایا)

وَانْتَصَرُوْا اور مشرکین سے بدلہ لیا۔

حلِ لغات : تاج المصادر میں ہے الانتصار بمعنے انصاف لینا (بدلہ لینا) ۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہُوا کہ ان کی مشرکین نے ہجو کی جیساکہ حضرت حسان بن ثابت اور کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ وغیرہم رضی اللہ عنہم حضرات رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کفار و مشرکین کی ہجو کا جواب دیتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر واردکردہ اعتراضات کے جوابات لکھتے اور پڑھتے تھے ۔

حضرت حسان حضوری نعت خوان رضی اللہ عنہ

حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو مسجد میں منبر بچھا دیتے جس پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کا جواب دیتے حضرت کمال اصفہانی نے فرمایا : ؎

ہجا گفتن ارچہ پسندیدہ نیست
مبادا کسے کالت آں ندارد
چو آں شاعرے کو ہجا گو نباشد
چو شیرے کہ چنگال و دنداں ندارد

ترجمہ : ہجو اگرچہ اچھی نہیں ہوتی ۔ خدا کرے وہ شاعر نہ ہو جو ہجو کی طاقت نہیں رکھتا ۔ ایسا شاعر جو ہجو نہیں جانتا اس کی مثال اس شیر کی ہے جو پنجہ اور دانت نہیں رکھتا ۔

شعر گوئی کے فضائل

حدیث شریف ۱ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انہیں فرمایا :

" اے کعب ! کافروں کی ہجو کر، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے شعر گوئی ان پر تیر سے بھی زیادہ سخت ہے ۔"

حدیث شریف ۲ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا:
"کافروں سے اموال و نفوس اور زبانوں سے جہاد کرو۔"

یعنی انہیں ایسی باتیں سناؤ جو ان کو سخت لگیں اور جن سے وہ چڑتے ہوں۔ جیسے ہجو اور سخت کلامی وغیرہ۔[۱]

نکتہ: استثنائے عمومی لایا گیا ہے تاکہ مخصوص لوگوں اور خاص شاعروں کے لیے مدح مقصود نہ ہو بلکہ ہر وہ شاعر اس مدح کا مستحق ہو جو شعرائے رسول کی پیروی اور اقتدا کرتا ہو، خواہ وہ شاعر ہو یا خطیب یا کوئی اور۔[۲]
(کذا قال الامام السہیلی)

ف: الکواشی (تفسیر) میں ہے کہ شعر ایک کلام کا نام ہے۔ کلام اچھا تو شعر اچھا۔ کلام قبیح تو شعر بھی قبیح۔

مسئلہ: وہ شعر جس میں توحیدِ الٰہی اور مکارم الاخلاق جیسے جہاد و عبادت وحفظ از زنا، بری نگاہ سے بچاؤ، صلہ رحمی وغیرہ، مدحتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مناقبِ اولیاء کرام ہوں، درست ہے۔[۳]

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اشعار میں اربابِ قلوب کے لیے نورِ ایمان کے ساتھ اقدامِ تفکر میں سلوک اور قوت عمل صالح اور تائید الذکر الکثیر ہے تاکہ وہ قرب کے اعلیٰ درجات کو پہنچیں پھر دقائق معانی کے ساتھ، ان کی ملائکہ تائید کرتے ہیں بلکہ حقایق کو حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالےٰ انھیں توفیق بخشتا اور الفاظ دقایق کے ساتھ ان کو الہام فرماتا ہے۔ پھر وہ الہام کے ذریعہ مواعظِ حسنہ اور حکمتِ بالغہ اور ذمِ دنیا اور اس کے ترک وتزیین الآخرۃ اور اس کی طلب وتشویق العبادۃ اور اللہ تعالیٰ کی محبت

---

[۱] جیسے اعلحضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ نے وہابیوں دیوبندیوں نجدیوں کے متعلق فرمایا: ؎

دشمنِ احمد پہ شدت کیجئے
ملحدوں کی کیا مروّت کیجئے

اور فرمایا: ؎

غیظ سے جل جائیں بے دینوں کے دل
یا رسول اللہ کی کثرت کیجئے

[۲] الحمدللہ اس تفسیر پر ہم اہلسنّت خوش نصیب ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تنقیص وتحقیر کرنے والوں کو دنداں شکن جواب دیتے ہیں شعر گوئی سے بھی، تحریر سے بھی، تقریر سے بھی۔

[۳] الحمدللہ ہم اہلسنت کو یہ تمام امور شعر گوئی کے لحاظ سے نصیب ہیں۔ ہمارے دور کے خوارج کو باقی اشعار سے تو انکار نہیں البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

پیدا کرنے و شرح المعارف و بیان الوصل اور سیر الی اللہ پر برانگیختہ کرنے و ذکر و ثنائے الٰہی و مدح النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و مناقب صحابہ رضی اللہ عنہم و بدلہ لینے کی نیت پر ہجو کفار کی وادی میں پھرتے رہتے ہیں۔

نعت خوانی کی فضیلت حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو فرمایا:

اهجِ المشركين فان جبريل معك۔

(کافروں کی ہجو کرو بے شک جبریل تمہارے ساتھ ہیں)

مسئلہ: جمہور کے نزدیک شعر گوئی مباح ہے بشرطیکہ اس میں کذب و قبح نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اگر شعر گوئی کا مشغلہ اتنا غالب آجائے کہ اسے ذکرِ الٰہی و تلاوتِ قرآن کا وقت بھی نہ ملے تو یہ مذموم فعل ہے اسی لیے بجا کہا جس نے کہا:

در قیامت نرسد شعر بفریاد کسے
کہ سراسر سخنش حکمت یونان گردد

ترجمہ: قیام میں اس کا شعر اسے کوئی فائدہ نہ دے گا جس کا سخن سراسر حکمتِ یونان پر مبنی ہو۔

ف: اگر مذکورہ بالا شرائط شعر میں پائی جائیں تو شعر گوئی مذموم ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

ان من الشعر لحكمة۔

(بعض اشعار میں حکمت ہوتی ہے)

یعنی وہ کلام ایسا نافع ہوتا ہے کہ جہل و حماقت و سفاہت سے بچاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شعر گوئی: سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم تمام خلفاء سے زیادہ شعر گو تھے۔

بی بی عائشہ رضی اللہ عنہ کی بلاغت: اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سب سے بڑی فصیحہ و بلیغہ تھیں۔

حضرت کاشفی مرحوم کی تقریر جناب کاشفی مرحوم فرماتے ہیں کہ "حقائق پناہ لیتے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے دیوان کے دیباچہ میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ در حکیم جل ذکرہ نے آیت والشعراء یتبعهم الغاوون الی ان شعراء (جو بحر شعر کے تیراک ہوتے ہیں) جمع کرکے ذکر فرمایا اور دام استغراق کا کمند ان کی گردن میں ڈال کر کبھی تو انہیں گمراہی کی حد میں گراتا ہے کبھی تشنہ لب کرکے وادیٔ حیرت و ضلالت میں حیران کرتا ہے ان کے بہت سے خوش قسمت اصلاح عمل و صدق ایمان کی وجہ الا الذین آمنوا الخ کی کشتی میں بیٹھ کر (وذکروا اللہ) کی برکت سے کنارے لگتے ہیں اور نجات پاتے۔

کسی شاعر نے کہا :

ﮦ

شاعرانرا اگرچہ غاوی گفت در قرآن خدا
ہست از ایشان ہم بقرآن ظاہر استثنائے

ترجمہ: (اگرچہ قرآن میں شاعروں کو اللہ تعالیٰ نے گمراہ کہا ہے
لیکن الا الذین آمنو الخ میں ہمیں مستثنیٰ فرمایا ہے)

حضور علیہ السلام کی شاعری چونکہ شعر گوئی انبیاء علیہم السلام کے شایانِ شان نہیں اس لیے حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے شعر بنائے نہیں پڑھے ضرور ہیں اور بے قصد شعر بھی بن گئے، اور یہ دونوں آپ کے باکمال ہونے کی بشری دلیل ہے کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم جامع عطا فرمایا۔ آپ ہر فصیح و بلیغ و شاعر بلکہ اشعر کو اس کی لیاقت پر جواب سے نوازتے اور ہر قبیلہ کی لغت و عبارت اور لہجہ کے مطابق جواب بخشتے اور کاتبین کو کتابت بتاتے اور ہر صاحبِ صنعت کو ہر قسم کی صنعت سمجھاتے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث فرمایا۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اور عنقریب ظالم لوگ جان لیں گے کہ جس شعر گوئی سے انہیں روکا گیا تھا اس سے نہ رکے۔ یہ عام ہے ہر ظالم کو۔ سین استقبالیہ تاکید کے لیے ہے اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝

ترکیب : ای منقلب ــ ینقلبون کی وجہ سے منصوب علی المصدریہ ہے سیعلم کا مفعول وغیرہ ہے اس لیے کہ ایّ اور اس جیسے اور اسما استفہامیہ کا ماقبل عمل نہیں کرتا اور یہ اپنے عامل پر مقدم اس لئے ہے کہ ایّ استفہام کے معنی کو متضمن ہے اور استفہام کے لیے تقدیم چاہیے اور یہ جملہ سیعلم کے متعلق اور دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ المنقلب بمعنے الانقلاب ہے بمعنے الرجوع۔

اب معنی یہ ہوگا کہ کون سی کروٹ بدلیں گے اور مرنے کے بعد کہاں لوٹیں گے یعنی بُری سزا کی طرف ان کا رجوع ہوگا اور یہ بہت بُرا لوٹنا ہے کیونکہ اس کا انجام جہنم ہے۔ کاشفی نے کہا کہ ظالموں کو معلوم

ہوگا کہ وہ کون سے مکان میں واپس ہوں گے۔ وُہ یہ کہ ان کی واپسی جہنّم میں ہوگی۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وصیّت نامہ جب سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی زندگی سے مایوس ہُوئے تو سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بُلا کر لکھوایا :

وھوھذا ما عھد ابن ابی قحافہ الی المؤمنین فی الحال التی یؤمن فیھا الکافر۔

یہ وُہ عہدنامہ ہے جو ابن ابی قحافہ نے اہل ایمان کی طرف ایسے وقت میں لکھا جب کافر ایمان لاتا ہے (یعنی موت کے وقت)

اس کے بعد آپ پر غشی طاری ہوگئی افاقہ ہُوا تو لکھوایا :

انی استخلف علیکم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فانہ عدل فذالك ظنی فیہ وان لم یعدل سیعلم الذین ظلموا ایّ منقلب ینقلبون ۔

میں تم پر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بناتا ہوں کیونکہ وہ عادل ہیں اور یہ میرا گمان ہے اگر وہ عدل نہ کریں گے تو انہیں معلوم ہے کہ ظالمین کون سی کروٹ لوٹیں گے۔

ف : الظلم بمعنے انحراف عن العدالۃ اور عدول عن الحق یعنی اس حق سے رُوگردانی جو دائرہ میں بمنزلہ نقطہ کے ہے۔

ظالم کی اقسام ظالم تین قسم ہیں :

(۱) ظالم الاعظم ۔ وہ جو اللہ تعالیٰ کی شریعت سے خارج ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے قول : ان الشرك لظلم عظیم (شرک بہت بڑا ظلم ہے) سے یہی مراد ہے۔

(۲) ظالم الاوسط۔ وُہ جو احکام سلطانی کو اپنے اوپر لازم نہ جانے ۔

(۳) ظالم الاصغر ۔ وہ جو کاروبار سے بیکار رہ کر لوگوں کے منافع کھا جائے اور انہیں منافع سے محروم رکھے ۔

عدالت کی فضیلت عدالت کی ایک فضیلت یہ ہے کہ ظلم اس کی نقیض ہے اور ظلم کی توبہ نامکمل ہے جب تک عدالت قائم نہ ہوگی ۔ مثلاً چند چور آپس میں چوری کے مال کی شرط لگائیں پھر اس پر اگر کوئی پورا نہ اُترے تو ان کا کام بھی بگڑ جائے گا۔ جب ایک غلط کام عدالت کے بغیر نہیں چل سکتا تو پھر امورِ سلطنت کیسے عدالت کے بغیر چل سکتے ہیں۔

سبق عاقل پر لازم ہے کہ وہ وعدہ وعید کو ہر وقت مدِ نظر رکھے اور جور و ستم سے باز آجائے اگرچہ عادل ہو تب بھی اس کا خیال ضروری ہے۔

ہم پناہ مانگتے ہیں ترقی کے بعد تنزل سے۔ اللہ تعالیٰ ہر سالک کا معین اور راستوں کی ہلاکت سے نجات دینے والا ہے۔

تاریخ اختتام سورۂ شعرا از صاحبِ روح البیان

(صاحبِ روح البیان قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں :)

سورہ شعراء کا اختتام بروز خمیس ۹ ذیقعدہ ۱۱۰۸ھ میں ہوا۔

فقیر اویسی اس کے ترجمہ سے ۲۸ صفر المظفر ۱۴۰۳ھ

شبِ بدھ بعد نمازِ عشاء

فارغ ہوا۔

فللہ الحمد علیٰ ذالک

انتباہ کل شب منگل قبل عشاء ۲ صفر ۱۴۰۳ھ کو سورۂ فرقان کی تفسیر کے ترجمہ سے فراغت پائی۔ اس سے کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ اتنی بڑی سورۃ شعراء کی تفسیر ایک شب میں کیسے مکمل ہوگئی۔ اس کا ازالہ ضروری سمجھتے ہوئے فقیر اویسی غفرلہٗ عرض گذاشت ہے کہ فقیر تفسیر کے ترجمہ میں ترتیب ملحوظ نہیں رکھتا تھا بلکہ سفر و حضر میں جہاں سے جیسے ہی موقع ملتا لکھ لیتا۔ آج سے چند برس پہلے فقیر نے ان دونوں سورتوں کا ترجمہ کر لیا تھا۔ نظرِ ثانی کے وقت ان کے باقی ماندہ مضامین کو لکھا تو حسنِ اتفاق سے سورۂ فرقان کا بقایا بھی ایک شب و روز میں ختم ہوا اور سورہ شعراء کی تفسیر بھی شب و روز میں ختم ہوئی۔ ہذا آخر مارقمہ قلم الفقیر محمد فیض احمد اویسی رضوی غفرلہٗ۔ وصلی اللہ علیٰ حبیبہ الکریم وعلیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین۔

۲۸ صفر المظفر ۱۴۰۳ھ

سُورَةُ النَّمل

سورة النمل مكية وهی ثلث وتسعون اٰية وسبع ركوعات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ○ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ○ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ط سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ○ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِى النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ط وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۙ وَاَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ط يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ وقف اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ○ صلے اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ وقف فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ط اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ○ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○ ج وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ط فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ○ ع

ترجمہ: یہ قرآن اور روشن کتاب کی آیات ہیں ایمان والوں کے لیے خوشخبری اور ہدایت ہیں وہ جو نماز قایم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں بے شک وہ لوگ جو آپ پر ایمان نہیں لاتے ہم نے ان کے اعمال ان کی نگاہ میں سنگار دیئے تو وہ بھٹکتے پھرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے برا عذاب ہے اور یہی آخرت میں سب سے بڑھ کر خسارہ والے ہیں بے شک تم قرآن

سکھائے جاتے ہو حکمت اور علم والے کی جانب سے جبکہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی اہلیہ سے کہا بیشک ایک آگ نظر آرہی ہے میں ابھی تمہارے پاس اس کی خبر لاتا ہوں یا اس میں سے کوئی چمکدار چنگاری لاؤں تاکہ تم سینکو سو جب وہ آگ کے قریب آیا آواز دی گئی اے موسیٰ! برکت دیا گیا وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے ارد گرد ہیں اور پاکی ہے اللہ کو جو پروردگارِ عالم ہے اے موسیٰ (علیہ السلام) بات یہ ہے کہ میں ہوں اللہ عزت والا حکمت والا اور اپنا عصا ڈال دے پھر موسیٰ (علیہ السلام) نے اسے دیکھا لہراتا ہوا گویا وہ سانپ ہے پیٹھ پھیر چلا اور مُڑ کر نہ دیکھا (ہم نے فرمایا) اے موسیٰ (علیہ السلام) مت ڈر میرے ہاں پیغمبروں کو خوف نہیں ہوتا ہاں جو حد سے تجاوز کرے پھر بُرائی کے بعد نیکی سے بدلے تو بیشک میں غفور رحیم ہوں اور اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال وہ سفید چمکیلا بے عیب نکلے گا نو نشانیوں کے ساتھ، فرعون اور اس کی قوم کی طرف، بے شک وہ فاسق لوگ ہیں پھر جب ہماری روشن نشانیاں ان کے پاس آئیں تو کہنے لگے یہ تو صریح جادو ہے اور ظلم و تکبر سے وہ ان کے منکر ہو گئے حالانکہ ان کے دلوں کو ان کا یقین ہو گیا تھا سو دیکھئے کہ فسادیوں کا انجام کیسے برباد ہوا۔

تفسیر عالمانہ سورۃ النمل مکیہ ہے اس کی ترانوے یا چورانوے آیات ہیں۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع وہ مہربان اور رحیم ہے۔ طٰسٓ یہ دراصل ھذہ طٰسٓ تھا یعنی یہ وہ سورت ہے جس کا نام طٰسٓ ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ طاء میں عُشاق کے قلوب کی پاکیزگی کی طرف اور سین میں اس سر (راز و رموز) کی طرف اشارہ ہے جو اس کے اور اس کے بندوں کے درمیان ہے کہ جہاں نہ کوئی فرشتہ دم مار سکتا ہے اور نہ کوئی نبی مرسل۔ (اس سے مرسل و انبیاء کی نفی بظاہر مبالغہ ہے ورنہ وہ مقام تو انہی خواص کا ہی تو ہے)۔

۲۔ ان دونوں لفظوں میں قسم مطلوب ہے یعنی قسم ہے طالبین یعنی عُشاق کے قلوب کی اور قسم ہے ان کے قلوب کی سلامتی کی کہ وہ ماسوائے حق تعالیٰ کے بے نیاز ہیں۔

۳۔ کشف الاسرار میں ہے کہ طاء میں طہارۃ قدس کی طرف اور سین میں اس کی عزت کی سنا یعنی چمک کی طرف اشارہ ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مجھے اپنے قدس کی طہارۃ اور عزت کی چمک کی قسم کہ میں کسی آرزو مند کی آرزو کو نہیں ٹھکراتا۔

۴۔ بعض بزرگوں نے فرمایا کہ طاء میں طول یعنی اس کے فضل کی طرف اور سین اس کے سنا، یعنی اس کی بلندی کی طرف اشارہ ہے۔

ف: طٰسٓمٓ میں اس قسم کی کافی بحث بیان کی گئی ہے وہاں دیکھ لیجیئے۔

ہمدانی قدس سرہٗ کا مقالہ حضرت عین القضاۃ الہمدانی قدس سرہٗ کے مقالات میں ہے کہ اگر قرآن مجید میں حروف مقطعات نہ ہوتے تو میں ہرگز ایمان نہ لاتا۔

کفر کا فتوٰی فقیر (صاحب روح البیان قدس سرہٗ) کہتا ہے کہ موصوف کے اس کلمہ پر ان کے ہم عصر کثیر علماء نے آپ پر کفر کا فتوٰی صادر فرمایا یہ ان علماء کرام کی عجلت کا نتیجہ تھا ورنہ اہل علم پر اس مقولہ کا سمجھنا آسان ہے وہ یہ کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ ان حروف کے باطنی معانی پر آگاہی سے ہمیں ایمان کا موقعہ نصیب ہوا ہے جیسا کہ ارباب حقائق کا طریقہ ہے کہ وہ ایسے دقیق امور سے معرفت الٰہی پاتے ہیں جس سے ان کے ایمان عیانی کے انوار میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔

تِلْكَ یہ عظیم الشان سورۃ یا وہ آیات جو اس سورۃ میں ہیں "اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ" قرآن کی آیات یعنی وہ قرآن جو اعلیٰ شان والا معروف و مشہور ہے یعنی ان کی بعض آیات جو مخصوص نام سے موسوم ہیں لیکن قرآن مجید سے جملہ قرآن مراد ہے جو اس سورۃ کے نزول کے وقت نازل ہو چکا تھا کیونکہ جب بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے تو فوراً فہم میں یہی نازل کردہ کلام الٰہی آجاتا ہے۔ وَكِتَابٍ اور عظیم الشان کتاب مُّبِيْنٍ ۝ حکمتوں اور حکموں اور آخرت کے امور کو ظاہر کرنے والی ہیں۔ منجملہ اس کے ثواب و عذاب ہے یا یہ کہ اس کا اعجاز اور اس کی صحت ظاہر ہے۔

حل لغات یہ ابان سے ہے بمعنے بان یعنی ظہر اس کا عطف کتاب پر عطف الصفۃ علی الصفۃ سے قبیل ہے جیسے "غافر الذنب و قابل التوب" گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا۔ یعنی یہ اس کلام کی آیات نہیں جو قرآنیہ و کتابیہ کا جامع ہے یعنی بایں معنی کہ اسے پڑھا اور لکھا جاتا ہے قرآنیۃ کی صفت کی تقدیم اس لیے ہے کہ پڑھنا پہلے ہے اور لکھنا بعد میں۔

سوال: سورۃ حجر میں قرآنیہ کیوں مؤخر ہے؟

جواب: اس میں یہ اشارہ مطلوب ہے کہ یہ تمام کتاب کتب الٰہیہ سے ممتاز ہے بلکہ ان تمام کی جامع ہے گویا کہ ان تمام کتب کی یہی ایک ہے۔

ف: کشف الاسرار میں ہے کہ قرآن و کتاب ہر دونوں اس کلام الٰہی کے علم ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور دونوں وصف بھی ہیں بایں معنٰی کہ اسے پڑھا لکھا جاتا ہے۔

ف: جب ان پر الف لام تعریف داخل ہو تو وہ علمیّت پر دلالت کرتا ہے کہ اگر نکرہ ہوں تو ان کی وصفیّت مراد ہوگی۔

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وہ آیات اہل ایمان کی ہدایت دینے والی اور خوشخبری سنانے والی ہیں۔ مصدر فاعل کے قایم مقام ہے مبالغہ کے لیے گویا کہ وہ سراسر ہدایت و بشارت ہے۔

سوال: اہل علم تو ہدایت یافتہ ہیں پھر ان کو ہدایت دینے کے کیا معنی؟

جواب : ان کی ہدایت میں اضافہ فرماتی ہیں جیسا کہ اللہ نے فرمایا "فزادھم ایمانا" ان کے ایمان کو بڑھایا۔ اور تبشیر کا مطلب ظاہر ہے کہ آیات اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل کی ان کو خوشخبری سناتی ہیں۔

سوال : ایمان والوں کی تخصیص کیوں حالانکہ یہ سب کے لیے ہدایت ہے؟

جواب : چونکہ یہی لوگ ان آیات سے نفع پاتے ہیں اسی لیے ان کی تخصیص کی گئی۔

اَلَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ ۔ یہ مومنین کی صفت مادحہ ہے۔

سوال : اہل ایمان کی یہ دو صفتیں کیوں مذکور ہوئیں؟

جواب : ایمان کی یہی دو صفتیں قرین اور عبادات بدنیہ و مالیہ کے دو اہم شعبے بلکہ باقی جملہ عبادات ان کے توابع ہیں اسی لیے ان کی تخصیص کی گئی۔

اب معنی یہ ہوا کہ وہ لوگ نماز کو اس کے شرائط و ارکان کے ساتھ اوقات میں ادا کرتے ہیں اور صدقہ مفروضہ مستحقین کو دیتے ہیں۔

وَھُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ھُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ۝ اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں ۔ یہ صلہ کا تتمہ ہے اور واو حالیہ ہے یعنی ان کا حال یہ ہے کہ وہ تصدیق کرتے ہیں کہ قیامت یقیناً آئے گی اور ان کا اس پر علم یقینی ہے ۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ بیشک دوسری دار میں ضرور جائیں گے اور ضمیر کا تکرار اشارہ کرتا ہے کہ آخرت کے آنے کا صرف انہیں یقین ہے یا یہ جملہ معترضہ ہے گویا کہا گیا ہے کہ یہ لوگ ایمان لاتے اور نیک عمل کرتے ہیں اور صرف ان کو یقین کامل ہے کہ آخرت آئے گی نہ ان کے ماسوا کو اس لیے کہ مشقات اور تکالیف کی برداشت انجام کے خوف سے ہوتا ہے اور ڈرتے رہتے ہیں کہ نامعلوم ان کا حساب کس طرح ہوگا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ بیشک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے یعنی مرنے کے بعد اٹھنے کی تصدیق نہیں کرتے ۔ زَیَّنَّا لَھُمۡ ہم نے ان کے کردار سنگار دیے یعنی ان کے قبیح اعمال جو سراسر شہوت ہیں انہیں اچھے لگتے ہیں اور نفس کو ان سے پیار ہے۔

حدیث شریف حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا شہوات نے جہنم کو گھیرے میں لیا ہوا ہے یعنی جہنم کو ایسے امور نے گھیرا ہوا ہے جو نفس کی لذت اور محبت پر مشتمل ہیں۔

معتزلہ و قدریہ کا رد ہر مشیت اور تزیین و اضلال اور اس جیسی آیات اللہ تعالیٰ کی طرف حقیقتاً دوسروں کی طرف بالتبع مجازاً منسوب ہیں ایسی آیات معتزلہ اور قدریہ کا رد ہیں کہ وہ ایسے افعال کی طرف اللہ تعالیٰ کو منسوب کرنا حرام سمجھتے ہیں۔

فَھُمۡ یَعۡمَھُوۡنَ ۝ تو وہ ایسے قبیح امور میں ہمیشہ متحیر و منہمک رہتے ہیں انہیں ان کے قبائح مضر کا تصور اور خیال بھی

نہیں گذرتا۔ فاء مسبب کی ترتیب علی السبب کے لیے ہے۔ خلاصہ یہ کہ لوگ ہمیشہ سرگرداں پھرتے رہتے ہیں العمہ بمعنی کسی معاملہ میں متحیر کے ساتھ متردد ہونا۔ "اُولٰٓئِکَ" وہی لوگ جو کفر وعمہ سے موصوف ہیں۔ "اَلَّذِیْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ" یہ وہ لوگ ہیں جس کے لیے دنیا میں برا عذاب ہوگا جیسے بدر میں قتل اور قید۔

حل لغات : السوء بمعنی ہر وہ فعل جو انسان کو برا لگے اور مغموم کرے۔

وَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ○ اور وہ آخرت میں بہت بڑے خسارے والے ہیں وہ تمام لوگوں سے بہت گھاٹے میں ہیں۔ اس وجہ سے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدنے سے وہ بہشت اور ان کی نعمتوں اور دوزخ کی نجات سے محروم ہوگئے۔

ف : اہل دنیا جنت کے خسارہ میں ہیں اور طالب جنت مولیٰ کے دیدار سے محروم ہیں جس نے کونین کی طرف توجہ نہیں کی وہ مولیٰ کے دیدار سے مشرف ہوگا۔

حکایت : سیدنا ابو یزید بسطامی قدس سرہٗ نے جنگل میں ایک کھوپری پائی جس پر لکھا تھا خسر الدنیا و الاخرۃ یہ دنیا اور آخرت میں گھاٹے میں رہا۔ حضرت بایزید دیکھ کر رو پڑے اور کھوپری کو چومنے لگے اور فرمایا یہ کھوپری کسی صوفی کی ہے اسی لیے اس کا خسارہ صرف اسی کو ہے جس نے مولیٰ کو پالیا اس نے سب کچھ پالیا اور جو کل کو مولیٰ کے سوا پا لیتا ہے سمجھو کہ اس نے کچھ فائدہ نہ پایا۔

حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا:

اوقات خوش آن بود کہ بادوست بسر رفت
باقی ہمہ بی حاصل و بے خبری بود

ترجمہ : اس کے جملہ اوقات خوش ہیں جو زندگی اپنے محبوب کے ساتھ بسر کی اس کے سوا باقی تمام بے حاصل اور بے خبری ہے۔

حکایت : بعض عارفین کو چالیس حوریں آسمان پر جلدی سے اڑتی ہوئی نظر آئیں جن کا لباس سونے اور چاندی کا اور موتیوں سے بھرپور تھا۔ فرمایا میں نے ان کی طرف نظر اٹھائی تو مجھے چالیس دن تک سزا میں رکھا گیا۔ اس کے بعد اتنی ہی اور حوریں دکھائی گئیں جو حسن وجمال میں ان سے بھی بڑھ کر تھیں مجھے حکم ہوا کہ میں نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھوں میں سنتے ہی سجدہ میں گر گیا اور آنکھیں بند کر کے کہا کہ میں تیرے سے پناہ مانگتا ہوں مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں میں روتا رہا گڑگڑاتا رہا یہاں تک کہ حوریں میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں۔

ف : عارفین کا یہی حال ہے کہ وہ ماسوا اللہ کی طرف التفات نہیں کرتے بلکہ وہ عالم ملک و ملکوت سے بے نیاز ہوتے ہیں چونکہ جہال کو ماسوی اللہ سے محبت ہوتی ہے اسی لیے ان کے دل کی آنکھیں اندھی اور کان بہرے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ عالم معنیٰ میں بہرے گونگے ہوتے ہیں۔ اسی طرف اشارہ فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

نے "حبك الشئی یعمی ویصم" تجھے کسی کی محبت اس کے عیوب دیکھنے سننے سے اندھا وبہرہ کر دیتی ہے بخلاف ظاہری اندھے کے کہ اس کی سمع بحال رہتی ہے کہ وہ دعوت کو سنتا اور قبول کرتا ہے۔

سبق: عاقل پر لازم ہے کہ ان اعمال قبیحہ سے اجتناب کرے جو اسے دل کی سیاہی اور ہلاکت کی طرف لے جانے والے ہیں اور ان اخلاق رذیلہ سے دور رہے جو دل کو اندھا کرنے والے ہیں بلکہ عمل بالقرآن کے لیے جدوجہد کرے جو واصل باللہ بناتا ہے اور ہر گھاٹے سے محفوظ فرماتا ہے۔ لہٰذا ہر عاقل کو چاہیئے کہ وہ ایسے ہی عمل صالح اور نماز پڑھنے میں کوشاں رہے۔

نکتہ: قیام نماز اس لیے ہے کہ اس حالت میں بندہ اپنے مولا سے مناجات کرتا ہے بخلاف اس کی دوسری ہیئت کے ان میں یہ کیفیت نہیں ہوتی اور قیام قیومیت سے مشابہت رکھتا ہے اور بڑوں کے ساتھ گفتگو کرنے کے آداب سے ایک یہ بھی ہے کہ بحالت قیام عرض و معروض کیا جائے مثلاً بادشاہوں کے ساتھ جب کوئی رعایا بات کرتا ہے تو سامنے کھڑے ہو کر بیٹھ کر بات کرنا بے ادبی سمجھا جاتا ہے۔ شرع نے عرف کا تبع کرتے ہوئے نماز میں قیام کا حکم فرمایا۔

ف: عارفین کے آداب سے ہے کہ ہر نماز میں خواہ فرض ہو یا نفل معین کر کے کسی خاص سورۃ کی تلاوت کرے نہ ہی کسی خاص آیت کا تعین کرے کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس کا مولیٰ کس طریقہ سے اسے مناجات کا موقع بخشتا ہے۔ پس عارف کو وہی کافی ہے جو وہ اپنے مولا سے ہمکلامی کرتا ہے یا اپنے دل میں اس کا تصور لاتا ہے اس لیے کہ حضور قلب کے بغیر جو نماز ادا کی جائے وہ مردے کی طرح بلا روح ہے اور جس میں روح نہ ہو تو وہ اپنے مولا کے حضور قیامت میں حاضر نہ ہو سکے گا۔ اعمال صالحہ میں (مذکورہ) زکوٰۃ و صدقہ بھی ہے افضل وہ ہے جو بحالت صحت و تندرستی کی حالت میں ہے۔

ف: مرتے وقت اگر صدقہ و زکوٰۃ دینا چاہے تو نیت کرے گا کہ میں امانت والے کی امانت دے رہا ہوں اس طرح سے وہ قیامت میں ان امانت دار کے ساتھ اٹھے گا جو مرتے وقت دیتے ہیں کیونکہ اس میں کسی قسم کی فضیلت نہیں۔ یہ حیلہ ہے اپنی صدقہ کی فضیلت حاصل کرنے کا کہ خرچ بھی ہو اور نفع کم ہو تو گھاٹے کا سودا ہوتا ہے اب ایسے حیلہ سے اس صدقہ کی مثال اس دانے کی ہو گی جو زمین میں ڈالا جائے تو چند دنوں کے بعد وہ ایک کے بجائے سینکڑوں دانے بنا ڈالتا ہے۔

تفسیر عالمانہ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ اور اے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے شک تم حاصل کرتے ہو قرآن کو۔

حل لغات: تلقی الکلام من فلان ولقنہ سے ہے بمعنی فلاں نے فلاں کلام پا یا یہ اس وقت بولتے ہیں

جب کوئی اس کے منہ کی بات بلاواسطہ حاصل کرے اور اس سے براہ راست سمجھے (تاج المصادر) میں ہے کہ التلقیۃ چیزی پیش کسی آوردن کسی کے آگے کوئی شے لانا۔ تلقی و تلقن و تلقف کا فرق سورۃ نور میں بیان ہو چکا ہے۔
مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ۝ بواسطہ جبریل علیہ السلام حکیم علیم سے نہ کہ اپنی طرف سے اور نہ ہی کسی اور سے جیسے کافروں کی بد گمانی ہے۔

حل لغات : لدن بمعنی عند لیکن لدن عند سے زیادہ بلیغ اور زیادہ خاص ہے اور حکیم علیم کی تنوین تفخیم و تعظیم کے لیے ہے یعنی بہت بڑی حکمت والا اور بہت بڑا علم والا ان کی تفخیم قرآن پاک کی عظمت کی طرف اشارہ ہے اور بتاتا ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی قرآن پاک کو پورے طور سمجھتے اور مکمل طور پر اس کے علم کا احاطہ رکھتے ہیں اور آپ کو ہی اس کے جملہ جلائل و دقائق کا علم ہے کیونکہ جو ذات ایسے حکیم و علیم سے علم و حکمت براہ راست حاصل کرتی ہے پھر اس کے علم و حکمت کا کیا کہنا۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ اے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ ہر رسول علیہ السلام کے ہر کمال کی حد سے آگے نکل گئے ہیں اس لیے کہ وہ کتاب جبریل علیہ السلام کے ہاتھوں سے لینے اور پیغامات جبریل علیہ السلام کے لفظوں سے حاصل کرتے لیکن آپ ہیں کہ آپ قرآن مجید اگرچہ جبریل علیہ السلام کے نازل کرنے سے حاصل کرتے ہیں لیکن قرآن کے حقائق حکیم و علیم سے پاتے ہیں کہ وہ آپ کے قلب مبارک پر براہ راست تجلّی ڈالتا ہے جس سے آپ کا قلب مبارک قرآنی حکمتوں سے لبریز ہو جاتا ہے اور یہ خاص صفت ہے جو اللہ کے ساتھ قائم ہے۔ اس معنی پر آپ کا علم حقائق القرآن پر مشتمل ہے اور اللہ نے آپ کو بلاواسطہ فیض قرآن کے قبول کرنے کی استعداد بخشی ہے اسے علم لدنی کہا جاتا ہے اور وہ اللہ بہت بڑا علم والا ہے جسے رسالت کا اہل جانتا ہے تو اسے ہی رسالت سے نوازتا ہے۔

نکتہ : حکیم و علیم دونوں اسموں کو یکجا لانے میں اشارہ ہے کہ قرآن کے علوم عقائد و شمائل پر مشتمل ہیں یا پھر ان میں قصص و اخبار غیبیہ ہیں۔

تفسیر عالمانہ (مربط) اب ان علوم کے بعض کا ذکر فرمایا کہ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یاد دلائیے اپنی قوم کو وہ وقت جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اہلیہ اور دیگر اپنے ان ساتھیوں کو فرمایا جو وادیٔ طور میں ان کے ساتھ تھے۔ اھل الانسان کے مخصوص گھر والے (اس میں شیعہ کا رد ہے جو اہلبیت کا اطلاق صرف اولاد فاطمہ و حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر کرتے ہیں حالانکہ اس کا اصل اطلاق ازواج پر ہے اور مجازاً ان مذکورہ بالا حضرات پر۔

واقعہ روانگی موسیٰ علیہ السلام حضرت موسیٰ شعیب علیہما السلام کے ہاں دس سال

گذار کر شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی یعنی اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر مصر روانہ ہوئے ۔ اس ارادہ پر کہ اپنی والدہ اور اپنی دو بہنوں سے ملاقات کریں ۔

ف : آپ کی ایک ہمشیرہ قارون کی منکوحہ تھیں اور دوسری یوشع بن نون کی ۔ راستہ طے کرتے ہوئے راہ بھول گئے رات اندھیری اور سخت سردی تھی آپ کی اہلیہ کو وضع حمل ہونے لگا موسیٰ علیہ السلام نے دیا سلائی جلائی اس روشنی سے آپ کو طور (پہاڑ) کی جانب آگ محسوس ہوئی ۔ اسی لیے اپنے اہل و عیال کو فرمایا ٹھہرو "اِنِّیْ اٰنَسْتُ نَارًا" بے شک میں نے آگ محسوس کی ہے یعنی مجھے آگ نظر آئی ہے ۔

حل لغات : الا یناس بمعنی دیکھنا (تاج المصادر) یہ باب ظہور الشیئ پر دلالت کرتا ہے اور ہر وہ شے جو طریقہء توحش کے منافی ہو ۔

ف : مقاتل نے فرمایا کہ نار بھی دراصل نور تھا اور وہ ربّ العزۃ کا نور تھا ۔ یہ جمعہ کی رات تھی ارض مقدسہ میں پہاڑ کے دائیں جانب یہ واقع ہوا ۔

ف : تجلیٔ نور کا نار کی صورت میں ظاہر ہونے کا راز ہم سورۃ طٰہٰ میں بیان کر آئے ہیں ۔

"سَاٰتِیْکُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ" "عنقریب میں تمہارے ہاں خبر لاؤں گا ۔ یعنی راستہ کی تحقیق کر کے لاؤں گا کہ وہ کہاں ہے ۔ سین بُعد مسافۃ پر دلالت کرتا ہے یا خبر لانے کی یا وعدہ پورا کروں گا ۔ اگرچہ دیر باید اس معنی پر یہ سین تاکیدیہ ہو گا یعنی بہت جلدی میں آپ کو آگ سے خبر لاؤں گا یا جو بھی وہاں موجود ہو گا اس سے پوچھ کر حال چال کی خبر لاؤں گا ۔

"اَوْ اٰتِیْکُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ" یا لاؤں گا میں تمہارے ہاں آگ سے چنگاری ۔

ف : قبس بڑی سی آگ سے چھوٹی سی چنگاری کو کہا جاتا ہے بہر حال وہاں اور کچھ بھی نہ ہو گا تو کم از کم کوئی راہ بتانے والا تو ہو گا کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے دو محرومیوں کا باعث نہیں بنتا ۔

حل لغات : اقتبست منہ نارا وعلما بمعنی استفدتہ منہ یعنی میں نے اس سے استفادہ کیا ۔ المفردات میں ہے الشہاب بمعنے وہ نورانی شعلہ جو جلنے والی آگ سے چمک اٹھے اور قبس وہ روشنی جو اس شعلہ سے حاصل ہو اور اقتباس بمعنے اس شعلہ کے طلب اب اس کا استعارہ علم و ہدایت کے لیے ہے ۔

سوال : سورۃ طٰہٰ میں فرمایا "لعلی آتیکم" امید ہے لاؤں گا تمہارے ہاں ۔ اور یہاں فرمایا سآتیکم جملہ خبریہ یقینی طور اور ان دونوں میں تضاد اور کلام الٰہی تضاد و اختلاف سے پاک ہے ؟

جواب : کوئی تضاد نہیں کیونکہ عرفاً جس بندے کو کسی کام پر امید غالب ہو جاتی ہے تو اس طرح کہتا ہے "سافعل کذا" اگرچہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے خلاف بھی ممکن ہے یہاں بھی اسی عرف کے مطابق کہا گیا ہے ۔ **لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ** امید ہے کہ تم اس گرمی سے ٹھنڈک حاصل کرو گے ۔ الصلاء بمعنے بڑی آگ اور الاصطلاء بمعنے آگ سے

گرم ہونا۔

فائدہ طبیہ: آگ سینکنا دل کو سخت کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آگ سینکنا مروی نہیں۔

"فَلَمَّا جَاءَهَا" پس موسیٰ علیہ السلام آگ کے قریب گئے تو وہاں نور ہی نور تھا جو درخت سے نکل رہا تھا اور اس میں جلانے کا نام تک نہ تھا حالانکہ آگ کا کام جلانا ہے لیکن وہ آگ ایسی نہ تھی۔ اور جس درخت سے روشنی نکل رہی تھی وہ کیکر کا درخت تھا۔ "نُودِيَ" "ندا دیئے گئے" یعنی موسیٰ علیہ السلام کو ندا سنائی دی اور وہ کلام طور کی جانب سے سنائی دیتا تھا۔

تفسیر صوفیانہ عرائس البیان میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ابتدائی دور میں مقام عشق و محبت میں تھے اور آپ کے مکاشفات کے اکثر احوال میں التباس رہتا تھا اسی لیے اللہ نے ان کے لیے ایسے مکاشفات پر درخت اور آگ بمنزلہ آئینہ فعلیہ کے مقرر کیا پھر اپنی ذات کے جلال و جمال کے تجلیات موسیٰ علیہ السلام کو نوازا اور انہیں رسوم انسانیت میں لایا گیا تاکہ وہ گھبراہٹ میں نہ آئیں۔ پھر جب آگ اور درخت کے قریب ہوئے تو پھر اللہ نے انہیں پکارا جب کہ انہیں پہلے جلال کے مشاہدہ سے نواز چکے تھے اگر ایسے نہ ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام اللہ کی عظمت و عزت کے سطوات سے فنا پا جاتے۔

"أَنْ" مفسرہ ہے اس لیے کہ النداء میں قول کا معنیٰ ہے یعنی بُورِكَ یا یہاں باء محذوف ہے دراصل "بان بورك" تھا اس وقت ان مصدریہ ہو گا۔ باء حذف کر کے ان کو اس کے قائم مقام کھڑا کیا گیا ہے جیسا کہ قاعدہ ہے بُورِكَ بَارَكَ کا صیغہ مجہول ہے اور یہ جملہ خبریہ ہے دعائیہ نہیں یعنی بابرکت بنایا گیا۔

مَنْ فِي النَّارِ بورك کا نائب فاعل ہے یعنی برکت والا ہے وہ جو آگ کی جگہ میں ہے اس سے مراد وہ مبارک جگہ ہے) جو "نودی من شاطئ الوادی الایمن فی البقعة المبارکة" میں مذکور ہے

"مَنْ حَوْلَهَا" اور وہ جو ان کے اردگرد ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس میں مبارک عام ہے ہر اس کے لیے جو اس جگہ میں ہیں۔ اردگرد کے مقامات یعنی شام کے علاقے کیونکہ یہ انبیاء علیہما السلام کے مبعوث ہونے کا مرکز ہے اور یہ برکت ان کی زندگی اور موت ہر لحاظ سے ہے بالخصوص وہ جگہ جہاں موسیٰ علیہ السلام اللہ سے ہم کلام ہوئے۔

ف: موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ابتدائی کلام میں بشارت تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے ایک بہت بڑا کام مقرر ہونا ہے۔ کہ جس کے برکات زمین کے اقطار میں پھیلیں گے اور وہ بڑا کام یہی کلام بر ذات اقدس اور نبوت کا حامل ہونا اور اظہار معجزات وغیرہ اور ظاہر ہے کہ جس جگہ مشاہدہ حق اور کلام الٰہی نصیب ہو تو وہ جگہ یقیناً مبارک ہو گی۔ کسی قائل نے فرمایا۔

اذا نزلت سلمی بواد فماؤه
زلال وسلسال وجثجاثه ورد

ترجمہ: جب سلمیٰ کسی وادی میں اترتی ہے تو اس کا پانی صاف ستھرا ہو جاتا ہے۔

ف: اللہ والوں کے جہاں قدم جمتے ہیں وہ جنگل ہوں یا پہاڑ تو وہ سرسبز و شاداب ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کے حالات میں اللہ کے فضل و کرم سے برکات و فیوضات ہوتے ہیں۔

ف: بعض مفسرین نے بودك کو دعا پر محمول کیا ہے جیسا کہ کاشفی مرحوم نے فرمایا کہ خدا کرے برکت دی جائے

ف: بعض مفسرین نے فرمایا "من فی النار" سے ملائکہ مراد ہیں۔ (اب معنی یہ ہوگا کہ اللہ نے برکت دی اس جگہ سے جو نور ظاہر ہوا اور ان ملائکہ کو جو اسی نور میں تھے۔

صوفیانہ تقریر بعض عارفین نے فرمایا "من فی النار" سے خود ذات باری تعالیٰ ہے یعنی وہ ذات حق جس نے موسیٰ علیہ السلام کو برکت مشاہدہ سے فیض یاب فرمایا۔ کیونکہ اللہ مالک ہے چاہے تو وصف نور میں تجلی فرمائے یا نار میں یا شجر میں یا طور میں یا کسی اور شئے میں جو اس کے عاشق کے حال کے لائق ہو باوجودیکہ اس کی ذات و صفات جہت وغیرہ سے منزہ ہے۔

حدیث شریف ان اللہ یری ہیئۃ ذاتہ کیف یشاء۔

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ اپنی ذات کو جس ہیئت میں چاہے دکھائے۔

"وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" اور اللہ پروردگار کے لیے پاکی اس تمام کلام سے جس کے ساتھ نداء دے دی گئی تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا کلام کسی شے کے مشابہ ہے اور تعجب دلانے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ وہ بہت بڑی عزت و عظمت والا ہے خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر تشبہ سے پاک و منزہ ہے۔

ف: منقول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب ندا سنی تو کہا کہ پکارنے والا کون ہے اس کے بعد دوسری ندا آئی کہ

"يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗ" اے موسیٰ علیہ السلام بے شک شان یہ ہے کہ "اَنَا اللّٰهُ" یہ شان کے لیے جملہ مفسرہ ہے یعنی میں اللہ تعالیٰ۔ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ عزیز حکیم ہوں قوی ہوں اپنی قدرتوں کا مالک ہوں کہ جو امور وہم و خیال سے بالاتر ہوتے ہیں میں انہیں کر دکھاتا ہوں اور بڑی حکمت اور نہایت تدبیر سے وہ کام سرانجام دیتا ہوں۔

سوال: الاسئلۃ المقحمۃ میں ہے کہ "انہ انا اللہ" کا کلمہ موسیٰ علیہ السلام نے درخت سے سنا اور یہ تو حدوث پر دلالت کرتا ہے کیونکہ جو آواز کسی جہت سے سنی جائے وہ حادث ہوتی ہے۔

جواب: ہم اللہ کے کلام کو جہت و مکان سے منزہ سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی اس کی ذات کو ایسے ہی اس کے کلام کو اصوات و حروف سے بھی منزہ سمجھتے ہیں۔ ہاں موسیٰ علیہ السلام کو کلام الٰہی کا سماع درخت سے نصیب ہوا اس معنی پر یہ جہت برائے سماع موسیٰ علیہ السلام ہے نہ کہ کلام الٰہی کے لیے۔

سوال : موسیٰ علیہ السلام نے کلام الٰہی کو صوت و حرف و جہت کے بغیر کیسے سُنا ہوگا ۔
جواب : اگر یہ سوال ہے کیفیت کلامِ حق تو سرے سے یہ سوال ہی غلط ہے کیونکہ ذات وصفات الٰہی میں کیفیت کا سوال محال ہے مثلاً یوں کہا جاتا کہ اس کی ذات جسم و جوہر و عرض کے بغیر کیسے ہے یا کہا جائے کہ کسب و ضرورت کے بغیر اس کا علم کیسے ہے ایسے ہی بلا صلابۃ اس کی قدرت کیسی ہے ایسے ہی بغیر شھوۃ و امنیۃ کے اس کا ارادہ کیسا ہے ایسے صوت و حرف کے بغیر اس کا کلام کیسا ہے ۔ اور اگر سماع موسیٰ علیہ السلام کی کیفیت کے متعلق سوال ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام میں علم ضروری پیدا فرمایا جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم گیا کہ یہ جو میں نے سُنا ہے یہ کلام الٰہی ہے اور وہ ازلی ہے قدیم ہے اور وہ کلام حرف و صوت کے بغیر ہے اور جہت سے بھی نہیں ویسے انہوں نے کلام جہات ستہ سے سنا اور آپ کا تمام جسم بمنزلہ کان کے ہوگیا ۔ اور ان شاء اللہ آخرت میں بھی ایسے ہی ہوگا ۔ اور دنیا میں کامل واصل آخرت کے حکم میں ہے ۔

(لہ ۔ یہی قاعدہ وہابیہ اور ہمارے درمیان اختلافی ہے کہ ہم اللہ والوں کے عادات و اطوار آخرت کے حکم کی طرح مانتے ہیں اور وہ اپنی مثل دنیوی حکم میں سمجھتے ہیں)۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ عطف بورك پر ہے اب معنی یہ ہوا کہ ان بورك من فی النار وان الق عصاك ۔ یہ کہ مبارک ہے وہ جو آگ میں ہے اور یہ کہ ڈال دے اپنا عصا ۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ جو اللہ کا کلام سُن لیتا ہے اور اس کے انوار کا مشاہدہ کر لیتا ہے تو اپنی ہمت کے ساتھ سے سوائے اللہ تعالیٰ کے توکل کے باقی تمام سہاروں کے ڈنڈے پھینک دیتا ہے پھر وہ صرف اور صرف اللہ کے فضل و کرم پر بھروسہ رکھتا ہے اور بس ؎

تکیہ بر غیر خدا کفر ہست از کفر طریق
جز بفضل حق مکن تکیہ درین رہ ای رفیق

ترجمہ : طریقت کے قانون پر غیر خدا پر تکیہ کرنا کفر ہے ۔ اس راہ میں اے دوست سوائے اللہ کے کسی اور کا سہارا نہ لے ۔

فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ فا فصیحیہ جملۃ محذوفۃ کی وضاحت کرتی ہے گویا کہا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام عصا زمین پر مارتا تو دوڑتا ہوا سانپ بن جاتا ۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے اسے دیکھا تو بہت شدید حرکت کرتا اور ہر طرف دوڑتا تھا ۔ **كَاَنَّهَا جَآنٌّ** گویا وہ اژدہا تھا ۔

لہ ۔ اضافہ از اویسی غفرلہٗ ۔

ف : جانٓ وہ سانپ جو ہلکا ہو لیکن تیز رفتار۔

سوال : اتنے بڑے اژدہا کو جانٓ سے کیوں تشبیہ دی گئی ہے ؟

جواب : سرعۃ حرکۃ اور النواء میں مشابہت ہے اور جانٓ سانپوں کی قسم ہے جو عموماً جنگلوں میں رہتا ہے اور ایذا نہیں دیتا۔ (کما فی القاموس)۔

ف : ابو اللیث رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا صحیح یہ ہے کہ ثعبان فرعون کے پاس اور جانٓ طور کے نزدیک رہتے تھے۔

ف : اس میں اشارہ ہے کہ جو بھی غیر اللہ پر سہارا کرتا ہے اس کے پاس معنوی ثعبان ہوتا ہے جیسا کہ مثنوی شریف میں ہے۔

ہر خیالے کو کند در دل وطن
روز محشر صورتے خواہد شدن

ترجمہ : ہر وہ خیال جو دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے وہ قیامت میں کسی ایک صورت میں ظاہر ہو گا۔

تفسیر عالمانہ وَلّٰی بمعنی لوٹا۔ پیچھے ہٹا حضرت موسیٰ علیہ السلام **مُدۡبِرًا** درآنحالیکہ پیٹھ پھیرنے والے تھے خوف سے۔

ف : کشف الاسرار میں ہے "ادبر عنہا وجعلہا تلی ظہرۃ" اس سے منہ پھیرے رہنے سے دوسرے کو پیٹھ دی۔

وَلَمۡ یُعَقِّبۡ ط اور مڑ کے نہ دیکھا یعنی عقب المقاتل جنگی نے پیٹھ پھیری یہ اس وقت بولتے ہیں جب بھاگنے کے بعد دوبارہ پھرے۔

ف : حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ خوف طاری ہوا تھا اس خیال سے کہ شاید اس سے ان کی ہلاکت کا ارادہ کیا گیا ہے **یٰمُوۡسٰی لَا تَخَفۡ** قف دلالت کرتا ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا کہ خوف نہ کیجیے میرے سوا اور کسی پر بھروسہ نہ کیجیے۔ **اِنِّیۡ لَا یَخَافُ لَدَیَّ** بے شک میرے ہاں خوف نہیں کرتے۔ **الۡمُرۡسَلُوۡنَ** پیغمبران عظام علیہم السلام یہ جملہ دلالت کرتا ہے کہ نفی الخوف مطلقاً ہے نہ یہ کہ جمیع الاوقات ان کو خوف نہیں ہوتا بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ بوقت خطاب کسی سے خوفزدہ نہیں ہوتے کیونکہ اس وقت شوئون الٰہی میں مستغرق ہوتے ہیں اور ماسوا اللہ کا ان کو التفات نہیں ہوتا اس لیے اس وقت کسی سے خوفزدہ ہونے کا خطرہ تک نہیں گذرتا ورنہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے تمام لوگوں سے زیادہ خوف رکھنے والے ہوتے ہیں یا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ان کو سوء خاتمہ ہی کا خوف نہیں ہوتا۔

تفسیر صوفیانہ جو اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور ماسوی اللہ سے روگردانی ہے ایسے کو اللہ ماسوی اللہ سے مامون و محفوظ فرماتا ہے اور اسے فرماتا ہے لا تخف خوف نہ کیجیے (فانک) اس لیے تو میرے ہاں ہے اور وہ نورانی قلوب جن پر الہام ربانی ہوتا ہے اور ان کے ہاں ہدایا و تحائف بھیجے جاتے ہیں وہ کسی سے نہیں ڈرتے اور عرائس البیان

میں ہے لا تخف، اژدہا سے نہ ڈریئے اس لیے کہ تم میری عظمت کی تجلّی کو دیکھ رہے ہو اور مقام الناس میں مجھ سے میرے جلال و عظمت کے مشاہدہ میں انبیاء السلام نہیں ڈرتے اس لیے کہ وہ میری ربوبیت کے اسرار کو جانتے ہیں۔

تفسیرِ عالمانہ (ربط) جب اللہ نے جانا کہ موسیٰ علیہ السلام اس شخص کے بارے میں پوچھنا چاہیئے ہیں جس نے قبطی کو قتل فرمایا اس لیے تعریضاً فرماتے۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ مگر جس نے ظلم کیا یہ استثنا منقطع ہے ہاں وہ انبیاء علیہم السلام جن سے کوئی لغزش ہوئی جیسے آدم و یونس و داؤد و موسیٰ علیہم السلام۔

ازالۂ وہم ظلم کا اطلاق ان کے اپنے اعتراف کی مناسبت سے ہے چنانچہ آدم علیہ السلام نے کہا "ربنا ظلمنا انفسنا اور یونس علیہ السلام نے کہا رب انی ظلمت نفسی، ثم بدل حسنا بعد سوء پھر جس برائی کے بعد نیکی کی یعنی بدی کے بعد نیکی کرنا ہے لغزش کے بعد توبہ کی،

فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ اس لیے کہ میں غفور رحیم ہوں۔ یعنی توبہ کرنے والوں کی مغفرت فرماتا ہے اور ان پر شفیق و کریم ہے۔

عصمت انبیاء علیہم السّلام کی تحقیق اہل علم نے اختلاف کیا ہے کہ کیا انبیاء علیہم السلام سے گناہ کا صدور ہوتا ہے یا نہیں۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مختار مذہب اہلسنت کے نزدیک یہ ہے کہ ان سے بحالت نبوت گناہ کا صدور نہیں ہوتا نہ صغیرہ کا نہ کبیرہ کا اور ان کا ترک اولیٰ ایسے ہی ہے جیسے ہمارے لیے گناہ صغیرہ ہے کیونکہ قاعدہ ہے حسنات الابرار سیآت المقربین۔ ابرار کی حسنات مقربین کی سیات ہوتی ہے

فتوحات مکیّہ کی تقریر فتوحات مکیہ میں ہے کہ خواص کے معاصی عوام کے معاصی کی طرح نہیں ہوتے کیونکہ عوام سے گناہ کا صدور شہوت طبیعہ سے ہوتا ہے۔ بخلاف خواص کے کہ ان میں شہوات طبیعہ کا تقاضا نہیں ہوتا اور خواص کے معاصی حظ پر محمول کی جاتی ہیں اور ان میں تاویل ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ کسی خاص بندے سے کوئی لغزش ظاہر کرنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے وہ گناہ بتاویل نیکی ظاہر فرماتا ہے جس سے وہ اسے خطا حق محسوس ہوتی اس لیے کہ عارف باللہ کو معرفت حق عصیاں سے مانع ہو جاتی ہے لیکن تاویل مانع نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ عارف باللہ کبھی بھی حرمات الٰہی کی ہتک نہیں کرتا پھر جب وہ تاویل کے مطابق عمل کر لیتا ہے اس کے بعد اس فعل کی حقیقت سامنے ظاہر ہوتی ہے تو پھر اسے غلطی محسوس فرما کر توبہ کرتا ہے جیسے آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی تو تاویل سے۔ عارف باللہ اپنی ایسی لغزش کو عصیاں سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ اس کو شریعت کی اصطلاح میں عصیاں کہا جاتا ہے اور وہ شرع کی اصطلاح میں استعمال کرتے ہیں جسے عوام نہیں سمجھتے ورنہ وہ اس تاویل سے قبل عصیاں سے پاک ہیں ایسے ہی تاویل کے بعد بھی۔

۷ ایک عجیب استدلال مجتہد جب اجتہاد کرتا ہے تو اس وقت اس کا اعتقاد عصیاں کی طرف نہیں ہوتا بلکہ اس کا ارادہ حق اظہار ہوتا ہے مجتہد کا یہ اجتہاد اگرچہ خطا پر ہو تب بھی اسے گناہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ اپنے اجتہاد میں مشروع امر کا مرتکب ہو رہا ہے پھر جب اسے اپنے اجتہاد کی خطا محسوس ہو گی تو یہ سمجھے گا کہ یہ خطا ہے۔ اس پر وہ اظہار توبہ کرے گا اس معنی پر اُسے گنہگار نہیں کہا جائے گا۔ اس سے واضح ہوا کہ بندہ غلطی کرتا ہے تو تاویل و تزئین سے یا نسیان سے اور ایسی غلطی کو شرعی غلطی نہیں کہا جا سکتا۔ جب ایسی غلطی کو غلطی نہیں کہا جا سکتا تو پھر ان کو گنہگار کہنا کیسا۔ ہاں اسے اصطلاحی خطا سے تعبیر کیا جائے تو حرج نہیں اور وہ بھی ان خواص کے لیے وہ جیسے چاہیں کہیں۔

۸ بایزید بسطامی قدس سرہٗ کی تقریر سیّدنا ابایزید بسطامی قدس سرہٗ سے یہ سوال ہوا کہ کیا عارف باللہ اور اہلِ کشف سے بھی عصیاں کا صدور ہو سکتا ہے آپ نے فرمایا ہاں اور وہ ان کی شانِ اعلیٰ کے منافی نہیں اس لیے کہ جسے ہم عصیاں کہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر ہے جو ان کے لیے مقدر ہوئی تھی جس کا ظاہر ہونا ضروری تھا۔ اور یہ بھی عارف کے ادب بدرگاہ الٰہی کی دلیل ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جب یہ تقدیرِ ربانی ہے تو پھر سرتابی کیوں اس لیے ان کے آگے تاویل حجاب بن جاتی ہے اس حجاب میں تقدیرِ ربانی کا اجراء ہو جاتا ہے اس طریق سے ان کی کون خطا اسے اچھی طرح سمجھ لو۔

تفسیر عالمانہ وَ اَدۡخِلۡ یَدَکَ فِیۡ جَیۡبِکَ

اور اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالیئے۔

سوال: فی جیبک کی بجائے فی کمک کیوں نہیں فرمایا؟

جواب: اس وقت موسیٰ علیہ السلام اون کا پیرہن پہنے ہوئے تھے اور ایسے پیرہن کی نہ آستین ہوتی ہے نہ بٹن۔ آپ کے پیرہن سے ہاتھ کھلے ہوئے تھے اسی لیے اللہ نے فرمایا پیرہن میں ہاتھ ڈالیئے۔

ف: مدرعۃ وہ چھوٹا سا جبہ ہوتا ہے جو قمیص کے بجائے پہنا جاتا ہے۔

تَخۡرُجۡ وہ نکلے گا۔ **بَیۡضَآءَ** سفید نورانی اس کی سورج جیسی روشنی ہو گی یعنی اگر تم اپنے پیرہن میں ہاتھ ڈالو گے تو پھر تمہارا ہاتھ روشن ہو کر ظاہر ہو گا **مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ** بغیر کسی بیماری کے یعنی وہ برص جیسی بیماری کی طرح نہ ہو گا۔ **فِیۡ تِسۡعِ اٰیٰتٍ** نو نشانیوں میں، یہ خبر ہے اس کا مبتداء محذوف ہے دراصل عبارت ،ھا داخلتان فی تسع آیات یعنی یہ معجزے بھی ان نو معجزوں میں داخل ہیں۔

موسیٰ علیہ السّلام کے نو معجزے موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزے یہ تھے۔ ۱۔عصا۔ ۲۔ید بیضا، ۳۔جنگلوں میں سرسبزی و شادابی ۴۔کافروں کے لیے قحط۔

۵- طوفان ۶- ٹڈی ۷- جوئیں ۸- مینڈک ۹- خون -

اِلٰی فِرْعَوْنَ فرعون کی طرف کا - درآنحالیکہ تم فرعون کی طرف مبعوث ہو - وَقَوْمِهٖ اور اس کی قوم کی طرف یعنی قبطی قوم - اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝ بے شک وہ فاسق قوم ہے یہ لعنت کی تعلیل ہے یعنی فرعون اور اس کی قوم کفران و عدوان میں حد سے متجاوز کرنے والے ہیں -

تفسیر عالمانہ

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا پس جس وقت ان کے ہاں ہماری آیات آئیں یعنی وہ نو معجزات جو موسیٰ علیہ السلام لائے اور آپ کے ہاتھ سے ظاہر ہوئے - مُبْصِرَةً درآنحالیکہ واضح اور روشن ہیں - اسم فاعل کا اسم مفعول پر اطلاق کیا گیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ وہ اتنا روشن اور واضح تھیں کہ دیکھنے والے کو ایسے محسوس ہوتی تھیں کہ گویا یہی خود واضح اور روشن ہیں - قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ کہا کہ یہ جادو گر ظاہر ہے اس کا جادو ہونا یعنی تمام لوگ جانتے ہیں کہ یہ جادو ہے - وَجَحَدُوْا بِهَا کذبوابھا زبانوں سے ان کی تکذیب کی اور ان کے معجزات ہونے کا انکار کیا -

حل لغات : الجحود جانتے اور یقین کرکے سرکشی سے انکار کرنا یہاں پر صرف تکذیب مراد ہے تاکہ استدراک لازم نہ آئے - چنانچہ فرمایا وَاسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ واو حالیہ ہے اور استیقان بمعنے بے گمان ہونا یعنی درآنحالیکہ ان کے قلوب کو یقین ہوگیا تھا کہ واقعی یہ اللہ کی نشانیاں ہیں اور یہ جادو نہیں ہوسکتیں -

ف : جناب ابو اللیث رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہر مصیبت میں پھنسنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کرتے تو مشکل حل ہو جاتی تو ان کو یقین ہوگیا کہ یقیناً یہ اللہ کی جانب سے ہیں -

ظُلْمًا ظلم نفسانی سے جحود (انکار) کی علت ہے - وَّعُلُوًّا ؕ انکار اور شیطانی تکبر سے فَانْظُرْ كَیْفَ پس اے محبوب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیکھئے کیسے ہے عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ مفسدین کا انجام، مثلاً ان کا دنیا میں دریا میں ڈوب کر مرنا اور آخرت میں دوزخ میں جانا - یعنی دنیا میں ان کا انجام برباد ہوا کہ وہ دریا میں ڈوب کر مرے - اور آخرت میں دوزخ میں جلیں گے -

ہم حالتِ مفسدان خوش است
سر انجام اہل فساد آتش است

ترجمہ : مفسدوں کی حالت برباد ہے اہل فساد کا انجام دوزخ ہے -

ف : اس میں کفار قریش کی تمثیل ہے کہ تم مفسد اور سرکش ہو تو جو ذات فرعون کو تباہ کرنے پر قادر ہے وہی ذات تمہیں بھی تباہ کرنے کی قدرت رکھتی ہے کیونکہ وہ اپنی اس صفت سے دائمی طور موصوف ہے کیونکہ کہ دشمنوں پر اس کا جلال دائمی ہے جیسے اس کا جمال اپنے محبوبوں کے لیے دائمی اور ہر زمانہ میں ہے اور ایسے ہی تا قیامت اپنی جملہ

ذات سے موصوف ہے۔

سبق عاقل پر لازم ہے کہ وہ دوسروں سے نصیحت حاصل کرے اور وہ اسباب بالکل ترک کر دے جو تباہی اور ہلاکت کی ڈالنے والے ہیں جیسے ظلم اور سرکشی جو کہ نفس امارہ کے عادات ہیں اور چاہیئے کہ اپنے جملہ احوال کو سنوارے جیسے عدل و تواضع وغیرہ کیونکہ یہ قلوب کے صفات عالیہ سے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے وہ استعداد ضائع کر دیں جو انہیں بلا واسطہ فیض الٰہی سے نصیب کرنے والی ہیں ان کا انجام یہ ہے کہ وہ جانوروں اور درندوں کے مرتبہ کو پہنچ جاتے ہیں اور شیطان کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ اور جہنم کے گڑھے میں داخل ہوں گے اس سے معلوم ہوا کہ بلند مراتب پر پہنچنا مشکل ہے لیکن برے انجام کے گڑھے میں گرنا آسان ہے کیونکہ نفس اور اس کی طبیعت اس پتھر کی مانند ہے جسے اوپر سے نیچے پھینکا جائے وہ اس طرح نیچے کو بہت جلد گرے گا اگر کوئی بندۂ خدا مجاہدات و ریاضیات سے اسے نرم کرے تو ان مراتب عُلیا کا پہنچنا آسان ہے اور کم درجات میں گرنے سے بچاؤ ہو جاتا ہے۔ حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ نے فرمایا ؎

بال بکشاؤ صفیر از شجر طوبیٰ زن
حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیر قفس

ترجمہ: بال کھول اور شجرۂ طوبیٰ سے آواز دے۔ بڑا افسوس ہو گا کہ تیرے جیسا پرندہ پنجرے میں گرفتار ہے۔

انتباہ کیا قبیح ترین ہے وہ شخص جو اپنے آپ کو ظاہری طور سنگارتا ہے اس کی مثال اس سرسبز و شاداب باغ کی ہے جس کا نگران الو ہو یا بکریوں کے اس ریوڑ کی ہے جس کا چرواہا بھیڑیا ہے اور اس کے مال و اسباب اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ کی مثال اس بیل کی سی ہے جس کو زیورات سے سنگار دیا جائے۔ پُر فضیلت وہ انسان ہے جو اپنی عالی ہمتی اور اتباع بالحق اور ادب و عقل سے ارتکاب منہیات سے بچ کر بُرے انجام سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے ارشاد کے قابل اور اپنی کتاب کا عامل اور اپنے عذاب سے محفوظ ہونے والوں اور جن کے مراتب پر رشک ہو گا سے بنائے۔ (آمین)

(اگلا صفحہ ملاحظہ ہو)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ

الْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا

مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ○ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ

وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ○ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا

النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ فَتَبَسَّمَ

ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى

وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ○

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ○ لَاُعَذِّبَنَّهٗ

عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ○ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ

اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ○ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ

وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ○ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ

دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ○ اَلَّا

يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا

تُعْلِنُوْنَ ○ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ○ السجدة قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ

كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا

يَرْجِعُوْنَ ○ قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ○ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ○ ع

ترجمہ : اور بیشک ہم نے داؤد و سلیمان کو بڑا علم عطا کیا اور دونوں نے کہا تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ
کے لائق ہیں کہ جس نے ہمیں اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی ۔ اور سلیمان
داؤد کا وارث ہوا اور کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیوں کا علم عطا ہوا ہے اور ہر چیز میں سے

ہمیں عطا ہوا بیشک یہی فضل ظاہر ہے اور سلیمان کے لیے اس کے لشکر جنوں اور آدمیوں اور پرندوں سے جمع کئے گئے تو وہ رو کے جاتے تھے یہاں تک کہ جب چونٹی کی وادی میں آئے تو ایک چونٹی نے کہا اے چونٹیو! اپنے گھروں میں گھس جاؤ کہ تمہیں سلیمان اور ان کا لشکر بے خبری میں کچل نہ ڈالیں۔ سو اس کی بات سن کر مسکرا کر ہنسا اور عرض کی اے میرے پروردگار! مجھے توفیق بخش کہ میں تیری نعمت کا شکر کروں کہ تُو نے مجھے اور میرے والدین کو نعمتوں سے نوازا اور یہ کہ میں ایسا نیک عمل کروں جس سے تُو راضی ہو اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما اور پرندوں کا جائزہ لیا تو کہا کیا بات ہے کہ میں ہُدہُد کو نہیں دیکھ رہا کیا واقعی وہ غائب ہے میں اسے ضرور سخت سزا دوں گا یا ذبح کر ڈالوں گا یا میرے پاس کوئی واضح ثبوت لائے سو زیادہ دیر نہ ٹھہرا تو آکر عرض کی میں وہ ایسی بات دیکھ آیا ہوں جو آپ نے نہیں دیکھی اور آپ کے پاس شہر سبا سے ایک یقینی خبر لایا ہوں بیشک میں نے ایک عورت دیکھی جو ان پر شاہی کر رہی ہے اور اسے ہر شے میں سے عطا ہوا ہے اور اس کا تخت بڑا ہے اور میں نے اسے اور اس کی قوم کو اس حال میں پایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کر رہے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظر میں سنوار کر انھیں سیدھی راہ سے روک دیا ہے سو وہ راہ نہیں پاتے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیوں نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین کی چھپی چیزیں نکالتا ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو وہ جانتا ہے اللہ تعالیٰ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بڑے عرش کا مالک ہے سلیمان نے کہا اب ہم دیکھیں گے کہ کیا تُو نے سچ کہا یا تُو جھوٹوں میں سے ہے میرا یہ خط لے جا اور اسے ان پر ڈال دے پھر ان سے ہٹ کر دیکھنا وہ کیا جواب دیتے ہیں عورت بولی اے دربار یو میری طرف ایک شاندار خط ڈالا گیا ہے بیشک وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور بیشک وہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے جو بڑا مہربان رحم والا ہے یہ کہ مجھ پر بلوا نہ کرو اور مسلمان ہو کر میرے ہاں حاضری دو۔

تفسیر عالمانہ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بخدا بے شک ہم نے عطا فرمایا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ داوٗد و سلیمان علی نبینا وعلیہم السلام، دونوں کو۔

ف مشکاۃ الانوار میں ہے کہ سلیمان علیہ السلام کو چیونٹی نے عرض کی حضور آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے والد گرامی کا نام داؤد اور آپ کا نام سلیمان کیوں رکھا گیا آپ نے فرمایا تو ہی بتا دے عرض کی اس لیے کہ آپ کے والد گرامی نے اپنے قلب کو التفات عن الغیر سے پاک کر کے اللہ سے محبت کی اور آپ چونکہ سلیم (بہ تصغیر) ہیں اس لیے آپ کو آپ کے والد گرامی کے ساتھ لاحق کیا گیا۔ گویا "داوٗد" داویٰ قلبہ الخ کا مخفف اور سلیمان (سلیم آن الخ کا مرکب ہے)

عِلْمًا ج علم کا ایک حصہ یعنی شرائع واحکام اور دیگر وہ علوم جو ان کے لائق اور ان کے لیے خاص تھے جیسے زرہ

بنانا و پہاڑوں کی تسبیح اور پرندوں اور جانوروں کی بولی ۔

سات علوم سات اشخاص کو

۱۔ آدم علیہ السلام کو اسماء کے علوم عطا فرمائے جو ان کو سجدۂ تحیہ کا سبب بنے۔ ۲۔ خضر علیہ السلام کو علم الفراستہ عطا فرمایا جس کی وجہ سے موسیٰ و یوشع جیسے پیغمبر ان کے شاگرد بنے ۳۔ یوسف علیہ السلام کو علم تعبیر بخشا جس کی وجہ سے آپ نے خود اہل مملکت کو پایا۔ ۴۔ داؤد علیہ السلام کو زرہ بننے کا علم سکھایا جس کی وجہ سے آپ کو ریاست و درجات بلند عطا ہوئے ۔ ۵۔ سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی بولی سکھائی جس کی وجہ سے آپ نے بلقیس کا تخت حاصل کیا ۔ ۶۔ عیسیٰ علیہ السلام کو کتاب و حکمت و تورات و انجیل کا علم عطا فرمایا جس کی وجہ سے تہمت کی شر سے بچ گئے ۔ ۷۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو شرع و توحید کا علم عطا فرمایا جس کی وجہ سے آپ کو شفاعت کل کا اختیار نصیب ہوا ۔

علم کیمیا

حضرت الماوردی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہاں علمًا سے مراد علم الکیمیا ہے اس لیے کہ یہ علم علوم انبیاء و مرسلین اور اولیاء عارفین سے ہے حضرت مولانا روم قدس سرہٗ الاعلیٰ نے فرمایا ؎

از کرامات بلند اولیاء
اوّلاً شعر ست و آخر کیمیا

ترجمہ : اولیاء کی بلند کرامات سے پہلی کرامت شعر گوئی اور آخری کیمیا ہے ۔

کیمیا کا صوفیانہ معنی

الکیمیا اصل میں یہ ہے کہ جو مل جائے اس پر قناعت کرنا جو نہ مل سکے اس پر پریشان نہ ہونا ؎

کیمیائے ترا کنم تعلیم
کہ در اکسیر در صناعت نیست

رو قناعت گزیں کہ در عالم
کیمیائے بہ از قناعت نیست

ترجمہ : میں تجھے بتاؤں کہ وہ اکسیر اور دوسری کسی صنعت میں نہیں یا قناعت کو قبول کیجیے دنیا میں قناعت سے بہتر اور کوئی کیمیا نہیں ۔

داؤد علیہ السلام کا تعارف

کشف الاسرار میں ہے کہ داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے نبی ہیں یعنے یہودا ابن یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے ہیں ۔ آپ موسیٰ علیہ السلام سے ایک سو انہتر سال کے بعد اس دنیا میں تشریف لائے اور آپکی شاہی طالوت کے بعد ہے ۔ آپ کی سلطنت میں تمام بنی اسرائیل متفق ہو گئے تھے اس لیے آپ کی سلطنت میں آرام و عیش تھا ۔ اللہ نے فرمایا وشددنا ملکہ اور ہم نے

داؤد علیہ السلام کی شاہی کو مضبوط کیا۔

ف : مروی ہے کہ ہر شب کو بنی اسرائیل کے تیس ہزار سردار آپ کی پہرہ داری پر مقرر تھے آپ کو علم و ملک دونوں عطا ہوئے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "و اتینا داؤد و سلیمان علمًا" اور ہم نے داؤد و سلیمان علیہما السلام کو علم عطا فرمایا۔

اعجوبہ داؤد و سلیمان علیہما السلام کے احکام کا اجراء اور اعمال صالحہ کی تلقین توراۃ سے تھی اسی لیے آپ کی کتاب زبور صرف مواعظ پر مشتمل تھی اس میں احکام اور اوامر و نواہی نہیں تھے۔

فائدۂ صوفیانہ حضرت عطا قدس سرہٗ فرمایا کہ علم سے علم بالرب و علم بالنفس مراد ہے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں (داؤد و سلیمان علیہما السلام) کے لیے علم بالرب اور علم بالنفس ثابت فرمایا اور علم بالنفس درحقیقت علم باللہ ہے چنانچہ سیدنا امیر المومنین علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہا سے فرمان ہے۔

من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ

ترجمہ: جس نے اپنے نفس کو پہچانا تو یقیناً اس نے اپنے رب کو پہچان لیا ؎

بر وجود خدائے عز و جل
ہست نفس تو حجت قاطع

چون بدانی تو نفس را دانی
کوست مصنوع وایزدش صانع

ترجمہ : خدا عزوجل کے وجود پر تیرا نفس ہی حجت قاطع ہے جب تو نفس کو معلوم کر لے گا تو تجھے حق کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اس لیے کہ وہ مصنوع ہے اور اس صانع اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔

ف : علم دو قسم کا ہے، ۱۔ علم البیان، یہ وہ علم ہے جو وسائط شرعیہ سے حاصل ہو۔ (۲) علم العیان، یہ علم وہ ہے جو کشوفات غیبیہ سے مستفاد ہو۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: سائل العلماء وخالط الحکما وجالس الکبراء۔

ترجمہ: علماء سے سوالات کر اور حکماء کے پاس آمد و رفت رکھ اور مشائخ (بزرگان دین) کی صحبت اختیار کر۔

شرح الحدیث علماء سے صرف علم البیان کا سوال کر کیونکہ مسائل شرعیہ کا حل ان سے ہی ہوتا ہے اور حکماء کے پاس آنا جانا علم العیان کی وجہ سے ہوتا ہے اور مشائخ کی صحبت

بیں بیان بھی ہوتا ہے اور احکام شرعیہ بھی اور علم المکاشفہ والاسرار بھی اور ان کی صحبت کا حکم اس لیے ہے کہ ان کی صحبت کے دارین دنیا اور آخرت کے بے شمار منافع حاصل ہوئے ہیں۔ ؎

تو خود بہتری جوی و فرصت شمار
کہ باچون خودی گم کنی روزگار

ترجمہ: تو خود بہتر ہے اسے تلاش کر اور فرصت کو غنیمت سمجھ ورنہ اپنی طرح روزگار کو ضائع کر دے۔

تفسیر عالمانہ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا اور ان ہر دونوں نے ہر ایک نے اس علم کا شکریہ ادا کیا جو انہیں نصیب ہوا کہا کہ جملہ تعریفیں اللہ کے لیے جس نے ہمیں فضیلت بخشی یعنی علم عطا فرمایا۔ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ بہت سے اپنے ایماندار بندوں پر۔

سوال عرب کے دستور کے مطابق یہاں عبارت کل منہما فضلنی ہوتی اسلوب عرب کے خلاف جمع متکلم کے صیغہ کے ساتھ کیوں لایا گیا ہے۔

جواب: اختصار وایجاز کو مدنظر رکھ کر اس سے حرف واو عاطفہ کو بجائے فاء کے لانے کا حسن اسلوب بھی معلوم ہو گیا اس لیے کہ واؤ عطف اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ علم ہر دونوں (باپ بیٹے) کو ملنے پہ حمد کر رہے ہیں صرف علم کے ملنے پر حمد نہیں کی گئی فاء عاطفہ ہوتی تو یہی دوسرا معنی بن جاتا اور اس میں اتنی لطافت نہیں جو پہلے معنی یعنی واؤ عاطفہ لانے میں ہے۔

ف: بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ واؤ عاطفہ لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ عطائے الٰہی کے مقابلہ میں ان کا حمد و شکر کرنا ایک معمولی شکرانہ ہے کیونکہ اس کی صرف ایک نعمت کا شکرانہ ہمارے لاکھوں بار حمد و شکر کرنے سے ادا نہیں ہو سکتا۔ گویا انہوں نے اپنے فعل کا شکریہ ادا کیا اور کہا الحمد للہ۔ الخ

ف: الکثیر سے وہ لوگ مراد ہیں جو ان کی طرح علوم سے نہ نوازے گئے نہ وہ جنہیں سرے سے دولت علم نصیب بھی نہ ہوئی۔ کثیر کو مؤمنین سے مقید کیا ہے اور ظاہر ہے کہ غیر مومنین جب ایمان سے محروم ہیں تو پھر ان کو علم سے بطریق اولیٰ محرومی ہوئی۔ کیونکہ ایمان سے خالی انسان نرا جاہل ہے اگرچہ وہ خود اپنے آپ کو اہل علم سمجھے یا لوگ اسے علامہ یا کوئی اور دیگر اوصاف دیں۔ کیا تم ابوجہل سے نہیں سمجھے کہ وہ باوجود دیکہ اپنی پارٹی میں بہت بڑا دانشور سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کی ان کے نزدیک ابوالحکم (حکمتوں کا سرچشمہ) تھا۔ اسی لیے حکماء نے فرمایا کہ بدمذہب کو عالم یا کوئی بڑا عہدہ دے کر بلانا وغیرہ مکروہ ہے۔

ف: کثیر کے لفظ میں اشارہ ہے کہ بعض دیگر حضرات ان پر علمی فضیلت رکھتے ہیں۔

فضیلت علم وعلماء آیت میں علم وعلماء کی فضیلت اور بزرگی پر واضح ترین دلیل ہے کہ سلیمان و داؤد علیہما السلام نے اسی علم پر شکریہ ورنہ علم کے علاوہ ان کے ہاں ملک و مال کی کمی نہ تھی اور نہ ہی مال و دولت میں ان کا ثانی تھا۔ اور اس میں علماء کرام کو بھی تحریص دلائی گئی ہے کہ وہ اپنی اس علمی دولت پر خدا تعالیٰ کا شکر کریں کہ ایسی بڑی دولت انہیں اللہ نے عطا فرمائی پھر اس دولت کے حصول کے بعد متواضع و متخاشع رہیں یہ ضروری نہیں کہ اس دولت میں ان کے برابر کوئی نہیں بلکہ ان سے بہت بڑے اہل علم موجود ہوں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وفوق کل ذی علم علیم" ہر اہل علم پر اور زیادہ علم والا ہوتا ہے۔

مقولہ عمر رضی اللہ عنہ حضرت فاروق اعظم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کیا خوب فرمایا کل الناس افقہ من عمر" تمام لوگ عمر سے فقیہ تر ہیں۔

(یہ ان کی تواضع ہے لیکن شیعہ لوگ ان کی تواضع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تاثر دیتے ہیں کہ معاذاللہ آپ جاہل اور غیر فقیہ تھے تفصیل فقیر اویسی غفرلہ کی تصنیف "رد الکذاب" میں ہے) [1]

تفسیر صوفیانہ آیت میں داؤد سے روح اور سلیمان سے قلب اور ان کے اہل علم سے الہام ربانی اور وہ علم الاسماء مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو عطا فرمایا اور ان کا حمد کرنا ان اعضاؤ جوارح کی وجہ سے ہے جو انہیں عبودیت کی ادائیگی میں کام کرتے تھے۔ اس لیے کہ اعضا کا کام ہے عبودیت وعمل اور روح و قلب کا کام ہے علم و معرفت جو کہ عمل کا اصل و بنیاد ہیں۔

حدیث شریف حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی نے سوال کیا کہ افضل الاعمال کیا ہیں تو آپ نے فرمایا العلم باللہ والفقہ فی دینہ معرفت الٰہی اور دین کی فقہ سمجھ اور اسے بار بار دہرایا پھر اس نے عرض کی یا رسول اللہ میں آپ سے عمل کا سوال کرتا ہوں اور مجھے علم کی خبر دیتے ہیں آپ نے فرمایا:

العلم ینفعک معہ قلیل العمل وان الجہل لا ینفعک معہ کثیر العمل۔

ترجمہ: عمل اگرچہ قلیل ہو لیکن علم کے ساتھ ہو تو وہ فائدہ دے گا اور جہل سے عمل کتنا ہی کثیر کیوں نہ ہو تب بھی کوئی فائدہ نہیں۔

ف: علم کے بغیر عمل ایسے ہے جیسے گدھا چکی کے اردگرد پھر رہا ہو۔ اس طرح سے وہ سفر طے نہیں کر سکے گا۔

نسخہ نمبر (۱) روحانی: فتح الموصلی قدس سرہ نے فرمایا کہ مریض کو جب طعام اور پانی اور دوا نہ ملے تو مر جائے گا۔

---

[1] اضافہ از اویسی غفرلہ۔

نسخہ روحانی نمبر (۲) : ظاہری غذا پیٹ بھر کر کھائی جانے سے قلب میں باطنی غذا داخل نہ ہو سکے گی۔

حکایت حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ ایک شخص دس سیر غذا کھاکر ساری رات عبادت میں گذار دیتا تھا کسی ولی اللہ نے سنا تو فرمایا کہ یہ شخص اگر آدھی روٹی کھاکر ساری رات سوتا رہتا تو اس پیٹ بھر کر عبادت گذاری سے افضل ہوتا۔ ؎

اندرون از طعام خالی دار
تا درو نور و معرفت بینی
تہی از حکمتی بعلت آن
کہ پُری از طعام تا بینی

ترجمہ : پیٹ کو طعام سے خالی رکھ تاکہ اس میں نور و معرفت پاؤ، حکمت سے تم اس لیے خالی ہو کر تم طعام سے ناک تک پُر ہو۔

نسخہ روحانی نمبر (۳) : عجب و کبر نور و صفائی کو روکتے ہیں ؎

تُراکی بود چون چراغ التہاب
کہ از خود پری ہمچو قندیل از آب

ترجمہ : تیرے چراغ میں روشنی کہاں سے آئے جبکہ تیرا چراغ پانی سے پُر ہے۔

نسخہ روحانی نمبر (۴) : جب انسان کا ظاہر شریعت سے اور باطن طریقت سے آراستہ ہو تو وہ اس فیض الٰہی کی استعداد پالے گا جو انبیاء اولیاء کو نصیب ہوا اسی وجہ سے وہ لوگ دوسرے اہل ایمان پر فضیلت پاگئے ہیں اور یہی فضیلت ہی ان کے حمد و شکر بجالانے کا سبب ہے اسی لیے تو انسان کو موہبہ و عطیۂ الٰہی کے مطابق شکر و حمد الٰہی کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ ان کا انعامات و عطیات پر حمد و شکر ادا کرتے ہیں جو اس نے ہمیں نصیب فرمائے اور علم و قطرات فیض کا سوال کرتے ہیں اور طریق تحقیق اور ثبات علی العمل بعلمہ النافع کی التجا ہے کیونکہ شہوات نفسانی کو علم نافع توڑتا ہے اور خواہشات کو بھی ختم کرتا ہے وہی فضل کرنے والا بہت بڑا ہے اور عطا فرمانے والا فیاض اور رحیم ہے۔

تفسیر عالمانہ وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ یعنی داؤد علیہ السلام کے وصال کے بعد علم و نبوت اور ملک صرف سلیمان علیہ السلام کی طرف منتقل ہوا ان کے دوسرے بھائیوں کو یہ وراثت نہیں ملی تھی اور اسے لفظ وراثت سے تعبیر کرنا مجازاً ہے۔

اس سے مسئلہ فدک کے لیے شیعہ کا اعتراض رفع ہو گیا۔ ؎

؎ اضافہ از اویسی غفرلہٗ

اس لیے کہ یہاں مالی وراثت مراد نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام کمالات نفسانیہ کے وارث ہوتے ہیں مال و اسباب دنیویہ کی ان کی نظروں میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا تم میرے بھائی اور وارث ہو حضرت علی نے عرض کی کہ میں آپ کی کون سی وراثت کا وارث ہوں آپ نے فرمایا مجھ سے پہلے انبیاء علیہ السلام کتاب و سنت کے وارث ہوئے تم میرے وارث ہو۔

(لہ اس سے شیعہ یہ نہ سمجھیں کہ خلافت بلافصل ثابت ہوگئی اس لیے کہ علمی وراثت آپ کے ہر صحابی کو نصیب ہوئی کیونکہ آپ کے کمالات محدود نہ تھے کہ حضرت علی ہی پالیتے تو باقی محروم ہوجاتے۔)

حکایت عجیبہ کسی قطب وقت نے عرض کی یا اللہ میرے بیٹے کو ہی میرے مقام ولایت کا وارث بنا دے۔ اللہ نے فرمایا پیارے یہ مرتبہ یعنی مقام خلافت وراثت نسبی پر نہیں کیونکہ وراثت یا علمی ہوتی ہے یا مالی۔ علمی وراثت صرف اس مرید صادق کو نصیب ہوتی ہے جو مخلص ہو وہی اپنے شیخ کے علوم حقائق کا وارث ہوتا ہے۔ جبکہ اس میں ان کی استعداد ہو تو پھر وہی مقامات انہیں نصیب ہوتے ہیں اسی لیے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "العلما ورثۃ الانبیاء" علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے سلیمان قلب داؤد روح کا وارث ہے اس لیے کہ ہر وارد و الہام و اشارہ، وحی و فیض ربانی حضرت الہیہ سے صادر ہوتے ہیں تو ان کا روح پھر اپنے کمال لطافت سے آگے بڑھ کر قلب پر وارد ہوتا ہے کیونکہ قلب اس کی صفات سے موصوف ہے اسی لیے اسے قبول کرلیتا ہے چونکہ قلب میں کثافت و صلابت بھی ہے اسی وجہ سے وہ ان کمالات کو اپنے اندر محفوظ کرلیتا ہے۔ قلب روح پر فضیلت رکھتی ہے اسی لیے مشہور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام سے قضاؤ افتاء میں فوقیت رکھتے تھے حدیث شریف بھی اس کی تائید کرتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یا وابصۃ استفت قلبک اے وابصہ اپنے دل سے فتویٰ پوچھو ورنہ استفت روحک فرماتے۔

داؤد علیہ السلام کی اولاد کی تفصیل جناب کاشفی مرحوم نے فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے انیس صاحبزادے تھے ہر ایک نے شاہی کی وراثت کا مطالبہ کیا اللہ نے آسمان سے ایک مکتوب مہر شدہ داؤد علیہ السلام کو بھجوایا اس میں چند مسائل تھے اور لکھا تھا کہ تمہاری اولاد میں سے جو بھی صحیح جواب دے وہی تمہارے ملک کا وارث ہے۔ داؤد علیہ السلام نے تمام صاحبزادوں اور اپنی شاہی کے تمام علماء و مشائخ کو بلایا اور وہ مسائل اپنے صاحبزادوں کے آگے رکھ دیئے وہ سوالات یہ تھے

لہ اضافہ از اویسی غفرلہ۔

۱۔ سب سے نزدیک تر کون سی شے ہے اور سب سے دور تر کون سی شے اور سب سے وحشت ناک تر کون سی شے ہے اور کس شے سے اسے انس زیادہ ہے ؟

۲۔ وہ کون سے دو ہیں جو قایم ہیں اور دیگر دو مختلف اور دیگر دو دشمن ہیں ؟

۳۔ وہ کونسا کام ہے جس کے آخر میں اس کی تعریف کی گئی ہے ؟

۴۔ وہ کون سا کام ہے جس کا انجام مذموم ہے ؟

حضرت داؤد علیہ السلام کے تمام صاحبزادوں نے معذرت کی حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا اگر اجازت ہو تو ان کا جواب میں عرض کروں داؤد علیہ السلام نے اجازت بخشی تو سلیمان علیہ السلام نے کہا پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ انسان کو قریب تر موت ہے اور سب سے بعید تر اس کا وہ ترکہ ہے جو وہ مرنے کے بعد چھوڑتا ہے اور اس کے لیے زیادہ وحشت والا وہ جسم ہے جو روح سے خالی ہو جائے جس سے اسے بہت زیادہ انس ہے وہ روح ہے ۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ جو دو قایم ہیں وہ آسمان اور زمین ہیں اور دو مختلف سے مراد دن اور رات ہے اور ایک دوسرے کے دشمن موت و حیات ہیں ۔

تیسرے کا جواب یہ ہے کہ وہ کام جس کا انجام محمود ہے وہ ہے حوصلہ بوقت غصہ ۔

چوتھے کا جواب یہ ہے کہ وہ کام جس کا انجام مذموم ہے وہ ہے تیزی جو بوقت غصہ آئے ۔

جب اکابر علماء و مشائخ نے کتاب منزل کے موافق جواب پایا تو فرمایا ان تمام صاحبزادوں پر حضرت سلیمان علیہ السلام کو فضیلت حاصل ہے فلہذا شاہی ان کے سپرد کی جائے اس کے دوسرے دن حضرت داؤد علیہ السلام کا وصال ہو گیا تو سلیمان علیہ السلام آپ کے جانشین ہوئے ۔

تفسیر عالمانہ **وَقَالَ** نعمت الٰہی کی تشہیر اور ان لوگوں کو اپنی طرف بلانے اور اپنی تصدیق کے لیے ان معجزات باہرہ کا ذکر فرمایا جو انہیں اللہ کی طرف سے عطا ہوئے یہ ذکر نہ تو بطور فخر تھا نہ از راہ تکبر ۔

ف : جناب بقلی نے فرمایا کہ سلیمان علیہ السلام نے عطا کردہ معجزات کا ذکر اس لیے فرمایا کہ قانون ہے کہ متمکن جو درجہ تمکین کو پہنچ جائے جائز ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے عطایائے الٰہی کی خبر دے تاکہ اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ اور منکرین پر حجت قایم ہو ۔ چنانچہ اللہ نے فرمایا واما بنعمة ربك فحدث اور اپنے اوپر نعمت حق کو بیان کیجئے ۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ اے لوگو مجھے پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں ۔

سوال : سلیمان علیہ السلام کو ہی یہ نعمت ملی تھی تو پھر آپ نے جمع کے صیغہ کو استعمال فرمایا اس سے تو تکبر کی بو آتی ہے ؟

جواب (۱) : سیاست کے طور پر ایسے مواقع پر جمع کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے اس سے تکبر و تفخر کا کوئی تعلق

نہیں ہوتا یہی اوتینا کے متعلق سوال و جواب ہو گا۔

جواب (۲) : سلیمان علیہ السلام نے جمع کا صیغہ بول کر اپنے والد گرامی کو بھی مراد لیا ہے اس سے یہ ثابت ہو گا کہ پرندوں کی بولی ہر دونوں جانتے تھے یہ معجزہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ مخصوص نہ تھا جیسا کہ عام مشہور ہو گیا ہے۔

حل لغات منطق نطق عرف میں ہر وہ مافی الضمیر جو زبان پر لایا جائے مفرد ہو یا مرکب اور کبھی اس کلام پر بولا جاتا ہے جو منہ سے نکلے خواہ مفرد ہو یا مرکب مفید ہو یا غیر مفید جیسے کہا جاتا ہے نطقت الحمامۃ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کبوتر اپنی بولی بولے۔ امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ نطق عرف میں وہ کلمات ہیں جو انسان منہ سے بولے اور جنہیں دل محفوظ کر سکے یہی وجہ ہے کہ یہ صرف انسان کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ غیر انسان پر بالتبع مستعمل ہوتا ہے اسی لیے کہا جاتا ہے ناطق و صامت ناطق وہ کلام جس میں آواز ہو اور صامت وہ جس میں آواز نہ ہو اسی لیے حیوانات کو ناطق نہیں کہا جاتا سوائے مقیدہ کے یا بطریق تشبیہ کے۔

سوال : حیوانات کے لیے یہاں منطق کیوں کہا گیا ؟

جواب : سلیمان علیہ السلام کی وجہ سے کہ وہ ان کی بولیاں سمجھتے تھے جو بھی کسی کی بولی سمجھے تو اس کی وجہ سے بالاضافہ بولنے والے حیوان کو ناطق کہہ سکتے ہیں اگرچہ وہ فی نفسہ صامت ہو اور ناطق نہ سمجھنے کی وجہ سے صامت ہے اگرچہ وہ فی نفسہ ناطق ہو۔

الطیر طائر کی جمع ہے جیسے راکب کی جمع رکب آتا ہے اور وہ حیوان جو پر رکھتا ہو اور اڑتا ہو۔

ف : سلیمان علیہ السلام پرندوں کے علاوہ دوسرے جانوروں کی بولیاں بھی جانتے تھے جیسا کہ آپ نے چیونٹی کی بات سن کر تبسم فرمایا اس کا مفصل مضمون آگے آتا ہے۔ اور دوسرے جانوروں کی بولی جاننے کو واوتینا من کل شیئ (اور ہم کو ہر شے عطا کی گئیں ہیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

نکتہ : الطیر کی تخصیص اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ پرندوں کو دوسرے جانوروں پر فضیلت ہے۔ آیت کا معنی یہ ہو گا کہ ہم پرندوں کی بولی سکھائے گئے ہیں جب وہ بولتے ہیں ہم ان کی مراد کو سمجھ جاتے ہیں۔ اور پرندوں کی ہر جماعت کی الگ الگ بولی ہے جسے صرف ہم سمجھتے ہیں دوسرے لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہتے ہیں۔

ف : حضرت سلیمان علیہ السلام نہ صرف ان کی بولی سمجھتے تھے بلکہ ان کی مراد و مقصد بھی معلوم کر لیتے تھے۔

صاحب النسان العیون فرماتے ہیں اس سے مراد وہ پرندے ہیں جو اپنی بولی صاف لفظوں میں نہیں بتا سکتے ورنہ بہت سے پرندے ایسے بھی ہیں جو ان کی بولی سے مطلب صاف معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض کوّوں

سے سنا جاتا ہے وہ کہتے ہیں (اللہ حق)۔

عجیب کوّا ایک شیخ کامل فرماتے ہیں کہ میں نے ایک کوّے کو سورۃ سجدہ تلاوت کرتے ہوئے سُنا۔ آیت سجدہ پر میں نے اس کوّے کو سجدہ کرتے بھی دیکھا۔ اور سجدے میں کہتا تھا:

سجد لك سوادی وامن بك فؤادی۔

ترجمہ: تیرے لیے میرے جسم نے سجدہ کیا اور تجھ پر میرا دل ایمان لایا۔

صاحب روح البیان قدس سرہٗ نے فرمایا کہ کبھی الدرہ بھی صاف گفتگو کرتی ہے چنانچہ شیخ بکری ایک دوست کے گھر گئے فرماتے ہیں کہ مجھے الدرہ نظر نہیں آتا تھا لیکن اس سے صاف لفظوں میں سنا وہ کہہ رہا تھا مرحبا بالشیخ البکری اے شیخ بکری قدس سرہٗ خوش آمدید اور وہ اس کلمہ کو بار بار دہراتا رہا میں اس کی فصاحت پر متعجب ہوا۔

ابوزریق پرندے کا قصہ ایک شخص بغداد سے باہر کہیں جا رہا تھا اس کے پاس چار سو درہم تھے۔ راستہ میں ابوزریق کو بکتے دیکھ کر ان دراہم سے وہ تمام خرید لیے واپس لوٹ کر ان کو پنجروں میں بند کر کے دوکان میں رکھ دیئے رات کو ٹھنڈی ہوا سے وہ تمام مر گئے ان میں صرف ایک کمزور بچ رہا۔ میں اپنی اس غلطی پر خوب رو رو کر اللہ کو عرض کرتا تھا یا غیاث المستغیثین اغثنی اے فریادیوں کے فریادرس میری مدد فرمایئے۔ ابوزریق کا چھوٹا بچہ میرے ساتھ ۔ یاغیاث المستغیثین اغثنی پڑھتا رہا۔ لوگ اس کی آواز سن کر جمع ہو گئے اور اس کے ایسے فصیح الفاظ سن کر تعجب کرتے تھے اور پھر تو وہ ایک تماشہ بن گیا۔ ایک دفعہ خلیفۂ وقت کی لونڈی وہاں سے گذری اس کا یہ تماشہ دیکھ کر اس نے ایک ہزار درہم دے کر خرید لیا۔ (کذا فی حیوۃ الحیوان)۔ 2/17

ف: علامہ امام دمیری نے فرمایا ابوزریق قنق کو کہتے ہیں۔ یہ ایک پرندہ ہے جو کبوتر جتنا ہوتا ہے اسے شامی لوگ زریق کہتے ہیں اور وہ انسان سے بہت زیادہ مانوس ہوتا ہے اور تعلیم کو قبول کرتا ہے اور جو کچھ کہا جائے وہ سمجھ جاتا ہے۔

حکایت بُلبل سیدنا سلیمان علیہ السلام بُلبل کے قریب سے گذرے جو درخت پر بیٹھ کر چہچہاتی ہوئی ٹھمکہ کرتی اور دم بھی ہلاتی تھی آپ نے اپنے صحابیوں سے فرمایا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے عرض کی اللہ اعلم ونبیہٗ [1] اللہ تعالیٰ اور اس کا نبی جانے فرمایا کہتی ہے اذا اکلت نصف تمرۃ فعلی الدنیا العفاء یعنی میں جب تم کھجور کا آدھا حصہ کھاؤ تو دنیا کے سر پر مٹی۔ شاید بلبل اس وقت کچھ کھا کر فارغ ہوئی تھی پھر یہی کلمہ پڑھا۔

4/11
2

فاختہ کی بولی اس کے بعد فاختہ کی آواز سنی گئی آپ نے فرمایا یہ کہہ رہی ہے لیت ذالخلق لم یخلقوا کاش مخلوق پیدا نہ ہوتی۔ شاید وہ اس وقت کسی مصیبت میں گرفتار تھی۔

---

[1] روح البیان ص ۳۲۹ ج ۶۔ معلوم ہوا کہ یہی عقیدہ قدیمہ دین حق والوں کا ہے الحمد للہ یہی عقیدہ اہلسنت کو نصیب ہے۔ اور احادیث پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ کرام کا بھی یہی طریقہ تھا۔

طاؤس (مور) کی گفتگو اس کے بعد مور بولا اور کہہ رہا تھا "کما تدین تدان"۔ اس کے معنی یہ ہوئے جیسی کرنی ویسی بھرنی ۔

ہُدہُد کی بولی : اس کے بعد ہدہد بولا اور کہہ رہا تھا استغفروا اللّٰہ یامذنبون ۔ اے مجرمو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔

چڑیا کی بولی چڑیا بھی مذکورہ بالا نصیحت کرتی ہے اسی لیے رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم نے چڑیا کو قتل کرنے سے روکا ہے ۔لیکن اس سے ایک خاص چڑیا مراد ہے جو عام طور پر باقی چڑیوں سے بڑا اور چھوٹی چڑیوں کا شکار کرتا ہے اس کا طریقۂ شکار یہ ہے کہ ہر پرندے کی بولی بولتا ہے تو وہ پرندہ اس کے قریب ہوجاتا ہے جب اسے اپنے قریب پاتا ہے تو اسے جھپٹ لگا کر کھا لیتا ہے ۔

ہُدہُد کی دوسری بولی : ایک روایت میں یہ ہے کہ ہُدہُد کہتا ہے من لایرحم لایرحم ۔ جو کسی پر رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا ۔ ان دو مختلف قولوں میں تطبیق یوں دی جا سکتی ہے کہ وہ کبھی پہلی بولی بولتا کبھی دوسری۔

طیطوی اور طوطے کی بولی طیطوی کہتا رہتا ہے کل حی میت وکل جدید بال ہر زندہ نے مرنا ہے اور ہر نئے نے پرانا ہونا ہے ۔ کشف الاسرار میں یہ کلمات طوطے کی طرف منسوب کیے ہیں۔

چمگادڑ کی بولی چمگادڑ بولتا ہے قدموا خیرا تجدوہ نیکی کرو اس کا پھل پاؤ گے اور الکشف میں ہے کہ چمگادڑ کہتا ہے الحمدللّٰہ رب العالمین اور سورۃ کے آخر میں ولاالضآلین کو ایسے کھینچ کر پڑھتا ہے جیسے ہمارے قاری پڑھتے ہیں ۔

ف : خطاف (بضم الخاء المعجمۃ) بروزن رُمّان اس کی جمع خطاطیف ہے اسے زوارالہند کہا جاتا ہے یہ ان پرندوں میں سے ہے جو انسانوں کی طرف بہت کھنچ کر آتے ہیں ۔ اور بہت طویل سفر کرتے ہیں اسی وجہ سے اسے انسانوں سے بہت انس ہے اسے عموماً لوگ عصفور الجنۃ یعنی بہشت کی چڑیا کہتے ہیں کیونکہ یہ لوگوں کے ہاں رکھی ہوئی چیز کی لالچ نہیں کرتا اسی لیے لوگ اس سے اُنس کرتے ہیں یہ مچھر اور مکھیوں پر گذارا کرتا ہے۔

قمری کی آواز : قمری کہتی ہے سبحان ربی الاعلی پاکی ہے بلند مرتبہ خدا تعالیٰ کے لیے۔

رخمہ یا کبوتر کی بولی کبوتر کے متعلق حضرت سلیمان علیہ السلام نے خبر دی ہے کہ وہ کہتا ہے سبحان ربی الاعلی ملء سمائہ وارضہ اللّٰہ تعالیٰ کی پاکی زمین وآسمان کے برابر ہے۔

ف : رخمہ ایک گونگا بہرہ پرندہ ہے جو نہ سُنتا ہے نہ بولتا ہے ۔

نکتہ : اسی لیے حکماء کہتے ہیں کہ رخمہ طویل العمر اسی لیے ہے کہ وہ بولتا نہیں ۔ کم بولنے سے سلامتی عمر اور برکت نصیب ہوتی ہے ۔

چیل کی بولی : چیل کہتی ہے کل شیٔ لک الااللّٰہ اللہ کے سوا سب کو فنا ہے ۔

ف : الحدائۃ کو فارسی میں زغن اور غلیواج اردو میں ۔
حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ؎

بہر این مردار چندت کاہ زاری کاہ زو
چون غلیواجی کہ ششش مہ مادہ و ششش مہ نر ست

ترجمہ : اس مردار (دنیا) پر کب تک فریفتہ رہے گا کہ کبھی کیسے اور کبھی کیسے جیسے چیل کہ چھ ماہ مادہ رہتی ہے اور چھ ماہ نر ۔)

قطاہ کی بولی : قطاہ کہتا ہے من سکت سلم جو خاموش رہا سلامتی میں رہا ۔

ف : قطاہ بیمار جیسا ہے چونکہ وہ اس کی بولی بولتا ہے اس کو اسی وجہ سے اس نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔ اس لیے وہ جب بولتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کہہ رہا ہے قطا، قطا) ۔

ف : ابن ظفر نے فرمایا کہ یہ پرندہ اپنے بچے گھونسلے میں چھوڑ کر دس یا اس سے زائد دنوں تک پانی کی تلاش میں رہتا ہے اور پانی صبح سے طلوع شمس کے درمیان لیتا ہے اس کے بعد اپنے گھونسلے میں لوٹتا ہے تو بھولتا نہیں اس لیے اس پر عرب کی مثال مشہور ہے ۔ "اھدی من قطاۃ" قطاہ پرندے سے زیادہ راہ جانتا ہے ۔

طوطے کی بولی : ببغا کہتا ہے ویل لمن کانت الدنیا خرابی ہو اسے جس کی مراد صرف دنیا ہی ہے : ببغا سے مراد طوطی ہے ۔

ف : حیوۃ الحیوان میں ہے ببغا وہ سبز پرندہ ۔ یعنی طوطا ۔

باز کی بولی : کاشفی مرحوم نے لکھا کہ باز کہتا ہے "سبحان ربی العظیم وبحمدہ" عظیم الشان پروردگار کی پاکی اس کی حمد کے ساتھ ۔

ف : حیوۃ الحیوان میں لکھا ہے کہ بازی ہمیشہ مؤنث ہی ہے اس کا نر گدھ کے ایک قسم اور شاہین سے ہوتا ہے اسی لیے یہ مختلف شکلوں میں ہوتا ہے یہ تمام جانوروں سے متکبر ہے اور اس میں نرمی بہت کم ہے ۔

ہزار داستان کی بولی : ہزار داستان کہتا ہے اذکروا اللہ یا غافلون اے غافلو خدا تعالیٰ کو یاد کرو ۔ ؎

دلا برخیز و طاعت کن کہ طاعت بہ ز ہر کارست
سعادت آن کسی دارد کہ وقت صبح بیدارست

ترجمہ : اے دل اٹھ عبادت کر اس لیے کہ عبادت سے بہتر اور کوئی کام نہیں وہی سعادت مند ہے جو صبح بہت جلد اٹھتا ہے ۔

مرغ کی بولی : مرغ کہتا ہے قم یا ایہا الغافل اے غافل اٹھ کھڑا ہو ۔ ؎

خروسان در سحر گویند قم یا ایہا الغافل
تو از مستی نمی دانی کسی داند کہ ہشیارست

ترجمہ: اے غافل اٹھ کھڑا ہو صبح ہوگئی ہے تو مستی سے نہیں جانتا اسے خبر ہے جو ہشیار ہے۔

سلیمان علیہ السلام کا مرغ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک سفید مرغ تھا۔ حدیث شریف میں ہے کہ وہ سفید مرغ میرے دوستوں کا دوست اور میرے دشمنوں کا دشمن ہے (کذا فی الوسیط) یہی مرغا فرشتے کو دیکھ کر آواز دیتا ہے اور گدھا شیطان کو دیکھ کر ڈھینچوں ڈھینچوں کرتا ہے۔

گدھ کی بولی: گدھ کی اپنی بولی میں کہتی ہے یا ابن آدم عش ماشئت اٰخرک الموت۔ اے آدم زادے جتنا چاہو زندگی بسر کرو آخر تم نے مرنا ہے۔

ف: اس وجہ مناسبت سے گدھ کو طویل عمر نصیب ہوئی ہے یہاں تک کہ یہ ایک ہزار سال تک رہ سکتی ہے اور اڑنے میں بہت تیز اور اس کے پر بھی بہت بڑے مضبوط ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دن میں مشرق و مغرب کی درمیانی مسافت طے کرلیتی ہے اور عام پرندوں میں سے سب سے بڑا پرندہ ہے۔ اسے تمام پرندوں میں سے عجوبہ کہا گیا ہے۔ (کذا فی حیوۃ الحیوان)۔

عقاب کی بولی: عقاب کہتا ہے فی البعد عن الناس انس۔ لوگوں سے دور رہنا اچھا ہے۔

مینڈک کی بولی مینڈک کہتا ہے سبحان ربی القدوس پاکی ہے پروردگار اقدس کو۔ یا کہتا ہے سبحان المعبود فی لجج البحار۔ معبود کی پاکی دریا کی گہرائیوں میں۔

حکایت داؤد علیہ السلام سیدنا داؤد علیہ السلام کو گمان تھا کہ ان جیسی اللہ تعالیٰ کی مدح و ثنا اور کوئی نہیں کرتا ہوگا اور نہ ہی ان سے بڑھ کر اور کوئی حمد گو ہو سکتا ہے اللہ نے فرشتہ بھیجا جب کہ آپ حجرے میں محو ذکرِ خدا تھے اور آپ کے قریب ایک پانی کا گڑھا تھا۔ فرشتے نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے داؤد اس گڑھے والے مینڈک سے سنیئے وہ کیا کہہ رہا ہے آپ نے خاموشی سے اس کی طرف کان لگائے تو وہ کہہ رہا تھا:
سبحانک وبحمدک منتھی علمک یا اللہ تیری پاکی اور تیری حمد تیرے منتہائے علم کے مطابق۔
فرشتے نے پوچھا اے داؤد علیہ السلام اب آپ کا کیا خیال ہے آپ نے فرمایا بخدا اس جیسی میں نے کبھی حمد نہیں کی۔

مینڈک نہ مارو حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مینڈک کو نہ مارو اس لیے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا گیا تو یہ منہ میں پانی لے کر آگ بجھاتا تھا۔ اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا۔

پانچ جانوروں کو نہ مارو حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانچ جانوروں کے قتل سے روکا ہے: ۱۔ چیونٹی ۲۔ شہد کی مکھی ۳۔ مینڈک ۴۔ خاص چڑیا ۵۔ ہُدہُد۔

ورشان کی بولی ورشان کہتا ہے لدوا للموت وابنوا للخراب موت کے لیے تیار رہو اور ویرانی کے لیے مکان بناؤ۔ یعنی فنا ہی فنا ہے۔

ف: یہ لام عاقبت کی ہے۔

اعجوبہ: الورشان فاختہ وحمامہ کے درمیان کا ایک پرندہ ہے جسے اولاد سے بہت پیار ہوتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے بچوں کو کوئی اٹھالے تو اپنے آپ کو مار دیتا ہے۔

تیتر کی بولی: تیتر کہتا ہے الرحمٰن علی العرش استوٰی رحمٰن الٰہی اپنی شان کے لائق مستوی ہے۔

محمد وآل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بغض رکھنے والوں پر لعنت فقیر (صاحب روح البیان رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہے اللھم العن مبغضی محمد وآل محمد۔ محمد اور آپ کی آل سے بغض رکھنے والوں پر خدا کی لعنت۔ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم)

گدھا کی بولی: گدھا بولتا ہے اللھم العن العشار۔ (اے اللہ عشار پر لعنت بھیج)

ف: بعض نے یہ کلمات کوے کی طرف منسوب کیے ہیں۔

گھوڑے کی بولی گھوڑا کہتا ہے جب جنگ کی دو صفیں آمنے سامنے ہوتی ہیں سبوح قدوس رب الملائکۃ والروح۔ پاکی والا تقدیس والا وہ ملائکہ اور روح کا پروردگار ہے۔

زرزور کی بولی: زرزور کہتا ہے اللھم انی اسئلک قوت یوم بیوم یا رازق۔ اے روزی رساں میں صرف تجھ سے روزی مانگتا ہوں۔

ف: زرزور ایک (بالضم) باریک آواز والا پرندہ ہے۔ یہ ایک چڑیا کی قسم ہے اس کی اپنی آواز پر اس کا نام زرزور ہے۔ زرزور یعنے (مخصوص آواز)۔ حضرت مولانا روم قدس سرہٗ نے اپنے اشعار میں فرمایا:

شیخ مرغانست لک لک لکش دانی کہ چیست
الحمد لک والامر لک والملک لک یا مستعان

ترجمہ: تمہیں معلوم ہے کہ تمام پرندوں کا مرشد کون ہے وہ ہے جو تین بار لک بولتا ہے مثلاً کہتا ہے الحمد لک، حمد تیرے لیے۔ امر تیرے لیے۔ ملک تیرے لیے اے مستعان۔

بوم کا وعظ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ تمام پرندوں سے بنی آدم سے بڑھ کر ناصح اور مشفق اُلّو سے اور کوئی جانور نہیں جب وہ ان کو آپس میں جھگڑتا دیکھتا ہے تو کہتا ہے: این الذین یتنعمون فی الدنیا ویسعون فیھا ویل لبنی آدم کیف ینامون وامامھم الشدائد۔ کہاں ہیں وہ جو دنیا فانی سے مستمتع ہے اور اس کے جمع کرنے کی کوشش میں رہے۔ بنو آدم کے لیے افسوس ہے کہ وہ سوتے کیوں ہیں جب جلتے

ہیں کہ آگے نشد ید تکالیف ہیں۔ آخر میں کہتا ہے: تزودوا یا غافلین و تاھبوا لسفرکم۔ اے غافلو زاد راہ تیار کرلو۔ اور سفر کی خوب تیاری کرو۔ حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ نے فرمایا۔

درع الکاسل تغنم فقد جری مثل
کہ زاد راہروان چستیت و چالاکی

ترجمہ: سستی چھوڑ غنیمت سمجھ وقت کو اس لیے کہ یہ مثل مشہور رہے کہ سفر کا زاد راہ چستی و چالاکی ہے۔

پرندے کی سلیمان علیہ السلام کی کچہری میں حاضری

ایک پرندہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ عرض کی آپ نے اپنے ہم نشینوں سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے سب نے عرض کی آپ خوب جانتے ہیں آپ نے فرمایا یہ کہتا ہے کہ اے بنی اسرائیل پر مسلّط بادشاہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کرامت بخشی ہے اور دشمنوں پر آپ کو غلبہ بخشا ہے میں اب اپنے بچوں کے ہاں جا رہا ہوں عنقریب واپس آؤں گا۔ سلیمان علیہ السلام سے انتظار کیا چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد پھر حاضر ہوگیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو سلام عرض کرکے کہا اجازت ہو تو میں اپنے بچوں کے لیے دانہ لاؤں بلکہ ان کو کھلا پلا کر حاضری دوں پھر جو حکم ہوگا بجالاؤں گا۔ آپ نے اسے کلی اجازت بخش کر حاضرین کو اس کا سارا ماجرا سنا دیا۔ (کذا قال المقاتل)

انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کا کمال

عرائس البیان میں ہے کہ پرندوں اور وحشیوں کی آوازیں اور تمام اکوان کے حرکات اللہ تعالیٰ کے خطابات ہیں جو اس نے اپنے پیارے محبوبوں، انبیاء مرسلین و اولیاء عارفین سے خطاب فرمایا۔ یہی حضرات ان کی بولیوں کو سمجھتے ہیں اس لیے کہ یہ ان کے احوال و مقامات ہیں۔ انبیاء و مرسلین علیہ السلام تو ان کی بعینہٖ بولیاں اور معانی کو سمجھتے ہیں۔ اور اولیاء کرام ان کی بولیوں سے ان کے مفہوم کو سمجھ جاتے ہیں یہ بھی سمجھنا الہام ربانی کے اعتبار سے ہوتا ہے جو ان کے قلوب میں وارد ہوتا ہے یہ نہیں کہ وہ بعینہٖ ان کی بولیوں کو جانتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

آیت میں اشارہ ہے کہ طیور ارواح ناطقہ اشباح میں حق کی بولی بولتے ہیں۔ لغت انوار کے ساتھ رموز و اسرار ظاہر کرتے ہیں لیکن انہیں صرف وہی سنتا ہے جسے فراست صادقہ نصیب ہو۔ جس کی عقل و قلب شہادت دین پر ہے اور لطیف ترین اشارہ یہ ہے کہ ہم صفات کے پرندوں کی بولی جانتے ہیں جو کہ وہ ذات کے علوم سے بولتے ہیں اور اس کے افعال کے پرندوں کا کلام سمجھتے ہیں جو حکم ازلیات باطنی اسرار کی خبر دیتے ہیں۔

ف: ابوعثمان مغربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ اپنے جمیع احوال میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ صدق و صفائی کرے

تواس کی بات کو ہر شے سمجھتی ہے اور وہ بھی ہر شے کی بات کو سمجھتا ہے جیسے طبل بجنے پر ہر ایک کو کوچ اور نزول کا علم ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو (مخصوص) سماع اصوات وشہود احوال مرئیات کے فنون کا علم عطا فرماتا ہے۔ اگرچہ کتنا ہی مختلف ہیں۔

جیسا کہ کہا گیا ہے: ؎

اذا المرء کان لہ فکرۃ

ففی کل شیئ لہ عبرۃ

ترجمہ: ہر مرد کو فکر کرنی چاہیئے اس لیے کہ ہر شے میں عبرت وموعظت ہے۔

تفسیر عالمانہ وَاُوْتِیْنَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ اور ہم ہر شے دیئے گئے ہیں۔ یہاں پر کل شے سے کثرت مراد ہے جیسے کہا جاتا ہے فلان یقصدہ کل شی ویعلم کل شی۔ اس سے کل قصد سے اور کل علم سے کثرت و وفرت مراد ہے۔

[1]۔ اس سے وہابیہ دیوبندیہ کے سوال کا رد ہوگیا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تبیانا کل شیئ میں علم کل مراد ہے تو پھر سلیمان وداؤد علیہما السلام کے لیے بھی کائنات کی ہر شے مانو۔

ف: کاشفی مرحوم نے اس آیت کے جملہ کا ترجمہ لکھا کہ ہم کو ہر وہ چیزیں عطا ہوئی ہیں جن کی ہمیں ضرورت تھی یہ وہابیہ کے لیے دوسرا جواب ہے[2]۔

اور کشف الاسرار میں ہے کل شیئ سے ملک ونبوت وکتاب ریاح (ہوائیں) جن وشیاطین کی تسخیر، جانوروں اور پرندوں کی بولی، محرابیں، تماثیلیں، لگن، دیگیں کالے تیل کا چشمہ دعین الصفر اور دیگر کئی قسم کی نعمتیں۔

اِنَّ هٰذَا بے شک یہ مذکور یعنی اعطائے الٰہی وتعلیم، لَهُوَ الْفَضْلُ البتہ وہ فضل اور احسان والا ہے الْمُبِیْنُ کھلم کھلا یعنی ایسا واضح اور روشن جو کسی سے پوشیدہ نہیں۔

ف: الوسیط میں ہے کہ یہاں پر زیادتی سے ظاہر وہ نعمتیں مراد ہیں جو اور لوگوں سے ان کو زائد نصیب ہوئیں۔ یہ ایسے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا انا سید ولد آدم ولا فخر میں اولادِ آدم کا سردار ہوں اور یہ کوئی فخر سے نہیں کہہ رہا۔ یعنی یہ میں بطریق شکر وحمد کے کہہ رہا ہوں فخر سے یا تکبر سے نہیں کہتا۔ سلیمان علیہ السلام نے بھی فخر سے نہیں بلکہ شکرا کہا۔

الجویہ: حضرت سلیمان علیہ السلام کو داؤد علیہ السلام کی نعمتوں کے علاوہ زائد یہ انعامات عطا ہوئے:

---

[1] اضافہ از اویسی غفرلہ۔ [2] ایضاً

۱۔ تسخیر الجن ۲۔ تسخیر الریح ۳۔ پرندوں کی بولیوں کا سمجھنا ۴۔ آپ کے زمانے میں ایسی عجیب مصنوعات ایجاد ہوئیں جن سے خلق خدا نے بہت فائدہ اٹھایا اور سلیمان علیہ السلام نے ساڑھے سات سو سال تک شاہی کی۔

چیونٹی کی دانائی جب حضرت سلیمان علیہ السلام تخت نشین ہوئے تو تمام حیوانات نے مبارکباد دی اور خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے سوائے چیونٹی کے۔ یہ آپ کو مبارک باد دینے کی بجائے تعزیت کر رہی تھی۔ سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی کو جھڑکا اس نے کہا میں آپ کو کیسے مبارک باد دوں جب کہ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس سے دنیا سمیٹ لیتا ہے اور آخرت کی طرف اسے لگا دیتا ہے لیکن سلیمان علیہ السلام رات دن دنیا میں مستغرق ہیں تو پھر یہ مبارک باد کی بجائے تعزیت کے زیادہ حق دار ہیں۔ (ذکرہ السیوطی فی قتادہ)

ف : حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ وہ کون سا بادشاہ ہے جس کے لیے گردنیں جھکیں اور جسم و جان قربان ہوں۔ آپ نے فرمایا ایسا بادشاہ تو زمین پر اللہ تعالیٰ کا سایہ ہوتا ہے جب وہ نیکی کرتا ہے تو اجر پاتا ہے اور رعایا کو اس کا شکر لازم اور جب وہ برائی کرے تو اس کو گناہ اور رعایا پر صبر ضروری ہوتا ہے۔

ف : یزدجر نے ایک دانا سے پوچھا کہ ملک کس عمل سے ابھارہ سکتا ہے اس نے جواب دیا رعایا سے نرمی کرنے سے اور ان سے نرمی کر کے حق طلب کرنا اور ان سے عدل و انصاف کے ساتھ پیار کرنا اور ان کے لیے سفری آسانیاں پیدا کرنا تاکہ امن و سلامتی کے ساتھ سفر کر سکیں۔ علاوہ ازیں مظلوم کے لیے انصاف کرنا ؂

رعیت نشاید بہ بیداد کشت
کہ مر سلطنت را پناہند و پشت
مراعات دہقان کن از بہر خویش
کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

ترجمہ : رعیت کو ظلم سے ذبح نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ رعایا سلطنت کے لیے پناہ و پشت ہیں۔ جاٹ (عام آدمی) کی رعایت اپنے لیے کیجیے اس لیے کہ خوش دل مزدور بہت کام آتا ہے۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ اور سلیمان علیہ السلام کے لیے لشکر جمع کیا گیا۔

حل لغات : الحشر بمعنے اخراج الجماعۃ الخ جماعت کو اپنی قرار گاہ سے نکال کر جنگ وغیرہ کے لیے باہر لے جانا اور یہ جماعت کے اخراج کے سوا فرد واحد کے لیے مستعمل نہیں ہوتا۔ (کذا فی المفردات)

الحشر کا حقیقی معنی ہے جمع کرنا (کذا فی التاج)۔ الجنود، جند کی جمع ہے۔ لشکر کو جُند کہا جاتا ہے۔ دراصل اس سخت زمین کو کہتے ہیں جس میں پتھر وغیرہ ہوں۔ پھر ہر مجتمع کو جُند کہتے ہیں۔ جیسے حدیث شریف میں ہے: الارواح جنود مجندۃ ارواح ایک لشکر تھے لشکر ایک مجتمع کے طور پر رہتا ہے۔ اسی مناسبت سے لشکر کو جُند کہا

جاتا ہے۔

ف: کشف الاسرار میں ہے کہ الجند کی جمع نہیں ہاں جنود جمع واقع ہوئی ہے
تو لشکر کی مختلف اجناس کی وجہ سے مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ جنّ والنس اور پرندوں سے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مخلوق کی ہر علیحدہ جنس کو جند کہا جاتا ہے اللہ فرماتا ہے وما یعلم جنود ربك الاھو اللہ تعالیٰ کے جنود کو اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا ۔ پس بعوض (مزودکا مچھر) لشکر ہے اور ابابیل (اصحاب فیل کے) پرندے لشکر ہے ہدہد (عسکر فوج) لشکر ہے ۔ عنکبوت (مکڑی) لشکر ہے ۔ حمامۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لشکر ہے وغیرہ وغیرہ۔
اب معنی یہ ہوا کہ سلیمان علیہ السلام کے لیے شام کی طرف سیر و سفر میں لشکر جمع کئے گئے ۔

ف: فتح الرحمٰن میں ہے اصطخر سے یمن تک ۔ اصطخر (بکسر الهمزة وفتح الطاء) فارس کے شہروں کا ایک شہر ہے اور یہی شہر سلیمان علیہ السلام کا دارالخلافہ تھا ۔ وہیں پر جنّ والنس اور پرندوں کے چیدہ چیدہ جمع ہوتے آپ جب سفر کرتے تو ان لوگوں سے مشورہ کرکے روانہ ہوتے ' (جن کا ذکر پہلے ان کی تیز رفتاری کی وجہ سے ہے) کیونکہ تیز رفتاری اور قوت وطاقت میں دیگر اجناس سے یہ گروہ بظاہر زائد ہے۔

فَهُمْ يُوزَعُونَ ○ پھر جماعتیں بنائی جائیں۔

حل لغات الوزع بمعنے الکف والمنع یعنی تفرق وانتشار سے روکنا اور الوزّاع بمعنے تفرق وانتشار سے روکنے والا اور وہ شخص جو ظالم وفساد رعایا اور عام ظلم وفساد سے روکے ۔ اس کی جمع وزعۃ آتی ہے

اب معنی یہ ہوا کہ آپ کے لشکر کے اگلے پچھلے سارے ایک جگہ روکے جاتے تھے تاکہ تمام لشکر ایک جگہ جمع ہوجائیں اور مجتمع ہوکر چلیں اور انتشار سے بچیں جیسے کثیر لشکر عموماً انتشار کا شکار ہوجاتا ہے۔

ف: سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں ہر جنس کو علیحدہ علیحدہ ایک روکنے والا تھا جو انہیں منتشر ہونے سے روکتا تھا۔

ف: اس میں اشارہ ہے کہ لشکر سلیمانی اگرچہ بکثرت تھا لیکن محال ہے کہ وہ منتشر ومتفرق ہوں ۔ ایسے نظم وضبط سے چلتے تھے اور رہتے تھے کہ گویا تسبیح کا دانہ ہیں ان میں سے ایک بھی اپنے مرتبے سے آگے پیچھے نہ ہوتا تھا ۔ ممکن ہے کہ یہ ترتیب صفوف کی ہو جیسا کہ المختار (کتاب لغت) میں ہے کہ الوزاع ہر وہ شخص جو صف کے آگے ہو اور اس کی اصلاح کرے ' آگے اور پیچھے والوں کی نگہداشت رکھے ۔

سوال: آگے والوں کو روکنے کی تخصیص کیوں حالانکہ لشکر والے پچھلے حصے سے بھی غلطی کر لیتے ہیں مثلاً پیچھے ہٹ جائیں یا رہ جائیں ۔

جواب: تیزی میں جتنا پہلے حصے والے سبقت کر سکتے ہیں وہ پچھلوں کو حاصل نہیں ۔ ہوا کی سیر میں بالخصوص اس کا لحاظ ضروری ہوتا ہے ۔

ف : کشف الاسرار میں ہے کہ فھم یوزعون وہ انہیں خروج اطاعت سے روکتے تھے اور اسی سے ہے ومن یزغ منھم عن امرنا نذقہ من عذاب السعیر ۔ اور جو ان سے ہمارے حکم سے روگردانی کرے گا۔ ہم اسے دوزخ کا عذاب چکھائیں گے ۔

لشکر سلیمانی کی تعداد حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر تین سو میل لمبا اور تین سو میل چوڑا تھا۔ پچھتر میل پر انسان پچھتر میل پر جنات اور پچھتر میل پر پرندے اور پچھتر میل پر وحشی جانور پھیلے ہوتے تھے اور آپ کے ایک ہزار شیشے کے بنگلے تھے جو لکڑیوں پر تیار کیے گئے تھے اس میں آپ کی تین سو منکوحات اور سات سو کنیزیں رہائش پذیر تھیں آپ کے لیے جنات نے تین میل لمبا اور تین میل چوڑا سونے اور ریشم کا قالین (فرشی) تیار کیا ۔ اس کے درمیان میں آپ کا سونے کا منبر بچھایا جاتا اس پر آپ رونق افروز ہوتے اس کے اردگرد سات لاکھ سونے اور چاندی کی کرسیاں بچھائی جاتیں سونے کی کرسیوں پر آپ کے نائبین اور چاندی کی کرسیوں پر علماء بیٹھتے ۔ ان کے اردگرد انسان اور ان کے اردگرد جنات و شیاطین بیٹھتے اور اس نوری جماعت پر پرندے پر بچھاتے کہ ذرہ بھر بھی سورج کی کرن ان پر نہیں پڑتی تھی ۔ اس پورے لشکر کو ہوا اٹھا کر چلتی جو ایک ماہ کے برابر سفر کرتی رہتی تھی ۔

ہوا پر شاہی اور ہر آواز کا سننا حضرت سلیمان علیہ السلام کا تیز ہوا کو حکم تھا کہ وہ آپ کے تخت کو اٹھائے اور نرم ہوا کو حکم تھا کہ وہ اسے چلائے اللہ نے فرمایا اے سلیمان علیہ السلام آپ زمین و آسمان کے درمیان چلتے وقت زمین کی آوازیں سن سکتے ہیں اس کا حکم ہم نے ہوا کو فرما دیا ہے [1]

---

[1] اس سے ہمارا استدلال ہے کہ محبوبان خدا دور اللہ کی دی ہوئی قوت سے سن سکتے ہیں ۔ اس کے تفصیلی دلائل توفیقر نے اپنی کتاب التحقیق السعید فی السماع عن البعید میں لکھی ہے ۔ یہاں صرف ایک حوالہ پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تین چیزوں کو قوت سماعت دی گئی ہے ۔ ایک یہ کہ جنت سنتی ہے اور دوزخ سنتی ہے اور وہ فرشتہ جو کہ میرے پاس مقرر ہو چکا ہے وہ سنتا ہے ۔ جب میری امت کا کوئی بندہ جہاں کہیں ہو ۔ جب بندہ کہتا ہے (اللھم انی اسئلک الجنۃ) اے اللہ مجھے جنت عطا فرما تو جنت اس کی آواز سن لیتی ہے اور کہتی ہے یا اللہ اس کو مجھ میں داخل فرمائے اور جب میری امت کا کوئی بندہ یہ دعا کرتا ہے (اللھم اجرنی من النار) یا اللہ مجھے دوزخ سے بچا ، تو دوزخ سن لیتی ہے) اور کہتی ہے یا اللہ اس کو مجھ سے بچا ۔ اور جب میری امت کا کوئی بندہ میرے اوپر سلام بھیجتا ہے وہ فرشتہ مذکور سنکر عرض کرتا ہے یارسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ فلاں ہے کہ سلام عرض خدمت کر رہا ہے ۔ اس کو سلام کا جواب دیا جاتا ہے ۔ اذافہ اویسی

کھیتی باڑی والے کسان کی آرزو منقول ہے کہ ایک وقت حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت آسمان کے نیچے اڑ رہا تھا کہ تخت ایک کسان کے اوپر سے گذرا وہ کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی اولاد کو کتنا بڑا ملک عطا فرمایا ہے (کاش یہی ملک مجھے بھی عطا فرماتا) یہ آواز حضرت سلیمان علیہ السلام نے سن لی تھی۔ اسی وقت آپ نے تخت کو نیچے اتارنے کا حکم دیا آپ نیچے اترتے ہی اسی کسان کے ہاں تشریف لائے اور فرمایا کہ میں تمہیں حکم دیتا ہوں تاکہ تم آئندہ ایسی آرزو نہ کیا کرو جو تمہارے بس یا تمہارے لائق نہ ہو۔ پھر فرمایا تمہارا ایک بار سبحان اللہ کہنا داؤد علیہ السلام کی آل کی نعمتوں سے بہتر ہے۔
صاحب روح البیان رحمۃ اللہ علیہ ص ۳۴۳ ج ۶

مدینہ منورہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی حاضری مطبوعہ استنبول جدید میں لکھتے ہیں سلیمان علیہ السلام مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال ھذہ دار ھجرۃ نبی آخر الزمان طوبی لمن آمن بہ وطوبی لمن اتبعہ وطوبی لمن اقتدی بہ۔ سلیمان علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ پاک سے گذرے تو فرمایا یہی نبی آخر الزمان علیہ السلام کی ہجرت گاہ ہے اسے مبارک ہو جو آپ پر ایمان لائے۔ اور اسے جو آپ کی فرمانبرداری کرے یا اسے جو آپ کی اقتداء کرے۔

حَتّٰۤی اِذَاۤ یہاں تک کہ گذرے اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ ۙ چیونٹیوں کی وادی کے اوپر سے۔

ف: بعض نے کہا کہ اتی کا صلہ علی ہے کہ یہاں اتیان بمعنی قطع مسافت ہے جیسے کہا جاتا ہے اتی علی الشئ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شئے کو پورا کرلے اور منزل مقصود کو مکمل کرلے ان قائلین کا یہ خیال اس لیے ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر سے اس وقت خطرہ ہوتا تھا جب وہ کہیں جاکر اترتے ورنہ ہوا کے اڑتے ہوئے کسی کو ان سے خطرہ نہ ہوتا تھا۔ (کذا فی الارشاد) اس سے مزید آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔

حل لغات وادی ہر وہ جگہ جہاں سے پانی بہ نکلے النملۃ نمل کا واحد ہے بمعنے چیونٹی یہ تنمل سے مشتق ہے بمعنے حرکت کرنا چونکہ یہ بکثرت حرکت کرتی رہتی ہے۔ باوجودیکہ اس کے ہاتھ پاؤں قلیل ہیں۔ اس لیے اسی نام سے موسوم ہے اور وادالنمل اس لیے موسوم ہے ان کی کثرت کی وجہ سے یہ ایسے ہے جیسے کہا جاتا ہے بلاد الثلج برفانی شہر ہے یہاں پر شام کے علاقہ کی ایک وادی ہے یا طائف میں یہ وادی واقع ہے کیونکہ وہاں چیونٹیاں بکثرت ہیں اور مشہور یہ ہے کہ یہاں چھوٹی چیونٹیاں مراد ہیں۔ بعض نے کہا کہ وہاں کی چیونٹیاں بھیڑیے اور عربی اونٹوں جتنا موٹی تھیں بعض نے کہا وہاں کی وادی میں جن رہتے تھے جن پر چیونٹیاں سواری کرتی تھیں۔

تفسیر عالمانہ قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو گھس جاؤ اپنے بلوں میں یہ اذا کا جواب ہے گویا جب چیونٹی نے انہیں دیکھا کہ سلیمان علیہ السلام

لشکر سمیت ان کی وادی کی طرف متوجہ ہیں تو چیونٹی بھاگی اور وہ تمام موجودہ چیونٹیاں بھی متنبہ ہوگئیں - اس کے پیچھے تمام چیونٹیاں دوڑیں -

سوال : یہ خطابات تو عقلاء کے ہوتے ہیں اور چیونٹی تو غیر ذوالعقول میں سے تھی ؟

جواب ۱ : یہ عموماً ہوتا ہے غیر ذوی العقول کو ذوی العقول قرار دے کر ان پر ذوی العقول کے احکام جاری کرتے ہیں۔

جواب ۲ : اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں عقل پیدا کر دی اور وہ قادر ہے کہ غیر ذوی العقول کو عقل بخشے اور پھر ان پر ذوی العقول کے طریقہ پر اعمال و افعال صادر ہوتے ہیں -

یہ چیونٹی لنگڑی تھی اس کے دو پر تھے جو مرغ یا شتر مرغ کے پروں کے برابر تھے - یا بھیڑیے کے قد کے برابر **اعجوبہ** اور وہ چیونٹیوں کی ملکہ یعنی سردار تھی - اس کا نام منذرہ یا طاخیہ یا جرمی تھا - اس کا یہ نام توراۃ یا انجیل یا کسی صحیفہ میں لکھا ملتا ہے اور اس کا یہ نام اللہ نے رکھا یا سلیمان علیہ السلام سے پہلے انبیاء علیہم السلام اسی نام سے موسوم کرتے چلے آئے - اس کا نام اس کے بولنے کی وجہ سے مشہور ہوا ورنہ چیونٹی کے علمیہ اسماء کہاں اور نہ ہی چیونٹیاں اپنی ایک دوسری کو خاص نام سے موسوم کرتی ہیں اور نہ ہی النسانوں کو ان کی شکلوں سے پہچان ہوتی ہے کہ یہ فلاں ہے اور وہ فلاں اور نہ ہی ابنائے آدم کے ماتحت ہیں کہ وہ انہیں اپنے گھوڑوں اونٹوں وغیرہ کی طرح نام سے یاد کریں (کذا فی التعریف والاعلام للسہیلی رحمۃ اللہ علیہ)

ف : نملہ مؤنث حقیقی ہے اس لیے کہ اس کے فعل میں تاء تانیث ہے اگر فعل میں تاء نہ ہو تو نملہ کو مذکر سمجھا جاتا۔ کیونکہ لفظ نملہ کا اطلاق مؤنث و مذکر ہر دونوں کے لیے برابر طور پر ہوتا ہے جب ان میں امتیاز معارب ہوتا ہے تو کسی خارجی امر سے فرق کیا جاتا ہے مثلاً کہا جائے گا

نملۃ انثی و نملۃ ذکر ایسے ہی حمامۃ و یمامۃ و دیگر مؤنث لفظیہ کا حال ہے -

---

حاشیہ اعجوبہ : عربی میں ہر انڈے کو بیض لکھیں گے سوائے چیونٹی کے کہ اس کے انڈے کو بنظ (ظاء) کے ساتھ لکھتے ہیں -(کنز مدفون)

ف : اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں ولا الضالین یعنی ضاء کو ظاء کے مخرج میں نہ پڑھنا چاہیے کہ اس سے نماز فاسد ہو جاتی اور عمداً پڑھنے سے کفر لازم آتا ہے کیونکہ بسا اوقات معنی میں تغییر فاحش ہو جاتا ہے - تفصیل فقیر کے رسالہ میں موجود ہے - رسالے کا نام یہ ہے: "رفع الفساد فی الظاء والضاد"۔

حکایت امام (فخر الدینؒ) نے کہا کہ حضرت قتادہ کوفہ میں تشریف لائے آپ نے اعلان کیا کہ مجھ سے جو چاہو پوچھو امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ ابھی بچے تھے آپ نے لوگوں سے فرمایا ان سے سوال کرو کہ سلیمان علیہ السلام کی چیونٹی نر تھی یا مادہ؟ حضرت قتادہ سے سوال کیا گیا تو جواب دے سکے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے فرمایا وہ مادہ تھی اس لیے کہ اس کا فعل قالت (مؤنث) ہے اگر نر ہوتی تو قال نملۃ کہا جاتا۔

ف : نملۃ حمامۃ و شاۃ کہ یہ مذکر و مؤنث ہر دونوں کی طرح مستعمل ہوتے ہیں۔ امتیاز کے لیے خارجی قرینہ کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً کہا جاتا ہے حمامۃ ذکر و حمامۃ انثی اور فائدہ ہو اور ھی ہر دونوں (مؤنث و مذکر) راجع ہوتے ہیں ورنہ قامت طلحۃ و حمزۃ نہیں کہا جاتا۔

لَا يَحْطِمَنَّكُمْ تمہیں نہ روندیں۔

حل لغات : حطم بمعنی توڑنا۔ کعبہ کے حطیم کو بھی اسی لیے حطیم کہا جاتا ہے اس کا ایک حصہ اس سے علٰحدہ کیا گیا ہے [1]

سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ یہ جملہ مستانفہ ہے یا امر (لا یحطمنکم) سے بدل ہے لیکن یہ امر دہ ہے جسے جواب کی ضرورت نہیں۔ قاعدہ ہے کہ امر میں نون تاکید (ثقلیہ و خفیفہ) بعض کلام کے وقت میں داخل نہیں ہوتا اور یہی جواب کے مطالبہ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

ف : یہاں امر سے معنوی امر مراد ہے ورنہ لا یحطمنکم توصیغہ نہی کا ہے۔ یاد رہے کہ چیونٹی نے حطم سے روکا ہے اس سے مراد ٹھہرنا اور پیچھے ہٹنا ہے۔ اب معنی یہ ہوا کہ لشکر تمہارے بلوں کو روند نہ دے اس لیے ان کے پہنچنے سے پہلے ہی بلوں میں گھس جاؤ۔

سوال : چیونٹی کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ لشکر سلیمانی ہے اور اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام بھی ہیں؟

جواب : سب کو معلوم ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی فرمانبرداری کا حکم جیسے انسانوں کو تھا ایسے ہی

---

[1] حطیم ایک قوس نما سنگِ مرمر کی دیوار ہے۔ بلندی ڈیڑھ گز ہے۔ یہ دیوار کعبہ کے ساتھ واقع ہے۔ دیوار کعبہ اور حطیم کے درمیان ایک راستہ ہے۔ یہ بھی نوافل اور اجابتِ دعا کا مقام ہے۔ اس کا اندرونی حصہ ۴ فٹ ہے۔ اس کا طول دیوار کعبہ اندرونی حصہ ۴ فٹ پانچ انچ ہے۔

مسئلہ : اس کے باہر سے طواف کرنا افضل ہے۔ اگرچہ اندر سے گزر کر طواف کرنا بھی جائز ہے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہاں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور بی بی ہاجرہ کے مزارات ہیں جو لوگ مزارات کی حاضری کو شرک کہتے ہیں وہ طواف جیسی عبادت میں ان مزارات کے گرد گھومنے پر کیا فتویٰ دیتے ہیں؟ (تفصیل فقیر کے سفرنامہ "مدینہ کے راہی" میں پڑھیے۔

.جملہ حیوانات اور پرندوں کو بھی تھا اور یہ چیونٹی بھی منجملہ انہی میں سے تھی اور قاعدہ ہے کہ جو کسی کی اطاعت پر مامور ہوتا ہے اور اسے جانتا بھی ہے۔

چیونٹی کے فہم و ذکا کا بیان چیونٹی دوسرے جانوروں سے زائد فہم رکھتی ہے۔ مثلاً اسے معلوم ہے کہ سردیوں کے لیے اناج جمع کر کے رکھنا ہے کہ وہ دانوں کو دو ٹوٹے کر دیتی ہے کیونکہ اسے دو ٹکڑے نہ کیا جائے تو وہ اُگ آتا ہے یہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں جانتا ایسے وہ کزبرہ کے دانہ کے چار ٹکڑے کر دیتی ہے کیونکہ اسے چار حصے نہ کیا جائے تو وہ پھر دوبارہ اُگ آتا ہے۔ یہ بھی چیونٹی کے فہم کی اعلیٰ دلیل ہے۔ اس کے باوجود اگر دانے پر پانی کی تری پڑ جائے تو اسے باہر لے جا کر دھوپ میں سکھاتی (خشک کرتی ہے) ہے تاکہ یہ دانہ دوبارہ اُگنے کے لائق نہ رہے کیونکہ خشک دانہ پر پانی پڑ جائے تو وہ اُگنے کے لائق بن جاتا ہے۔

چیونٹی کے انڈے حیوۃ الحیوان میں ہے کہ چیونٹی دوسرے جانوروں نر، مادہ کی طرح جفتی نہیں ہوتی اور نہ ہی اس میں نر مادہ کی کیفیت ہوتی ہے۔ ان کے توالد و تناسل کا قصہ یوں ہوتا ہے کہ ہر چیونٹی سے معمولی سی کوئی شے زمین پر گرتی ہے تو وہ شے پھر بڑھنے لگتی ہے یہاں تک کہ وہ انڈے کی شکل اختیار کر لیتی ہے پھر اسی سے ہی چیونٹی کے بچگان پیدا ہوتے ہیں۔

ف: ہر انڈہ کو عربی میں بیض (بالضاد) کہا جائے گا سوائے چیونٹی کے کہ اس کے انڈے مذکور کو بیظ بالظاء سے تعبیر کیا جائے گا۔

وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۔ یہ لا یحطمنکم سے حال ہے یعنی ان کا یہ حال بمعنی روندنا ان سے لاشعوری سے ہو سکتا ہے کیونکہ جب وہ معلوم کر لیں گے تو اسے ہرگز نہیں کریں گے اس لیے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور آپ کے لشکر کے عدل و فضل کا تقاضا یہ ہے کہ نہ وہ چیونٹی کو روند سکتے ہیں نہ اس سے بڑے جانوروں کو روندتے ہیں نہ اس سے چھوٹے کو۔

چیونٹی کا پاک عقیدہ گویا چیونٹی کا عقیدہ تھا کہ انبیاء السلام ظلم و ایذاء سے معصوم ہوتے ہیں سوائے اس کے کہ یہ عمل ان سے سہواً ہو۔ چیونٹی کے اس عقیدہ کی نظر لشکر حبیب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل ہے کہ اس کے لیے بھی اللہ نے فرمایا: فتصیبکم منھم معرۃ بغیر علم تو تمہیں ان کی لاعلمی سے تمہیں ضرر پہنچے کیونکہ ان کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ کسی اہل ایمان کو ضرر پہنچائیں۔

لشکرِ سلیمانی اور لشکرِ محمدی کا فرق لشکرِ سلیمانی کے لیے اس فعل کا استثناء چیونٹی نے کیا ہے لیکن نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لشکر کا استثنا خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اس سے فرق خود ہی معلوم کیجیے کہ لشکرِ محمدی کو لشکرِ سلیمانی پر کتنی فضیلت حاصل ہے۔ ایسے ہی حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کو جملہ انبیاء علیہ السلام پر فضیلت ہے۔

سلیمان علیہ السلام کا دور سے سننا مروی ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی کا یہ مقولہ تین میل سے سن لیا تھا جسے ہوا نے آپ تک یہ آواز پہنچائی۔

ف : ہوا ہر آواز کو ہر ایک کان میں پہنچاتی ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے تخصیص یوں ہوئی کہ آپ کو ہر آواز مطلب کے مطابق پہنچنے کے بعد سمجھ آجاتی تھی اور بہت بڑی دوری کے لیے حائل نہ تھی بخلاف ہمارے کہ آواز ہم کو تو پہنچ رہی ہے لیکن . . . .

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّن قَوْلِهَا پس سلیمان علیہ السلام چیونٹی کی بات سے ہنسنے لگے۔ اس سے سلیمان علیہ السلام کے ہنسنے کا مبالغہ کا بیان ہے کہ ان کے ہنسنے کا انتہائی مرتبہ یہی تھا دوسرے عوام جیسا ہنسنا نہ تھا کہ ان کے ہنسنے کا انتہا قہقہ ہوتا ہے اور انبیاء علیہ السلام سے قہقہ نہیں ہوتا یہ ان کی شان کے خلاف ہے اور انبیاء علیہ السلام کی ہنسی کا انتہا یہی تبسم ہے اور ضاحکاً حال مقدرہ یا مؤکدہ ہے اب معنی یہ ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام چیونٹی کے ڈرنے ڈرانے سے تعجب کرتے ہوئے ہنسے۔

حل لغات التبسم بمعنے وہ ہنسنا جس سے آواز صادر نہ ہو اب آیت کے معنی یہ ہوا کہ وہ ہنسے۔ درآنحالیکہ وہ ضاحک تھے لیکن یہاں ضحک سے ہنسنے میں شروع ہونا مراد ہے جیسا کہ اوپر گذرا ہے اور سلیمان علیہ السلام کو چیونٹی کی ہوشیاری پر ہنسی آئی کہ وہ کیسے اپنی برادری کو ڈراتے ہوئے رہبری کر رہی ہے اور انہیں ان کی مصلحتوں سے آگاہ فرما رہی ہے۔

مسئلہ : یاد رہے کہ انبیاء علیہ السلام کا ہنسنا تبسم تک محدود ہوتا ہے اور قاعدہ ہے کہ جب کوئی نئی چیز دیکھتا ہے یا اعجوبہ سنتا ہے تو متعجب ہو کر ہنستا ہے۔

فائدہ بعض مفسرین نے فرمایا کہ سلیمان علیہ السلام کا ظاہراً تو چیونٹی کی کیفیت عجیبہ سے ہنسنا تھا لیکن درحقیقت اپنی حاصل کردہ نعمت پر خوشی کر رہے تھے کہ اس کریم نے مجھے چیونٹی کی بات سمجھنے اور دور سے سننے کی توفیق بخشی اور اظہار فرحت مطلوب تھا کہ اس مالک نے مجھے بہترین لشکر عطا فرمایا ہے کہ جس کے تقویٰ و شفقت کا اعتراف چیونٹیوں تک ہے۔

نکتہ : ہم نے یہ تقریر اسلام کے اس قاعدہ سے سمجھا ہے کہ ہر نبی علیہ السلام دنیوی امور کے لیے نہیں ہوتے بلکہ انہیں دینی امور سے فرحت اور خوشی ہوتی ہے۔

سلیمان علیہ السلام کے راکٹ کا بریک مروی ہے کہ چیونٹی نے صرف لشکر کی صرف آواز سنی اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ لشکر آسمان پر ہے یا زمین پر اس لیے اس نے عمومی حیثیت سے کہہ دیا شاید لشکر زمین پر ہے اسے چیونٹیو بلوں میں گھس جاؤ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام

نے ہوا کو حکم فرمایا کہ تخت کو روک لے یہاں تک کہ چیونٹیاں بلوں میں داخل ہو جائیں چنانچہ آپ کا راکٹ وہیں تین میل دور رُک گیا پھر جب تک تمام چیونٹیاں بلوں میں داخل نہ ہوگئیں راکٹ روانہ نہ ہوا۔

الوسیط میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر سے بعض سواریوں پر تھے

لشکر زمین پر چل رہا تھا اور بعض پیدل چل رہے تھے اسی لیے چیونٹی کو اپنے لشکر کے روندے جانے کا خطرہ ہوا اس تقریر پر یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب سلیمان علیہ السلام کو ہوا کی تسخیر کا معجزہ عطا نہیں ہوا تھا کیونکہ لشکر اگر آسمان پر ہوتا تو چیونٹی خوف نہ کھاتی۔

مروی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ چیونٹی کو میرے ہاں

مکالمہ سلیمان علیہ السلام بہ نمل لاؤ چنانچہ چیونٹی حاضر کی گئی تو ذیل کا مکالمہ (گفتگو) ہوئی۔

سلیمان علیہ السلام : اے چیونٹی کیا تجھے معلوم نہ تھا کہ میرا لشکر کسی پر ظلم و ستم نہیں کرتا۔

چیونٹی بے شک میرا عقیدہ یہی ہے کہ آپ کا لشکر ظلم و ستم نہیں کرتا لیکن چونکہ میں ان سب کی سردار ہوں اسی لیے میرا فرض منصبی تھا کہ میں انہیں ہر نشیب و فراز سے آگاہ کروں۔

سلیمان علیہ السلام : کیا تمہیں معلوم نہ تھا کہ لشکر تو آسمان پر تھا تو پھر ان سے روندنے کا خطرہ کیسا۔

چیونٹی : معلوم تھا لیکن میں نے سمجھا کہ میرا لشکر آپ کے لشکر کی شوکت کو دیکھ کر دنیوی مشاغل میں مشغول ہو جائیں گے اس طرح ذکر الٰہی سے محروم ہو جائیں گے۔ ان کے روندے جانے سے ظاہری معنی مراد نہ تھا بلکہ باطنی معنی مراد تھے کہ ذکر الٰہی سے محرومی باطنی طور تباہی و بربادی ہی بربادی ہے۔

سلیمان علیہ السلام : اے چیونٹی تیری اس تقریر سے تیری قدر و قیمت میرے دل میں بڑھ گئی ہے فلہذا میرا جی چاہتا ہے تو مجھے کوئی پند و نصیحت سنا دے۔

چیونٹی : آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے والد گرامی کا نام داؤد علیہ السلام کیوں رکھا گیا۔

سلیمان علیہ السلام : نہیں۔

چیونٹی : آپ کے والد کا اسم گرامی داؤد علیہ السلام اس لیے تھا کہ انہوں نے زخمی دل کا دوا (علاج) کیا۔ گویا ان کا نام داوی جراحۃ قلبہ کا مخفف ہے۔ پھر چیونٹی نے سوال کیا کہ اے سلیمان علیہ السلام کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کا نام سلیمان علیہ السلام کیوں ہے۔

سلیمان علیہ السلام : نہیں۔

چیونٹی : اس لیے کہ آپ سلیم الصدر و القلب ہیں۔ گویا سلیمان علیہ السلام انہی الفاظ کا مخفف ہے۔

چیونٹی کے لشکر اور اس کی سلطنت کا حدود اربعہ : کشف الاسرار میں ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے

چیونٹی سے پوچھا کہ تمہاری سلطنت کا حدود اربعہ اور تمہارے لشکر کی تعداد کتنی ہے؟ چیونٹی نے عرض کی کہ لشکر کی نگرانی کے لیے میں چار ہزار کوتوال رکھتی ہوں اور ان میں سے ہر ایک کے ماتحت چہل ہزار نقیب ہیں پھر ہر ایک نقیب کے تحت چہل ہزار چیونٹیاں رہتی ہیں۔

چیونٹیاں زیر زمین کیوں حضرت سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی سے فرمایا کہ تو اپنے لشکر سے باہر کیوں نہیں جاتی چیونٹی نے عرض کی اے پیارے نبی علیہ السلام مجھے روئے زمین کا اختیار دیا گیا لیکن میں نے ٹھکرا دیا صرف اس لیے کہ مجھے اپنے لشکر رعیت کو چھوڑ کر کہیں جانا گوارہ نہیں بلکہ عرض کی کہ اے پروردگار عالم ہمیں زیر زمین رکھنا تا کہ تیرے سوا ہمیں کوئی نہ جانے اور ہم بھی تیرے سوا کسی کو نہ جانیں۔

سلیمان علیہ السلام کا چیونٹی سے نصیحت پذیر ہونا سیدنا سلیمان علیہ السلام سے چیونٹی نے کہا کہ آپ بھی تو مجھے بتادیں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑی کون سی نعمت عطا فرمائی ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ نے ہوا کو میرے تابع کر دیا ہے۔ میں صبح کو مشرق میں ہوتا ہوں اور شام کو مغرب میں۔ چیونٹی نے کہا یہ تو کوئی بڑا کمال نہیں بلکہ اس میں تو اشارہ ہے کہ آپ کی شاہی اس کی مثال یہی ہے کہ گویا وہ ہوا پر سہارا کر رہا ہے۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا ؎

نہ بر باد رفتی سحر گاہ و شام
سریر سلیمان علیہ السلام
بآخر ندیدی کہ بر باد رفت
خنک آنکہ با دانش و داد رفت

ترجمہ: کیا سلیمان علیہ السلام کا تخت صبح و شام ہوا پر نہیں چلتا تھا لیکن انجام کیا ہوا یہی کہ وہ مٹ کر رہ گیا فلہذا خوش قسمت ہے وہ انسان جو دانائی اور انصاف سے زندگی گذار گیا۔

یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا مانگی **قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيْٓ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ** کہا اے میرے پروردگار مجھے توفیق دے تاکہ میں تیری نعمتوں کا شکر ادا کروں۔

حل لغات اوزع کا ہمزہ تعدیہ ہے الوزع بمعنے تفرق و انتشار سے روکنا جیسا کہ پہلے گذرا ہے۔ اب معنی یہ ہوا کہ اے پروردگار مجھے توفیق دے کہ میں جمع کردوں تیری نعمت کو اور اسے ایسا مضبوط کرلوں کہ وہ مجھ سے دور نہ ہو۔ یہاں تک کہ میں تیرے شکر کو نہ بھولوں۔ خلاصہ یہ کہ سلیمان علیہ السلام نے دعا مانگی کہ مجھے اپنے شکر شکر کو جمع کرنے والا بنا دے۔

ف : شکر کو جماعت نافرہ سے تشبیہ دینا استعارہ مکنیہ ہے اور اثبات الوزع والربط تخییل اور اس تشبیہ کا قرینہ ہے۔

حدیث شریف شکر ایک وحشی جانور ہے اسے شکر سے قید کرو۔ شکر کیا جائے تو نعمت قرار پکڑتی ہے نہ کرو تو بھاگ جاتی ہے۔

ملفوظ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سیدنا امیر المومنین علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تمہارے ہاں نعمت کے اطراف بھا تھ لگ جائیں تو قلت شکر سے انہیں دور نہ بھگاؤ۔ یعنی جو شخص نعمت حاصلہ کا شکر ادا نہیں کرتا وہ نعمت غیر حاصلہ کو خاک پائے گا۔ ؎

چون بیابی تو نعمتی ور چند
خرد باشد چو نقطۂ موہوم
شکر آن یافتہ فرد مگذار
کہ زنا یافتہ شوی محروم

ترجمہ : جب تمہیں نعمت نصیب ہو اگرچہ تھوڑی سہی تو تجھے وہ ایک نقطۂ موہوم کی طرح معمولی محسوس ہوگی لیکن تیرے لیے لازم ہے کہ اس حاصل کردہ نعمت کو شکر کے بغیر نہ چھوڑ ورنہ غیر حاصل شدہ نعمت سے بھی محروم ہو جاؤ گے۔

اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ وہ جو کہ تو نے مجھے نعمت عطا فرمائی۔ علم و نبوت اور ملک و عدل اور پرندوں وغیرہ کی بولیوں کا سمجھنا وغیرہ وغیرہ۔ **وَعَلٰی وَالِدَیَّ** اور میرے والدین پر میرے باپ داؤد بن ایشا کو نبوت۔ پہاڑوں اور پرندوں کا ان کے ساتھ تسبیح پڑھنا اور زرہ بنا اور لوہے کا موم ہو جانا وغیرہ وغیرہ اور میری والدہ پر یوں کہ :

یہ دراصل اوریا کی بیوی تھی اسی بی بی سے حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش ہوئی تھی۔ یہ بی بی مسلمان پاکیزہ صفت اور طیبہ و طاہرہ تھی یہی وہ بی بی ہے جس نے نصیحت فرمائی کہ اے بیٹے رات کو کم سویا کرو کیونکہ رات کو زیادہ نیند کرنا انسان کو قیامت میں زیادہ تنگ دست بنا دے گی۔ (کذافی کشف الاسرار)

نکتہ ماں باپ کا ذکر درمیان میں اس لیے لائے ہیں کہ ماں باپ پر عطا کردہ نعمتیں گویا اولاد کی نعمتوں سے نوازا گیا ہے۔ اسی لیے اولاد پر شکر کا اظہار ضروری ہے کیونکہ اعلیٰ اور شریف باپ کی طرف منسوب ہونا بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے تو بیٹے کو اس نعمت کا بھی شکر کرنا چاہیئے۔

تفسیر صوفیانہ سلیمان قلب نے کہا کہ اے پروردگار تو نے میرے باپ روح کو اپنے فیض سے فیض یاب فرمایا۔ اور میری ماں جسم کو ارکان شریعت میں استعمال فرمانے کی نعمت سے نوازا اور انہی دونوں امروں سے نعمت مکمل ہوتی ہے اے اللہ ہمیں نعمت والوں اور شکر گزاروں سے بنا۔ آمین

تفسیر عالمانہ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ اور مجھے ان اعمال کی توفیق بخش جن سے تو راضی ہو۔ ابو اللیث رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایسے اعمال کی توفیق عطا فرما جنہیں تو قبول کرے۔ وَاَدْخِلْنِیْ اور مجھے بہشت میں داخل فرما۔ بِرَحْمَتِكَ اپنی رحمت سے۔ اسی لیے کہ تیری رحمت و فضل کے سوا کوئی بھی بہشت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اعمال کا کوئی بھروسہ نہیں۔ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ اپنے نیک بندوں کے ساتھ یعنی مجھے انہی کے ساتھ کر دے یہاں عباد صالحون سے انبیاء اور ان کے وہ تابعدار جو نیکیوں میں ان کی اقتدا کرتے ہیں۔

ف: اللہ تعالیٰ کی اصلاح دو قسم ہے: ۱۔ پیدائشی نیک ۲۔ ازالۂ فساد کے بعد پہلا دوسرے سے زیادہ برگزیدہ اور ایسے انسان نادر الوجود ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگوں کے اوائل احوال منکدرہ اور برائیوں سے مخلوط اور حجب کثیرہ میں محجوب ہوتے ہیں۔

ف: ابن الشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ الصلاح الکامل سے نیکی مراد ہے جس میں کسی قسم کے عصیاں کی ملاوٹ نہ ہو اور نہ ہی وہ کسی برائی کا ارادہ کرے۔ یہ وہ بلند مرتبہ ہے جس کا طلب گار ہر نبی و ولی ہے۔

تفسیر صوفیانہ کبر الحقائق میں ہے کہ وادی نمل سے نفس حریص کی خواہشات برائے دنیا اور نمل منذرہ سے نفس لوامہ اور سلیمان سے قلب اور مساکن سے حواس خمسہ مراد ہیں۔

سبق عاقل پر لازم ہے کہ وہ سلیمان علیہ السلام کے مرتبۂ عالی کے حصول کے بعد ان کے مشرب کا کاربند ہو کر ہمت بلند رکھے۔ جیسا کہ ان کا آسمانوں پر اڑنے کی ہمت دلالت کرتی ہے کیونکہ وہ زمین کی گہرائیوں سے ہٹ کر آسمان کی بلندی پر اڑتے اور وہ بھی بہت بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے کوئی معمولی بات نہیں۔ ہاں آپ کا چیونٹی سے گفتگو کرنا اور اس کی باتوں کو اپنے لیے لائحہ عمل کہنا تواضعاً تھا ورنہ کہاں نبوت کا اعلیٰ مرتبہ اور کہاں چیونٹی۔ حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا ؎

نظر کردن بدرویشاں منافیٔ بزرگی نیست
سلیمان باچنیں حشمت نظرہا بود باموریش

ترجمہ: فقیروں مسکینوں پر نظر کرنا بزرگی امیری کے خلاف نہیں سلیمان علیہ السلام باوجود اونچے مرتبہ کے چیونٹی پر نظر کرم فرمائی۔

اور جسے عشق کے پرندوں سے کچھ حاصل نہیں وہ پرندوں کی بولی خاک سمجھے گا۔ اور جو سلیمانِ وقت کو نہیں پاسکا وہ صورت کا معنی خاک سمجھے گا ؎

چون ندیدی دمے سلیمان را
تو چہ دانی زبان مرغان را

ترجمہ : جب تو نے دم سلیمان کو نہیں دیکھا تو تجھے پرندوں کی بولی کی کیا خبر۔

فائدہ صوفیانہ سلیمان سے وہ مرشد کامل مراد ہے کہ جس کے ہاتھ میں حقیقت کی انگشتری ہو اور اسی کے ذریعے ہی اقالیم قلوب کی حفاظت ہوتی ہے اور وہی اسرار غیب پر مطلع ہوتا ہے ۔ ایسے مرشد کامل کے ساتھ ہر شے بات کرتی ہے ۔ کوئی خود بخود کوئی بالاجبار والاکراہ اور بالاجبار والاکراہ اس کی تابعداری ہے وہ شیاطین ہیں یا ان جیسے دیگر اور (جو اولیا ءکرام کے تفرفات کے قائل نہیں وہ سوچیں کیا وہ اس ارشاد گرامی کے مصداق نہیں اگر نہیں تو تفرفات اولیاء کا اقرار کریں ورنہ . . . .) اسی لیے لازم ہے کہ امام وقت کی معرفت حاصل کی جائے ۔ (جیسے مرشد کامل)

حدیث شریف : جو امام وقت کو نہیں پہچانتا وہ جاہلیت کی موت مرے گا ۔

ف : حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنت کی دعا مانگ کر شکر پر ثابت قدمی، اصلاح و بھلائی اور خاتمہ بالخیر کی دعا مانگی ہے جیسے آپ کے آباء کرام علیہم السلام کا طریقہ تھا کہ وہ بھی اسی طرح کی دعائیں مانگتے چلے آئے اور یہ ان کی عظمت ہے اور سوء خاتمہ سے کوئی محفوظ نہیں ۔(سوائے انبیا علیہم السلام کے)

سبق اس میں امت کو سبق دیا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ شریعت کی اچھی حالت اور طریقت کے پسندیدہ مرتبہ اور معرفت کے برگزیدہ مقام اور حقیقت کے بلند درجہ پہ زندگی بسر کریں ۔ کیونکہ جو شخص معرفت اور معاملہ عبودیت کو شریعت کے ساتھ نہیں ملاتا وہ تباہ و برباد ہوگا [1] بلکہ دنیا و آخرت میں فاسقین و ہالکین کے ساتھ ہوگا اسے ذرہ برابر بھی امور باطنہ وظاہرہ میں ذرہ صالحین کا ساتھ نصیب نہ ہوگا ۔ ہم اللہ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اعمال حسنہ و احوال پسندیدہ کی توفیق بخشے اور زہد و تقویٰ کے علاوہ ہر اچھے اور نیک امر سے سنوارے وہی اجابت کے لائق اور ہر شے پر قادر ہے ۔

تفسیر عالمانہ وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ اور خبر لی اڑتے جانوروں کی ۔

حل لغات التفقد القاموس میں ہے کہ التفقد بمعنے طلب الشئ من غیبة کوئی شے غائب ہونے پر اس کی تلاش کرنا اور کشف الاسرار میں ہے بمعنے طلب المفقود یعنی گم شدہ شے کی تلاش اور گم شدہ شے پر تفقد کا اطلاق اس لیے ہوتا ہے کہ اس کے طالب کو اس کے حال کا کچھ ادراک ہوتا ہے اور کچھ اس سے بے خبر ہوتا ہے ۔ المفردات میں ہے التفقد بمعنے التعہد ۔ فرق اتنا ہے کہ تفقد فقدان الشئ کے تصرف کو کہتے ہیں اور تعہد عہد مقدم کے تصرف کو کہا جاتا ہے ۔ الطیر (پرندوں) کا جامع اسم ہے ۔(کذا فی الوسیط)

---

[1] اس صدی کی جاہل کو کون سمجھائے جو شریعت کو کچھ نہیں سمجھتا ۱۲۔

اب معنی یہ ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کا حال معلوم کیا تو ان میں ہُدہُد کو گم پایا اور وہی تمام پرندوں کا سردار تھا اس کا نام یعفور تھا۔

فَقَالَ مَالِیَ تو فرمایا مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میرا حال یہ ہے کہ لَآ اَرَی الْھُدْھُدَ میں ہُدہُد کو نہیں دیکھ رہا۔ کسی پردے کی آڑ میں ہے یا کوئی اور سبب ہے جب واضح ہو گیا کہ وہ غیر موجود ہے تو سابق گفتگو سے ہٹ کر فرمایا: اَمْ کَانَ مِنَ الْغَآئِبِیْنَ کیا وہ غائبین ہے بلکہ بات یہ ہے کہ کیا وہ غائب ہے اس تقدیر پر ام منقطعہ جس کا لفظ بل اور ہمزہ محذوف ہے اب معنی یہ ہوا کہ میں ہُدہُد کو پرندوں کی ٹولی میں نہیں دیکھ رہا۔ یا یہ ہے کہ میری آنکھ سے اوجھل ہے یا ہماری جماعت سے غائب ہو گیا ہے۔

ف : الوسیط میں ہے کہ مالی لا اری الھدھد کا معنی ہے ماللھدھد لم اراہ ہدہد کو کیا ہے کہ میں اسے نہیں دیکھ رہا اس لیے کہ اہل عرب کہتے ہیں مالی اراک کئیبا اور اس کا معنی کرتے ہیں مجھے کیا ہے کہ میں تجھے غمگین دیکھتا ہوں لیکن یہ قلب اس عبارت سے ہے جس کا معنی وضاحت کرتا ہے اگر اس کا معنی وضاحت نہ کر سکے وہ کلام مہمل ہو جاتا ہے۔

کسا تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ بادشاہوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی مملکت میں ہوشیاری **اصول شاہانہ رکھیں** اور قیام امور کا سلیقہ درست کریں اور رعایا کے جملہ امور پر کڑی نگرانی ہو اور بحیثت کے معمولی سے معمولی فرد کے حالات سے بھی بے خبری نہ ہو۔ بادشاہ وقت پر جیسے بڑوں کی خبرگیری ضروری ہے اس سے کہیں بڑھ کر چھوٹوں کے حالات آگاہی ہو یہاں تک کہ ہر چھوٹا بڑا اس کی معلومات سے اوجھل نہ ہو جیسے سیدنا سلیمان علیہ السلام کا طریقہ کریمہ تھا کہ آپ پرندوں تک کے چھوٹے سے چھوٹے پرندوں کے حال سے بے خبر نہیں رہتے تھے اور پلک بھر بھی کوئی شے آپ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی ان کی شفقت کی کیفیت بھی قابل ستائش ہے باوجود یکہ یہ کوتاہی ہُدہُد سے سرزد ہوئی لیکن سلیمان علیہ السلام نے شفقت کے طور پر اپنی طرف منسوب فرمایا کما قال مالی اری الہدہد ورنہ فرماتے ماللہدہد لم اراہ رعایا کی تادیب بھی ضروری ہے۔ چنانچہ تادیبا فرمایا: ام کان من الغائبین۔ یعنی یہ بھی منجملہ ان سے ہو گیا ہے جو میری اجازت کے بغیر غائب ہو جاتے ہیں۔

ف : حیوۃ الحیوان میں ہے کہ ہُدہُد میں بدبو ہوتی ہے اس لیے یہ اپنا گھونسلہ گندگی کے ڈھیر میں بناتا ہے۔

جنون کا علاج : ہدہد کے گوشت کی دھونی سونگھنے سے جنون چلا جاتا ہے۔

بندش کا علاج : عورت کے جماع سے قادر نہ ہونے والے کو ہدہد کا گوشت سونگھایا جائے تو اس کی بندش دفع ہو جائے گی۔

جادو کا علاج : اگر کسی پر جادو ہو تو ہدہد کے گوشت کو سونگھنے سے جادو رفع ہو جائے گا۔

مسئلہ: فتاویٰ زینبیہ میں ہے کہ ہدہد کا گوشت حلال ہے ۔

ربط: حضرت سلیمان علیہ السلام نے رعایا کی تادیب و عبرہ کے بعد اب قانون کی خلاف ورزی پر تہدید سنائی ۔

اور فرمایا لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا البتہ ضرور سخت سزا دوں گا ۔

حل لغات العذاب بمعنے الایجاع الشدید کسی کو سخت درد پہنچانا اور کہا جاتا ہے ۔ عذبہ تعذیبًا یہ اس وقت ہے جب کسی کو کوئی عذاب کی صورت میں زیادہ دیر قید رکھے ۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ میں ہدہد کو سخت عذاب کروں گا ۔ یہ کہ اس کے بال نوچ کر اسے دھوپ میں ڈال دوں گا یا چیونٹیوں کو حکم دوں گا وہ اسے کھا جائیں گی یا اسے اس کے دشمنوں کے ساتھ پنجرے میں مقید کر دوں گا کیونکہ مشہور یہی ہے کہ کسی کو سخت سزا دینی ہو تو اسے اس کے مخالف کے ساتھ مقید کر دو یا اسے اپنے پیاروں سے علیحدہ کر دو ۔

ف: الف بمعنے جفت (زوجہ) یا اسے کسی غلط کار کی خدمت کرنے پر لگا دوں گا ۔

ف: تاویلات نجمیہ میں ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ میں ہدہد کو اپنے سے دور کر دوں گا اور اپنے سے ایسا علیحدہ کر دوں گا کہ پھر کبھی منہ نہ لگاؤں گا یا اس کا کسی بڑھیا سے نکاح کر دوں گا ۔ (انسان العیون)

یا اسے اس کے ہم جولیوں کی خدمت پر لگا دوں گا یا اسے اپنی خدمت سے محروم کر دوں گا ۔

سوال: الاسئلۃ القحمہ میں ہے کہ اتنی بہت بڑی سزا ایسی شے کے لیے جو غیر مکلف ہے ؟

جواب (۱): یہ تادیبی کاروائی ہے جو سنائی کسی کے لیے جاتی ہے اور عمل درآمد کسی اور کے لیے ہوتا ہے

جواب (۲): جانوروں اور بچوں پر بھی تادیبی کاروائی کی جاتی ہے اور وہ بھی غیر مکلف ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ غیر مکلف پر تادیبی کاروائی نہ ہو بالخصوص وہ غیر مکلف جیسے کسی کی اطاعت لازم ہو اور وہ کوتاہی کرے تو پھر وہ ایسی سزاؤں کا مستحق ہوتا ہے ۔

معجزۂ سلیمانی حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ہُدہُد کے علاوہ ہر پرندہ بلکہ تمام جن وانسان اور شیاطین اور جملہ حیوانات سلیمان علیہ السلام کے تابع فرمان تھے اور ان کے مناسب احوال پر وہ مکلف بھی تھے اور اس کا انہیں فہم و ادراک بھی تھا اور ان کے احوال اس وقت ایسے تھے جیسے تکلیف میں انسان کے حالات ہوتے ہیں یعنی وہ اوامر و نواہی کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ تھا (کذافی التاویلات النجمیہ)

أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ یا اسے ذبح کر ڈالوں گا کہ آئندہ اس کی نسل بھی ختم ہو جائے یا اس کے ابنائے جنس اس سے عبرت پکڑیں ۔

اور تاویلات نجمیہ میں ہے کہ میں اس سخت عذاب میں ذبح کر ڈالوں ۔

حل لغات: الذبح بمعنے انسان وغیرہ کا حلق چیرنا۔
اَوْلَیَاْتِیَنِّیْ یہ دراصل تین نونات سے تھا یا متکلم سے پہلے والے نون کو حذف کر لیا گیا **بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ** یالائے دلیل ظاہر یعنی ایسی حجت کہ جس سے اس کا عذر ظاہر ہو۔ یعنی کوئی ایسی دلیل لائے کہ جس سے اس کی گمشدگی کا قابلِ قبول عذر ہو پھر یہ میری سزا سے بچ جائے گا۔

ملک چلانے کا گُر شاہی سیاست کے بغیر نہیں چل سکتی اور نہ ہی عدل و انصاف کے بغیر چلنا اس کا ممکن ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ مجرمین کے جرائم سے زائد سزا نہ ہو اور نہ ہی واضح عذر کے باوجود کسی کو سزا دی جائے عذر کا قبول کرنا بھی بحث و تحیص کے بعد ہو۔

ف: قسم اٹھانا پہلے دو میں سے ایک کے ہونے پر اور لفظ او پہلے دو میں تخییر کے لیے اور تیسرے میں تردید کے لیے ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی مکہ میں آمدورفت مروی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جب بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو مکہ معظمہ کی طرف حج کے ارادہ سے روانہ ہوئے اور حرم شریف میں جی بھر کر اقامت پذیر رہے اور اپنی اقامت گاہ پر روزانہ پانچ ہزار اونٹنیاں اور پانچ ہزار گائیں اور بیس ہزار بکریاں خیرات کرتے۔ پھر یمن کی طرف روانگی فرمائی صبح کو مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے سہیل تک جانے کا پروگرام تھا۔ دوپہر کے وقت تک صفا و یمن پہنچ گئے۔ مکہ سے صفا و یمن تک ایک ماہ کا سفر تھا۔ صفا و یمن کی زمین اچھی لگی کیونکہ یہاں دیکھا کہ یہ سرسبز علاقہ تھا لیکن اترتے ہی پانی نہ پایا چونکہ پانی کی تلاش پر ہدہد مامور تھا اس لیے کہ وہ زمین کے اندر سے پانی کو دیکھ لیتا تھا جیسے ہم کسی شے کو شیشے کے اندر سے دیکھ لیتے ہیں اور وہ پانی کی ناپ جان لیتا تھا کہ یہاں نیچے پانی کتنا ہے۔ پانی کی جگہ پر چونچ رکھتا تھا تو شیاطین آکر اس زمین کے ٹکڑے کو ایسے دور پھینک دیتے تھے جیسے جانور کا چمڑا ادھیڑا جاتا ہے اس طرح سے پانی آسانی سے میسر آجاتا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلایا تو غیر موجود تھا۔

ہدہد سلیمانی کو بلقیس کے ہدہد کی دعوت تقدیر ربانی جب آتی ہے تو اسے کوئی شے نہیں روک سکتی۔ بہت سے بندگانِ خدا دوسروں کے لیے تو گڑھا کھودتے ہیں لیکن خود اس میں گر کر مر جاتے ہیں۔ ہدہد پر تقدیر واقع ہوئی۔ ہوا یوں کہ ہدہد جب دیکھا کہ سلیمان علیہ السلام اقامت گاہ میں آرام فرما ہیں تو وہ اونچا اڑ کر زمین پر نگاہ ڈالتا یعنی آزادی سے سیر و سیاحت میں مصروف ہو جاتا۔ یہاں یمن میں اونچائی سے دیکھا تو اسے ایک اور ہدہد نظر آیا جس کا نام عنفیر تھا جو ایک جگہ پر وہ ٹھہرا ہوا تھا تو اسے دیکھ کر وہ نیچے اتر آیا دونوں گلے ملے۔ سلیمانی ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے اوصاف کریمہ بتائے اور اس کی شاہی کے حالات سنائے اور بلقیس کے ہدہد نے اپنی ملکہ کی باتیں سنائیں اور کہا کہ اس کے ماتحت ایک لاکھ لیڈر ہے اور ہر لیڈر کے ماتحت ایک ایک لاکھ افراد رہتے ہیں۔ سلیمانی ہدہد کو بلقیس کی شاہی کے دیکھنے کا شوق ہوا تو چلا گیا اور بلقیس کی شاہی کی سیر

کرتے عصر ہو گئی۔

اس کو اللہ نے فرمایا فَمَکَثَ ۔ تو ٹھہرا ۔

حل لغات : المکث بمعنے انتظار کے بعد کسی جگہ ٹھہرنا یعنی ہدہد ٹھہرا ۔

غَیْرَ بَعِیْدٍ تھوڑی سی دیر ۔ اس میں اشارہ ہے کہ اس کی غیر موجودگی اگرچہ عذاب شدید یعنے سلیمان علیہ السلام کی حاضری سے محرومی و دیگر منافع کا نقصان لیکن درحقیقت وہ سعادت ہی تھی کہ واپسی کے لیے تیز رفتاری اور جبر نقصان کی تدبیر کی ۔

ہدہد کی واپسی اور اس سے باز پرس حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہدہد کی غیر موجودگی پر احساس ہوا کہ چونکہ دھوپ سے بچنے کے لیے پرندوں کو مقرر کیا ہوا تھا اور جب ہدہد اپنی جگہ چھوڑ گیا تو دھوپ محسوس ہوئی تو پوچھا کہ ہدہد کہاں ہے نہ پانے پر گدھ کو بلایا اور فرمایا دیکھ کہاں گیا ۔ گدھ نے اڑ کر دیکھا تو اسے نظر نہ آیا اس کے بعد عقاب کو حکم ملا ۔ عقاب نے اڑ کر دیکھا تو واپس آ رہا تھا آگے جا کر ملا ہدہد ڈر گیا ۔ عقاب کو کہا تمہیں اس رب کی قسم جس نے تجھے قدرت و قوت بخشی مجھے کچھ نہ کہنا بلکہ بتائیے سلیمان علیہ السلام میرے متعلق کیا فرماتے ہیں ۔ عقاب نے کہا کہ وہ قسم اٹھا چکے ہیں کہ ہدہد واپس آیا تو اسے ضرور سزا دوں گا ۔ ہدہد نے کہا قسم مطلق ہے یا اس سے استثناء بھی فرمایا تھا ۔ عقاب نے کہا ہاں ساتھ ہی فرمایا تھا کہ اگر کوئی معقول عذر لایا تو معاف کر دوں گا ۔ ہدہد نے کہا اب خیر ہے چنانچہ ہدہد جونہی حضرت سلیمان علیہ السلام کی بارگاہ میں پہنچا تو پر پھیلائے اور گردن نیچی کر کے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضری دی تو سلیمان علیہ السلام نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف کھینچا تو ہدہد نے کہا اے پیارے نبی آپ اپنی حاضری بارگاہ حق کی یاد کیجئے یہ سن کر سلیمان علیہ السلام تھرا گئے ۔ مروی ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے ہدہد سے فرمایا اگر تو چاہے تو تیرے پر و بال اڑا کر تجھے دھوپ میں پھینک دوں ہدہد نے کہا آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے کیونکہ یہ تو شکاری کرتے ہیں اور آپ تو پیغمبر ہیں ۔ پھر سلیمان علیہ السلام نے کہا میرا جی چاہتا ہے کہ میں تیرے گلے پر چھری چلا دوں ۔ ہدہد نے کہا یہ بھی آپ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ قصابوں کا کام ہے اور آپ تو نبی ہیں ۔ پھر سلیمان علیہ السلام نے فرمایا میں چاہتا ہوں تجھے ناجنسوں کے ساتھ قید کر دوں عرض کی کہ آپ یہ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ یہ کام خسیس لوگوں کا ہے اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے شان پیغمبری سے نوازا ہے ۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا تو پھر کیا کروں عرض کی معاف فرما دیں کیونکہ معاف کرنا انبیاء علیہ السلام کی شان ہے ۔ اس پر آپ نے اسے معاف فرما دیا پھر حالات پوچھے ؛

تو ہدہد نے کہا فَقَالَ اَحَطْتُّ الاحاطة العلم بالشی من جمیع جہاتہ شے کو اس کی جمیع جہات سے جاننے کو احاطہ کہا جاتا ہے لے ۔ (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ میں نے اس کا گھیرا کیا ہے جس کا تم نے گھیرا نہیں کیا یعنی علم و معرفت اور اس کی جمیع جہات سے حفظ نہیں کیا، کیونکہ اسے سلیمان علیہ السلام نے مشاہدہ نہیں فرمایا تھا اور نہ ہی کسی جن و انس نے آپ کو اس کی خبر دی تھی اس میں اشارہ ہے کہ اللہ کا کرم وسیع ہے کہ وہ ایک پرندے کو کسی شے کا علم دے دے جس سے اس وقت تک نبی مرسل کو معلوم نہ ہوا ہو اور یہ نبوت کے شان کے خلاف بھی نہیں کیونکہ نبی و رسول کو نبوت کے سوا کسی اور غیر نافع باتوں کا جاننا ان کے لیے ضروری نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسے غیر نافع علوم سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پناہ مانگتے تھے۔ کما قال علیہ السلام اعوذ بك من علم لا ینفع میں پناہ مانگتا ہوں غیر نافع علم سے۔

خلاصہ یہ کہ ظاہری طور ہدہد کا احاطہ سلیمان علیہ السلام کے شان اعلیٰ سے بڑھ جانے کا توہم غلط ہے کیونکہ ہدہد کا امور حسیہ کا احاطہ اور سلیمان علیہ السلام کا عدم احاطہ یا اس سے بے خبر رہنا آپ کی شان کی کمی کی وجہ سے نہیں۔ اس لیے کہ امور محسوسہ کے ادراک و عدم ادراک میں عقلاء و غیر عقلاء برابر ہیں۔ اس میں فوقیت کا کوئی اعتبار نہیں۔

سوال الاسئلة المقحمة میں ہے کہ ایسا خطاب یعنی ادنیٰ اعلیٰ کو کہے کہ میں نے احاطہ کیا ہے لیکن تو نے احاطہ نہیں کیا تو سوءِ ادب ہے کہ جو ادنیٰ ہر وقت اعلیٰ کے ساتھ رہتا ہے۔ اسے تو ایسا کہنا ہی بہت بڑی گستاخی ہے۔؟

جواب : چونکہ اصل مقصد کو بعد میں بیان کیا گیا ہے جب ایسے فوائد کا ذکر فوراً بیان کر دیا جائے ایسے خطابات اکابر برداشت کر لیتے ہیں۔

ربط : ہدہد نے حقیقت واضح کرتے ہوئے کہہ دیا کہ میں اگرچہ گم رہا لیکن وہاں بھی آپ کی خدمت کے لیے گیا تھا۔ چنانچہ سن لیجئے اگر غلط ہو تو پھر سزا دیں۔

وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ اور میں آپ کے ہاں حاضر ہوا ہوں سبا کے شہر سے جیسے مآرب بھی کہتے ہیں۔
بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ یقینی خبر اور ہے بھی بہت بڑی عظیم القدر اور اس میں بالکل شک نہیں اس میں اشارہ ہے کہ مخبر پر لازم ہے کہ وہ خبر سنائے جس میں سولہ آنے یقین ہو بالخصوص بادشاہوں کی بارگاہ میں۔

ف : سبا منصرف ہے اور یمن کے ایک قبیلے کا نام ہے اور اپنے جد اکبر کی وجہ سے اس نام سے موسوم ہوئے۔

نسب نامہ سبا اور اس کا تعارف سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان۔ بعض نے کہا اس کا نام عبد الشمس اور سبا اس کا لقب تھا اس لیے یہی سب سے پہلا تھا اس کے بعد

ل (حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس سے رد ہو گیا دیوبندی وہابی فرقہ کا جب کہ وہ اسی آیت سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے علم کی نفی کرتا ہے۔

مآرب کے شہر کا نام پڑگیا۔ صنعاء اور اس کے درمیان تین دنوں کا فاصلہ ہے بعض نے کہا سبا یہی وہ بادشاہ ہے جس نے سب سے پہلے شاہی تاج سر پر رکھا۔ اس کے دس لڑکے تھے چھ یمن میں رہتے تھے اور چار شام میں۔ جو شام میں رہتے تھے ان کے نام یہ ہیں: ۱۔ لخم ۲۔ جذام ۳۔ عاملہ ۴۔ غسان۔
اور وہ جو چھ یمن میں رہتے تھے ان کے نام یہ ہیں: ۱۔ کندہ ۲۔ اشعر ۳۔ ازد ۴۔ مذحج ۵۔ انمار ۶۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کی گئی یا رسول اللہ انمار کون تھا آپ نے فرمایا خثعم و بجیلہ کا باپ تھا۔

ف: المفردات میں ہے کہ سبا مکان کا نام ہے جہاں سے متفرق قبیلے دوسرے علاقوں میں پھیلے جیسا کہ کہا جاتا ہے ذھبوا ایادی سبا یعنی اس جگہ کے لوگ دوسری جگہوں میں متفرق ہوئے۔

سوال: جب بلقیس اتنی بڑی ملکہ تھی تو پھر سلیمان علیہ السلام سے اس کے حالات مخفی کیوں رہے؟

جواب: جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام صنعاء میں نازل ہوئے اور وہ مآرب میں رہتی تھی جس کا درمیانی فاصلہ تین ایام کا تھا یا تین میل یا تین فرسخ یعنی نو میل کا فاصلہ پر تھی آج کے دور میں اگرچہ اتنا بڑا فاصلہ نہیں لیکن اس دور کے لحاظ سے بہت بڑا فاصلہ ہے پھر اس میں اللہ کی حکمت کا تقاضا یہی تھا جیسے یعقوب علیہ السلام کے متعلق ہے کہ یوسف علیہ السلام باوجودیکہ اول دنوں میں قریب کے فاصلہ پر تھے لیکن یعقوب علیہ السلام کی توجہ وہاں سے ہٹا لی گئی اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں ؎

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم
گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

ترجمہ: کبھی تو ہم عرش اعلیٰ پر بیٹھتے ہیں اور کبھی اپنے پاؤں کی پشت بھی نہیں دیکھتے۔

اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ بے شک میں نے ایک عورت کو دیکھا جو ان پر شاہی کر رہی ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے جو ہدہد خبر لایا ہے اس کا بیان ہے۔

ف: رایتُ کو وجدتُ اس لیے کہا گیا کہ ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ وہ اس عرصہ میں ان کی خدمت کے لیے باہر رہا ہے۔ اگرچہ ان سے دور رہا تب بھی ان کے کام میں لگا رہا کہ ایک ایسی عورت کے حالات کے متعلق واقفیت حاصل کی جو گویا سلیمان علیہ السلام کے لیے ضرورت کی شے تھی جسے وہ حاصل کر کے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہے۔

ف: ھُمْ کا مرجع یا تو اس لیے ہے کہ وہ قبیلہ کا نام ہے یا اس لیے کہ اس کے اہل مراد ہیں جس پر ان کے شہر کا ذکر دلالت کرتا ہے۔

بلقیس کا تعارف اور اس کی شاہی سبا کے لوگوں پر شاہی کرنے والی عورت تھی۔ یہاں پر ان کے مالک ہونے ان کی گردن کی ملکیت مراد نہیں بلکہ شاہی مراد ہے۔ اور وہ یعرب بن قحطان کی اولاد سے تھی اس کا باپ یمن کا بادشاہ تھا۔ دراصل اس سے بلقیس بنت شرحبیل بن مالک بن ریان مراد ہے۔ اور یہی یعرب بن قحطان کی اولاد تھی۔ ان کی شاہی چالیس پشتوں سے بطور وراثت چلی آ رہی تھی۔ اسی بلقیس کے اور کوئی اولاد نہ تھی اور وہ باپ کی وراثت پر یمن کی ملکہ بنی اور تمام لوگ اس کے زیر فرمان رہتے تھے۔ وہ خود اور اس کی قوم آتش پرست تھی۔

بلقیس کی ماں جنّیہ تھی بلقیس کے باپ کو شاہان وقت نے نکاح کی پیش کش کی تو وہ کہتا میری کفو کا کوئی نہیں اسی لیے میں نے شادی نہیں کی۔ اسی لیے جنیہ عورت سے اس کا نکاح کیا گیا جس کا نام فارعہ تھا یا ریحانہ بنت السکن تھا اس سے یہی بلقیس پیدا ہوئی جس کا نام بلقہ یا بلقیس (بالکسر) رکھا گیا۔
(کذا فی القاموس)

فائدہ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن و انس میں سے ایک دوسرے کا نطفہ ٹھہرنا ممکن ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ جنات آگ سے پیدا کیے گئے ہیں لیکن وہ اپنے عنصر ناری پر باقی نہیں رہتے۔ جیسے انسان اپنے عنصر ترابی پر باقی نہیں تو اس معنی پر ان کا آپس میں نکاح ممکن ہے (مزید تحقیق آکام المرجان میں ہے)

بعد وفات بلقیس کی کہانی عجیب مروان الحمار نے حکم فرمایا کہ تدمر (بروزن تنصر) شہر کو تباہ و برباد کر دو۔ جب شہر پر ہلا بولا گیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجائی گئی تو اس میں ایک مکان پایا گیا جس میں ایک مُردہ عورت ملی جس کا جسم ادویہ (مصبر وغیرہ) سے صحیح رکھا گیا تھا۔ اس کی شکل وصورت سورج کو شرما رہی تھی۔ اس کے پاس ایک تختی پڑی تھی جس پر لکھا تھا:

انا بلقیس صاحبة سلیمان بن داؤد علیهما السلام خرب الله ملك من یخرب بیتی۔

ترجمہ: میں بلقیس زوجہ سلیمان بن داؤد علیہما السلام ہوں اللہ تعالیٰ اس کے ملک کو تباہ و برباد کرے جو میرے اس گھر کو خراب کرے گا۔ (روح البیان ص ۳۲۹ ج ۶ مطبوعہ استنبول جدید)

وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اور وہ دی گئی ہے ہر وہ اشیاء جن کی بادشاہوں کو ضرورت پڑتی ہے۔ (اس سے وہابیہ کا رد ہو گیا کہ اگر حضور علیہ السلام کے لیے کل شے سے کلی علم ثابت ہے تو پھر بلقیس کے لیے بھی کل شے ہے)[1] جیسے گھوڑے، لشکر اور پھر بکثرت سیاست اور ہیبت و حشمت اور مال و نعمت۔

---

[1] اضافہ از اویسی غفرلہٗ۔

نکتہ: اس کے حسن و جمال کا ذکر ادب کے خلاف تھا اس لیے کہ انبیاء علیہ السلام کے سامنے غیر عورت کا حسن و جمال سنانا سوء ادب ہے۔

حدیث شریف: بہترین حسن تین چیزیں ہیں ۱۔ حسین چہرہ ۲۔ اچھی آواز ۳۔ خوش خلقی۔

ف: حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جو اللہ سے محبت کرتا ہے اسے ہر ملیح شے سے انس و محبت ہوتی ہے اس لیے کہ ہر اچھا حسن حسن ازل کے معدن سے ظاہر ہوا ہے اور جو اللہ سے محبت نہیں کرتا اور پھر بھی اچھی شے سے محبت کرتا ہے تو وہ مجاز کا عاشق ہے

وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ اور اس کا بہت بڑا تخت بہ عظمت بلقیس اپنے حال کی بہ نسبت ہے یا بہ نسبت دیگر بادشاہوں کے ہے۔

تحقیق عرش عرش دراصل چھت والی شے کو کہا جاتا ہے لیکن اکثر بڑے تخت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور بلقیس کا تخت ۸۰ × ۸۰ گز تھا اور اونچا بھی ۸۰ گز تھا۔ اس کا اگلا حصہ سونے کا تھا یاقوت، احمر و زبرجد اخضر سے جڑا گیا تھا اور اس کا پچھلا حصہ چاندی کے مختلف جواہر سے تیار کیا گیا تھا اس کے چار پائے تھے۔ ۱۔ یاقوت احمر ۲۔ یاقوت اخضر ۳۔ زبرجد ۴۔ موتی۔ اور اس کے کناروں پر سونا ہی سونا تھا۔ اس کے سات دروازے تھے اور ہر دروازہ مقفل تھا اور ہر جگہ بہترین قالین بچھی ہوئی تھیں۔

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ میں نے اسے اور اس کی قوم کو سورج کا پجاری پایا ہے یعنی اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر سورج پرستی کرتے ہیں۔ **وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ أَعْمَالَهُمْ** شیطان نے ان کے کردار اچھے بنا کر دکھلائے ہیں۔ یعنی سورج پرستی اور دیگر ان کے قبیح کردار مثلاً کفر و معاصی بھلے بنا کر دکھائے۔ **فَصَدَّهُمْ** تو شیطان نے ان کو اپنے گندے کرداروں کی وجہ سے منع کیا ہے۔ **عَنِ السَّبِيلِ** راہ حق و صواب سے۔ السبیل وہ راستہ جس پر عادتاً عام طور پر چلیں۔ **فَهُمْ** اسی سبب مذکور سے **لَا يَهْتَدُونَ** وہ راہ نہیں پاتے۔ **أَلَّا يَسْجُدُوا** یہ صد کا مفعول ہے یہاں لام محذوف ہے دراصل عبارت لان لا یسجدوا تھی یہ ان کی مذمت ہے کہ انہوں نے ذات حق تعالیٰ کا سجدہ ترک کیا اسی لیے ان آیات کے اتمام پر سجدہ واجب ہے۔ **لِلّٰهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ** یہ کہ سجدہ کریں اللہ تعالیٰ کے لیے وہ جو آسمانوں اور زمینوں سے چھپی چیزیں نکالتا ہے یہاں پر الخبأ سے مخفی ذخائر مراد ہیں یعنی وہ چیزیں جو چھپی ہوئی ہیں کسی کے ظاہر کرنے سے ظاہر نہیں ہوتیں سوائے اللہ تعالیٰ کے جیسے ثلج، مطر، نبات پانی وغیرہ۔ **وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ** اور وہ جو تم دلوں میں چھپائے ہو انہیں وہی جانتا ہے **وَمَا تُعْلِنُونَ** اور انہیں جو تم زبانوں پر لاتے ہو اور اعضاء سے ظاہر کرتے ہو۔

نکتہ: وما تعلنون کے ذکر سے اس کے دائرۂ علم کی وسعت کا اظہار مطلوب ہے اور متنبہ کرنا ہے کہ اس کا علم ہر

طرح برابر ہے۔ [1]

بر دو عــلم یک ذرہ پوشیدہ نیست
کہ پنہاں و پیدا بنزدش یکیست

ترجمہ : اس کے علم کے سامنے کوئی شے مخفی نہیں اس لیے کہ ظاہر و باطن اس کے لیے برابر ہے۔
اَللّٰہُ مبتدا ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ یہ مبتدا کی خبر ہے رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ وہی بہت بڑے عرش کا رب ہے ۔ یہ مبتدا کی دوسری خبر ہے اور عرش عظیم کو عظیم اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ جمیع مخلوق سے بڑا ہے اس سے ثابت ہوا کہ بلقیس کے تخت کی عظمت بہ نسبت دوسرے بادشاہوں کے ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے عرش کی عظمت اللہ اللہ کہ اس کے آگے تمام زمین و آسمان یعنی چودہ طبق یک ذرہ و بے مقدار ہیں [1]
بہرحال ان دونوں عرشوں کے مابین زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ لیکن اس پر بھی عظیم کا اطلاق آیا ہے فلہذا شرک کیسا [2]

ع چہ نسبت سہارا بآفتاب درخشاں ۔

عرش الٰہی کی تحقیق المفردات میں ہے کہ عرش الٰہی ان امور سے ہے جن کی حقیقت کوئی فرد بشر نہیں جانتا سوائے اللہ کے عوام صرف اس کے نام سے واقف ہوتے ہیں اور بس یہی تصور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے ہوتا ہے جبکہ آپ کو بھی فرد بشر مانا جاتا ہے جبکہ ہم سب مانتے ہیں کہ :

---

[1] : اور ہمارے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اللہ ، اللہ ؎

عــرش است کمین پایہ زایون محمد صلی اللہ علیہ وسلم
جبریل امین خادم دربان محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اعلیٰحضرت قدس سرہٗ نے فرمایا ؎

ذہے عــزت و اعتلائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کہ عــرش حق ہے زیر پائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

[2] : اسی لیے ہم اہلسنّت کہتے ہیں کہ وہ صفات جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں سوائے چند مخصوص صفات کے تمام کا اطلاق رسول اللہ و دیگر انبیاء علیہ السلام اور اولیاء کرام و دیگر عوام پر جائز ہے کیونکہ فرق معنوی سے شرک کا شائبہ نہیں رہتا ———————— ولکن الوھابیۃ قوم لا یعقلون ۔ اویسی غفرلہٗ ۔

ع : عرش حق ہے مسند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ۔ سو جیسے یہی حکم عوام کے لیے ہے تو ایسے ہی دیگر امور عامہ کو سمجھئے کہ جس طرح اس عام حکم سے حضور علیہ السلام مستثنیٰ ہیں ایسے ہی دیگر امور عامہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ کو ماننا ہوگا۔

ف : اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حکایت از ہدہد احطتُ کے حکم میں الذی یخرج الخباء داخل نہ ہوگا کیونکہ یہ وہ علوم و معارف ہیں جسے ہدہد کو سلیمان علیہ السلام کے صدقے نصیب ہوئے اس کے ذکر میں اس لیے بیان ہوئے تاکہ معلوم ہو کہ ہدہد اس عقیدہ کا مالک تھا اور وہ اپنے عقیدہ و دین میں متصلب تھا اور یہ سب کچھ اسی لیے بیان کیا گیا ہے تاکہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہدہد کا عذر معقول تر دل سے قبول فرمائیں اور بلقیس کے مقابلہ کے لیے مکمل طور تیاری کر کے اسے قابو میں لا سکیں ۔

حدیث شریف : حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تمہیں ہدہد کے قتل کرنے سے روکتا ہوں اس لیے کہ وہ سلیمان علیہ السلام کے لیے پانی کی رہبری کرتا اور بتاتا کہ پانی قریب ہے یا بعید ۔ اور محبوب رکھتا تھا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اور کہتا تھا اے سلیمان علیہ السلام میں آپ کے ہاں یقینی خبر لایا ہوں وغیرہ وغیرہ

ابوقلابہ کی ماں کا خواب اور عجیب تعبیر حضرت ابو قلابہ حافظ امام عالم عبد الملک بن محمد رقاش رضی اللہ عنہ کی والدہ محترمہ حاملہ تھیں خواب دیکھا کہ انہوں نے ہدہد جنا ہے تعبیر پوچھی گئی تو کہا گیا کہ تو اگر سچی ہے تو بچہ جنے گی جو بڑا نیک نمازی ہوگا ۔ امام مذکور اسی بی بی سے پیدا ہوئے جب جوان ہوئے تو نماز بکثرت پڑھتے تھے یہاں تک کہ دن میں چار سو رکعت پڑھا کرتے اور ساٹھ ہزار حدیث کے حافظ تھے ۔ آپ نے ۲۷۶ھ ہجری میں وصال فرمایا ۔

مسئلہ : رب العرش العظیم پر سجدۂ تلاوت کیا جائے ۔ بقول امام اعظم رضی اللہ عنہ آٹھواں اور بقول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نواں سجدہ ہے ۔

ف : فتوحات میں اس سجدے کو سجدۂ تخفیف لکھا ہے اور سجدہ کی جگہ میں بھی اختلاف ہے بعض کے نزدیک وما تعلنون کے بعد اور بعض کے نزدیک رب العرش العظیم کے بعد لکھا ہے ۔

سرت بسجدہ در آرار ہو ای حق داری

کہ سجدہ شد سبب قرب حضرت باری

ترجمہ : سر سجدہ میں لا اگر حق پرستی کی خواہش رکھتے ہو ، اس لیے کہ سجدہ قرب حق تعالیٰ کے قرب کا سبب ہے ۔

قَالَ یہ جملہ مستانفہ ہے اور سوال کا جواب ہے گویا کہا گیا ہے کہ ہدہد کے عذر پیش کرنے پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے کیا فرمایا ۔ تو اس کے جواب میں فرمایا کہ سَنَنْظُرُ ہم غور فرمائیں گے ۔ اس امر میں جس کی تو خبر دے رہا ہے ۔

النظر بمعنے التامل ہے اور سین تاکید کا ہے۔ یعنی تجربہ کریں گے تیری سنائی ہوئی خبر کا۔ اور حضرت کاشفی مرحوم نے فرمایا کہ ہم تیری سنائی ہوئی خبر پر ابھی غور و فکر کرتے ہیں کہ أَصَدَقْتَ جو بات تو نے کہی ہے اس میں تو سچا ہے۔ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ یا جھوٹے لوگوں سے ہے۔

قاعدہ اصولیہ اس سے معلوم ہوا کہ خبر احد یعنی وہ خبر جسے ایک یا دو یا اس سے زائد خبر دیں جو درجۂ شہرت و تواتر کو نہ پہنچے تو وہ موجب علم نہیں بلکہ اس میں توقف ضروری ہے۔ البتہ اس پر عمل کرنا جائز ہوگا۔ نیز اس میں دلیل ہے کہ ایسی خبر کو ضائع نہ چھوڑا جائے بلکہ تحقیق کی جائے اگر اس میں صداقت کا پہلو نمایاں ہو تو اس پر عمل کیا جائے ورنہ چھوڑ دیا جائے۔

لطیفہ جب ہدہد نے بلقیس کے مال و دولت اور حسن و جمال کا ذکر کیا تو سلیمان علیہ السلام نے کچھ توجہ نہ دی لیکن جب اس نے اس کے دین کی بات چھیڑی کہ وہ سورج پرست ہے تو پھر متوجہ ہوئے اور اس کے دین (غلط دین) کی پرستاری پر اظہار ناراضگی فرماتے ہوئے کاغذ، قلم اور دوات منگوائی تاکہ اسے خط لکھ کر دین حق کی دعوت دیں۔

مکتوب گرامی سلیمان علیہ السلام برائے بلقیس اسی وقت یا بعد کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے درج ذیل گرامی نامہ لکھا کہ:

من عبد اللہ سلیمان بن داؤد (علیہما السلام) الی ملکۃ بلقیس بسم اللہ الرحمٰن الرحیم السلام علی من اتبع الھدی اما بعد فلا تعلوعلی وأتونی مسلمین۔

ترجمہ: یہ خط اللہ کے بندے سلیمان بن داؤد علیہما السلام سے ملکہ بلقیس کی طرف۔ شروع اللہ کے نام سے جو وہ رحمٰن و رحیم ہے۔ سلام ہو اس پر جو ہدایت کی تابعداری کرتا ہے بعد حمد کے اے بلقیس میرے سامنے تکبر نہ کر بلکہ میرے ہاں لشکر سمیت مسلمان ہو کر آجا۔

اس کو خوشبو سے معطر کر کے سر بمہر کیا۔ آپ کی انگشتری پر اسم (اللہ) اعظم لکھا تھا۔ خط کو ہدہد کے حوالے کیا اس نے خط کو چونچ میں رکھا یا دھاگہ باندھ کر گلے میں ڈالا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کو خط مبارک دے کر فرمایا اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا میرا یہی خط لے جا۔ یہ باء تعدیہ کی ہے۔

سوال: خط دے کر بھیجنے کی تخصیص کیوں (ہدہد کو) جب کہ آپ کی خدمت میں بہت بڑے زور آور اور طاقت ور جنات وغیرہ تھے انہیں بھیجا جاتا۔

جواب: چونکہ ہدہد فہم و فراست اور علم و حکمت میں دوسروں سے زائد تھا اور بلقیس کے طور و اطوار سے بھی زیادہ واقف تھا اسے بھیجا گیا تھا تاکہ اس کا عذر معقول مزید مضبوط ہو جائے۔

فائدہ صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ چونکہ ہدہد نے سچ کہا اور اپنے مالک کی خیرخواہی کا حق ادا کیا۔ اور جانب حق کی رعایت کی اسی لیے مستحق ہوگیا کہ وہ خدا کے پیغمبر کا سفیر مقرر ہو۔ ورنہ وہ اپنی شکل وصورت ظاہری و باطنی کے لحاظ سے اس کا اہل نہ تھا کہ وہ، اتنا بہت بڑا عہدہ سنبھالے۔

فَاَلْقِهْ اِلَیْهِمْ تو اسے بلقیس اور اس کی قوم کو پہنچا دے۔ قوم کا نام اس لیے لایا گیا کہ سورج پرستی میں وہ بھی بلقیس کے ہم مذہب تھے۔

ف: الارشاد میں ہے کہ جمع کی ضمیر اس لیے ہے کہ دعوت اسلام میں سب شامل ہوں۔

سوال: القہ کی ہا ساکن کیوں؟

جواب: لغت صحیحہ میں تخفیفاً پڑھنا جائز ہے۔ نیز وقف کی نیت پر بھی اسے ساکن پڑھا جانا صحیح ہے یعنی اگرچہ یہ ضمیر مذکر غائب کی کتاب کی طرف راجع ہے اور القِ مفعول بہ ہے اگرچہ ضمائر ساکن نہیں ہوتیں لیکن یہاں جائز ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ خط ڈال کر پھر ان سے علیحدہ ہو جا یعنی ان کے قریب ہونے سے ہٹ جا اور کسی دور علیحدہ جگہ پر چھپ کر بیٹھ جانا اور کان لگا کر ان کا جواب سننا کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ **فَانْظُرْ** پھر غور و فکر کرکے دیکھنا اور سمجھنا **مَاذَا یَرْجِعُوْنَ** کیا ایک دوسرے کو کہتے ہیں اور کیا نتیجہ نکالتے ہیں۔

ترکیب ابن الشیخ نے فرمایا کہ ماذا اسم واحد استفہامیہ اور منصوب ہے۔ یرجعون کا مفعول ہے یا مبتدا اور ذا بمعنے الذی اور یرجعون اس کا صلہ ہے اور اس کا عائد محذوف ہے دراصل عبارت، ای شیٔ الذی یرجعونہ تھی یعنی وہ کون سی شے لوٹاتے ہیں۔

مکتوب سلیمانی پہنچنے پر ایوانِ بلقیس میں کھلبلی مچ گئی مروی ہے کہ ہدہد خط لے کر بلقیس کے ہاں پہنچا وہ آرام فرما رہی تھی اس کا طریقہ تھا کہ جب آرام کرتی تھی تو دروازے بند کرکے شاہی چابیاں سرہانے کے نیچے رکھ دیتی تھی ہدہد شاہی محل کے روشن دان سے داخل ہو کر خط کو بلقیس کے سینہ پر ڈال دیا کیونکہ وہ چت لیٹی تھی یعنی خط ڈال کر ہدہد محل کے کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جاگی تو گھبرائی چونکہ خود پڑھی لکھی تھی۔ عربی النسل حمیری تبع کی نسل سے تھی۔ جس وقت سلیمانی مہر دیکھی تو کانپ گئی۔ لیکن خط کے سامنے سر کو جھکا دیا کیونکہ جب مہر کو دیکھا کہ یہ کسی عظیم بادشاہ کی ہے اور مہر کا نقشہ کچھ ایسا تھا کہ اس میں ملک سلیمانی کا حدود اربعہ منقش تھا اور ساتھ ہی اس میں اشارہ تھا کہ اس عظیم کی اطاعت میں جملہ پرند وغیرہ ہیں۔

اسی لیے کہا **قَالَتْ** اپنی مجلس شوریٰ کے اراکین سے کہا اور وہ تین سو تیرہ یا بارہ ہزار تھے **یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا**

اے ممبران !

ف : الملأ قوم کے ان لیڈروں کو کہا جاتا ہے جن کی ہیبت سے عوام ان سے آنکھ نہ ملا سکیں اور ان کے دلوں پر ان کا رعب ہو۔ اس کی جمع املاء ہے جیسے نبأ کی جمع انباء ہے۔

إِنِّيٓ أُلْقِيَ إِلَيَّ كِتَٰبٌ كَرِيمٌ ۝ بے شک میرے ہاں ایک مکرم و معظم خط پہنچایا گیا ہے۔ اسے مکرم و معظم اس لیے کہا کہ اس پر ایک عجیب طرح کی مُہر ثبت تھی کہ اس جیسی مہر دیکھی نہ سنی گئی تھی۔ جیسا کہ اسئلۃ المقحمہ ہے کہ یہ سلیمان علیہ السلام کا معجزہ تھا جو آپ کی مُہر سے ظاہر ہوا۔ اس لیے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط پر وہی مُہر لگائی جس پر آپ کے ملک کا تمام نقشہ منقش تھا۔ اس سے بلقیس مرعوب ہوئی۔ یوں سلیمان علیہ السلام کے معجزے کا ظہور رہا۔

ف : یہاں سے ثابت ہُوا کہ کریم بھی مختوم ہے جیسا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا :

کرم الکتاب ختمه۔

(وہ تحریر مکرم ہے جس پر مُہر ہو)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس روایت کو آیت انی القی الیّ کتٰب کریم سے مؤید فرمایا ہے (کما فی المقاصد الحسنہ للسخاوی)

مُہر کی وجہ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی کہ عجمیوں کی عادت ہے کہ وہ اس خط کو قبول نہیں کرتے جس پر مُہر نہ ہو۔ فلہذا آپ عجمیوں کی طرف خط لکھتے ہیں تو اس پر مہر لگائیے۔ اس لیے آپ نے اپنی ایک مُہر بنوائی جس پر منقوش تھا : محمد رسول اللہ۔ جسے آپ نے انگشتری میں کندہ کرا کر بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی مبارک میں پہنے رکھا، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ گندہ

ف : ہر وہ خط جس پر مُہر نہ ہو وہ مغلوب ہے۔ تفسیر جلالین میں اس کا ترجمہ لکھا ہے ، حسن ما فیہ۔ ابن الشیخ نے سورۃ شعراء کے اوائل میں لکھا کہ کتاب کریم یعنی لفظاً و معناً پسندیدہ یا کریم بمعنے شریف یعنی شرافت والا خط۔ کیونکہ اس کی ابتداء بسم اللہ شریف سے تھی جیسا کہ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جس خط کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کا نام ہو وہ تمام خطوط سے زیادہ بزرگی والا ہوتا ہے ؎

اے نام تو بہترین سر آغاز

بے نام تو نامہ چوں کنم باز

آرائش نامہاست نامت

آسائش سینہا کلامت

ترجمہ : تیرا نام بہترین آغاز ہے تیرے نام کے بغیر خط کو کیسے کھولوں۔ تیرا نام تمام ناموں کا سنگھار ہے اور تیرا کلام سینوں کی آسودگی ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ چونکہ خط سلیمانی بلقیس کی ہدایت کا سبب اور اس کے ایمان لانے کا موجب تھا اسی لیے اس کا نام کریم رکھا اسی لیے اس خط کی کرامت و برکت سے اسے دولتِ ایمان نصیب ہوئی۔

با ادب بانصیب بعض مشائخ نے فرمایا چونکہ بلقیس نے سلیمانی مکتوب گرامی کا ادب کرتے ہوئے اسے کریم کے نام سے یاد کیا تو اللہ تعالیٰ نے ادب نبوت کی برکت سے اسے دولتِ ایمان سے نوازا۔ جیسے جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام کا ادب کیا اور کہا: اما ان تلقی الخ۔ اسی لیے ایمان سے نوازے گئے۔[1]

بے ادب بے نصیب چونکہ کسریٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوبِ گرامی پھاڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس کا انجام بھی برباد کیا کہ وہ کفر و عناد پہ مرا۔[2]

تفسیر عالمانہ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ یہ سوال کا جواب ہے گویا بلقیس سے پوچھا گیا کہ یہ خط کیسا ہے، کس نے لکھا ہے، اس میں کیا لکھا ہے۔ اس کے جواب میں کہا کہ بے شک یہ خط سلیمان علیہ السلام سے آیا ہے وَاِنَّهٗ اور اس کا مضمون یہ ہے یا اس میں یہ لکھا ہے کہ بے شک شان یہ ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع وہ بڑے رحم والا رحیم ہے۔

صوفیانہ تحقیق باء میں اس کے بقا کی طرف اور سین میں اس کی روشنی کی طرف اور میم میں اس کے ملک کی طرف اور الف میں اس کی احدیت کی طرف اور دونوں لام جمال و جلال کی طرف اور ہاء اس کی ہویت کی طرف اور رحمان دارین میں عوام پر رحمت کی طرف اور رحیم آخرت میں خواص پر رحمت کی طرف اشارہ ہے۔

نکتہ : بعض مشائخ نے فرمایا در اصل بسم اللہ شریف میں برات کا بیان ہے اور چونکہ دنیا سے حیوانات کو بیزاری حاصل ہے اسی لیے ان کو توفیق ملی کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر ایمان لائے۔

نکتہ : بسم اللہ میں الف کے محذوف ہونے کے بعد باء پر اس لیے اکتفا کیا گیا کہ وجود کونی میں ہر شے کو رحمتِ عامہ و خاصہ کی محتاجی ہے اور بس۔

مسئلہ : یہ بسم اللہ شریف بسم اللہ مجرھا و مرسٰھا کی طرح آیت کاملہ نہیں بخلاف اس بسملہ کے جو اوائل سورۃ میں ہے کہ وہ آیت کاملہ ہے کہ وہ ایک سو چودہ بار ہر سورۃ کے ساتھ نازل ہوئی۔ (لیکن سورۃ مخصوصہ کا جزو نہیں)

---

[1] مزید تفصیل فقیر کی کتاب "با ادب بانصیب" میں پڑھیے۔ [2] تفصیل کے لیے فقیر کی کتاب "بے ادب بے نصیب" پڑھیے۔ اویسی غفرلہٗ

لطیفہ بسم اللہ شریف کا ہر حرف شرابِ رحیق کا ایک مستقل اور بہت بڑا ظرف ہے اور اس کا ہر کلمہ درۂ تحقیق کا ایک مستقل صدف ہے اور اس کا ہر نقطہ آسمانِ ہدایت کا ایک مستقل ستارہ ہے اور گمراہ کے لیے ہر ستارہ ایک جلانے والا رجم ہے۔

حضرت عارف جامی قدس سرہٗ نے بسم اللہ شریف کے بارے میں لکھا ہے: ؎

نوزدہ حرفست کہ ہژدہ ھزار

عالم ازو یافتہ فیض عمیم

ترجمہ: بسم اللہ کے انیس حروف سے اٹھارہ ہزار عالم فیض عمیم پا رہا ہے۔

اَنْ مفسرہ ہے لَا تَعْلُوْا عَلَیَّ مجھ پر بڑائی نہ کرو جیسے متکبر بادشاہوں کو تکبّر ہوتا ہے وَ اْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ ○ اور میرے پاس آؤ درانحالیکہ تم ایمان لانے والے ہو اس لیے کہ ایمان اسلام و انقیاد کو مستلزم نہیں۔ بخلاف اسلام و انقیاد کے انہیں ایمان لازم ہے۔

لطیفہ یہی انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے کہ وہ اپنے مکتوباتِ گرامی میں طوالت نہیں کرتے۔ یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کا مکتوب گرامی صرف اتنا ہی تھا جتنا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ذکر فرمایا ہے۔

سوال: سلیمان علیہ السلام نے اسلام کی دعوت پہلے کیوں پیش فرما دی حالانکہ آپ پر لازم تھا کہ پہلے وہ اپنی رسالت کی حجت قایم فرماتے۔ اس طرح سے تو ایمان تقلیدی ہوگا اور ایمان تقلیدی قابلِ قبول نہیں ہوتا۔

جواب: (۱) چونکہ آپ کے مکتوب گرامی میں آپ کا معجزہ واضح تھا جیسا کہ پہلے مذکور ہوا تو یہی دعوائے رسالت کے لیے کافی ہے اسی لیے انہیں رسالت کے دعویٰ اور اس کی حجت قایم کرنے کی ضرورت نہ تھی اس معنی پر یہ ایمان تقلیدی نہ ہوگا۔

(۲) فقیر (صاحبِ روح البیان رحمہ اللہ تعالیٰ) کہتا ہے کہ ایمان کے بارے میں علم ضروری ہے کہ کسی طریق سے کسی رسول علیہ السلام کی رسالت کا یقین ہو جائے۔ وہ بلقیس کو حاصل ہو گیا ورنہ صرف خط کے پہنچنے سے اسے یہ وہم بھی ہو سکتا تھا کہ یہ جنّات کا تصرف ہو۔ جنّات اس قسم کے خوارق ظاہر کرتے رہتے تھے جیسے اس نے اپنے عظیم تخت کی ساخت سے سمجھا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں اس کی ماں بھی جنّیہ تھی اسی لیے اسے خرق (معجزہ) سے سلیمان علیہ السلام کی رسالت پر یقین ہو گیا۔

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِىْ فِىْٓ اَمْرِىْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ○ قَالُوْا نَحْنُ
اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِىْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ○ قَالَتْ
اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ
يَفْعَلُوْنَ ○ وَاِنِّىْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ○ فَلَمَّا جَآءَ
سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ
تَفْرَحُوْنَ ○ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ
اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ○ قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِىْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِىْ
مُسْلِمِيْنَ ○ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّىْ
عَلَيْهِ لَقَوِىٌّ اَمِيْنٌ ○ قَالَ الَّذِىْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ
اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّىْ ۖ لِيَبْلُوَنِىْٓ ءَاَشْكُرُ
اَمْ اَكْفُرُ ۗ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّىْ غَنِىٌّ كَرِيْمٌ ○ قَالَ
نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِىْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ○ فَلَمَّا جَآءَتْ
قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ۗ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ○ وَ
صَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ○ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِى
الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۗ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ
قَوَارِيْرَ ۗ قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ ع

ترجمہ: بلقیس نے کہا اے سردارو مجھے اس معاملہ میں مشورہ دو کسی معاملہ میں کوئی قطعی فیصلہ
نہیں کرتی بیشک کہ تم لوگ میرے پاس موجود نہ ہو انہوں نے جواب دیا کہ ہم بڑے طاقت ور اور
بڑے لڑنے والے ہیں اور اختیار تیرے ہاتھ میں ہے سو تو سوچ لے کہ کیا امر کرتی ہے کہنے لگی
کہ بے شک بادشاہوں کی عادت ہے کہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ کر ڈالتے ہیں
اور اس کے معزز ین کو ذلیل کر دیتے ہیں اور وہ ایسا ہی کرتے ہیں اور میں ان لوگوں کے پاس ایک

تحفہ بھیجتی ہوں پھر دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا جواب لے کر آتے ہیں پھر جب وہ سلیمان (علیہ السلام) کے
پاس آیا تو کہا کیا تم مال سے میری مدد کرتے ہو سو جو کچھ مجھے اللہ نے عطا فرمایا ہے اس سے بہتر ہے
جو تمہیں دے رکھا ہے کہ تم ہی اپنے تحفہ سے خوش ہوتے ہو ان کے ہاں واپس چلا جا ہم ان پر
ایک ایسا لشکر لائیں گے جس کے مقابلے کی انہیں طاقت نہ ہو گی اور ہم انہیں اس شہر سے ذلیل
کر کے نکال دیں گے اور وہ ہمیشہ کے لیے ماتحت ہو جائیں گے سلیمان نے فرمایا اے درباریو! تم
میں کون ہے جو اس تخت کو میرے ہاں لے آئے اس سے قبل کہ وہ مطیع ہو کر میرے ہاں حاضر ہوں۔
ایک قوی ہیکل جن نے کہا کہ وہ تخت میں آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں گا اس سے قبل کہ آپ مجلس
برخاست فرمائیں اور بے شک میں اس کی طاقت رکھتا ہوں امانت دار بھی ہوں اس نے عرض
کی جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہ میں اسے آپ کی خدمت میں آنکھ جھپکنے سے پہلے حاضر کر دوں گا۔
پھر جب سلیمان نے تخت اپنے سامنے رکھا دیکھا تو کہا یہ فضلِ ربّی سے ہے تاکہ وہ میری آزمائش
کرے کہ میں اس کا شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔ اور وہ جو شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لیے شکر
کرتا ہے (اسی طرح) جو ناشکری کرتا ہے۔ تو میرا پروردگار بے نیاز اور کریم ہے سلیمان نے فرمایا
بلقیس کے تخت کی صورت بدل دو ہم دیکھیں کہ اسے پتا چلتا ہے یا وہ بے خبروں میں سے ہوتی ہے
پھر جب وہ آئی تو اس سے کہا گیا کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے کہا گویا یہ وہی ہے اور اس سے
قبل ہی ہمیں اس کا علم عطا ہوا اور ہم اسی وقت سے مان چکے ہیں اور اسے غیر اللہ کی پرستش نے
روکے رکھا بیشک وہ کافر لوگوں میں سے تھی اس سے کہا گیا کہ وہ اس محل میں داخل ہو۔ تو جب اس کا
صحن دیکھا تو اس کو پانی (سے بھرا ہوا) سمجھا اور اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں۔ سلیمان نے فرمایا
یہ تو ایک محل ہے شیشوں سے بنا ہوا۔ بلقیس کہنے لگی اے میرے پروردگار! میں نے (اب تک)
اپنے نفس پر ظلم کیا تھا (کہ شرک میں مبتلا تھی) اور میں اب سلیمان کے ساتھ (یعنی ان کے طریقہ پر)
ہو کر رب العالمین پر ایمان لاتی ہوں۔

تفسیر عالمانہ

قَالَتْ یہ قول مکرر اس لیے ہوا کہ جماعت کو تنبیہ ہو جائے کہ بلقیس کو کوئی اہم اور سخت
مہم درپیش ہے یٰٓاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِیْ فِیْٓ اَمْرِیْ اے میرے مشیرو! مجھے سوچ کر اس کا
جواب دو جو میں تم سے پوچھوں پھر نہایت غور و فکر کے بعد اس کا حل بتاؤ۔
نکتہ: ان کے جواب کو فتوٰی سے تعبیر کرنے میں اشارہ ہے کہ جیسے فتوٰی کا مشکل امور کے جواب پر استعمال ہوتا ہے

ایسے ہی میرے سوال کو سمجھو۔ یعنی میری مشکل حل کرنے میں بہت غور و خوض کی ضرورت ہے۔ جب تمہیں صحیح سوچ ذہن میں آئے تو بتاؤ۔

نکتہ: بعض نے کہا کہ فتویٰ کا اشتقاق فتی سے ہے بمعنے نوجوان طاقت ور۔ اور چونکہ مفتی یعنی جو فتویٰ کا جواب دیتا ہے وہ اپنے فیصلہ سے سائل کے سوال کو دلائل سے پختہ اور مضبوط کرتا ہے اسی لیے اسکے فعل کو فتویٰ کہا جاتا ہے۔

مَاكُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا میں کسی معاملہ کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی اور نہ ہی کسی حکم کو نافذ کرتی ہوں حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ۝ یہاں تک کہ تم میرے سامنے ہوتے ہو۔ یعنی جب بھی میں فیصلہ کرتی ہوں تو تمہارے مشورہ سے ہی کرتی ہوں اور تمہاری موجودگی میں ہی۔ یہ ان کے دل موہ لینے کے لیے ہے تاکہ وہ اس کی مخالفت نہ کر سکیں۔

سبق: اس میں اشارہ ہے کہ ہر شخص اپنی من مانی نہ کرے بلکہ اپنے رفقائے کار سے مشورہ لے اور جائز مشوروں کو قبول کرے بالخصوص وہ لوگ جو امورِ سلطنت سے متعلق ہوں یا خود بادشاہ ہوں ان کو یہ طریقہ اختیار کرنا بطریقِ اولیٰ ضروری ہے اور مشیر بھی ایسے ہوں جو صاحب الرائے اور صاحبِ بصیرت ہوں۔ اچھے مشیروں کے بغیر کوئی بھی فیصلہ نہ کیا جائے ؎

مشورت رہبر صواب آمد

در ہمہ کار مشورت باید

کار آنکس کہ مشورت نکند

غایتش غالباً خطا آید

ترجمہ: مشورہ تیرا اچھا رہبر ثابت ہوگا اس لیے تجھے ہر کام میں مشورہ ضروری ہے وہ شخص جو مشورہ نہیں کرتا اس کا نتیجہ اکثر غلط نکلتا ہے۔

قَالُوْا سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ گویا کسی نے پوچھا کہ بلقیس کو مشیروں نے کیا مشورہ دیا، جواب میں فرمایا کہ انہوں نے کہا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ ہم بڑے طاقتور ہیں ساز و سامان کی کوئی کمی نہیں ہتھیار تو ویسے بھی ہمارے ہاں بہت ہیں وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ۬ اور جنگجو تو ہم ہیں ہی، اور ہماری شجاعت اور بہادری چار دانگِ عالم میں مشہور ہے۔ اس سے اپنی ملکہ کو تسلی دلائی کہ جنگ سے نہ گھبرانا اگر تیرا حکم ہو تو ہم سربکف ہیں وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ اور معاملہ تیرے سپرد ہے تو خود ہی فیصلہ کر جیسے جی چاہے مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ۝ جو حکم کرے گی ہم ہر طرح حاضر ہیں۔ صلح یا جنگ کا حکم دینا تیرا کام اور اس پر عمل کرنا ہمارا کام۔ (كذا قال الكاشفی رحمہ اللہ)

اگر جنگ خواہی بزد آوریم
دل دشمناں را بدرد آوریم
دگر صلح جوئی ترا بندہ ایم
بتسلیم حکمت سر افگندہ ایم

ترجمہ: اگر جنگ چاہتی ہے تو ہم حاضر ہیں، دشمنوں کا دل چکنا چُور کر دیں گے اور اگر صلح کرلے گی تو بھی ہم خادم ہیں تیرے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم ہے۔

مسئلہ: اس میں اشارہ ہے کہ مشیر کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی رائے صواب کا اظہار کر دے اس پہ ضروری نہیں کہ مستشار کو مجبور کرے کیونکہ ممکن ہے مستشار مشیر سے معاملہ شناسی میں زیادہ ہو ؎

خلاف رائے سلطاں رائے جستن
بخون خویش باشد دست شستن

ترجمہ: اپنے بادشاہ کی رائے کے خلاف رائے زنی کرنا اپنے خون سے ہاتھ رنگنا ہے۔

ربط: جب بلقیس نے محسوس کیا کہ مشیر لڑائی اور جنگ پر تُلے ہُوئے ہیں اور ان کی یہ رائے مبنی بر خطا ہے تو خود اپنے قوائے ذاتیہ کی رائے قوی کو ظاہر کرنے پر مجبور ہو کر سلیمان علیہ السلام کے فضائل و مناقب بیان کر دیے تاکہ سلیمانی کمالات وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ اسی لیے کہا کہ میرا خیال تو یہ ہے کہ صلح کی جائے کیونکہ جنگ میں دونوں پہلو ہوتے ہیں: فتح یا شکست۔ ہماری فتح ممکن ہے تو شکست کا بھی احتمال ہے اگر وہ فتحیاب ہُوئے تو پھر بادشاہوں کا کام ہے کہ وہ دوسرے بادشاہ کی آبادی کو برباد کر دیں یا چھوڑ دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے قول کی حکایت بیان فرمائی کہ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً بلقیس نے کہا کہ جب بادشاہ کسی بستی یا شہر یعنی کسی علاقے میں داخل ہوتے ہیں اور جنگ و جدال کا پروگرام بناتے ہیں اَفْسَدُوْھَا تو اسے خراب اور ویران کر ڈالتے ہیں وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَآ اَذِلَّۃً اور اس کے معززین کو ذلیل و خوار کرتے ہیں اعزّہ، عزیز کی جمع ہے یعنے غالب و قاہر اور بہت شریف۔ یہ عزّۃ سے ہے انسان کی وہ حالت جو اسے مغلوب ہونے سے روکے۔ اذلّۃ، ذلیل کی جمع ہے یعنی خوار و بے مقدار۔ یعنی قتل اور قید اور جلاوطن کر کے اور دیگر اور ذلتوں اور خواریوں سے۔ وَکَذٰلِکَ یَفْعَلُوْنَ ۝ اور ایسے ہی گزارتے ہیں۔ اور یہ ماقبل کی تاکید و تقریر ہے۔ یعنی ایسے زبردست بادشاہوں کی ایسی عادت عام ہوتی ہے۔ اس معنی پر یہ بلقیس کا بقایا کلام ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بلقیس کے نظریہ کی تصدیق کے لیے فرمایا ہو جیسے وہ کہہ رہی ہے واقعی ایسے ہی ہے۔

ف : اس میں اشارہ ہے کہ عاقل وہ ہے کہ اسے جیسے ہی مخالف کا دفعیہ آسانی سے میسر آتا ہے وہ اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے میں نہیں پھینکتا اپنے اختیار و ارادہ سے جنگ اور لڑائی نہیں کرتا جب تک اسے مجبور نہ کیا جائے۔

ف : سردار وہ ہے جو صلح و صفائی کا مادہ رکھتا ہو اور اس میں غیرت کی بھی کمی نہ ہو۔

تفسیر صوفیانہ اس میں اشارہ دیگر بھی ہے وہ یہ کہ جب صفاتِ ربانیہ کے ملوک شخص انسانی کے علاقہ میں اپنی تجلی کے ساتھ داخل ہوتے ہیں تو اسے طبیعۃ انسانیہ حیوانیہ کے افساد سے تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں وجعلوا اعزۃ اھلھا میں اھل سے نفسِ امارہ اور اس کے صفات مراد ہیں اذلۃ انہیں تجلی حق کے سطوات سے ذلیل کر دیتے ہیں وکذلک یفعلون اور وہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کے ساتھ کرتے ہیں کیونکہ وہ انہی صفات کے لیے آئینے کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں تاکہ وہ کنز مخفی کو ظاہر کریں۔ اس معنی پر وکذلک یفعلون الخ عارف باللہ کی صفت ہو گی (کذا قال ابویزید البسطامی قدس سرہٗ)۔

سیدنا امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی تقریر صوفیانہ سیدنا امام جعفر صادق رضی اللہ نے فرمایا کہ اس میں اہلِ ایمان کے قلوب کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب معرفت قلوب میں داخل ہوتی ہے تو پھر اس سے تمام آرزوئیں اور مرادیں ختم ہو جاتی ہیں پھر وہ دل اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے نہیں رہتے۔

حضرت ابن عطاؒ کی صوفیانہ تقریر حضرت ابن عطاؒ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب غلبۂ حق کا ظہور ہوتا ہے اور قلب میں اس کی عظمت جاگزیں ہوتی ہے تو غفلتیں مٹ کر رہ جاتی ہیں اور اس پر ہیبت و اجلال چھا جاتا ہے پھر اس میں سوائے حق کے کسی کی عظمت نہیں رہتی اسی لیے وہ اپنے اعضاء کو سوائے طاعتِ الٰہی کے کسی کام میں نہیں لگاتا اور نہ ہی زبان کو ذکرِ الٰہی کے بغیر کھولتا ہے اور دل کو صرف اسی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

ف : بزرگ فرماتے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کے اسم ملک کے بالمقابل اپنے قلب کو لاتا ہے تو پھر وہ سوائے اس کے قبضے کے اور کسی کا تصور ہی نہیں لاتا اس کے ملک میں سلامتی و عافیت ہی ہوتی ہے اور وہ اپنے مالک کے حقوق میں لگ جاتا ہے۔

الفتوحات المکیہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر غلطی معاف فرما دیتا ہے سوائے تین کے :

(۱) اس کے حرم کی ہتک

(۲) اس کے راز کا افشاء

(۳) اس کے ملک میں دست اندازی

دعا: طریقِ طلب ہیں ہم اللہ تعالیٰ سے ادب کی توفیق کا سوال کرتے ہیں۔

تفسیر عالمانہ وَاِنِّیْ مُرْسِلَۃٌ اِلَیْہِمْ اور میں اس کے اور اس کی قوم کے ہاں بھیجتی ہوں بِہَدِیَّۃٍ بہت بڑا ہدیہ و تحفہ۔ ہر وہ شے جو محبت و پیار سے کسی کو بھیجی جائے اسے عربی میں ھدیہ کہتے ہیں۔

المفردات میں لکھا ہے کہ ہر وہ شئے جو ہم ایک دوسرے کو محبت اور پیار سے بھیجتے ہیں وہی ہدیہ ہے۔

فَنٰظِرَۃٌ پھر دیکھتی ہوں۔ کشف الاسرار میں ہے کہ ناظرۃ یہاں پر بمعنے المنتظرہ ہے۔ کاشفی مرحوم نے لکھا ہے: دیکھتی ہوں کہ وہاں سے بِمَ دراصل بما تھا (الف گر گیا ہے) ما استفہامیہ ہے کون سا جواب لے کر یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ○ قاصد جو وہاں گئے ہوئے ہیں کون سا جواب لے کر لوٹتے ہیں۔ اس کے بعد جو مناسب ہوگا کارروائی کریں گے۔

ہدایائے بلقیس مروی ہے کہ بلقیس نے پانچ سو غلاموں کو لونڈیوں کا لباس پہنایا اور انہیں زیورات سے آراستہ کیا (جیسے کنگن اور بالیاں وغیرہ) اور ان کے ہاتھ مہندی سے رنگے اور ایسے گھوڑوں پر سوار کیا جو ریشم کے کپڑوں سے آراستہ کیے گئے اور سونے کی لگاموں اور جواہرات سے مرصع زینوں سے پیراستہ کئے گئے اور پانچسو لونڈیاں بھیجیں جن کے ہاتھ میں تیر تھے اور ان کا لباس مردانہ تھا اور ہدیہ کے طور ایک ہزار سونے اور چاندی کی اینٹیں بھیجیں۔

حضرت مولانا روم قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

ہدیۂ بلقیس چہل اشتر بدست
بار آنہا جملہ خشت زر بدست

ترجمہ: بلقیس نے چالیس اونٹ بھیجے جن پر سونے کی اینٹیں تھیں۔

اور ان لڑکیوں (جنہیں مردانہ لباس پہنایا تھا) کے سروں پر قیمتی جواہر و موتیوں کے جڑاؤ سے بہترین تاج رکھے اور بیش قیمت عطر و مشک اور عنبر اور قیمتی موتیوں سے بھرے ہوئے متعدد ڈبے اور کئی قسم کے اعلیٰ ترین تحفے بھیجے۔ مثلاً چند کوڑیاں سوراخ کرکے ایک بڑے ڈبے میں ڈال دیں: اور ایک خط بھی لکھا جس میں ان تحائف و ہدایا کی تفصیل تھی اور سب سے اعلیٰ اور بڑے افسر منذر بن عمرو کو سربراہ بنایا اور اس کے ماتحت دیگر کئی سمجھدار اور عقیل و فہیم نمائندے روانہ کئے۔

اس تمام کارروائی سے نبی کے لئے غیب دانی من جانب الٰہی کا عقیدہ ہی نبوت کو ماننے کی دلیل ہے

اس کا مطلب یہ تھا جیسے اس نے خود کہا:

ان کان نبیا میز بین الغلمان والجواری واخبر بما فی الحقة قبل فتحها وثقب الدرة ثقبا مستویا و سلك فی الخرزة خیطا۔

اگر وہ نبی ہیں تو انہیں غلاموں اور کنیزوں کا امتیاز ہو جائے گا اور ڈبے کھولنے سے پہلے بتا دیں گے کہ ان میں کیا ہے اور کوڑیوں کو سوراخ کئے گئے ہیں وہ انھیں اٹھا کر تاگہ ڈالنے کا حکم دیں گے۔

پھر منذر بن عمرو (سربراہ) سے کہا کہ اگر تجھے پہلی ملاقات میں وہ غصہ آلود نگاہوں سے ملیں تو سمجھنا بادشاہ ہے پھر گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ خندہ پیشانی سے بولیں تو سمجھنا کہ وہ نبی ہیں۔

سلیمان علیہ السلام کی جوابی کارروائی

ہُدہُد تمام کارروائی سُن کر سلیمان علیہ السلام کے ہاں پہنچ گیا اور تمام ماجرا عرض کر دیا۔ آپ نے حکم فرمایا کہ ایک میدان میں اٹھارہ میل کا ایک احاطہ تیار کرو جس کا فرش سونے چاندی کا ہو۔ اور اس میدان کے اردگرد دیوار کھینچو جس پر صرف سونا چاندی ہو اور حسین ترین دریائی اور جنگلی جانور لائے جائیں۔ کشف الاسرار میں ہے کہ دریائی جانور منقش پلنگ مختلف رنگ کے لائے گئے اور میدان کے دائیں بائیں باندھنے کا حکم دیا گیا۔ جنّات نے آناً فاناً یہ کام سرانجام دیا۔ اس میدان کے درمیان میں آپ نے اپنا تخت بچھایا۔ آپ کے اردگرد کرسیاں بچھائی گئیں۔ چار ہزار کرسیاں آپ کے دائیں اور چار ہزار بائیں بچھائی گئیں۔ پھر کئی میلوں تک جنّات صف بستہ کھڑے ہوئے۔ ایسے ہی انسانوں، جانوروں، درندوں اور وحشیوں وغیرہ کی صفیں کھڑی کی گئیں اور پرندے اوپر سے سایہ کئے ہوئے تھے اور یہ ایسی مجلس قائم ہوئی کہ آسمان نے ہزاروں سال میں نہ دیکھی ہوگی۔

بلقیس کے نمائندے مبہوت ہو گئے

جب بلقیس کے نمائندے اس میدان میں پہنچے تو مبہوت ہو گئے کہ یہاں تو سونے اور چاندی پر سلیمان (علیہ السلام) کے جانور پیشاب کر رہے ہیں۔ مثنوی شریف میں ہے:

۱ چوں بصحرائے سلیمانی رسید
فرش آنرا جملہ زر پختہ دید

۲ بارہا گفتند زر را وا بریم
سوئے مخزن ما چہ کار اندریم

۳ عرصۂ کش خاک زر دہ دہیست
زر بہدیہ بر دن آنجا ابلہیست

ترجمہ :(۱) جب بلقیس کا نمائندہ صحرائے سلیمانی میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں سونے کا فرش بچھا ہوا ہے۔
(۲) بار ہا انہیں خیال گزرا کہ وہ اس معمولی پونجی کو واپس لے جائیں کیونکہ اتنے بڑے خزانے کے سامنے ان کی پونجی کس کام کی !
(۳) جن کا میدان ہی سونے سے پُر ہے ان کے ہاں سونا ہدیہ لے جانا حماقت ہے۔

حکایت ان کا حال اس اعرابی کا تھا جو خلیفۂ بغداد کے ہاں پانی کا گھڑا ہدیہ کے طور پر لے گیا پھر جب خلیفہ کے باغ کے سامنے دجلہ بہتا ہُوا دیکھا تو شرمسار ہو کر گھڑے کو توڑ ڈالا۔

نمائندگانِ بلقیس بلقیس کے نمائندگان کا باقی حال مولانا روم قدس سرہٗ نے بیان فرمایا ؛ ؎

(۱) باز گفتند ار کساد وار روا
چیست بر ما بندۂ فرمانیم ما
(۲) گر زر و گر خاک مارا بر دنیست
امر فرمانده بجا آوردنیست
(۳) گر بفرمایند کہ کین واپس برید
ہم بفرمان تحفہ را باز آورید

ترجمہ : (۱) پھر کہا کہ ہمیں اس تھوڑی سی پونجی سے شرمساری کا ہے کی، ہمیں تو اپنی ملکہ کا حکم پُورا کرنا ہے۔
(۲) سونا ہو یا مٹی ہمیں اس سے کیا غرض ! ہمیں تو اپنی مالکہ کی فرمانبرداری ضروری ہے۔
(۳) اگر سلیمان علیہ السلام فرمائیں گے کہ اسے واپس لے جاؤ تو پھر انہی کے فرمان سے ہی واپس لے جاؤ۔

جب نمائندگان نے جنّات و شیاطین کی ڈراؤنی شکلوں اور ان کی کثرت کو دیکھا تو گھرا گئے۔ جنّات و شیاطین نے کہا بلا خوف و خطر چلے چلو۔ جب سلیمان علیہ السلام کے دربار میں پہنچے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے پرتپاک خیر مقدم کیا اور کہا کہ کیا لاتے ہو ؟ منذر نے آگے بڑھ کر بلقیس کا پیام سنایا اور ساتھ ہی اس کا مکتوب بھی سلیمان علیہ السلام کو پیش کر دیا۔ جب خط پڑھا تو فرمایا : موتیوں کا ڈبّہ لاؤ۔ ڈبہ پیش کیا گیا تو فرمایا ، اس میں

بیش بہا اور قیمتی موتی ہیں جن کا سوراخ نہیں نکالا گیا اور کوڑیاں ہیں جن کے سوراخ ٹیڑھے نکالے گئے ہیں ۔
ف : ممکن ہے آپ کو اس کا علم جبریل علیہ السلام کے خبر دینے سے ہوا ہو یا ہد ہد کے ذریعہ ۔ جیسا کہ قصے کا سیاق بتاتا ہے ۔

ہدایا کی تفتیش اور دیمک اور کیڑے کی خدمات کا بیان حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات اور انسانوں کو بلا کر پوچھا کہ موتیوں اور کوڑیوں کے ساتھ کیا کیا جائے ۔ انہوں نے لاعلمی ظاہر کی ۔ پھر شیاطین کو بلایا ، وہ بھی اس سے بے خبر تھے ۔ صرف یہ بتایا کہ دیمک کو بلاؤ وہ کچھ خبر رکھتی ہے ۔ آپ نے دیمک سے پوچھا تو اس نے بال منہ میں لیا اور موتی میں سوراخ کر کے دوسری طرف نکل گئی ۔ آپ نے اس سے کہا تو منہ مانگا انعام مانگ ۔ عرض کی کہ میرا رزق درختوں میں مقرر فرما دیجئے ۔ اسی روز سے اس کا رزق درختوں میں مقرر ہو گیا ۔ اس کے بعد کوڑیوں کے سوراخ کے متعلق پوچھا تو عرض کی مجھے اس کے متعلق معلوم نہیں ۔ سفید کیڑے نے اُٹھ کر عرض کی : یہ ڈیوٹی میرے ذمہ لگا دیجئے آپ کی اجازت سے سفید کیڑے نے تاگہ منہ میں لیا اور کوڑی میں داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل آیا ۔ آپ نے اس سے بھی فرمایا تم کیا چاہتے ہو؟ عرض کی : یا نبی اللہ ! میرا رزق پھلوں میں مقرر فرمائیے ۔ اس روز سے اس کا رزق پھلوں میں مقرر ہو گیا ۔ اس کے بعد آپ نے تاگے کے دونوں سروں کو پکڑ کر مُہر لگا کر نمائندگان کو واپس کر دیا ۔

غلاموں اور کنیزوں کے امتیاز کا قصہ اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے پانی طلب کیا اور غلاموں اور کنیزوں کو حکم فرمایا کہ گرد و غبار سے اپنے چہرے پانی سے صاف کر لو ۔ اس طرح سے آپ اپنی پرکھ بتانا چاہتے تھے کہ ان میں غلام کون ہیں اور کنیزیں کون ۔ چنانچہ کنیزوں نے برتن سے پانی لے کر ہاتھ پر رکھا پھر منہ دھویا اور غلاموں نے برتن سے ہی پانی لے کر منہ دھویا ۔ (اس سے واضح ہو گیا کہ کنیزیں کون ہیں اور غلام کون) پھر ہدیہ واپس کر دیا ۔ یہ بھی اس لیے کہ بلقیس نے کہا تھا کہ اگر ہدیہ لے لیں گے تو بادشاہ ہیں پھر ہمیں کوئی خطرہ نہیں بادشاہ سے ہم نمٹ لیں گے ۔ اگر ہدیہ واپس کر دیں تو پھر نبی ہیں (علیہ السلام) ۔ اسی لیے فرمایا :
فَلَمَّا جَآءَ پس جب وہ نمائندہ جو بلقیس کی طرف سے آیا تھا **سُلَیْمٰنَ** سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں ہدایا لایا **قَالَ** سلیمان علیہ السلام مخاطب ہوئے قاصد سے یا جس کی طرف بھیجا گیا تھا کیونکہ عرف میں غائب کو حاضر تصور کر کے خطاب کیا جاتا ہے ۔ ڈبے کے کھولنے و دیگر ہدایا کی تفتیش کا معاملہ ختم ہوا تو فرمایا ۔ یہ گفتگو ان کے آتے ہی نہیں ہوئی جیسا کہ عبارت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے ۔ **اَتُمِدُّوْنَنِ** (کیا تم میری مدد کرتے ہو)

ترکیب : دراصل انمدن و ننی تھا۔ یاء کو حذف کر دیا گیا ہے بوجہ یا پر اکتفا کرنے کے کیونکہ کسرہ یاء کے محذوف ہونے پر دلالت کرتی ہے اور ہمزہ استفہام انکاری ہے۔

حلِ لغات : الامداد بمعنے مدد کرنا۔ دوسرے مفعول کی طرف با کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔

اب معنی یہ ہوا کہ کیا تم میری مدد کرتے ہو **بِمَالٍ** معمولی سے مال کے ساتھ۔ مال کو اس لیے مال کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف ہمیشہ میلان طبعی ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے عرض بھی کہا جاتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے مال کنجری کی مانند ہے کبھی عطار کے گھر ہے تو کبھی تیلی کے گھر میں۔ (کذا فی المفردات)

ربط : ہدیہ قبول نہ کرنے کی علت بتائی کہ **فَمَآ** موصولہ ہے **اٰتٰىنَِۧ اللّٰهُ** پس وہ جو مجھے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے یعنی یہ جو تم دیکھ رہے ہو کہ میرا ٹھاٹھ شاہی کتنا ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ نے نبوت سے بھی نوازا ہے اور شاہی ایسی کہ اس کی مثال ناپید ہے **خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ** اس سے بہتر ہے جو تم مجھے ہدیہ کے طور پر مال و متاعِ دنیا پیش کر رہے ہو۔ اسی لیے مجھے تمہارے ہدیہ و تحفہ کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ مجھے اس کا کوئی خیال ہے ؎

آنکہ پرواز کند جانب علوی چو ہمائے
دنی اندر نظر ہمت او مردار است

ترجمہ : جو بھی بلندیوں کی طرف ہما کی طرح پرواز کرتا ہے کم ہمت ہے اور مردار اور خسیس ہے۔ (کیونکہ کہاں ہما اور کہاں یہ)

مثنوی شریف میں ہے : ؎

۱ من سلیماں می نخواہم ملکتان
بلکہ من برہانم از ہر ہلکتان

۲ از شما کے کدیۂ زر می کنیم
ما شما را کیمیا گر می کنیم

۳ ترک ایں گیرید گر ملک سباست
کہ برون از آب و گل بس ملکہاست

۴ تختہ بنداست آنکہ تختش خواندہ
صدر پنداری و بر در ماندہ

ترجمہ : (۱) میں سلیمان ملک دنیا نہیں چاہتا بلکہ میں تو ہر دنیا دار کے لیے برہان ہوں۔

(۲) ہم تم سے زر لے کر کیا کریں گے بلکہ ہم تو تمہیں بھی کیمیاگر بنائیں گے۔
(۳) یہ خیال ترک دو کہ ملک صرف سبا کا ہے بلکہ اس آب و گل کے ملک کے علاوہ اور بھی بہت ملک ہیں۔
(۴) وہ تختۂ قید ہے جسے تم تخت سمجھتے ہو۔ جسے تم صدر ماننے ہو وہ تو ایک لاشئے ہے۔

ملفوظ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دنیا اللہ تعالیٰ اور انبیاء و اولیاء کے نزدیک کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ یہ حضرات نہ دنیا کے ہونے سے خوش ہوتے ہیں اور نہ ہونے سے مغموم ہوتے ہیں۔

سبق : علماء اور عقلمندوں پر لازم ہے کہ وہ دنیا کے اسباب سے خوش نہ ہوں ؎

مالِ دنیا دام مرغانِ ضعیف
ملک عقبیٰ دام مرغانِ شریف

ترجمہ : مالِ دنیا کمزوروں کی پھانسی ہے ملک عقبیٰ شریفوں کی پھانسی ہے۔

بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ○ بلکہ تم ہی ہدایا سے خوش ہوتے ہو۔ مضاف الیہ وہ ہے جس کی طرف ہدیہ بھیجا جاتے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ بلکہ تم وہ ہو کہ جب تمہارے ہاں ہدایا و تحائف وغیرہ بھیجے جاتے ہیں تو تم خوش ہوتے ہو اس لیے کہ تم دنیا دار ہو اور تمہیں دنیا سے پیار ہے کیونکہ دنیا کے ظاہر کو دیکھتے ہو۔ یہی قصہ کے سیاق و سباق کے مناسب ہے۔

ف : الارشاد میں ہے انکار از امداد سے اعراض کرکے زجر و توبیخ شروع فرما دی کہ تمہیں لوگ ہدایا و تحائف سے خوش ہوتے ہو بلکہ اسے اپنے لیے فخر اور شکریہ کے طور دینے والے کو ممنون بناتے ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہ باتیں ہمیں ان کی کارروائی سے معلوم ہوئیں کہ موتیوں کا ڈبہ کھلوایا۔ پھر لونڈیوں اور غلاموں کے متعلق پرکھ ظاہر کر دی جو کہ انہوں نے بطور ہدایا و تحائف پیش کیے جو ان کا ایک فخریہ انداز تھا۔

ف : (صاحب روح البیان لکھتے ہیں کہ) فقیر کہتا ہے کہ جب انہوں نے سلیمان علیہ السلام کی شاہی کا ٹھاٹھ باٹھ دیکھا تو اپنی لائی ہوئی چیزوں کو نہایت حقیر و زبوں سمجھ کر سونے چاندی کی اینٹیں پھینک دینے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن چونکہ وہ اس وقت امین بن کر آئے تھے اس لیے رُک گئے پھر ان کا منت و احسان جتلانے کا معنیٰ کیسا یا وہ اپنی لائی ہوئی اشیاء پر کیسے فاخر و نازاں ہو سکتے تھے۔ ہاں کہا جا سکتا ہے کہ ان کا غلمان و کنیزیں اور ڈبے کا پیش کرنا امتحان و آزمائش کے طور تھا جیسا کہ مضمون کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ ہدیہ و تحفہ دلوں میں الفت پیدا کرنے کا موجب ہے لیکن دین کے عشاق کا طریقہ ہے کہ جب دیکھتے ہیں کہ ان ہدایا و تحائف میں دُنیوی فوائد تو بکثرت ہیں لیکن دینی نقصان ہے تو پھر وہ ہدایا و تحائف کو قبول کرنے کی بجائے انہیں ٹھکرا دیتے ہیں پھر دنیوی منافع اگرچہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو وُہ اسے کچھ نہیں سمجھتے کیونکہ وُہ فانی ہے اور امور دینیہ اگرچہ کتنے ہی قلیل ہوں وُہ انہیں ترجیح دیتے ہیں اور اسے کثیر سمجھتے ہیں کیونکہ وہ باقی ہیں۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے کیا کہ جب آپ کے ہاں بلقیس کا قاصد آیا تو اس کے بیش بہا تحائف و ہدایا کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا وہ نعمتیں اور کمالات و قربات و درجات اخرویہ جو مجھے اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائے ہیں وہ تم کو عطا کردہ نعمتوں سے بہتر ہیں اور تم جیسے دُنیا دار دنیوی ہدایا فانیہ سے خوش ہوتے ہیں کیونکہ تمہارے نفوس خسیس ہیں اور تم اُخروی سعاداتِ باقیہ سے بے خبر ہو۔

اِرْجِعْ اے قاصد! لَوٹ جائیے۔

تفسیر عالمانہ سوال: پہلے ضمائر خمسہ تو جمع تھے اب واحد کی ضمیر کیوں؟

جواب: یہ ضمیر صرف نمائندگان کے سربراہ اور اس کی مخصوص امداد وغیرہ کی طرف لَوٹتی ہے (اور یہ قاعدہ عام ہے)

اِلَیْھِمْ بلقیس اور اس کی قوم کی طرف ان کے ہدایا و تحائف لے کر واپس جائیے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ دین کے عشاق دنیوی لالچوں میں نہیں پھنستے۔ ان کا ارادہ صرف اور صرف یہی ہے کہ تم اسلام قبول کر لو اور ایمان دار ہو جاؤ فَلَنَاْتِیَنَّھُمْ بِجُنُوْدٍ ورنہ ہم ان کے ہاں جنات و انسانوں کا ایسا لشکر لائیں گے اور تائیدِ الٰہی بھی ہمارے شاملِ حال ہو گی لَّا قِبَلَ لَھُمْ بِھَا ان کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا اور نہ ہی ان کے ہاں ان کے مقابلہ کی کوئی طاقت و قدرت ہے۔

حلِ لغات: المختار میں ہے کہ قَبَلٌ (بفتحتین) قُبُلٌ (بضمتین) قبل بکسر الاول و فتح الثانی بمعنے مقابلہ اور آگے کی شے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

او یاتیھم العذاب قبلا۔ (یا ان کے ہاں عذاب سامنے آ جائے)

اہلِ عرب کہتے ہیں:

ولی قبل فلان حق۔ (اور میرے لیے فلاں کے ہاں حق ہے)

اور کہتے ہیں:

ومالی بہ قبل یعنی مجھے ان کے مقابلہ کی کوئی طاقت نہیں۔

اور المفردات میں یُوں سمجھا جاتا ہے کہ یہ اصل میں بمعنے عنل ہے۔ پھر قوت و طاقت علی المقابلہ کے لیے استعارہ کیا گیا ہے بمعنے مجازاۃ ۔ مثلاً کہا جاتا ہے :

لا قبل لی بکذا یعنی مجھے قدرت نہیں کہ میں اس کا مقابلہ کر سکوں ۔

اور لا قبل لہم بہا کا معنی ہے کہ ہمارے لشکر کے دفاع کی انھیں کوئی طاقت نہیں وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ اس کا عطف جواب قسم پر ہے مِّنْهَآ اور ہم انہیں سبا کے علاقے سے نکال دیں گے اَذِلَّةً درانحالیکہ وہ ذلیل وخوار اور بے عزّت ہوں گے جبکہ اب وہ عزّت اور شان وشوکت کے مالک ہیں ۔

سوال : اذلّۃ تو جمع قلّت ہے جو دس عدد سے زائد پر نہیں بولی جاتی حالانکہ وہ ان گنت تھے ۔

جواب : اس سے ان کی ذلّت وخواری پر مزید حقارت کا اظہار مطلوب ہے اگرچہ وہ کتنے ہی ہیں لیکن سلیمان علیہ السلام کی نظروں میں وہ مٹھی بھر ہیں ۔

ذلّۃ بمعنے عزّت و ملک کا چھن جانا وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ اور قیدی ہوکر مزید ذلّت وخواری کا شکار ہوں گے یہ دُوسرا حال ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انھیں ہم اپنے علاقہ سے شہر بدر کر دیں گے ۔

حلِ لغات : اہلِ عرب کہتے ہیں صغر صغرا (بالکسر) کبر کی نقیض اور صغار (بالفتح) ذلۃ کے معنی میں آتا ہے اور صاغر وُہ شخص جو خسیس مرتبہ پر خوش ہو ۔

ف : ہر طرح کی ذلّت وخواری مبنی علی الانکار والاصرار ہے ایسے ہی ہر طرح کی عزّت و شرافت مبنی علی التصدیق والاقرار ہے ۔ چونکہ مخالف کو نقصان پہنچانے سے پہلے اطلاع ضروری ہے اسی لیے سلیمان علیہ السلام کو قاصد کو لوٹنے کا حکم فرما کر اس کو اطلاع پہنچانے پر مامور فرمایا ۔ مثنوی شریف میں ہے : ؎

۱ باز گردید اے رسولان خجل ۔۔۔ زر شما را دل بمن آرید دل

۲ کہ نظر گاہ خداوندست آں ۔۔۔ کز نظر انداز خورشیدست کاں

۳ کو نظر گاہ شعاع آفتاب ۔۔۔ کو نظر گاہ خداوند لباب

---

۴ اے رسولان میفرستمتان رسول ۔۔۔ ردمن بہتر شما را از قبول

۵ پیش بلقیس آنچہ دیدید از عجب ۔۔۔ باز گوئید از بیابان ذہب

۶ تا بداند کہ بزر طامع نہ ایم ۔۔۔ ما زر از زر آفرین آوردہ ایم

---

۷ ہین بیا بلقیس ورنہ بد شود ۔۔۔ لشکرت خصمت شود مرتد شود

۸ پرده دارت پرده ات را برکند جان تو با تو بجان خصمی کند

---

۹ ملک برہم زن تو ادھم وار زود تا بیابی ہمچو او ملک خلود

---

۱۰ ہین بیا که من رسولم دعوتی چوں اجل شہوت کشم من شہوتی

۱۱ ور بود شہوت امیر شہوتم نے اسیر شہوت و روے بتم

۱۲ بت شکن بودست اصل اصل ما چوں خلیل حق و جملہ انبیا

---

۱۳ خیز بلقیسا بیا و ملک بین برنب دریاے یزداں در بچین

۱۴ خواہرانت ساکن چرخ سنی تو بمرداری چه سلطانی کنی

۱۵ خواہرانت راز بخششہاے داد ہیچ می دانی که آں سلطان چه داد

۱۶ تو ز شادی چوں گرفتے طبل زن که منم شاه و رئیس گولخن

---

۱۷ آں سگ در کو گداے کور دید حمله می آورد و دلقش می درید

۱۸ کور گفتش آخر آں یارانِ تو برکه اند ایں دم شکاری صید جو

۱۹ قوم تو در کوه می گیرند گور درمیان کوے می گیری تو گور

۲ ترک ایں تزویر گو شیخ نفور آب شوری جمع کرده چند کور

۲۱ کایں مریدان من و من آب شور می خورند از من ہمی کردند کور

۲۲ آب خود شیریں کن از بحر لدن آب بد را دام ایں کوران مکن

۲۳ خیز شیران خدا بین گور گیر تو چو سگ چونی بزرقی گور گیر

ترجمہ :(۱) اے قاصدو! رسوا ہو کر لوٹ جاؤ۔ اپنے زر کا دل ہماری طرف متوجہ کرو۔

(۲) اس لیے کہ نظر صرف اس کے مالک پر لازم ہے اس لیے کہ نظر انداز سورج ہی ہے اور بس۔

(۳) کہاں سورج کی کرنوں کو دیکھنا اور کہاں خود سورج پر نظر رکھنا (زمین و آسمان کا فرق ہے)

(۴) اے قاصدو! تم میرے قاصد بن کر واپس جاؤ مجھے تمہارے تحائف قبول کرنے کے بجائے رد کرنا بہتر ہے۔

(۵) بلقیس کو اگر عجب کرتا دیکھو تو پھر میرے سونے چاندی کے ڈھیروں کا بھی اسے بتانا۔
(۶) تاکہ اسے معلوم ہو کہ ہم زر کے لالچی نہیں ہم نے زر آفرینؔ سے بہت زر پایا ہے۔
(۷) خبردار اے بلقیس! مطیع ہو کر آ جا ورنہ انجام برا ہوگا تیرا لشکر اُلٹا تیرا دشمن اور باغی ہو جائے گا۔
(۸) تیرا اپنا پردار ہی تیری پردہ دری کرے گا بلکہ تیری اپنی جان بھی تیری دشمن بن جائے گی۔
(۹) (ابراہیم بن) ادھم کی طرح ملک کو جلد تر چھوڑ دے تاکہ ان کی طرح تمہیں دائمی شاہی نصیب ہو۔
(۱۰) ابھی آجا کہ میں رسولِ برحق ہوں اور دعوتِ حق دیتا ہوں موت کی طرح شہوت کش ہوں، میں بڑا طاقتور ہوں۔
(۱۱) اگر کسی کو کوئی طاقت حاصل ہے تو میں تمام طاقتوں کا امیر ہوں، نہ شہوت کا اسیر ہوں اور نہ ہی بتوں کے چہرے کا۔
(۱۲) بُت شکنی ہمارا کام ہے خلیل علیہ السلام و دیگر انبیاء علیہم السلام کی طرح۔
(۱۳) اے بلقیس! اُٹھ کھڑی ہو۔ آ جا میری شاہی دیکھ۔ اللہ تعالیٰ کے دریا سے موتی چُن لے۔
(۱۴) تجھ جیسی تو آسمان نشین ہیں تو مردار ہے خاک پر بادشاہی کر رہی ہے۔
(۱۵) تیری جیسوں کو جو بخششیں نصیب ہوئی ہیں کیا تجھے معلوم ہے کہ انھیں کیا نصیب ہوا۔
(۱۶) جب تُو خوشی سے ہمارے ہاں آنے کا طبل بجائے گی تو آرام پائے گی اس لیے کہ میں شاہ ہوں، رئیس ہوں۔ بہادر ہوں۔
(۱۷) ایک کُتے نے اندھے گداگر کو دیکھا تو اس پر حملہ کر کے اس کی گُدڑی پھاڑ ڈالی۔
(۱۸) اندھے نے کہا تیرے دوسرے ساتھی کہاں ہیں وہ بھی شکار کی تلاش میں ہیں۔
(۱۹) تیری قوم تو پہاڑوں میں اندھوں سے گدڑی چھینتی ہے اور تُو گلی کا شیر بنا ہوا ہے۔
(۲۰) اس مکر کو ترک کر اے شیخ آبِ شور پر چند اندھوں کو اکٹھا کئے ہوئے ہے۔
(۲۱) تو کہتا ہے کہ یہ اندھے میرے مرید ہیں اور میں آب (شور) ہوں اور یہ اندھے میرے پانی سے سیراب ہو رہے ہیں۔
(۲۲) بحرلدن سے پہلے اپنے شور آب کو میٹھا کر اور گندے پانی سے ان اندھوں اور مریدوں کو شکار نہ کر۔
(۲۳) اُٹھ اور خدا کے شیروں کو دیکھ اور کتے کی طرح مکر و فریب سے اندھے کو پکڑ رہا ہے۔

سبق عاقل پر لازم ہے کہ وہ قیل و قال کو چھوڑ کر مالکِ متعال کی طرف گڑگڑائے کہ وہ اسے مقاماتِ عالیہ اور بلند درجات تک پہنچا دے کیونکہ وہ کریم اور بہترین آقا ہے۔

نمائندگانِ بلقیس کی واپسی جب نمائندے بلقیس کے ہاں پہنچے اور جا کر سلیمان علیہ السلام کے حالات

سنائے تو کہا میں تو پہلے سمجھ گئی تھی کہ وہ بادشاہ نہیں بلکہ نبی ہیں اور ہم سے ان کا مقابلہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ کہہ کر سلیمان علیہ السلام کی طرف ایک قاصد بھیج دیا اور عرض کی کہ اپنے سرداروں کو لے کر حاضر ہو رہی ہوں جو آپ کا حکم ہوگا اسے ہم بجا لائیں گے اور آپ کا دین قبول کریں گے۔

تختِ بلقیس بلقیس نے تخت کو ایک مکان میں چھپایا۔ حفاظت کے لیے چند نگہبان مقرر فرمائے۔ تالہ لگا کر چابی جیب میں ڈالی اور سلیمان علیہ السلام کی طرف روانہ ہوئی۔ بلقیس کے تحت بارہ ہزار بہت بڑے بادشاہ تھے انہیں قبل (بفتح القاف) کہا جاتا تھا اور ہر بادشاہ کے تحت کئی ہزار رعایا تھی۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام بھی بارعب تھے۔ آپ سے بات میں کوئی بھی پہل نہیں کرتا تھا، جب تک آپ خود اس سے نہیں پوچھتے تھے۔ ایک دن تخت پر رونق افروز تھے کئی میلوں تک ایک بہت بڑا لشکر دیکھا، پوچھا یہ کیا ہے؟ عرض کی گئی بلقیس اپنے بادشاہوں اور لشکر سمیت آرہی ہے اس وقت آپ اپنے مشیروں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، یا یہ اس وقت فرمایا جب معلوم کیا کہ اس نے ہمارے ہاں آنے تک کتنے میلوں کا فاصلہ ہے قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا فرمایا اے میرے مشیرو! اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا تم میں کون ہے جو اس کا تخت لے آئے قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ اس سے پہلے کہ میرے ہاں آئیں مُسْلِمِيْنَ ۝ مسلمان ہو کر۔ اس لیے کہ آپ کو بذریعہ وحی معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہو کر آرہی ہے لیکن وہ عجائبات دیکھنا چاہتی ہے، جو سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے ہیں اور وہ عجائب اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت اور سلیمان علیہ السلام کی نبوت کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام نے حکم فرمایا کہ بلقیس کا وہ تخت لاؤ جس کی حفاظت کے لیے وہ بہت بڑی وصیتیں کر کے آئی ہے اور وہ ابھی میرے ہاں نہ پہنچ پائے کہ تخت یہاں آجائے۔ مثنوی شریف میں ہے: ؎

۱ چونکہ بلقیس از دل و جان عزم کرد
برزمان رفتہ ہم افسوس خورد

۲ ترک مال و ملک کرد او آں چناں
کہ بترک نام و ننگ آں عاشقاں

۳ ہیچ مال و ہیچ مخزن ہیچ رخت
میدریغش نامہ الا جز کہ تخت

۴ پس سلیمان از دلش آگاہ شد
کز دل او تا دل او راہ شد

۵ دید از دورش کہ آں تسلیم کیش
تلخش آمد فرقت آں تخت خویش

۶ از بزرگی تخت کز حد می فزود
نقل کردن تخت را امکاں نبود

۷ خردہ کاری بود و تفریقش خطر
ہمچو اوصال بدن با یکدیگر

۸ پس سلیمان گفت گرچہ فی الاخیر
سرد خواہد شد برو تاج و سریر

۹ لیک خود با ایں ہمہ بر نقد حال
جست باید تخت او را انتقال

۱۰ تا نگردد خستہ ہنگام لقا
کودکانہ حاجتش گردد روا

ترجمہ : (۱) جب بلقیس نے تہِ دل سے حاضری کا ارادہ کیا اور وہ زمانہ گزشتہ پر افسوس کرتی تھی۔
(۲) ملک و مال کو ترک کر دیا جیسے عشاقانِ خدا کا طریقہ ہے۔
(۳) کوئی مال کوئی خزانہ کوئی اسباب یاد نہ رہا صرف تخت یاد رہا کہ وہی اس کی پونجی تھی۔
(۴) سلیمان علیہ السلام بھی اس کے دل کے راز سے آگاہ ہو گئے کیونکہ اس کے دل تک انہیں راہ ملی۔
(۵) دُور سے دیکھا کہ اس تسلیم کے طریقہ والی کو ہر شے بھول گئی ہے لیکن تخت کی جُدائی سے پریشان ہے۔
(۶) تخت کی پہنائی ایسی تھی کہ اسے اتنی دُور لے جانا نہایت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔
(۷) سلیمان علیہ السلام کے لیے اگرچہ یہ بھی ناموزونیت تھی لیکن بلقیس کے (لیے) اس کی جُدائی موجبِ پریشانی تھی ایسے کہ جسم سے جوڑ کاٹ لئے جائیں۔
(۸) پھر سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ اگرچہ آخر میں تخت و تاج کے خیالات بھی بلقیس کے لیے سرد پڑ جائیں گے۔
(۹) لیکن اب اسے خواہش ہے تو فوراً ہی اس کا تخت وہاں سے اٹھایا جائے۔

(۱۰) تاکہ ملاقات کے وقت اسے پریشانی میں نہ دیکھوں بچّوں کی خواہش کے مطابق اس کا تخت اٹھا کر اسس کی خواہش پوری کر دی جائے۔

منکرینِ کرامت اور سلیمان علیہ السلام تاویلات نجمیہ میں ہے کہ جب سلیمان علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کی امت میں بعض اہلِ کرامت ہیں۔ اسی لیے چاہا کہ ان کی کرامت کا ظہور ہو تاکہ منکرین کو معلوم ہو کہ انبیاءؑ علیہم السلام کی امتوں میں صاحبانِ کرامات ہُوا کرتے ہیں اسی لیے اہلِ ایمان کراماتِ اولیاء کا انکار نہیں کرتا (اور بے ایمان انکار کرے تو وہ معذور ہے)

انکارِ معتزلہ از کراماتِ اولیاءٔ معتزلہ نے اولیاء کی کرامات کا انکار کیا اور ان کے انکار کا ادنیٰ نقصان یہ ہے کہ وہ درجۂ کرامت سے محرومی ہے جیسے بدعتی اور اہلِ ہوا کے لیے کرامات کا حال ہے (جیسا کہ ہم نے وہابیوں، دیوبندیوں اور مرزائیوں کو آزمایا ہے)

ازالۂ وہم کسی جاہل کو یہ گمان نہ ہو کہ خود سلیمان علیہ السلام تخت لانے کی قدرت نہ رکھتے تھے اور نہ ہی ان کو ایسی کرامت حاصل تھی ورنہ وہ خود تخت لاتے کسی دوسرے کو نہ کہتے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت مقصد یہ تھا کہ انبیاء علیہم السلام کی اُمت میں اہلِ کرامات ہوتے ہیں کیونکہ کرامات منجملہ معجزات انبیاءؑ سے ہوتی ہیں اس لیے کہ وُہ بھی ان کی نبوت کی تصدیق اور ان کے دین کی حقانیت پر دال ہیں۔

حضرت شیخ داؤد قیصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ خوارق عادات اقطاب وخلفاءؑ سے بہت کم صادر ہوتے ہیں البتہ ان کے وزراءؑ وخلفاءؑ سے زیادہ۔ اس لیے کہ وہ خود قیام عبودیت تام اور فقر کلّی میں مشغول ہوتے ہیں اور وہ خود اپنے لیے تصرف نہیں کرتے۔ ان کی سب سے بڑی کرامات یہی ہیں کہ وہ جہلاءؑ کی صحبت میں مبتلا نہ ہوں بلکہ انھیں علماءؑ وصلحاء کی صحبتوں سے نوازا جاتا ہے اور ان سے ان کا بوجھ ہلکا کیا جاتا ہے اور ان کے احکام واقوال نافذ کرتے ہیں جیسے آصف وسلیمان علیہ السلام کا حال ہے۔

ف : بعض عارفین فرماتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ کامل زمان اپنے ہم زمان لوگوں سے ہر حیثیت سے اور ہر مرتبہ میں اعلیٰ ہو جیسے حضور علیہ السلام نے تابیرِ نخل میں فرمایا:

انتم اعلم باموردنیاکم۔

(تم ہی اپنے دنیوی امور کو خوب جانتے ہو)

اور یہ کامل کے لیے کوئی نقص بھی نہیں کیونکہ ہر طرح کا کمال حضرت الوہیۃ وربوبیت کے ساتھ مخصوص ہے اور اللہ تعالیٰ کے ماسوا تمام عاجز بندے اور کسی نہ کسی معاملہ میں ناقص۔ ہاں کسی کو کسی خاص کمال کی خصوصیت ہو تو وہ الگ بات ہے جیسے موسیٰ وخضر علیہما السلام کہ موسیٰ علیہ السلام اگرچہ کلیم زمانہ تھے لیکن خضر علیہ السلام ان سے علم لدنی

ہیں اکمل تھے لہٰذا ایسے ہی سلیمان علیہ السلام اگرچہ باکمال تھے لیکن عرش اُٹھانے کی خصوصیت آصف کو نصیب تھی، ہماری اس تقریر کی دلیل ہے :

ففہمناھا سلیمان (وہ ماجرا ہم نے سلیمان علیہ السلام کو سمجھا دیا)

باوجودیکہ اس وقت خلیفۂ حق حضرت داؤد علیہ السلام تھے لیکن اس وقت معاملہ فہمی کی قوت سلیمان علیہ السلام کو زائد نصیب ہوئی ۔

قصہ حیض میں جماع کرنے والے کا حضرت سلیمان علیہ السلام و داؤد علیہ السلام کے سامنے ایک عورت نے دعویٰ کیا کہ میرا شوہر میرے بطن سے پیدا شدہ لڑکے کو اپنا بچہ نہیں مانتا فیصلہ فرمایئے ۔ مرد سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ لڑکے کی شکل و صورت مجھ سے نہیں ملتی اس لیے کہ میں سفید رنگ ہوں اور یہ سیاہ فام ۔ فلہٰذا میری عورت نے کسی سے زنا کرایا ہوگا ۔ عورت زنا سے انکار کرتی تھی ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس مرد سے پوچھا : کیا تو نے اپنی بیوی کے ساتھ بحالتِ حیض جماع کیا تھا؟ اس نے اقرار کیا تو فرمایا : یہ لڑکا تیرا ہے اور اس کی سیاہ روئی تیرے لیے سزا ہے (آئندہ ایسا نہ کرنا) یہ خصوصیت سلیمان علیہ السلام کو نصیب ہوئی ۔

قَالَ عِفْرِيْتٌ ایک خبیث و سرکش **مِّنَ الْجِنِّ** جن نے کہا ۔ یہ مِنْ بیانیہ ہے یعنی سرکش و خبیث جن ، اس لیے کہ عفریت ہر اس انسان کو کہا جاتا ہے جو خبیث اور اپنے ہم زمان لوگوں کو ناخوش کرتا اور نہایت قبیح اور گرد آلود ہو ۔ اور المفردات میں ہے کہ عفریت سرکش خبیث جن، لیکن لفظ شیطان کی طرح استعارۃً انسان کے لیے بولا جاتا ہے ۔

حل لغات : العفر (بفتحتین و بسکون الوسط) سے ماخوذ ہے یعنی ہر وہ شخص جو مٹی میں مٹی ہوا پھرے گویا وہ مٹی کاندھے پر ڈالے اور مٹی میں ہی لیٹ کر جسم کو مٹی آلود کرلے ۔ یہ دراصل عفر تھا پھر تاء مبالغۃً زاید لائی گئی ہے ۔

عفریت کا اصلی نام کیا تھا عفریت کا اصلی نام ذکوان تھا اور فتح الرحمٰن میں اس کا نام کوذی یا اصطر لکھا ہے یہ تمام جنات کا سردار تھا چونکہ یہ پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ سرکشی کرچکا تھا (بعد کو تابع ہوا) اصطر فارس اسی کے نام سے مشہور ہے اور یہ بہت بڑا قدآور تھا دور سے معلوم ہوتا کہ گویا ایک بہت بڑا پہاڑ ہے تاحدِ نگاہ قدم رکھتا تھا ۔

اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ میں ہی آپ کی خدمت میں وہ تخت لاؤں گا **قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ** اس سے پہلے کہ آپ اپنی کچہری برخاست کریں ۔

سلیمانی عدالت کا ٹائم ٹیبل حضرت سلیمان علیہ السلام کی عدالت کا وقت صرف بارہ بجے تک تھا۔ (یعنی آپ خود اس وقت تک تشریف فرما رہتے تھے)

ف : آتی یا تو صیغہ مضارع ہے یا صیغۂ اسم فاعل ہے اور یہی زیادہ موزوں ہے کہ وہ عرش کے لانے کا دعویٰ کر رہا تھا تو تنہا خود لائے گا جسے کسی دوسرے معاون کی ضرورت نہ ہوگی اور جملہ اسمیہ پر عطف ڈالنے کے موافق ہے یعنی وہ سلیمان علیہ السلام سے عرض کر رہا تھا کہ میں ابھی ابھی اکیلا ہی وہ تخت لانے والا ہوں۔

وَاِنِّیْ عَلَیْہِ اور بے شک میں اس کے لانے پر لَقَوِیٌّ قوت رکھتا ہوں اس کا بوجھ اٹھانا میرے لیے مشکل نہیں اَمِیْنٌ ○ امانت دار ہوں اس میں جتنے جواہر اور نفیس چیزیں ہیں چراؤں گا نہیں، اور نہ ہی تبدیل کروں گا۔ قَالَ جب سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے تو اس سے بھی زیادہ جلدی چاہیے۔ تو کہا اَلَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ وہ جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا اس سے آصف بن برخیا مراد ہے۔

آصف کا تعارف آصف (رضی اللہ عنہ) بن برخیا حضرت سلیمان علیہ السلام کا خالہ زاد اور آپ کا وزیر اور کاتب تھا بلکہ بچپن میں سلیمان علیہ السلام کی تربیت بھی اس کے سپرد تھی۔ بہت سچا اور تعلیم یافتہ تھا۔ سابقہ کتبِ الٰہیہ لکھا کرتا تھا اور وہ اسم اعظم جانتا تھا جس کے ذریعہ وہ جو دعا مانگتا قبول ہو جاتی اسے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی مدد و نصرت کے لیے ہی پیدا کیا تھا تاکہ وہ ان کے ساتھ مل کر کتاب (احکام) کا نفاذ کریں۔

ف : الکتاب جنس ہے یعنی ان کتابوں میں سے جو موسیٰ و ابراہیم علیہما السلام وغیرہما پر نازل ہونے والی کتابوں میں سے کوئی ایک کتاب مراد ہے یا اس سے لوحِ محفوظ اور اس کے اسرارِ مکتومہ مراد ہیں۔

معتزلہ نے کہا اس سے حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔ وہ چونکہ کراماتِ اولیاء کے منکر ہیں اسی لیے وہ آصف کی بجائے جبریل علیہ السلام مراد لیتے ہیں۔

اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ۔

حلِ لغات : الارتداد بمعنے الرجوع (لوٹنا)۔ الطرف کسی شے کے دیکھنے کے لیے پلکوں کا ہلانا اور کھولنا۔ یہاں ارتداد سے انضمام (ملانا) مراد ہے۔

نکتہ : رد کی بجائے ارتداد کا لفظ لایا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہاں پر طبعی آنکھ جھپکنا مراد ہے اور طرف بمعنے نظر عام آتا ہے جبکہ پلک جھپکانے کو دیکھنا لازم ہے اور یہی تیز رفتاری کی آخری قوت ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی شے انسان کے لیے تیز رفتار نہیں اور تیز رفتاری میں اسی کی مثال دی جاتی ہے کیونکہ آنکھ جھپکنے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔

آصف کا وظیفہ جناب کاشفی مرحوم نے لکھا کہ جونہی سلیمان علیہ السلام نے آصف رضی اللہ عنہ کو اجازت بخشی تو آصف نے سر سجدہ میں رکھ کر کہا : یا حیُّ یا قیوم ۔ جسے عبرانی زبان میں آھیا شراھیا کہا جاتا ہے ۔ بعض نے کہا کہ آصف نے کہا : یا ذاالجلال والاکرام ۔ بہرحال آصف نے دُعا مانگی تو آنکھ جھپکنے سے پہلے بلقیس کا تخت سلیمان علیہ السلام کے سامنے آگیا ۔

دلیل عجیب یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں کہ آصف کی قبولیت دعا پر تختِ بلقیس وہاں سے مٹا دیا اور یہاں بعینہٖ اسی طرح کا تخت پیدا کر دیا تاکہ ولی کی کرامت اور نبی کا معجزہ ظاہر ہو ۔

مسئلہ : فقیر (اسمٰعیل حقّی رحمہ اللہ) کہتا ہے کہ یہ مسئلہ ایجاد و اعدام کے قبیل سے ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان :

الدنیا ساعۃ وقل من یفھمہا ۔ (دنیا ایک پلک بھر ہے بہت سے لوگ اسے نہیں سمجھتے)

کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کے طور اطوار کو عقل نہیں سمجھتی ۔ مثنوی شریف میں ہے : ؎

۱ پس ترا ہر لحظہ موت و رجعتیست
مصطفیٰ فرمود دنیا ساعتیست

۲ ہر نفس نو می شود دنیا و ما
بے خبر از نو شدن اندر بقا

۳ عمر ہمچوں جوی نو نو مے رسد
مستری می نماید در جسد

۴ آں ز تیزی مستمر شکل آمد ست
چوں شرر کش تیز جنبانی بدست

۵ شاخ آتش را بجنبانی لسائز
در نظر آتش نماید بس دراز

۶ ایں درازی مدت از تیزیِ صنع
می نماید سرعت انگیزی صنع

ترجمہ : (۱) تجھے ہر آن موت اور رجعت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دُنیا ایک

ساعت ہے۔

(۲) ہر سانس جدید پر دنیا ختم ہو جاتی ہے اور ہم بقا میں اس تجدید کو نہیں جانتے۔

(۳) زندگی جو جدید کی طرح ختم ہو رہی ہے لیکن جسم میں ہمیشگی نظر آتی ہے۔

(۴) وہ زندگی گزارنے کی تیزی دائمی سے ایک شکل نظر آتی ہے جیسے انگارہ کہ تیزی سے ہاتھ پر ہو۔

(۵) آگ کو تیز حرکت دو تو وہ بہت لمبی معلوم ہوتی ہے۔

(۶) اس کی یہ درازی تمہاری حرکت کی وجہ سے ہے جو کہ تیز تیز چلانے سے دراز معلوم ہو رہی ہے۔

فَلَمَّا رَاٰهُ پس جب تخت سلیمان علیہ السلام کے ہاں پہنچ گیا اور آپ نے دیکھا مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ اپنے ہاں ٹھہرا ہوا۔ یعنی تخت آپ کے سامنے موجود تھا جو صرف آنکھ جھپکنے میں آ گیا اور اسے منتقل کرنے میں کسی قسم کا خلل بھی نہیں آیا قَالَ سلیمان علیہ السلام نے حصول نعمت پر شکر کے طور پر کہا هٰذَا میری مراد کا حصول کہ تھوڑی سی مدت میں تخت پہنچ گیا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے جو اس نے مجھے عطا فرمایا باوجودیکہ میں اس کا مستحق بھی نہیں لِيَبْلُوَنِيْ تاکہ وہ مجھے آزمائے۔

حل لغات: المفردات میں ہے کہ یہ بلی الثوب (کپڑا پرانا ہوا) سے ہے۔ بلوتہ میں نے اسے آزمایا۔ گویا میں نے اسے بار بار آزما کر پرانا کیا۔ اور جب کہا جائے:

ابتلا فلان بکذا و بلاہ۔

تو وہ دو معنوں کو متضمن ہوتا ہے:

(۱) اس کے حال کو معلوم کرنا اور اس کے معاملات غیر معلومہ سے واقف ہونا۔

(۲) اس کے کھرے کھوٹے ہونے کا ظاہر ہونا۔

کبھی دونوں معانی مراد ہوتے ہیں کبھی ایک، مگر جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو۔ مثلاً کہا جائے بلاہ و ابتلاہ۔ تو اس وقت صرف کھرے کھوٹے ہونے کا ظہور مراد ہوگا اس کے حال سے واقف ہونا مراد نہ ہوگا اور نہ ہی اس کے غیر معلومہ معاملہ کا حال معلوم کرنا مراد ہوگا کیونکہ وہ تو علام الغیوب ہے اس کے لیے یہ دوسرا معنیٰ اس کی شان کے خلاف ہے۔

ءَاَشْكُرُ کیا میں اس کا شکر کرتا ہوں کہ یہ سمجھوں کہ اسی کا فضل ہے اور بس، اس میں میری تدبیر یا طاقت و قوت کو کوئی دخل نہیں اَمْ اَكْفُرُ یا ناشکری کرتا ہوں کہ یہ سمجھوں کہ اس میں میرا کوئی دخل ہے اور پھر اس کے شکر کی ادائیگی میں کوتاہی کروں۔

فائدہ علمیہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ جن کو اگرچہ لطافتِ جسمانیہ حاصل ہے لیکن وہ قوائے ملکوتیہ تک محدود ہے لیکن انسان اگرچہ کثیف جسمانیت والا ہے لیکن جب اسے کتابِ الٰہی نصیب ہو تو اسے قوتِ ربانیہ نصیب ہوتی ہے کہ اس نے کتاب پر عمل کرنے سے یہ قوت حاصل کی ہے۔ وہ جن تھوڑے سے وقت میں اتنا بڑا تخت لا سکتا ہے تو انسان کو اس سے بڑھ کر قوت حاصل ہے۔

ربط : چونکہ کرامتِ ولی حضرت سلیمان علیہ السلام کے معجزہ کی مؤید تھی اسی لیے فرمایا : ھذا من فضل ربی لیبلونی ءاشکر ام اکفر۔

ف : حضرت قتادہ نے فرمایا کہ جب سلیمان علیہ السلام نے سر اٹھا کر دیکھا تو تخت سامنے تھا تو دیکھ کر کہا : الحمد للہ الذی جعل فی اھلی من ید عوہ فیستجب لہ (شکر ہے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے میری امت میں ایسے لوگ بنائے جو اس سے دعا مانگتے ہیں وہ ان کی دعا قبول کر لیتا ہے) ؎

گفت حمد اللہ بریں صد چنیں
کہ بدی و دستم ز رب العالمیں

ترجمہ : کہا اللہ تعالیٰ کی حمد ہے کہ اس کو ہزاروں حمد کہ یہ قوت و طاقت ہمیں رب العالمین سے ملی۔

وَمَنْ اور جو بھی **شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ** شکر کرتا ہے تو وہ اپنے فائدے کے لیے ہی کرتا ہے کیونکہ نعمتِ موجودہ کے لیے شکر قید اور نعمتِ غیر موجودہ کے لیے شکار ہے **وَمَنْ كَفَرَ** اور وہ دی ہوئی نعمتوں کا شکر نہیں کرتا اور نہ ہی اس عطیہ کے حقوق ادا کرتا ہے تو اس کا اپنا نقصان ہے ، **فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ** اس لیے کہ میرا پروردگار شکر سے مستغنی ہے **كَرِيمٌ** ۝ کوئی شکر نہ بھی کرے تب بھی وہ نعمت بند نہیں کرتا اور نہ ہی اسے لنجلت سزا دیتا ہے۔

ف : المفردات میں ہے کہ نعمت و محنت دونوں آزمائشیں ہیں اس لیے کہ محنت صبر طلب کرتی ہے اور نعمت شکر کی مقتضی ہے۔ صبر کی ادائیگی آسان ہے بہ نسبت شکر گزاری کے۔ اس معنی پر محنت سے نعمت کی زیادہ آزمائش ہے۔

ملفوظ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم مصائب میں مبتلا ہوئے تو صبر کیا اور نعمتوں میں مبتلا ہوئے تو صبر نہ کر سکے۔ اور فرمایا کہ جسے دنیا کی فراوانی نصیب ہو اور وہ اپنے لیے آزمائش

نہیں سمجھا تو اسے عقل نے دھوکا دیا ہے۔

ملفوظ حضرت واسطی قدس سرہٗ حضرت واسطی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شکر فضل الٰہی کا کب مقابلہ کر سکتا ہے کہاں شاکرین کا شکر اور کہاں اس کا فضل! کیونکہ اس کا فضل قدیم ہے اور شاکرین کا شکر حادث۔ تو یُوں سمجھیے کہ جو شکر کرتا ہے تو وہ اپنے لیے ہی کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کے شکر سے مستغنی ہے۔

ملفوظ حضرت شبلی قدس سرہٗ حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نعمتِ الٰہی کے مقابلہ میں شکر ایک بُجھی ہوئی چنگاری ہے۔

اثبات کرامت اولیاءؒ اسئلۃ المقحمہ میں ہے کہ آیت میں کرامت کا اثبات دو وجہوں سے ہے: (۱) جب جن (عفریت) نے تخت لانے کا یُوں دعویٰ کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی نشست گاہ سے اُٹھنے بھی نہیں پائیں گے کہ میں تخت لا دوں گا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: مجھے تو اس سے بھی زیادہ جلدی چاہیے۔ جب یہ کام ایک جن (عفریت) کے لیے ممکن ہے تو پھر اولیاءؒ کے لیے غیر ممکن کیوں
(۲) جس کے پاس کتاب کا علم تھا وہ تھے حضرت آصف سلیمان علیہ السلام کے وزیر۔ اور وہ نبی نہ تھے۔ اور وہ آنکھ جھپکنے سے پہلے تخت لے آئے جیسا کہ قرآن نے شہادت دی ہے۔ اس سے ثابت ہُوا کہ خرقاً للعادۃ اولیاءُ اللہ کے لیے جائز ہے، خلافاً للقدریۃ۔ یعنی قدریہ نے اولیاءِ کرام کی کرامت کا انکار کیا ہے۔

کرامت و استدراج اور معجزہ کی تعریف ایسے مومن متقی سے خرق للعادت کا صدور ہو جو مدعیِ نبوت نہیں ہے تو وہ کرامت ہے۔ اگر مدعیِ نبوت سے صادر ہو تو وہ معجزہ ہے اگر غیر مومن اور فاسق سے صادر ہو تو وہ استدراج ہے۔ بعض نے کہا کہ کرامت معجزہ کا نتیجہ اور اس کی مؤید ہے۔ لیکن حقیقی کرامت انسان کے علم و عمل وحسنِ خلق سے ہی ہوتی ہے جس میں علم صحیح اور عمل صالح نہ ہوں اور اس سے کرامت کا صدور ہو وہ کرامت نہیں استدراج ہے۔ بہر حال اس بندۂ خدا سے طی الارض ممکن ہے جو اپنے جسم کو مجاہدات اور قسم قسم کی عبادات میں مشغول رکھے اور کئی کئی راتیں بیدار رہ کر مناجات میں گزار دے تو پانی پر تیرنا بھی اس بندۂ خدا کے لیے ممکن ہے، جو بھوکوں کو طعام کھلائے اور ننگوں کو کپڑے پہنائے اگر اس کے پاس دنیا و دولت ہے تو اپنی دولت سے، ورنہ دوسروں سے کہہ کر یا ان پڑھ کو علم پڑھائے اور گمراہ کو راہِ راست دکھائے کیونکہ یہ دونوں صفتیں حیاتِ حسیہ و علمیہ کی حیات کا سبب ہیں اور ان کو پانی سے مناسبت ہے جو اسے مضبوط کرتا ہے تو پانی اس کے حکم پر چلے گا اور وُہ پانی پر تیرتا چلا جائے گا چاہے تو اس پر تیرے چاہے زُہد اختیار کرے اور بوقتِ ضرورت کام میں لائے۔ اور عارف کے لیے زیادہ

مناسب بھی یہی ہے کہ وہ کرامات حسیہ علمیہ کے اظہار سے کنارہ کشی کرے کیونکہ یہ اظہار کرامات آفات و بلیات ہے عارف کے لیے جائز ہے کہ اپنے لباس وخوراک وغیرہ کے لیے جن وملک سے خدمت کرائے۔

ردِّ وہابیہ دیوبندیہ (اہل سنّت کا عقیدہ ہے کہ اولیاء اللہ جب چاہیں کرامت کا اظہار کریں وہ اس امر میں مختار ہیں مگر اس فعل کی تخلیق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اسے ان کا غیر اختیاری کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی مسلک کو صاحبِ رُوح البیان نے بیان فرمایا۔ اس سے پتا چلا کہ یہی عقیدہ صدیوں پہلے تھا وہابیہ نے اپنے نوایجاد مذہب میں توحید کی آڑ میں کہہ دیا کہ" نبی و ولی کچھ اختیار نہیں رکھتے نہ کسباً نہ تخلیقاً۔ روح البیان ج ۶ ص ۳۵۰ پر یوں مرقوم ہے کہ:)[1]

قال فی کشف الاسرار قد تحصل الکرامة باختیار الولی و دعائه و قد تکون بغیر اختیاره۔

کشف الاسرار میں ہے کہ کرامت کبھی ولی اللہ کے اختیار سے صادر ہوتی ہے اور کبھی اس کے اختیار کے بغیر۔

ف: پچھلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کرامت ان سے صادر ہو جاتی ہے جس کا ان کو اس کے صادر کرنے کا ارادہ نہ تھا۔

حدیث شریف میں ہے:

کم من اشعث اغبر ذی طمرین لا یؤبه له لو اقسم علی اللہ لا برہ۔

(بہت سے غبار آلود اور پھٹے پرانے کپڑوں والے جن کا کوئی اعتبار نہ کیا جائے گا لیکن وہ اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں قسم کھائیں تو اللہ تعالیٰ انہیں قسم میں سچا کر دکھلائے)

زمین کی خوش بختی آثار میں وارد ہے کہ جب حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وصال ہوا تو زمین رو پڑی اور عرض کی:

بقیت لا یمشی علیّ نبی الیٰ یوم القیامة۔

(اب قیامت تک میرے اوپر کوئی نبی نہیں چلے گا)[2]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں ایسے لوگ پیدا کروں گا جن کے قلوب انبیاء علیہم السلام جیسے ہوں گے اور ان سے کرامات کا صدور ہو گا۔

---

[1] اضافہ از اویسی غفرلہٗ

[2] کیونکہ آپ آخر الانبیاء تھے اور وہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اویسی غفرلہٗ

مسئلہ : کراماتِ اولیا معجزاتِ انبیا سے ملحق ہیں کیونکہ اگر نبی سچا نہ ہوتا تو اس کے امتی سے کرامت صادر نہ ہوتی۔

وہابی دیوبندی کی نشانی اولیاء کی کرامات کا منکر صرف محروم القسمۃ ہی ہوسکتا ہے ورنہ خوش قسمت لوگ کبھی کسی کرامت کا انکار نہیں کرتے ہیں ایسے خوش قسمت لوگوں کی علامت یہ ہے کہ وہ مطلقاً ہر کرامت کا اقرار کرلیتے ہیں خواہ ان کے اپنے زمانے کے اولیا ہوں یا ان سے پہلے۔ بخلاف بدقسمت محروموں کے۔ یعنی منکرین اولیا کے کہ وہ اپنے ہم عصر اولیا کی کرامات کے قائل تو ہوتے ہیں لیکن اپنے سے پہلے اولیاء کی کرامات کا انکار کرجاتے ہیں جیسے معروف کرخی و سہل وجنید [اور ان جیسے دیگر اولیا جیسے غوث صمدانی قطب یزدانی سیدنا عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہم کی کرامات کا انکار کرجاتے ہیں۔ مثلاً کہا جائے کہ محبوب سبحانی رضی اللہ عنہ نے مُردے زندہ کئے، بے اولادوں کو اولاد دلائی اور بڑھیا کا بیڑا ترایا اور بارہ سال کے بعد مُردہ بارات صحیح و سالم باہر آئی تو منکرین کراماتِ اولیا سیخ پا ہوجاتے ہیں آزما کر دیکھئے۔ ایسے لوگوں کو صاحبِ روح البیان نے محروم القسمۃ کہا ہے اور ہمارے زمانے میں ان کا نام وہابی دیوبندی ہے۔ اور پھر اس کے بعد ایک عجیب مثال قائم فرماتے ہیں کہ] ان منکرین کی مثال ان یہودیوں کی سی ہے کہ وہ اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام کو تو مانتے ہیں لیکن انہیں حضور علیہ السلام کی نبوت کا انکار رہے اور یہ بُری عادت یہودیا نہ ہے اللہ تعالیٰ سے ہم توفیق اور اپنے انجام پر حُسنِ خاتمہ مانگتے ہیں اپنے لیے بھی اور جملہ اہلِ اسلام کے لیے بھی۔ اور گڑگڑا کر عرض کرتے ہیں کہ قیامت میں ہمیں اہلِ کرامات کے ساتھ اٹھائے (آمین)

قَالَ سلیمان علیہ السلام نے کہا۔ قال کا تکرار اس لیے ہے کہ پہلے اور آنے والے مضمون میں فرق ہے اس لیے کہ پہلے مضمون میں شکر کا بیان ہے دوسرے میں خدام پر امر ہے وہ یہ کہ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا تنکیر بمعنے شے کی ہیئت کو ایسا بدلنا کہ اسے پہچانا نہ جاسکے۔ اور تعریف وہ شے کہ اسے مکمل طور پر پہچانا جائے۔ تاج المصادر میں ہے بمعنے ناشناسا کردن۔ اب معنی یہ ہوا کہ اس تخت کی ہیئت کو ایسے تبدیل کردو کہ پہچانا نہ جائے۔ سلیمان علیہ السلام کا یہ حکم سُن کر شیاطین نے بلقیس کے تخت کو الٹا دیا اور اس کے اوپر عجیب وغریب قبتے بنادئے، جہاں سبز موتی تھے وہاں سرخ اور جہاں سُرخ تھے وہاں سبز موتی لگادئے۔ نَنْظُرْ اس کا مجزوم ہونا امر کے جواب کی وجہ سے ہے تاکہ ہم دیکھیں کہ بعد از سوال أَتَهْتَدِيْ کیا وہ اس کے پہچاننے میں راہ پاتی ہے تو پھر اس سے اس کی عقل کی وسعت ظاہر ہو جائے گی أَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝ یا وہ ان سے ہے کہ انہیں اس کے پہچاننے کی راہ نہیں ملتی تو پھر اس کی عقل کی کمزوری واضح ہوجائے گی۔

ربط : شیاطین کو گمان ہوا کہ بلقیس سلیمان علیہ السلام کو جنات کے پوشیدہ اسرار سے آگاہ کرے گی کیونکہ وہ جنیہ کی لڑکی تھی اور پھر اگر سلیمان علیہ السلام سے اس کا نکاح ہوگیا اور کوئی لڑکا پیدا ہوگیا تو وہ ہم پر ہمیشہ کے لیے مسلط رہے گا کیونکہ اس میں جن وانس دونوں طاقتیں ہوں گی۔ اس طرح سے ہم تا قیامت ان کے پنجے سے نہ چھوٹ سکیں گے اور ہماری زندگی ہمیشہ کے لیے ذلت وخواری کا شکار ہو جائے گی اسی لیے سلیمان علیہ السلام سے کہہ دیا کہ وہ تو عقل سے بے بہرہ ہے دوسرے یہ کہ اس کے پاؤں گدھے کے کھروں جیسے ہیں ، تیسرے اس کی پنڈلیوں پر بال ہیں۔ اور یہ تمام امور نہایت ہی قبیح ہیں ۔ سلیمان علیہ السلام نے اس کی عقل کی پہچان کے متعلق تو پہلے فرما دیا اور اس کی پنڈلیوں وغیرہ کا افشا آگے چل کر کریں گے ۔

فَلَمَّا جَآءَتْ پس جب وہ (بلقیس) سلیمان علیہ السلام کے ہاں حاضر ہوئی تو تخت وہاں پڑا دیکھا قِيْلَ سلیمان علیہ السلام کی طرف سے براہِ راست کہا گیا یا بالواسطہ ، بہرحال یہ بطور امتحان کے تھا تاکہ اس کی عقل کے متعلق معلوم ہو جائے اَهٰكَذَا عَرْشُكِ کیا تیرا تخت ایسا ہے ۔ یہ نہ فرمایا کہ کیا یہی تیرا تخت ہے تاکہ اس سے ان کا بنانا امتحان کے خلاف نہ ہو جائے جبکہ اس وقت اس سے امتحان مطلوب ہے۔ قَالَتْ کہا ۔ اس وقت بلقیس نے اپنا تخت نہ ہونے کا نہیں کہا اور نہ ہی کہا کہ وہی ہے بلکہ جس طرح انہوں نے بلقیس پر ایک شکل تبدیل کر کے شبہ میں ڈال دیا اس نے بھی جواب اسی طرح کا دیا حالانکہ حقیقتِ حال اس پر منکشف ہوگئی تھی كَاَنَّهٗ هُوَ گویا یہ وہی ہے ، اس طرح ظاہر کیا کہ اس کی صفات میں تغیر ضرور ہے لیکن ذاتی طور پر تو یہ میرا تخت ہی معلوم ہوتا ہے ۔ اس طرح سے اس کی عقل کی فراوانی کا امتحان ہوگیا اور وہ خود بھی سمجھ گئی تھی کہ اس طرح سے سلیمان علیہ السلام اس کا امتحان لینا چاہتے ہیں اور ساتھ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ (سلیمان علیہ السلام) صاحبِ معجزہ نبی ہیں کہ اس (بلقیس) کے پہنچنے سے پہلے ہی انھوں (سلیمان) نے اس کا تخت اٹھوا لیا وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا اور اس سے پہلے ہی معلوم کر چکے تھے یعنی آیاتِ الٰہ سے پہلے ۔ وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ۝ درانحالیکہ ہم اس وقت مسلمان تھے وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (اور اسے غیر اللہ کی پرستش نے روکے رکھا)

ربط : یہ بیان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کہ اظہارِ اسلام سے تاحال اسے سورج پرستی نے روک رکھا تھا غیر اللہ کی عبادت میں مشغول رہی ۔

اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝ بیشک تھی وہ کافر لوگوں سے ۔ یہ اس کی عبادت غیر اللہ کی علت ہے کہ وہ کافروں میں رہتی تھی یہاں تک کہ سلیمان علیہ السلام کے قبضہ میں آگئی اب وہ دائرۂ ایمان

میں ہے۔ مثنوی شریف میں ہے ؎

چون سلیمان سوئے مرغانِ سبا
یک صفیری کرد بست آں جملہ را
جز مگر مرغے کہ بد بیجان و پر
یا چو ماہی گنگ بد از اصل و کر

ترجمہ : سلیمان علیہ السلام نے سبا کے مرغوں (پرندوں) کو ایک آواز دی تو پھر تمام کو اپنی قید میں کر لیا سوائے اس مرغ (پرندے) کے جو بے جان و پر تھا یا وہ مچھلی جو گونگی اور بہری تھی۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں دلیل ہے کہ کسی کام میں مشغول ہونا اسے اس کی ضد سے مانع رکھتا ہے۔ جیسے بلقیس کو سورج پرستی نے عبادتِ الٰہی سے محروم رکھا۔ اس لیے انسان پر لازم ہے کہ وہ کسی دنیوی کام میں مستغرق نہ ہو بلکہ وہ صرف اور صرف عبادتِ الٰہی اور محبتِ ایزدی کو اپنائے اس لیے کہ جب اس پر ما سوی اللہ کی حُب غالب ہوگی اور اسے اس سے کوئی شے روکنے والی بھی نہ ہوگی نہ عقل سے نہ دین سے تو وہی محبت اسے ماسوی اللہ سے اندھا اور بہرہ بنا دے گی۔

جیسا کہ حدیث شریف میں ہے :

حدیث شریف حُبُّكَ الشَّیْئَ یعمی ویصم۔

(تجھے کسی شے کی محبت اندھا و بہرہ بنا دے گی)

عجیب محل کی تیاری مروی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کے پہنچنے سے پہلے حکم فرمایا کہ ایسا محل تیار کیا جائے جس کا صحن سفید شیشوں کا ہو اور اس کے نیچے پانی جاری کیا جائے اور اس میں مچھلیاں وغیرہ ڈال دی جائیں اور سلیمان علیہ السلام کا تخت اس کے درمیان میں رکھا جائے۔ یہ سب کچھ کر کے سلیمان علیہ السلام تخت پر بیٹھ گئے اور آپ کے اردگرد پرندے اور جن و انس کھڑے ہو گئے۔

تفسیر عالمانہ جب بلقیس محل کے قریب پہنچی قِیْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ تو اسے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو جا

حلِ لغات : الصرح بمعنے محل اور وہ عمارت جو اونچی ہو۔ اسے اس نام سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ وہ ہر قسم کی ملاوٹ سے خالص ہوتا ہے۔ اور صرح (بفتحتین) بمعنے خالص عن کل شئی۔

فَلَمَّا رَاَتْهُ پس جبکہ بلقیس نے اسے دیکھا کہ اس میں سورج چمک رہا ہے اور پانی خالص ہے اور اس میں مچھلیاں تیر رہی ہیں حَسِبَتْهُ لُجَّةً لُجَّۃ بمعنے دریا کی گہرائی، جس کا پانی موجیں مار رہا ہو۔ (کذا فی المفردات)

کشف الاسرار میں لجۃ بمعنے پانی کی گہرائی اور وہ تھوڑا سا پانی مراد ہے جو زیادہ سے زیادہ گٹوں یا پنڈلیوں تک ہو یا جس میں انسان ڈوب نہ سکے۔ (کذا فی القاموس)

اب معنیٰ یہ ہوا کہ بلقیس نے خیال کیا کہ سلیمان علیہ السلام کے آگے گہرا پانی ہے اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ پانی شیشے کے نیچے بہ رہا ہے۔ ارادہ کیا کہ وہ اس میں داخل ہو وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا اور اپنی دونوں پنڈلیوں کو کھولا۔ ساقین ساق کا تثنیہ ہے اور دو گٹوں کے درمیان والی جگہ کو ساق کہا جاتا ہے دو گٹوں سے ایک گٹہ گھٹنوں کا دوسرا قدم کا گھٹنا مراد ہے یعنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھایا تاکہ پانی میں بھیگ نہ جاتے۔ جب پنڈلی کھولی تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ پنڈلی اس قدر حسین تھی کہ ایسی پنڈلی کسی نے کبھی دیکھی نہ سُنی اور اس پر بالوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ قَالَ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا پنڈلی سے کپڑا اٹھانے کی ضرورت نہیں اِنَّهٗ اس لیے کہ بیشک وہ جسے پانی گمان کر رہی ہے صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ محل ہے چکنا، سیدھا، ہموار، صاف ستھرا شیشے اور تلوار کی طرح۔ اسی سے امرد (بے ریش) ہے کہ اس کی داڑھی کے بال نہیں ہوتے، چہرہ صاف ستھرا ہوتا ہے اور نہایت ہی نرم و نازک ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: شجرۃ مرداء (وہ درخت جس کے پتے نہ ہوں) مِّنْ قَوَارِيْرَ شیشوں سے۔

حلِ لغات: القاموس میں ہے القوارير قادورۃ کی جمع ہے۔ وہ شے جس میں پانی وغیرہ قرار پکڑے یا مطلق شیشہ۔

یعنی یہ خالص شیشوں سے تیار کیا گیا ہے اس میں پانی نہیں ہے قَالَتْ جب بلقیس نے یہ حال دیکھا کہ سلیمان علیہ السلام صاحب معجزہ ہیں کہا رَبِّ اے میرے پروردگار! اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ بے شک میں نے سورج پرستی کر کے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ اب میں اسلام لائی ہوں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے، وہ پروردگار عالم ہے۔

نکتہ: بلقیس نے رب العالمین کی صفت کا اضافہ کر کے ظاہر کیا ہے کہ مجھے اس کی الوہیت کی مکمل معرفت نصیب ہو گئی ہے اور اب میں سمجھ گئی کہ صرف وہی عبادت کا مستحق ہے کیونکہ وہ جملہ عالم کا پروردگار ہے منجملہ ان کے یہی سورج بھی ہے جس کی میں پرستش کرتی رہی۔

اب معنیٰ یہ ہوا کہ اس نے کہا کہ اب میں توحید خالص کی اقراری ہوں اور سلیمان علیہ السلام کی فرمانبردار

ہوں اور ان کی اقتداء میں عبادتِ الٰہی بجالاؤں گی۔

ف : قیصری نے کہاکہ (بلقیس نے کہا) میں سلیمان علیہ السلام جیسا اسلام قبول کرچکی ہوں۔

یہ لفظ مع اس مع کی طرح ہے جو آیت :

یوم لا یخزی اللّٰہ النبی والذین اٰمنوا معہ۔

(اس دن اللہ تعالیٰ اپنے رسول علیہ السلام کے ساتھ اہلِ ایمان کو رُسوا نہ کرے گا)

میں ہے۔ یہ اس لیے کہ اہلِ ایمان عوام کا ایمان رسل کرام علیہم السلام کے ایمان کے مقارن نہیں ہوتا۔ ایسے ہی بلقیس کا ایمان سلیمان علیہ السلام کے ایمان کے مقارن نہ تھا۔ مطلب یہ کہ بلقیس نے کہا: میں اللہ اور آخرت پر اسی طرح ایمان لائی ہُوں جیسے سلیمان علیہ السلام ایمان لائے ہیں۔ جیسے وہ اللہ کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے ہیں میں بھی اسی طرح سرِ تسلیم خم کرتی ہُوں۔

ف : یہ مع بمعنے بعد ہے، جیسے ان مع العسر یسراً میں مع بمعنے بعد ہے۔

نکاحِ بلقیس بلقیس کے نکاح کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہاکہ سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کا نکاح یمن کے امراء کے ایک صاحبزادے سے کردیا یعنی ذوتبع کے ساتھ جو ہمدان کا بادشاہ تھا۔ اور تبع یمن کی لغت میں اس بادشاہ کو کہا جاتا ہے جس کی تابعداری کی جائے۔ وہ اس لیے کہ بلقیس کو جب سلیمان علیہ السلام نے اپنے ساتھ نکاح کے لیے کہا تو اس نے انکار کردیا اور کہا مجھ جیسی مردوں سے نکاح نہیں کرسکتی۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایاکہ نکاح بھی ہمارے دین کا ایک حکم ہے۔ کہا تو پھر میرا نکاح ذوتبع سے کردیجئے۔ اس پر آپ نے اس کا نکاح ذوتبع سے کرکے واپس یمن بھیج دیا اور یمن کی شاہی اس ذوتبع کے سپرد فرمائی۔ اس کے بعد آپ نے زوبعہ امیرِ جنّاتِ یمن کو بلاکر فرمایاکہ تمہارے ذمہ ذوتبع کی خدمت ضروری ہے وہ جو چاہے تم سے خدمت لے تم ان کی خدمات سرانجام دو۔ اسی لیے ذوتبع نے یمن میں بہترین صنعتیں تیار کرائیں اور مضبوط قلعے تیار کرائے جیسے صرواح ومرواح و بندۃ و ہنیدۃ وفلتوم۔ یہ وہ قلعے ہیں جنھیں یمن میں جنّات نے تیار کیا تھا لیکن آج وہ ویران و برباد ہوکر ناپید ہوچکے ہیں اور ذوتبع و بلقیس کی شاہی سلیمان علیہ السلام کے وصال کے بعد ختم ہوگئی۔ اس لیے کہ جب سلیمان علیہ السلام کا وصال ہُوا تو زوبعہ جنّات کے بادشاہ نے اعلان کیاکہ سلیمان علیہ السلام فوت ہوگئے ہیں اب جہاں چاہو چلے جاؤ۔ اس اعلان کے بعد جنّات ذوتبع کے حکم سے علیٰحدہ ہوکر منتشر ہوگئے۔

بلقیس کا نکاح سلیمان علیہ السلام کے ساتھ بعض علماء فرماتے ہیں کہ بلقیس کو سلیمان علیہ السلام خود اپنے نکاح میں لائے تھے۔ صاحبِ تاویلات نجمیہ اس پر دلیل قایم فرماتے ہیں کہ شیاطین نے بلقیس کے متعلق شبہ ڈالا تھاکہ وہ جنّیہ ہے اور اس کی پنڈلی پر بال ہیں

اسی لیے آپ نے اس کی پنڈلی کھلوانے کا سبب بنایا اور اس کی پنڈلی کو دیکھا اگر نکاح کا ارادہ نہ ہوتا تو آپ کبھی اس کی پنڈلی کو نہ دیکھتے (جبکہ شرعاً عورت کے اجزا کا دیکھنا ناجائز ہے اور نبی ہر ناجائز فعل کے ارتکاب سے معصوم ہوتا ہے۔

بال صفا دوائی کی ایجاد فتح الرحمٰن میں ہے کہ بلقیس کی پنڈلی پر واقعی بال تھے سلیمان علیہ السلام نے ان کے مونڈنے کا مشورہ انسانوں سے لیا تو انہوں نے کہا کہ اُسترے سے مونڈ لیے جائیں۔ آپ نے فرمایا: استرے سے خراش کا خطرہ ہے کوئی اور تجویز چاہیے۔ اس پر جنات کو بلایا گیا جنات نے نورہ (بال صفا دوائی) تیار کی اور کہا کہ حمام میں داخل ہو کر اسے پنڈلی پر لگائیں بال جھڑ جائیں گے۔ اس روز سے نورہ اور حمام ایجاد ہوئے۔

ف: بعض نے کہا: حمام خود حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کے ارد گرد تیار کرائے تھے جو باب اسباط کے باہر واقع تھے۔ روئے زمین پر سب سے پہلے آپ نے ہی حمام بنوائے۔

نکاحِ سلیمان بہ بلقیس اور محبّت کی کہانی روضۃ الاخبار میں ہے کہ جب سلیمان علیہ السلام نے بلقیس سے نکاح کیا تو جنات نے کہا کہ ہم آپ کو ایسا مکان تیار کر دیتے ہیں جو چاروں موسموں کے موافق ہو۔ ایسا مکان تیار کیا گیا اور اس میں حمام بھی تیار ہوا۔ سلیمان علیہ السلام کے نکاح کے بعد اس سے محبت شدید پیدا ہوگئی لیکن اسے اپنے ملک یمن (سبا) میں قیام رکھنے کا حکم فرمایا لیکن جنات سے تین قلعے تیار کرائے:

۱۔ ملحین
۲۔ غمدان
۳۔ بینون

وہ اتنے اُونچے تھے کہ مضبوطی اور حُسن و جمال میں دنیا بھر میں ان کی مثال نہ تھی لیکن آج بالکل ویران ہیں اور ان کے نشانات بھی نہیں ملتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ ہُود میں ان کے متعلق فرمایا: حصید (یعنی ریزہ ریزہ ہو کر ملیامیٹ ہو گئے) حضرت سلیمان علیہ السلام بلقیس کے پاس مہینہ میں ایک دفعہ تشریف لے جاتے اور تین دن اس کے ہاں ٹھہرتے۔ بلقیس سے آپ کا ایک بیٹا داؤد بن سلیمان بن داؤد پیدا ہوا لیکن سلیمان علیہ السلام کی زندگی میں ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔

سلیمانی شاہی کی مدّت سیّدنا سلیمان علیہ السلام تیرہ سال کی عمر میں مسند نشین ہُوئے اور ترپن سال کی عمر میں فوت ہُوئے۔ اس معنی پر آپ نے چالیس سال سلطنت سنبھالی۔ بعد وفات موسیٰ علیہ السلام ۵۷۵ھ کے اواخر میں وفات پائی۔ آپ کی وفات اور ہجرت شریفہ اسلامیہ کے

درمیان ۷۷۳ سال گزرے۔ آپ کی قبر مبارک بیت المقدس میں جیسمانیہ کے نزدیک ہے اور آپ کے والد گرامی کا مزار بھی یہیں ہے۔ بلقیس بھی سلیمان علیہ السلام کے وصال کے صرف ایک ماہ بعد فوت ہو گئی۔

اعجوبہ جب تدمر کی دیوار توڑی گئی تو اس پر بہتر (۷۲) حلہ جات پائے گئے جو مصبر اور مصطگی (دواؤں) سے باقی رکھے گئے تھے، پھر ان کے حسن وجمال کا کیا کہنا۔ اور پھر لطف یہ کہ وہ ہلانے سے بجتے تھے۔ بلقیس کی کی قبر کے سرہانے لکھا تھا:

"انا بلقیس صاحبة سلیمان بن داؤد خرب اللہ من یخرب بیتی۔"

(میں سلیمان بن داؤد علیہ السلام کی زوجہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس کے ملک کو برباد کرے جو میرے گھر کو اجاڑے)

یہ واقعہ مروان الحمار کے دور میں ہوا۔

۱ همه تخت وملکے پذیرد زوال
بجز ملک فرمانده لایزال

۲ جہان اے پسر ملک جاوید نیست
ز دنیا وفاداری امید نیست

۳ مکن تکیہ بر ملک وجاه وحشم
کہ پیش از تو بودست وبعد از توہم

۴ نہ لایق بود عشق با دلبرے
کہ ہر بامدادش بود شوہرے

۵ دریغا کہ بے ما بسے روزگار
بروید گل وبشگفد نوبہار

۶ مکن عمر ضایع بافسوس حیف
کہ فرصت عزیزست والوقت سیف

۷ عروسے بود نوبت ماتمت
گرت نیک روزے بود خاتمت

ترجمہ: (۱) ہمہ ملک وتخت زوال پذیر ہیں سوائے لایزال حاکم (اللہ تعالیٰ) کے۔
(۲) اے بیٹے! ملک دائمی نہیں، دنیا سے وفاداری کی امید نہیں۔ (باقی بر صفحہ ۴۳۲)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ○
قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○
قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ○ وَكَانَ فِي
الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ○ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا
بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ○
وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ
اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ○ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ
لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ○ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً
مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ○ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا
اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ○ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا
امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ○ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ○
قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○

ترجمہ : اور بے شک ہم نے ثمود کی طرف ان کے ہم قوم صالح کو بھیجا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو پھر وہ اس وقت دو گروہ ہو گئے آپس میں جھگڑنے والے۔ صالح نے فرمایا اے میری قوم! تم نیکی سے پہلے برائی کی عجلت کیوں کرتے ہو اللہ تعالیٰ سے مغفرت کیوں نہیں مانگتے شاید تم پر رحم کیا جائے بولے ہم نے تمھیں اور تیرے ساتھ والوں سے برا شگون لیا فرمایا تمہاری بدشگونی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے بلکہ تم لوگ آزمائش میں ڈالے گئے ہو اور شہر میں نو آدمی تھے کہ زمین میں فساد ڈالتے ہیں اور اصلاح نہیں چاہتے آپس میں قسم کھا کر بولے کہ ہم ضرور صالح (علیہ السلام) اور اس کے گھر والوں پر رات کو چھاپہ ماریں گے پھر اس کے وارث سے کہیں گے کہ اس کے گھر والوں کے قتل کے وقت ہم موجود نہ تھے اور بے شک ہم سچے ہیں اور انہوں نے ایک عجیب مکر کیا اور ہم نے خفیہ تدبیر فرمائی جس سے وہ

بالکل بے خبر رہے سو دیکھیے ان کے مکر کا انجام کیسا ہُوا ہم نے انہیں اوران کی ساری برادری کو تباہ کر ڈالا۔ سو یہ ہیں ان کے گھر گرے پڑے ہیں یہ انہیں ان کے ظلم کی سزا ملی بیشک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو علم رکھتے ہیں اور ہم نے ایمان داروں اور پرہیزگاروں کو نجات بخشی اور لوط (علیہ السلام) کو ہم نے بھیجا جبکہ اس نے اپنی برادری کو کہا تم بے حیائی پر آتے ہو حالانکہ تم سمجھدار ہو کیا عورتوں کو چھوڑ کر لڑکوں کے پاس شہوت سے جاتے ہو بلکہ تم جاہل لوگ ہو۔ تو اس کی برادری کا کوئی جواب نہ تھا مگر یہ کہ بولے کہ لوط کے خاندان کو اپنے علاقے سے نکال دو بیشک یہ لوگ تو بڑے پاکباز بننا چاہتے ہیں سو ہم نے اسے اور اس کے خاندان کو نجات بخشی مگر اس کی عورت کہ ہم نے اسے پیچھے رہ جانے والوں میں مقدر کر رکھا تھا اور ہم نے ان پر ایک قسم کا مینہ برسایا تو ڈرائے ہوؤں کا کیا ہی برا مینہ تھا فرمائیے تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور سلام ہو اس کے برگزیدہ بندوں پر کیا اللہ تعالیٰ بہتر ہے یا ان کے خود ساختہ شریک۔

(بقیہ صفحہ ۴۳۲)

(۳) ملک وجاہ وحشم پر بھروسا مت کر اس لیے کہ تجھ سے پہلے بھی بہت ہوئے اور بعد کو بھی بہت آئیں گے۔

(۴) اس محبوب سے محبت اچھی نہیں جس کا ہر صبح نیا شوہر ہو۔

(۵) افسوس ہے کہ ہمارے بغیر زمانے میں بہت سے پھول اُگیں گے اور نئی بہاریں آئیں گی۔

(۶) عمر ضائع نہ کیجئے افسوس وحیف ہے کہ فرصت عزیز ہے اور وقت تلوار ہے۔

(۷) مرتے وقت تیرا خاتمہ اچھا ہو گیا تو تجھے ایسی موت پر مبارک ہو۔

تفسیر عالمانہ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی ثَمُوۡدَ اور ہم نے ثمود کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ یہ عرب کا ایک قبیلہ تھا جو بُت پرستی میں مبتلا تھا اَخَاهُمۡ ان کے اس نسب سے صدق وامانت میں معروف تھا صٰلِحًا صالح علیہ السلام کو ان کا ترجمہ وتعارف پہلے بیان ہو چکا ہے اَنِ یہ مصدریہ ہے یہ در اصل بَاَنۡ تھا۔ یہ کہ اعۡبُدُوا اللّٰهَ اللہ کی عبادت کرو اس کا کوئی شریک نہیں فَاِذَا هُمۡ فَرِیۡقٰنِ پس اس پر ان کے دو گروہ ہو گئے یَخۡتَصِمُوۡنَ ۝ آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے اختصام بمعنی ایک دوسرے سے دست بگریبان ہونا یعنی ایک گروہ بدستور کافر رہا یعنی صالح علیہ السلام کے اعلانِ نبوت پر ثمود کے دو گروہ ہو گئے ایک مسلمان ہو گیا دوسرا کافر۔

ف : کاشفی مرحوم نے لکھا کہ ان کے جھگڑے کی تفصیل سورۂ اعراف میں بیان ہو چکی ہے۔ مثلاً :
قال الملأ الذی استکبروا من قومه للذین استضعفوا۔ (قوم کے لیڈروں نے کمزوروں سے کہا الخ)

قَالَ صالح علیہ السلام نے کافروں سے فرمایا یٰقَوْمِ اے میری قوم! لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ کیوں سزا کی جلدی کرتے ہو۔ مثلاً وہ کہتے تھے :
ائتنا بما تعدنا (لائے وہ جس سے تم ڈراتے ہو)

حلِ لغات : الاستعجال بمعنے وقت سے پہلے کسی شے کا مطالبہ کرنا۔ لِمَ دراصل لِمَا (استفہام) ہے۔
قَبْلَ الْحَسَنَةِ توبہ سے پہلے۔ تم توبہ کو نزولِ عذاب سے موخر کر رہے ہو۔ وہ اپنی جہالت و غوایت کی وجہ سے کہتے تھے کہ جب عذاب آئے گا تو ہم توبہ کر لیں گے ورنہ جس حال میں ہیں یہی اچھا ہے۔

ف : کشف الاسرار میں ہے کہ قبل میں تقدم زمانی مراد نہیں بلکہ تقدم رتبی و آزمائشی مراد ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے کوئی کہے :
صحۃ البدن قبل کثرۃ المال۔
(کثرتِ مال سے قبل صحۃ البدن ضروری ہے)

لَوْلَا یہ حرف تحضیص بمعنے ھلا ہے تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ تم نزولِ عذاب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے بخشش کیوں نہیں مانگتے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں توبہ کیوں نہیں کرتے لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ امید کرو کہ تم پر رحم کیا جائے اور تمہاری توبہ قبول ہو جائے تو عذاب سے بچ جاؤ گے کیونکہ نزولِ عذاب کے وقت قبولِ توبہ کا امکان نہیں رہتا ہ

تو پیش از عقوبت در عفو کوب
کہ سودے ندارد فغاں زیر چوب

ترجمہ : سزا سے پہلے ہی معافی کا دروازہ کھٹکھٹا اس لیے کہ جب ڈنڈا سر پر برسا تو اس وقت فریاد کام نہ آئے گی۔

قَالُوا اطَّيَّرْنَا انہوں نے کہا ہم نے بُری فال لی ہے۔ یہ دراصل تطیّرنا تھا تطیّر بمعنے بدفال لینا۔

طریقۂ فال ان کے فال لینے کا ایک طریقہ تھا کہ اگر سفر کو جاتے وقت کسی پرندے کو دائیں جانب اڑتا دیکھتے تو سمجھتے اس سے ان کا فائدہ ہے اگر وہ بائیں طرف گزر جائے تو سمجھتے کہ اس سے نقصان ہو گا۔
یُوں انہوں نے تقدیرِ ربانی کی بجائے نفع و نقصان کی نسبت پرندے کی طرف کر رکھی تھی۔ جو فعل کسی شے کے سبب

سے ہوتا یا کسی بندے سے ہوتا تو وہ اس سے نیک و بد فالی پکڑتے۔

ف : فتح الرحمٰن اور الکواشی میں ہے کہ سانح وہ پرندہ جو دائیں جانب اُڑے تو اسے تیر مار کر گرایا جا سکتا ہے اسی سہولت کی بنا پر اس سے نیک فالی لیتے تھے۔ اور البارح وہ پرندہ جو بائیں جانب اڑتا چونکہ اسے تیر مار کر گرانا مشکل ہو جاتا ہے اس لیے اس سے بد فال پکڑتے اس کے بعد ہر بد فالی کو تطیّر کہنے لگے۔

القاموس میں البارح وہ پرندہ جو کسی کی دائیں جانب سے بائیں جانب کو جائے۔ مثلاً کہا جاتا ہے،

برح الظبی بروحاً یعنی ہرنی پیٹھ پھیر کر تیری بائیں جانب سے نکل گئی۔

اور سنح۔ سنوحا، برح کی نقیض ہے اور کہا جاتا ہے،

لی بالسنح بعد البارح۔ یعنی مجھے منحوس کے بعد مبارک ملا۔

ف : کشف الاسرار میں ہے کہ یہ عرب کے اعتقادات تھے جو بعض وحوش وطیور میں ایسی فالیں پاتے تھے مثلاً جب کوئی پرندہ ایک جانب سے بولے اور دوسری جانب کو چھوڑ دے تو کہتے ہم بلاؤں اور مصیبتوں میں مبتلا ہوں گے۔

حدیث شریف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی باتوں سے روکا ہے، فرمایا:
اقروا الطیر علی مکناتہا۔

(پرندوں کو اپنے گھونسلوں میں رہنے دو)

کیونکہ یہ صرف اوہام ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

ف : المکنات بمعنے ضبہ کا انڈا۔ اس کا واحد مکنۃ ہے۔

قولِ ابنِ عباس حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک پرندہ بولا۔ کسی نے کہا خیر ہو گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

لاخیر ولا شر (اس میں نہ خیر ہے نہ شر) ؎

لا تنطقن بما کرھت فربما
نطق اللسان بحادث فیکون

ترجمہ : مکروہ کلمہ منہ سے نہ نکالو اس لیے کہ کبھی زبان سے ایسا کلمہ نکل جاتا ہے جو ہو کر رہتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:
انّ اللہ یحب الفال ویکرہ الطیرۃ۔

(بے شک اللہ تعالیٰ فال کو پسند فرماتا اور بد فالی کو ناپسند فرماتا ہے)

شرح الحدیث ابن الملک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اہلِ جاہلیت کی عادت تھی کہ جب کوئی کسی کے ہاں کسی کام کے لیے جانا چاہتا اور بوقتِ روانگی اس کی بائیں جانب پرندہ یا کوئی شے گزرتی تو وہ اسے نحوست سمجھ کر لوٹ آتا اسے وہ طیرہ سے تعبیر کرتے۔

بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ اب آیت کا معنیٰ یہ ہُوا کہ ہم نے تمہیں اور تیرے دین کے ساتھیوں کو منحوس سمجھا ہے کیونکہ تمہاری وجہ سے ہم پر مسلسل مصائب آ رہے ہیں وہ اس لیے کہ جب سے تم نے دعوتِ ارشاد کا سلسلہ شروع کیا ہے ہم اس روز سے مصائب و شدائد میں مبتلا ہیں۔

ف: جب وہ قحط کے شکار ہوتے تو کہتے اے صالح (علیہ السلام)! یہ تیری اور تیرے ساتھیوں کی نحوست ہے (معاذ اللہ) ایسے ہی قومِ موسیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اور اہل انطاکیہ نے اپنے رسل کرام علیٰ نبینا وعلیہم السلام کو کہا تھا۔

قَالَ طٰٓئِرُكُمْ صالح علیہ السلام نے فرمایا جس سبب سے تمہارے ہاں شر آیا ہے عِنْدَ اللّٰهِ وہ اللہ تعالیٰ سے ہے یعنی اس کی تقدیر سے ہے یا تمہارے ان اعمال کی شامت ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں لکھے ہوئے ہیں۔

نکتہ: تقدیر کو طائر سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس طرح پرندہ تیز اڑتا ہے ویسے ہی تقدیر تیزی سے گھرتی ہے اسی لئے مشہور ہے کہ:

لا شئ اسرع من قضاء محتوم۔

(تقدیر مبرم سے کوئی شے تیز تر نہیں) کما فی فتح الرحمٰن۔

یعنی یہ خیر و شر منجانب اللہ ہیں ان کا سبب تو تمہارے گناہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں لکھے ہوئے ہیں اور اس کا حکم ازلی ابدی ہے میری وجہ سے تبدیل نہیں ہوگا ؎

قلم بہ نیک و بد خلق در ازل رفتست
بگفت و گوے خلائق گہ نخواہد شد

ترجمہ: مخلوق کی نیک و بُری تقدیر ازل سے لکھی جا چکی ہے اب مخلوق کی باتوں سے تبدیل نہ ہوگی۔

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ۝ بلکہ تم خیر و شر کے نزول سے آزمائش کیے جا رہے ہو تاکہ کبھی دولت دے تو کبھی غربت اور کبھی سہولت دے تو کبھی مشقت / یا تفتنون بمعنے تعذبون ہے یعنی عذاب دئے جاؤ گے اور یہ اعراض ان کی بد فالی کے قول سے ہے کہ واقعی یہ جو تم مصائب میں گھر گئے ہو یہ بد فالی سے نہیں بلکہ تمہارے

اعمال کی شامت ہے۔ اس کی مثال وُہ ہے جو اہلِ عرب کہتے ہیں ،

فتنت الذهب بالنار ۔

(میں نے سونے کو آگ سے پرکھا) (تاکہ معلوم ہوجائے کہ یہ سونا کھرا ہے یا کھوٹا)

ازالۂ وہم اللہ تعالیٰ کا امتحان لینا بایں معنیٰ ہے کہ ظاہر ہوجائے ان میں کون کھرا ہے اور کون کھوٹا۔ بفضلہٖ تعالیٰ انبیاء و اولیاء و صلحاء کا کھراپن واضح ہے۔ مثلاً ایوب علیہ السلام کو آزمایا گیا تو خلقِ خدا کے سامنے ان کے درجات اور قربِ الٰہی کے حالات واضح ہوگئے اور کفار و منافقین اور فاسقین کا کھوٹا ہونا بھی واضح ہے۔

حکایت ایک عورت کی بیماری نے طول پکڑا۔ صبر نہ کرسکی۔ بالآخر کافر ہوگئی۔ اسی لیے کہا جاتا ہے :
عند الامتحان یکرم الرجل او یهان ۔

(امتحان سے یا تو انسان کی عزت افزائی ہوتی ہے یا ذلت و خواری) ؎

خوش بود گر محک تجربہ آید بمیان
تا سیہ روئے شود ہرکہ در وغش باشد

ترجمہ : اچھا ہے اگر کسوٹی پر پرکھا جائے تاکہ جھوٹے کا منہ کالا ہو۔

ف : ہر آزمائش بصورت مرغوب ہو یا مکروہ رحمتِ الٰہی ہے اس لیے کہ اس طرح سے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو قریب لانا چاہتا ہے اگر بندہ اسے نہ چاہے تو اس سے ناراض ہوجاتا ہے پھر اس کی نہ دنیا میں خیر ہے نہ آخرت میں۔ جیسا کہ یہ طریقہ امم سابقہ سے تا قیامت چلتا جائے گا۔

اولیاء اللہ کی نشانی اللہ والوں کے لیے نعمت و مشقت دونوں برابر ہیں کیونکہ وُہ سمجھتے ہیں یہ دونوں اللہ تعالیٰ سے آتی ہیں اسی لیے ان کا ہر لمحہ خوشی سے گزرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہیں بدفالی نہیں کرتے۔ وُہ ہر وقت حمدِ الٰہی میں لگے رہتے ہیں اور وہ کسی بھی دُکھ تکلیف پر جزع فزع نہیں کرتے۔

گناہ کی مصیبت گناہ کی مصیبت تمام مصائب کا سر ہے۔ ایسے ہی باطنی مصیبت ظاہری مصیبت سے سخت تر ہے۔ حضرت فارض رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ع

وکل بلا ایوب بعض بلیتی

ترجمہ : ایوب علیہ السلام کی تمام مصیبت میری مصیبت کا ایک حصہ ہے۔

حلِ اشکال (چونکہ بظاہر یہ مصرع نبی علیہ السلام کی بے ادبی پر دلالت کرتا ہے اسی لیے اس کی توضیح فرمائی کہ) اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ میرا مرض روحانی ہے اور ایوب علیہ السلام جسمانی مریض تھے پھر انہیں تو نبوت کی برکت بھی حاصل تھی اور میں بیچارہ کون۔ اس لیے میرا مرض ان کی بیماری سے

شدید تر ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے توفیق و عافیت کا سوال کرتے ہیں۔

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ اور تھے شہر میں نو شخص / المدینۃ سے یہاں پہ الحجر (بکسر الحاء المهملة) مراد ہے۔ یہی ثمود کے علاقے تھے۔ اور وہ حجاز و شام کے درمیان واقع ہے۔ اور رھط سے اشخاص مراد ہیں اسی لیے یہ تسعۃ کی تمیز واقع ہے لفظاً بلکہ معنیً، کیونکہ تین سے نو عدد تک کی تمیز جمع اور مجرور ہوتی ہے۔ اور رھط لفظاً مفرد ہے لیکن معنیً جمع۔

رھط و نفر کا فرق رھط تین یا سات سے دس تک، لیکن ان میں عورت نہ ہو۔ اور نفر تین سے نو تک (مطلقاً)۔

نو اشخاص کے اسماء: بقول وہب رضی اللہ عنہ اُن نو اشخاص کے اسماء یہ ہیں:

(۱) ہذیل بن عبد الرب

(۲) غنم بن غنم

(۳) یاب بن مہرج

(۴) مصدع بن مہرج

(۵) عمیر بن کردیہ

(۶) عاصم بن مخزمہ

(۷) سبیط بن صدقہ

(۸) سمعان بن صفی

(۹) قدار بن سالف

اور کشف الاسرار میں ہے کہ ان کے نام یہ ہیں:

(۱) قدار بن سالف

(۲) مصدع بن دہر

(۳) اسلم

(۴) رھمی

(۵) رھیم

(۶) دعمی

(۷) دعیم
(۸) قبال
(۹) صداف

یہی وہ نو بدبخت ہیں جنہوں نے اونٹنی کو مارنے کی کوشش کی اور جو قوم صالح میں بڑے سرکش انسان تھے حالانکہ ان کے اسلاف قوم کے برگزیدہ لوگ تھے۔

ربط : اب ان نو اشخاص کے اوصاف بتاتے ہیں کہ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وہ حجر کے علاقے میں جرائم کے ارتکاب سے فساد پھیلاتے تھے۔

ف : الارشاد میں ہے کہ المدینۃ کی بجائے الارض فرمایا تاکہ معلوم ہو کہ ان کا فساد صرف اسی شہر تک محدود نہ تھا بلکہ تمام علاقہ ان کے شر و فساد کی لپیٹ میں تھا اس سے معلوم ہوا کہ یہاں الارض سے مطلقاً زمین مراد نہیں بلکہ ایک مخصوص علاقہ مراد ہے۔

وَلَا یُصْلِحُوْنَ ۝ اور وہ کسی قسم کی اصلاح کے روادار نہ تھے حرف عطف سے اشارہ کر دیا کہ ان کا فساد ہی فساد تھا اصلاح کا نام و نشان اس میں نہیں تھا قَالُوْا (یہ جملہ مستانفہ ہے ان کے فساد کے بعض کارناموں کا بیان ہے) یہ اس وقت انہوں نے کہا جب صالح علیہ السلام نے انہیں عذابِ الٰہی سنایا کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی اونٹنی کو قتل کیا تو تم پر تین دنوں کے اندر عذاب آ جائے گا اور تمہاری شکلیں بھی بدل جائیں گی اس پر ان کی مجلس شوریٰ کے بعض ممبروں نے کہا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰہِ اللہ کی قسمیں کھاؤ (اہلِ عرب کہتے ہیں: اقسم ای حلف۔ یعنی قسم کھائی۔ یہ دراصل القسامہ سے ہے۔ القسامہ وہ قسمیں ہیں جو متہمین پر خون کی دیت میں تقسیم کی جاتی ہیں پھر ہر قسم کی قسم کو کہا جانے لگا۔ یہ امر ہے اور قالوا کا مقولہ ہے یا ماضی کا صیغہ ہے واؤ سے حال ہے بشرط حذف قد کے۔) اب معنی یہ ہوا کہ درانحالیکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھائیں لَنُبَیِّتَنَّہٗ وَاَھْلَہٗ ہم صالح علیہ السلام اور اس کے گھر والوں کے ہاں رات کے وقت اچانک دھاوا بول کر اسے اور اس کے گھر والوں کو قتل کر دیں گے (التاج میں ہے کہ التبییت بمعنے رات کو اچانک دشمن پر دھاوا بولنا) ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِیِّہٖ پھر صالح علیہ السلام کے متولیوں کو کہیں گے اگر وہ ہم سے صالح علیہ السلام کے قتل کے بارے میں پوچھیں گے تو پھر ہم کہیں گے مَا شَھِدْنَا مَھْلِکَ اَھْلِہٖ ہم تو ان کی اور ان کے اہل کی ہلاکت میں موجود بھی نہ تھے پھر ہم سے سوال کیوں۔ اس معنی پر مہلک مصدر ہے یا معنیٰ یہ ہے کہ ان کی ہلاکت کے وقت موجود نہ تھے اس وقت یہ ظرف زمان ہوگا۔ یا معنیٰ یہ ہے کہ ان کی ہلاکت کی جگہ پر موجود نہ تھے اس معنی پر یہ ظرف مکان ہوگا وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ اور یقیناً ہم سچے ہیں۔ یہ مقولہ کا آخری حصہ ہے یعنی ہم کہیں گے کہ ہم اپنے دعویٰ میں سچے ہیں یہ ایسے ہے جیسے یعقوب علیہ السلام کو

بیٹوں نے کہا ؛

وما انت بمؤمن لنا ولوکنا صادقین ۔

(اور تم نہیں مانو گے اگرچہ ہم سچے ہیں)

وَمَكَرُوْا مَكْرًا اور انہوں نے اسی طریقہ سے مکر کیا ۔ المکر کسی کو حیلہ سے مقصد سے پھیرنا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا اور ہم نے ان کے اسی طریق سے ہی انہیں تباہ کر ڈالا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ اور انھیں خبر تک نہ ہوئی سہ

ہر آنکہ تخم بدی کشت و چشم نیکی داشت

دماغ بیہدہ پخت و خیال باطل بست

ترجمہ ؛ جو بُرائی کا بیج ڈال کر نیکی کی امید رکھتا ہے اس نے بیہودگی اور باطل خیالی کی۔

فَانْظُرْ پس اے حبیب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) غور و فکر فرمائیے اس میں کہ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ان کے مکر کا انجام کیا ہُوا یعنی ان کا انجام کس حال پر واقع ہوا ۔ وُہ یُوں ہُوا کہ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ بے شک ہم نے انہیں تباہ کر ڈالا ۔

حلِ لغات ؛ التدمیر کے معنے جڑ اکھاڑ کر کسی کو تباہ کر ڈالنا ۔

وَقَوْمَهُمْ اور ان کی وہ قوم جو ان کے ساتھ رات کے وقت صالح علیہ السلام پر حملہ آور ہُوئی اَجْمَعِيْنَ ○ سب کو یہاں تک ان کا ایک فرد بھی ہمارے عذاب سے نہ بچ سکا ۔

ثمود کی تباہی کا واقعہ جب صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو کافروں نے قتل کر ڈالا تو آپ نے انہیں فرمایا اب صرف تین دن تک تم زندہ رہ سکو گے اس کے بعد عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے اور صالح علیہ السلام کی مسجد حجر (شہر) کے ایک کونے میں تھی جس میں آپ نماز وغیرہ ادا کرتے ۔ کافروں نے کہا رات کو چل کر صالح علیہ السلام کو قتل کر دیں اس کے بعد اس کی ماننے والی برادری کو، معلوم ہو کہ تین ایام کے اندر اندر ہم تباہ ہوئے یا وہ ۔ چنانچہ یہ طے کر کے رات کے وقت وہ لوگ صالح علیہ السلام کو شہید کرنے کے لیے آرہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بھاری پتھر کھڑا کیا یہ لوگ غار میں چھپے تو وہ پتھر غار کے منہ پر آگرا وہ غار میں بند ہو گئے اس طرح وہ یہاں تباہ ہوئے ۔ قوم پریشان رہی کہ وہ کہاں گئے ۔ ان تین ایام کے اندر ان کو بھی چنگھاڑ نے تباہ و برباد کر دیا ۔

ف ؛ فقیر (صاحبِ روح البیان قدس سرہٗ) کہتا ہے کہ ان کی تباہی و بربادی کی خبر کی تطبیق یوں ہوگی کہ ان کا ارادہ ہُوا کہ وہ صالح علیہ السلام کو تباہ و برباد کریں اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہُوا ان کو تباہ و برباد کرنے کا۔ ان کی قوم کو چنگھاڑ نے تباہ و برباد کر دیا کیونکہ وہ فساد برپا کرتے وقت کرخت آوازے کستے ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی

جنس کی سزا میں مبتلا فرمایا۔

فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ پس یہ ان کے گھر ہیں خَاوِيَةً گرے پڑے ہیں اور اپنے مکینوں سے خالی ہیں۔

حلِ لغات : یہ خوی البطن سے ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب پیٹ خالی ہوجائے۔ یا خوی النجم سے ہے بمعنے ستارہ گرا۔

اب معنیٰ یہ ہُوا کہ آج کل حجر (علاقہ) کے محلات دیکھو تو خالی اور خراب ہوئے پڑے ہیں بِمَا ظَلَمُوا بسبب ان کے ظلم مذکورہ و دیگر گندے کرتوتوں کے جیسے شرک وغیرہ۔

تفسیر صُوفیانہ حضرت سہل (تستری) رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت میں بیوت سے قلوب مراد ہیں کہ یہ بعض ذکرِ الٰہی سے معمور ہوتے ہیں اور بعض غفلت کی وجہ سے تباہ و برباد۔ جس دل میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر القاء فرمایا وہ ظلم سے بچ گیا۔

تفسیر عالمانہ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ بیشک بیان مذکور مثلاً ان کے ظلم کی وجہ سے ان کی عجیب وغریب تباہی لَآيَةً البتہ عبرت عظیم ہے لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ ایسے لوگوں کے لیے جو علم سے موصوف ہیں اور اس سے نصیحت پاتے ہیں یعنی اے محبوب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ! میں تیری قوم سے بھی یہی کرسکتا ہوں لیکن ان کے لیے ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت آگیا تو پھر ان کی خیر نہیں۔ (کذا فی کشف الاسرار) وَأَنْجَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا اور ہم نے ایمان والوں کو نجات دی۔ یعنی صالح علیہ السلام اور ان کے دیگر اہلِ ایمان ساتھیوں کو وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝ اور وہ کفر و معاصی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچتے تھے اسی لیے وہ دائمی نجات کے لیے مخصوص ہُوئے اور کل چار ہزار افراد تھے انہیں صالح علیہ السلام حضرموت کی طرف لے گئے۔

ف : یمن میں ایک شہر کا نام حضرموت ہے۔ اس نام سے اس لیے موصوف ہے کہ صالح علیہ السلام اس میں داخل ہوتے ہی فوت ہوگئے۔ اس مناسبت سے اس کا نام حضرموت پڑگیا۔

ف : اس میں اشارہ ہے کہ ظلم کے علاقہ سے عدل کے علاقہ کی طرف ہجرت کرنا واجب ہے بالخصوص ان ظالموں سے دامن بچا کر چلا جانا ضروری ہے جو بلا وجہ مار دھاڑ کرتے رہتے ہیں۔ اسی لیے کہ جہاں ظلم ہوتا ہے وہ علاقہ تاریکی کی لپیٹ میں آجاتا ہے وہاں عبادت کو کبھی نور نصیب نہ ہوگا جہاں ظلم ہوتا ہو وہاں سے ہجرت کرکے ایسی جگہ چلا جانا ضروری ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہوتی ہو۔

تفسیر صُوفیانہ قالب انسانی یعنی عناصر اربعہ اور حواسِ خمسہ کل نو ہُوئے۔ جب یہ ظالم مفسد فساد ڈالنے لگیں اور صالح قلب پر غلبہ کا ارادہ رکھیں کیونکہ قلب اور ان نو اشخاص (اعضائے انسانی) کو آپس میں ضد ہے کیونکہ قلب انہیں عبودیت اور ترکِ شہوات کی دعوت دیتا ہے اور یہ اسے نظارۂ دنیا اور عقبیٰ

سے اعراض اور خدمت مولیٰ سے بالکل فارغ بیٹھنے کی دعوت دیتے ہیں جب کسی کا قلب الہام ربانی سے مؤید ہو تو وہ کبھی حظوظ ظاہرہ و باطنہ کی طرف مائل نہ ہوگا بلکہ وُہ دل تمام اعضاء پر غالب رہے گا اس کے بعد اسے نجات حاصل ہُوئی اور وہ جو اس کے نواشخاص بالمقابل تھے وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے اور ان کی جملہ آفات و بلیات بھی ملیا میٹ ہو جائیں گی اس کے بعد دل اور وہ اعضا جو ان حواس خمسہ کے رہنے کی جگہ سے خالی ہو جائیں گے ۔ پھر اس میں نہ وہ خواص نہ وہ آفات ۔ فنا کے بعد پھر کبھی زندہ نہ ہو سکیں گے ۔ خوب کہا جس نے کہا :

الفانی لا یرد الی اوصافہ ۔

(فانی اپنے بقا والے اوصاف کی طرف نہیں لوٹ سکے گا)

یہی وجہ ہے کہ اولیاء اللہ کو ظہور طبیعت کا خوف نہیں ہوتا اس لیے کہ طبیعت نفس اور شیطان دونوں دشمن ہیں اور دشمن کا کام بھی یہی ہے کہ وہ دھوکا اور مکر و فریب کرے لیکن ان کی عداوت محبت سے تبدیل ہو جائے تو پھر کاہے کا بغض اور کاہے کی عداوت ۔

ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں نفس و شیطان کے مکر و فریب سے بچائے اور ہر دشمن کی جملہ حوادث و تکالیف مطلقاً سے نجات بخشے ۔

تفسیر عالمانہ وَلُوْطًا اور ہم نے لُوط بن ہاران علیہ السلام کو بھیجا اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖ جب انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا یہ ارسال کی ظرف ہے اس سے وہ امر ممتد مراد ہے جو ارسال اور اس کے درمیان افعال و اقوال گزرے ۔ بعض نے کہا کہ لوطاً کا منصوب ہونا اذکر فعل محذوف کے مفعول ہونے کی وجہ سے ہے اور اذ اسی سے بدل ہے ۔ یعنی اے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ! یاد کیجئے جب قوم لوط علیہ السلام کو علی وجہ الانکار فرمایا اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ کیا تم فاحش فعل کرتے ہو ؟

حل لغات : فاحشہ تمام قبائح و شنائع اقوال و افعال کا سرتاج ۔ یہاں پر لواطت مراد ہے یعنی دُبر میں وطی کرنا ۔

اب معنیٰ یہ ہُوا کہ اے خدا کے بندو ! کیا انتہائی قبیح کام کرتے ہو وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝ حالانکہ تم بڑے باسمجھ ہو ۔ یہ بصر القلب سے ہے بمعنے علم یعنی وہ قوت مدرکہ جو قلب کو حاصل ہے جسے بصیرت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کبھی اس پر بصر کا بھی اطلاق ہوتا ہے لیکن عام اعضاء کے لیے بصیرت کا اطلاق نہیں ہوتا ۔

(**لطیفہ** : اندھے کو بصیر کہا جاتا ہے یہ ع

بر عکس زنگی نام نہند کافور

کے قبیل سے ہے یا بصیرت اہلِ قوت کو کہا جاتا ہے)

ایسی قوت قلب کو حاصل ہے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ تم یقیناً جانتے ہو کہ لواطت بہت بُرا فعل ہے اور جان بُوجھ کر قبیح فعل کا ارتکاب انتہائی برا ہے۔ اسی لیے ایک عربی مقولہ مشہور ہے:

فساد کبیر جاهل متنسك و عالم متهتك۔

(یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے کہ جاہل عابد ہو اور عالم بے عمل)

یا یہ نظر العین سے ہے یعنی اس قبیح فعل کو دیکھ کر کرتے ہو کہ ایک دوسرے کے سامنے ایسے قبیح فعل کا ارتکاب کرتے ہو اور یہ قبیح ترین عمل ہے اَئِنَّكُمْ کیا تم لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ البتہ آتے ہو مردوں کے پاس، یہ ان کے فحش کے ارتکاب کا بیان ہے شَهْوَةً بطور شہوت کے۔ یہ اس فعل کی مزید قباحت کے ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ جماع اولاد بڑھانے کے لیے ہوتا ہے نہ کہ آتشِ شہوت بڑھانے کے لیے۔ شہوۃ کا اصل معنی یہ ہے کہ نفس کا اپنی خواہش کی طرف مائل ہونا مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ عورتوں کے سوا، یعنی تمہارا یہ حال ہے کہ تم اس فعل میں عورتوں سے تجاوز کرتے ہو حالانکہ شہوت کا محل تو یہی ہیں بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ بلکہ تم جاہل لوگ ہو کہ اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کر رہے ہو اس لیے کہ جو اپنے پڑھے کے مطابق عمل نہ کرے بلکہ جاہلانہ عمل کرے تو اس میں اور جاہل میں کوئی فرق نہیں۔ اور تجھلون' قوم کی صفت ہے اور چونکہ قوم بمنزلہ مخاطب کے ہے اسی لیے اس کی صفت بھی صیغہ مخاطب کے ساتھ لائی گئی ہے۔

تم الجزء التاسع عشر بمن الله وكرمه (اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے انیسواں پارہ ختم ہوگیا)

انتباہ (صاحبِ روح البیان علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ کے ہاں یہاں انیسواں پارہ ختم ہوگیا لیکن ہمارے یہاں پاک و ہند میں ابھی انیسواں پارہ ختم نہیں ہوا بلکہ ابھی کچھ آیات باقی ہیں جو یہ ہیں:)

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ تو نہ تھا ان کی قوم کا جواب۔ الجواب کا منصوب ہونا کان کی خبر ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس کا اسم اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا ہے، مگر ان کا ایک دوسرے کو کہنا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ لوط اور اس کے تابعداروں کو نکالو مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اپنے شہر سے۔ اس سے سدوم مراد ہے اِنَّهُمْ اُنَاسٌ انس کی جمع ہے اور الناس اسی کا مخفف ہے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ یہ ایسے لوگ ہیں يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝ ہمارے افعال سے بچ بچاؤ کرتے ہیں یا پلیدیوں سے، یا ہمارے افعال کو پلیدیوں سے تعبیر کرتے ہیں۔

ف: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں انہوں نے بطریق استہزاء کہا تھا یہ ان کا وہ جواب ہے جو لوط علیہ السلام نے آخری مواعظ ونصائح فرمائے اس کے بعد پھر کوئی وعظ و نصیحت نہ فرمائی۔ اور یہ جواب بھی ان کا آخری تھا کہ اس کے بعد انہوں نے اور کوئی جواب نہ دیا۔

فَاَنْجَيْنٰهُ پس ہم نے لوط علیہ السلام کو نجات دی وَاَهْلَهٗٓ اور اس کے گھر والوں کو۔

یعنی اس کے اپنے رشتہ دار اور دوسرے لوگ اس کو ماننے والے تھے بایں طور کہ ہم نے حکم دیا کہ اس شہر سے ہجرت کرجاؤ اِلَّا امْرَاَتَہٗ مگر اس کی عورت جو کافرہ تھی جس کا نام بو اہلہ تھا اسے نجات نصیب نہ ہوئی قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝ ہم نے اسے پیچھے رہنے والوں میں مقدر کر دیا کہ وہ بھی ان کی طرح عذاب میں مبتلا ہو۔ اسی لیے وہ اس شہر سے لُوط علیہ السلام کے ساتھ نہ گئی یا ہجرت کر کے چلی لیکن راستہ میں پتھر سے مسخ ہوگئی جیسا کہ گزر آیا۔

حلِ لغات: غبر غبورا بمعنے بقی۔ اس کا مفصل بیان سورۂ شعراء کے اواخر میں ہے۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ ہم نے ان کے شہروں کو اُلٹنے کے بعد ان کو اوپر سے نیچے کر کے بارش برسائی یا ان کے اکے دُکے اور جو سفروں میں تھے ان پر غیر معہود بارش ہوئی یعنی ان پر پتھر برسائے گئے فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝ پس بُری تھی وہ بارش جس سے ان کو ڈرایا گیا جیسا کہ مخفی نہیں ہے اس کا مخصوص بالذم الحجارۃ ہے۔

مسئلہ: ابنِ عطیہ نے کہا کہ بعض فقہاء کرام نے اس آیت سے لوطی کو سنگسار کرنے کا استنباط کیا ہے یعنی لواطت کو انہوں نے زنا کا حکم دیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود انہیں اس فعلِ بد کی یہی سزا دی۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں فاعل و مفعول دونوں کو سنگسار کیا جائے وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔

امام احمد و امام شافعی رحمہا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لواطت کا حکم زنا جیسا ہے۔ اگر شادی شدہ ہوں تو سنگسار کرو ورنہ کوڑے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے تعزیر کا حکم فرمایا اور فرمایا کہ لوطی پر حد نہیں۔

صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ نے خلاف کرتے ہوئے فرمایا کہ لوطی کا حکم زنا سے ملحق ہے۔

نکتہ حنفیہ: شرح الاکمل میں ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب میں اس فعل کے استعظام کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ وہ کتنا ہی قبیح سہی لیکن قتل و زنا جیسا نہیں اسے سختی سے دبایا جائے اور اس کا علاج تعزیر کافی ہے جیسے یمین غموس کا قصہ ہے کہ اس میں کفارہ نہیں کیونکہ یہ عظیم گناہ ہے اس لیے صرف کفارہ سے اس کی کمی پُوری نہیں ہو سکے گی۔

نکتہ از صاحبِ رُوح البیان فقیر (صاحبِ روح البیان رحمہ اللہ) کہتا ہے وہ لوگ رجم (سنگسار ہونے) سے اس لیے معذّب ہوئے کہ ان کا فعل بہت بُرا تھا کیونکہ لواطت منہیات میں فاحش ترین فعل ہے۔ ان کے شہر کو اس لیے الٹا کیا گیا کیونکہ وہ لواطت کے وقت لڑکوں کو الٹا کرتے تھے۔ اس مناسبت سے انہیں مناسب سزا ملی ؎

نہ ہرگز شنیدیم در عمر خویش   کہ بد مرد را نیک آمد بہ پیش

ترجمہ : ہم نے زندگی بھر یہ نہیں سُنا کہ بُرے مرد کو بھلائی حاصل ہُوئی۔

تفسیر صُوفیانہ اس میں اشارہ ہے کہ بُرائی سیدھے راستے سے بھٹکا دیتی ہے۔ اس کی ظاہری علامت ایک تو یہ ہے کہ انسان موافق طبع منہیات شرع کا ارتکاب کرنے لگ جاتا ہے۔ طبع سے یہاں نفس امارہ مراد ہے اور باطنی علامات سے دوسری علامت یہ ہے کہ ایسے شخص کو حُبِ دنیا و شہوات اور ان سے لذات پانے کا مرض ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے : تم ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہتے ہو جب تک تم سے دو نشے ظاہر نہ ہوں :

(۱) نشۂ جہل

(۲) نشۂ حُبِ دنیا

رُوحانی نسخے بعض اکابر اولیاءؒ نے فرمایا کہ صدق اور وصول الیٰ مقامات الانبیاء کی تین علامتیں ہیں :

(۱) مال و دولت کی محبت دل سے ایسے نکل جائے کہ سونا چاندی مٹی کے برابر محسوس ہو۔[۱]

(۲) تصورِ خلق خدا کو دل سے ایسے نکالا جائے کہ نہ کسی کی مدح سے خوشی ہو اور نہ کسی کی مذمت سے ملال۔[۲] گویا یُوں سمجھے کہ وہ مردہ ہیں اور میں اکیلا زندگی بسر کر رہا ہُوں۔

(۳) سیاستِ نفس اپنے قابو میں ہو، یہاں تک کہ بھُوک اور ترکِ شہوات پر اتنی خوشی ہو جتنی دنیا داروں کو پیٹ بھر کر کھانے اور شہوات کی تکمیل سے ہوتی ہے۔

لطیفہ حسین و جمیل عورت شہوات کے قبیل سے نہیں بلکہ تصفیہ کے اسباب اور اس کی موافقت دنیا کی بہترین سعادات سے ہے۔

ملفوظ علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا : انسان کے لیے پانچ امور سعادت کے

---

[۱] جیسے سیدنا غوثِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حال تھا کہ ایک دفعہ آپ کے ایک کارندے نے کہا کہ آپ کا مال سے لدا ہوا جہاز غرق ہو گیا ہے آپ نے فرمایا : الحمدُ لِلّٰہ۔ کارندے نے پھر تھوڑی دیر کے بعد حاضر ہو کر عرض کی کہ وہ جہاز ڈوبنے سے بچ گیا۔ آپ نے فرمایا : الحمدُ للّٰہ۔

[۲] اعلیٰحضرت قدس سرہٗ فرماتے ہیں :

نہ مرا نوش ز تحسین نہ مرا نیش ز طعن — نہ مرا گوش بمدحے نہ مرا ذمے

منم و کنج خمولی کہ نگنجد دردے — جز من و چند کتابے و دوات قلمے

(حدائق بخشش ص ۱۲۸ مطبوعہ کراچی، باہتمام ظفر علی نعمانی)

اویسی غفرلہٗ

اسباب ہیں :

(۱) زوجہ موافق

(۲) اولاد نیک

(۳) بھائی پرہیزگار

(۴) ہمسائیگان نیک بخت

(۵) اس کا رزق اس کے اپنے شہر میں ہو۔

بے ریش لڑکے فتنے ہیں بے ریش لڑکا دنیا کے عظیم فتنوں سے ہے کیونکہ نہ تو اس سے عورت کی طرح نکاح ہو سکتا ہے (اور نہ ہی اس کی وطی سے کوئی فائدہ بلکہ ہزاروں بیماریوں اور ذلتوں اور خواریوں کے سوا کچھ حاصل نہیں)

سبق : عاقل پر لازم ہے کہ بے ریش لڑکے کو دیکھنے سے بھی بچے اور پھر لواطت تو بہت برا فعل ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ بندے کو اپنے روکے ہوئے فعل کا مرتکب دیکھتا ہے تو اسے غیرت آتی ہے اس پر وہ اس بندے کی سرزنش کرتا ہے یا اسے سزا دیتا ہے۔ ہم اس کی پکڑ سے پناہ مانگتے ہیں اور اس کے غصے اور رنج سے بچنے کی التجا کرتے ہیں۔

تفسیر عالمانہ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ فرمائیے اے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ! جملہ تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں ان جملہ نعمتوں پر جو اللہ نے ہمیں عطا فرمائیں منجملہ ان کے ایک یہ کہ انبیاء و مرسلین اوران کے سچے جانشینوں اولیاء کرام کے اعداء کو تباہ و برباد کیا۔ وہ اس لیے کہ لوط علیہ السلام کے ساتھیوں کو جو نعمت عطا ہوئی وہ گویا ان کو عطا ہوئی وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اور سلامتی و نجات اللہ تعالیٰ نے ان پاکباز بندوں پر جنہیں اس نے برگزیدہ فرمایا اوران کی تخلیق ازل سے ہی نہایت اعلیٰ فرمائی اور انھیں ہدایت بخشی اور انہیں ہمیشہ کے لیے نبوت و رسالت و ولایت کے لیے چنا ان سے انبیاء و رسل علیٰ نبینا و علیہم السلام اور ان کے خواص مقرب بندے مراد ہیں جو آفات اور عقوبات سے مطلقاً محفوظ رہے۔

فائدہ عالمانہ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ والوں کے اعداء ضرور تباہ و برباد ہوتے ہیں اگرچہ دیر کے بعد سہی۔ اور آگاہ کرنا ہے کہ انبیاء خود اوران کے اصحاب کو سلامت و نجات نصیب ہوتی ہے اور یہی طریقہ ان کے وارثین کاملین اولیاء کے لیے جاری ہے ان کے اعداء تباہ و برباد ہوتے رہیں گے اور یہ ہر زمانہ میں ہوا اور ہوگا۔ اس مقام پر یہی بات واضح اور سابقہ آیات کے مضامین کے عین مطابق ہے۔

فائدہ صوفیانہ بزرگ فرماتے ہیں کہ اہل اسلام وہ ہیں جو تعلقات کی آلائش سے پاک اور ان کا سر فکر

خلائق سے خالی ہے آج وہ بالواسطہ سلام کی صدائیں سُنتے ہیں کل وہ بلاواسطہ سُنیں گے جبکہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا:
سلامٌ قولاً من رب رحیم (یہ سلام رب رحیم سے ہے) ؎

ہر بندہ کہ او گشت مشرف بسلامت
البتہ شود خاص بتشریف سلامت
لطفے کن و بنواز دلم را بسلامت
زیرا کہ سلامت ہمہ لطفست و کرامت

ترجمہ : جو بندۂ خدا سلامتی سے مشرف ہُوا وہ تشریفِ خداوندی سے مخصوص ہوگیا، لطف فرما اور میرے دل کو سلامتی سے نواز اس لیے کہ سلامتی تمام کی تمام لطف وکرامت ہے۔

آٰللّٰہُ دو الفوں کی مقدار کھینچیں۔ دراصل ءَاَللّٰہُ تھا۔ پہلا ہمزہ استفہامیہ ہے دوسرا وصلی تخفیف کے طور، پہلے پر مد لائی گئی۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ کیا خدائے برحق **خَیْرٌ** بہتر ہے اپنے بندوں کو زیادہ نفع پہنچاتا ہے۔

ف : کشف الاسرار میں ہے کہ خدا کو لائق ہے بہتری۔

اَمَّا دراصل امّ الّذی تھا۔ ام متصلہ اور ما موصولہ ہے **یُشْرِکُوْنَ** ۝ یا وہ جن کو وہ شریک بناتے ہیں یعنی بت اپنے پرستاروں کو زیادہ نفع پہنچاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بت خاک نفع پہنچاتے ہیں نفع تو اللہ تعالےٰ ہی پہنچاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ہی بہتر عبادت کے لائق ہے۔

مسئلہ : حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ آیت ختم کرتے تو پڑھتے :
بل اللّٰہ خیر و ابقی۔
(بلکہ اللہ ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے)

سوال : لفظ خیر کا اطلاق ان دو چیزوں پر ہوتا ہے جن میں ایک بہ نسبت دوسری کے اچھی ہو۔ اور یہاں اللہ تعالیٰ پر خیر کے اطلاق سے بتوں کے لیے خیریت ثابت ہوئی ہے حالاں کہ وہ کسی بھی بھلائی کے لائق نہیں۔

جواب : یہاں مشرکین پر الزام، ان پر تہدید و تشدید اور ان پر تہکم مراد ہے یا اس لیے کہ وُہ لوگ اپنے بتوں کے لیے بھلائی کا عقیدہ رکھتے تھے۔

ف : یہ استفہام اور دوسرے وہ استفہامات جو بیسویں پارہ کے پہلے رکوع میں آنے والے ہیں سب کے سب تقریر و توبیخ کے استرشاد کے لیے نہیں۔

ربط : آنے والے بیان میں تثبیت سے تصریح کی طرف انتقال ہے اور مزید تشدید ہے ۔

الحمد للہ فقیر قادری نے پارہ نمبر ۱۹ کے ترجمہ سے ۲۳ ربیع الآخر ۱۴۰۳ھ بروز ایمان افروز پیر مبارک پونے دس بجے دار العلوم جامعہ اویسیہ رضویہ بہاول پور کے صحن میں فراغت پائی

فللہ الحمد علیٰ ذٰلک والصّلوٰۃ والسلام علیٰ

حبیبہ الکریم وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ واحبابہٖ

اجمعین۔

فقط

محمد فیض احمد اویسی رضوی غفرلہ

۷ ر فروری ۱۹۸۳ء بہاولپور ، پاکستان
